قیمت سالانہ چھ روپے (للعہ)   رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴۷   قیمت ششماہی ۳ روپے فی پرچہ ۸ آنے

منجانب انجمن ادبیہ اسلامیہ

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹرز:-
ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۵   اشاعت ماہ جولائی ۱۹۲۴ء   نمبر ۱

تصویر   کرشن

فہرست مضامین

... جالندھری پرنٹر اور پبلشر ... پریس ...

دریا بہ حباب اندر

(صفحۂ ادارت)

دو سال گزر گئے اور اس اشاعت کے ساتھ ہزار داستان اپنی زندگی کے تیسرے سال کا افتتاح کر رہا ہے۔

بادی النظر میں یہ دو سال کی مدّت بہت قلیل معلوم ہوگی۔ لیکن اپنی مخصوص و محدود روش کے لحاظ سے اس نے اُردو ادب کی جو خدمت کی ہے، توقع سے بہت زیادہ ہے۔

ہزار داستان کے اجرا سے پیشتر ادبِ لطیف کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف تھے لیکن آج دُنیائے اُردو کے ہر گوشہ میں اس کے سمجھنے والے اور اس میں دلچسپی لینے والے موجود نظر آتے ہیں۔ اور یہ عظیم الشان کامیابی ہزار داستان کے لئے بجا طور پر مایۂ صد نازش ہے۔

اُردو رسائل کی قدیم و جدید روش کا مقابلہ کرنے سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہو جائیگی۔

آج "افسانہ" سوقت الشیوع رسائل کا عنصرِ غالب نظر آتا ہے۔ لوگ اسے شوق سے پڑھتے اور اس سے سبق لیتے ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں جب موعظت و حکمت کے خشک مباحث میں تاثر پیدا کرنے کے لئے افسانہ ہی ایک بہترین ذریعہ سمجھا جائیگا۔

آسمانِ ہند کے نیچے مذاقِ صحیح کی خوشگوار فضا پیدا کرنے میں ہزار داستان اپنے معاصرین سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ یہ کہنا بھی کچھ بیجا نہیں کہ عام مشکلات کے باوجود مستقل طور پر صرف ادبِ لطیف کو اپنا حلقۂ عمل بنا لینا ہزار داستان کے سر اولیت کا سہرا باندھتا ہے۔ بیشک اس نے جس کارِ دشوار کا بیڑا اُٹھایا تھا اُسے ایک حد تک پُورا کر دکھایا ہے

لیکن رسالہ کو کامیاب بنانے اور اس کا بلند معیار قائم رکھنے میں کارپردازانِ ہزار داستان سے زیادہ وہ ہستیاں قابلِ مبارکباد ہیں جو ہر طرح قلمے درمے اس کی مدد پر تلی رہی ہیں۔ اور جن کی امداد کے بغیر ہم کچھ بھی کر سکنے کے قابل نہ تھے۔ غالباً ہمارا یہ اعتراف ہمیں الزامِ خودستائی سے بچا لیگا۔

ہم اپنے محسنوں کی خدمت میں اپنا ناچیز [illegible] مستدعی ہیں کہ اپنی نوازشات کا سلسلہ جاری رکھیں اور زبانِ اُردو کو اسی بلندی [illegible] جس پر دوسری زبانیں پرواز کر رہی ہیں۔

خدا کا فضل شامل حال رہا تو امسال بھی ہزار داستان اپنے اہم فرائض کی بجا آوری میں بیش از بیش مستعدی اور سرگرمی سے کام لیگا۔

ہزار داستان مدت کے بعد پھر حضرت مسہا کے پُر کیف کلام سے مزین ہوا ہے۔ اور اس یاد آوری کے لئے ہم جناب ممدوح کے دل سے شکرگزار ہیں۔ لیکن اتنی عرض ضرور کرینگے کہ ؎

وہ اگر یاد کریں ہم کو تو بھولیں کس کو ہم اگر ان کو بھلائیں تو کسے یاد کریں

فخر پنجاب حضرت مولنا اسا تاک کے ہم خاص طور پر احسان مند ہیں۔ کیونکہ آپ نے اپنی بے حد مصروفیتوں کے باوجود ہمارے تقاضوں کو رد نہیں کیا۔ اور آئندہ بھی اپنی نوازشات کو جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

جناب ابوالفاضل سید ناز چاندپوری نے جنکی ترنم ریز و معنی خیز نظمیں اور غزلیں برابر صفحات ہزار داستان کی زینت بن رہی ہیں اب نثر کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے۔ روداد محبت ان کی پہلی کوشش ہے جو ترجمہ کی شکل میں نذر ناظرین ہوتی ہے۔ اور ہم اس سعی کامیاب کی داد دیتے بغیر نہیں رہ سکتے۔

حسین لڑکی کا لڑکپن" یہ بینظیر اور نیچرل نظم سحرالبیان حضرت مولنا احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی نے (ہمارے سفر رامپور کے دوران میں) "اعجاز" مرحوم کے لئے عنایت فرمائی تھی۔ اعجاز کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اس لئے اب ہزار داستان کو اسے شائع کرنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ ممدوح اردو شاعروں میں بہت بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ نے ہندوستانی لڑکی کا لڑکپن جس نیچرل طریق سے پیش کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

پیشتر عرض کیا جا چکا ہے کہ ہزار داستان اب ہر انگریزی مہینے کی آخری تاریخ شائع ہوا کریگا۔ وہ اصحاب جو اس تاریخ مقررہ سے پیشتر ہی تقاضا شروع کر دیتے ہیں۔ براہ مہربانی تیسری تاریخ تک انتظار فرمالیا کریں۔

نمونہ کا رسالہ لوگ مفت طلب کرتے ہیں۔ ان کے خطوط ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے جاتے ہیں۔ نمونے کے لئے ۱ر کے ٹکٹ ارسال فرماتے۔

مینیجر

کرشن کنھیّا

اے دیکھنے والو　اس حسن کو دیکھو
اس راز کو سمجھو
یہ نقشِ خیالی　یہ فکرتِ عالی
یہ پیکرِ تنویر　یہ کرشن کی تصویر
معنی ہے کہ صورت؟　صنعت ہے کہ فطرت؟
ظاہر ہے کہ مستور؟　نزدیک ہے یا دور؟
یہ نار ہے یا نور؟

وہ طُرفہ نظارے　یاد آ گئے سارے
جمنا کے کنارے
سبزے کا لہکنا　پھولوں کا مہکنا
گھنگھور گھٹائیں　سرمست ہوائیں
معصوم اُمنگیں　اُلفت کی ترنگیں
وہ گوپیوں کے ساتھ　ہاتھوں میں دیے ہاتھ
رقصاں ہُوا برجناتھ

دُنیا سے نرالا　یہ بانسری والا
گوکل کا گوالا
ہے سحر کہ اعجاز؟　کھُلتا ہی نہیں راز
کیا شان ہے واللہ　کیا آن ہے واللہ
حیراں ہوں یہ کیا ہے　اک شانِ خُدا ہے
بُت خانے کے اندر　خود حسن کا بت گر
بت بن گیا آکر

بنسی میں جو لَے ہے　نشہ ہے نہ مے ہے
کچھ اور ہی شے ہے
اِک رُوح ہے رقصاں　اِک کیف ہے لرزاں
اِک عقل ہے مَے نوش　اِک ہوش ہے مدہوش
اِک خندہ ہے سیّال　اِک گریہ ہے خوشحال
اِک عشق ہے پُر نُور　اِک حسن ہے مجبور
اِک سحر ہے مسحور

⁂

دربار میں تنہا لاچار ہے کرشنا[1]
آ شیام ادھر آ

سب اہلِ خصومت ہیں درپئے عزّت
اور راج دُلارے بُزدل ہوتے سارے
پردہ نہ ہو تاراج بیکس کی رکھ لاج
آجا میرے کالے! بھارت کے اُجالے!
دامن میں چھپالے!

وہ ہو گئی ان بن وُہ گرم ہُوا رن
مغموم ہے ارجن
وُہ آگئے جگدیش وہ مٹ گئی تشویش
اُپدیش سُنایا سب وہم بُھلایا
عم زاد کا غم کیا؟ اُستاد کا غم کیا؟
لو ہو گئی تدبیر لو بن گئی تقدیر
لو چل گئی شمشیر

سیرت ہے عدوسوز صورت نظرافروز
دِل کیفیت اندوز
غصّہ میں جو آجائے بجلی ہی گرا جائے
اور لطف پر آئے تو گھر بھی لُٹائے

پریوں میں ہے گلفام رادھا کے لئے شیام
بلرام کا "بھیّا" متھرا کا "بسیّا"
بندرا بن کنھیا

بن ہو گئے ویراں برباد گلستاں
سکھیاں ہیں پریشاں
دریا کا کنارا سنسان ہے سارا
طوفان ہیں خاموش موجوں میں نہیں جوش
لو تجھ سے لگی ہے حسرت ہی یہی ہے
اے ہند کے راجا اِک بار پھر آجا
دُکھ درد مٹا جا

ابر اور ہوا سے بُلبل کی صدا سے
پھولوں کی ضیا سے
جادو اثری گُم شوریدہ سری گُم
ہاں تیری جُدائی فطرت کو نہ بھائی
تو آئے تو شان آئے تو آئے تو جان آئے
آنا نہ اکیلے ہوں ساتھ وہ میلے
سکھیوں کے جھمیلے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

[1] کرشنا دروپدی کا دوسرا نام ہے

حیات تازہ

(۱)

ریاض نے اپنی زندگی میں مصائب اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔ شادی ہونے کے بعد اس کے ماں باپ ایک سال کے اندر اندر راہیِ مُلکِ عدم ہو گئے۔ اور ضروریاتِ حیات کا بار آغازِ شباب ہی میں اس کے سر پر رکھ دیا گیا۔ ناتجربہ کاری سے زر و مال تجارتی ڈاکوؤں کے نذر ہو گیا۔ اور وہ خیال کرنے لگا۔ کہ دنیا نے اُسے لُوٹ لیا ہے۔ رہی سہی پونجی اس کی بیوی تھی جس کو وہ اپنے بدنصیب ہاتھوں سے آج دو ماہ ہوتے سپردِ خاک کر چکا تھا۔

بازارِ حیات میں قسمت آزمائی کی حوصلہ شکن ناکامیوں کے بعد یہ ایسا صدمہ تھا جس نے اس کے حوصلے پست کر دیے اور وہ صحرائے ہستی میں اس خشک لکڑی کی طرح رہ گیا جسے آگ لگا کر قافلے والے روانہ ہو جاتے ہیں۔

اب اسے کوئی ہمدرد نظر نہ آتا تھا۔ دنیا دار اہلِ رشتہ اور منہ دیکھے کے یار آشنا تعزیت کے لئے آئے۔ اور اس کی بدبختی کا رونا رو گئے۔ تسلّی کے عوض اس کو ان کی ماتم داری میں ایک قسم کا اندازِ استہزا نظر آیا۔

دو ماہ سے وہ اپنے فرسودہ مکان میں تنہا تھا کئی مرتبہ جب اس کی بیوی کچھ دنوں کے لئے میکے چلی جاتی تھی وہ تنہا رہا کرتا تھا۔ اُس وقت اُس کی راتیں امید افزا انتظار میں کروٹیں بدلتے کٹتی تھیں۔ ایک پُر لطف بے چینی اسکے دل کو بہلائے رہتی تھی۔ اس کی ولولہ انگیز سیٹیوں میں گھر کی ہر ایک چیز ڈوب جاتی تھی۔ اُن دنوں اس کی بیداریاں لطیف امیدوں سے لبریز اور اسکی نیندیں خوشگوار خوابوں سے معمور رہا کرتی تھیں۔

لیکن آہ! موجودہ تنہائی بالکل برباد اور ویران تھی۔ اس سے پیشتر اسے اس قسم کی خاموش اور سنسان راتیں بسر کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اب اس کی زندگی بالکل بے مقصد معلوم ہوتی تھی۔ وہ حیران نگاہوں سے در و دیوار کو تکتا۔ اور گم ہو جاتا وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان تمدن میں بالکل بے مصرف ناکارہ چیز سمجھ رہا تھا۔ اس کی کیفیت زا سیٹیاں دم بخود تھیں اور اس کا انتظار ختم ہو چکا تھا۔

ابھی آدھی رات کا گجر نہیں بجا تھا۔ اور وہ اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا آسمان کو تک رہا تھا۔ ہوا کی تھکی ہوئی رفتار گرد و پیش کی اُداسی میں اضافہ کر رہی تھی۔

چودھویں کا چاند اس کے زرد چہرے پر طعن آمیز ہنسی ہنس رہا تھا۔ اور ستاروں کا درماندہ قافلہ اندوہ فزا خاموشی کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔

"زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن"

اس کے لبوں سے ایک ہلکی آہ کے ساتھ یہ شعر نکلا۔ اور وہ ایک افسردہ انگڑائی لیکر اُٹھ بیٹھا۔ اس کے تخیل نے دُنیا والوں کے ظاہری اور خشک برتاؤ کی وجہ سے اسے اس جگہ کی ہر چیز سے بالکل متنفر کر دیا تھا۔ اس نے بے بس نگاہیں اپنے گھر کے در و دیوار پر ڈالیں۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک آخری قطرہ ڈھلک گیا ——

وہ بہت رو چکا تھا۔ اس نے دو ماہ گزرے اپنی بیوی کے بالین مرگ سے اُٹھ کر تنہائی میں خُدا کے حضور دُعائیں مانگی تھیں۔ آنسو بہائے تھے۔ گڑگڑایا تھا۔ مگر بیدرد موت نے اس کی مسرت کا خزانہ چھین لیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سوتے خشک کر دیئے۔

اس وقت وہ اپنے سوچے ہوئے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے بارہ بجنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا مختصر سامانِ سفر ایک کمبل اور ایک بڑے تھیلے کی شکل میں چارپائی کے قریب دھرا تھا۔

"ترکِ تعلق۔ ترکِ تمدن۔ ترکِ دُنیا"۔ تصور نے پہاڑوں اور جنگلوں کی غیر آباد جھونپڑیوں میں رہنے والے راہبوں کی ویران زندگی کے نقشے اس کی آنکھوں کے سامنے لا رکھے تھے۔ اور انسانوں کی سرد مہری نے ایک تند اور جوشیلی نفرت کی فصیل اس کے گرد کھینچ دی تھی اور وہ ظاہرداروں کی بستی چھوڑنے کے لئے بالکل تیار تھا۔

(۲)

اس کا سفر عظیم الشان اور اس کی ہمت کے لحاظ سے پُرشکوہ تھا۔

اب وہ دُنیا کے خود غرض ہنگاموں سے بہت دُور کوہستانِ کشمیر سے بھی پرے سر بفلک پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی وادی میں مقیم تھا۔ اس وادی تک پہنچنے کے لئے وہ کسی شاہراہ یا کسی پگڈنڈی کا مرہونِ منت نہ تھا۔ بلکہ وہ یہاں پہنچنے کو ایک معجزہ خیال کرتا تھا۔

اس نے کوہستان کا چپہ چپہ روند ڈالا۔ مگر اس وادی سے زیادہ آرام دہ پُر فضا اور انسانی آلائشات سے پاک اور کوئی جگہ نہ دیکھی۔ اور اسے اپنے رہنے کے لئے منتخب کر لیا۔ اُس نے بڑی محنت کے ساتھ ایک بڑی چٹان کی آڑ میں پتھروں اور درختوں کے پتوں کو ملا کر ایک خوشنما اور پُرامن جھونپڑی بنالی۔ اس کو عطر بیز اور گلپوش بیلوں سے سجایا۔ اور اس میں رہنے لگا۔

جب صبح کا دُھندلکا منتشر ہو جاتا۔ اور آفتاب بلند

چڑیوں کو تاج زرّیں پہنا دیتا۔ وہ فریضۂ صبح ادا کرنے کے بعد ایک خود مختار بادشاہ کی طرح اپنی جھونپڑی سے نکل کھڑا ہوتا۔ اور وادی کے درمیان نہایت متانت سے بہنے والے شفاف چشمے کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ ٹہلتا۔ خوشبودار پھولوں سے پٹا ہوا دامن کوہ اس کی آنکھوں میں اطمینان کا نور بھر دیتا۔ اور جواہرات کی طرح پھلوں سے لدے ہوئے درختوں میں چڑیوں کے لطیف نغمے اس کے تلخ خیالات کو دل سے محو کر ڈالتے۔ اس کا سارا سارا دن مچھلیاں پکڑنے، اپنے خود ساختہ غلیل سے پرندوں کا شکار کرنے اور کھودنے، درختوں سے پکے ہوئے پھل توڑنے اور سامان کو بارش اور برف باری کے دنوں کے لئے سکھانے میں صرف ہو جاتا تھا۔

اناج نہ یہاں مل سکتا تھا اور نہ فطرت کی طرف سے پھلوں، پرندوں اور خرگوشوں کی وسیع بخشش کے باعث اسے اس کی احتیاج تھی۔ ایندھن بیشمار ادھر ادھر پڑا تھا وہ اسے جمع کرتا اور برفباری کے دنوں کے لئے اپنے جھونپڑے کے ساتھ کی پہاڑی کھوہ میں انبار لگا دیتا تھا کبھی کبھی جب وہ اپنی تنہائی سے اکتا جاتا اور ہم جنس کی یاد اس کے دل کو پریشان کرتی تو وہ اپنے خود غرض دوستوں کی یاد سے اپنے گرد اس وادی کے پہاڑوں سے بھی زیادہ بلند ایک دیوار قائم کر لیتا تھا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز تبسّم آجاتا تھا۔

وہ گرمی کے دنوں میں کئی کئی مرتبہ سرد اور آئینے کی طرح صاف چشمے میں اُتر جاتا۔ پہروں اس کی ہلکی اور رواں لہروں اور تہ میں چمکنے والے کنکروں سے کھیلتا۔ اور پھر داڑھی اور سر کے بڑھے ہوئے سیاہ بالوں کو نچوڑتا ہوا باہر نکلکر اپنی کھال کا لباس پہن لیتا۔ شکاری چھُرا کمر میں لگاتا اور اپنی غلیل لیکر پہاڑوں اور چٹانوں پر پھلانگتا پھرتا۔

شام کے وقت جب مغرب کی جانب سے ایک نورانی شعاع تمام پہاڑوں اور ندی کے پانی کو ارغوانی رنگ میں رنگ دیتی اُس وقت وہ فریضۂ مغرب کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ اور اس سچے دل سے خداوند قدوس کی تعریف و تسبیح کرتا کہ اس کا دل خوشی سے معمور ہو جاتا تھا۔

پھر وہ دن بھر کی بھونی ہوئی حلال اور پاکیزہ چڑیوں اور خوش ذائقہ پھلوں کو شکریہ اور رغبت کے ساتھ کھانے بیٹھ جاتا۔ اور جب سیاہی اس وادی کو اپنے دامن میں چھپا لیتی تو وہ آہستہ آہستہ اپنی خوشنما جھونپڑی میں داخل ہوتا۔ جہاں شبنم اور ہوا کی خنکی اسے کوئی ضرر نہ پہنچاتی۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ اور اُس نے انسان تو کیا حشرات الارض اور پرندوں کا نشان بھی اس جنت نشان وادی میں نہ دیکھا۔

لاریب یہ ایک چھوٹی سی جنت تھی۔ اور وہ صرف ایک ہی

ہوا تھا جیسے کسی حوا کی غیر موجودگی اتنا مضطرب نہ کرتی تھی کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا۔

(۳)

اسے یقین ہو گیا تھا کہ انسان اپنی ہوا و ہوس چھوڑ کر کبھی اس غیر آباد خطہ کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتے۔ علاوہ ازیں سینکڑوں کوس کے کوہستانی سلسلے کی دشوار گزار صعوبتیں جن کا اس کو خود تجربہ تھا۔ اسے مطمئن رکھتی تھیں۔ اگرچہ کبھی کبھی ہم جنس کو دیکھنے کا شوق اور کبھی دانۂ گندم کی کشش تھوڑی دیر کے لیے اسے وادی سے نکلنے پر اکساتی۔ مگر وہ ان خواہشوں کو بزور دبا دیتا تھا۔ اور اپنی شہنشاہی چھوڑ کر کہیں جانے کے خیال پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا تھا۔

ایک روز شام کو وہ اپنے دامن میں پھل اور دن بھر کے بھونے ہوئے شکار لیکر اپنے وسیع جھونپڑے کی طرف لوٹ رہا تھا تو اس کے دل میں انسانی دنیا کے خیالات کے ہجوم نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اسنے ان خیالات کو دبانے کے لئے دشوار گزار بلندیوں پر نگاہ ڈالی۔ یکایک وہ ٹھہر گیا۔ اُس نے دور افق پر بادلوں کے درمیان دو شکلیں متحرک دیکھیں۔ حیرانی اور شوق کے ملے جلے جذبات نے اس کے قدموں کو زمین میں گاڑ دیا۔ اور وہ غور سے ادھر دیکھنے لگا۔ ارغوانی بادلوں میں مبہم سی دو صورتیں نظر آئیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں ڈوب گئیں۔ وہ اپنے داہیے پر ہنسا۔ اور جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ چڑیاں درختوں کو لوریاں دے رہی تھیں۔ اور فضا میں ایک تحیر تھا۔ اور تذبذب!

(۴)

نماز کے بعد وہ اپنے خشک گھاس کے گدے اور آرام دہ بستر پر لیٹ گیا۔ اور موجودہ آزاد اور پاکیزہ زندگی پر خدا کا شکر کرتا ہوا سو گیا۔ کیونکہ وہ بہت جلد سو جانے کا عادی تھا۔

وہ ایک پر لطف خواب دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک غیر متوقع انسانی آواز نے اسے بیدار کر دیا۔ اور وہ ایک پر شوق گھبراہٹ میں گھرا ہوا اپنے جنگلی بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسنے جلد جلد لباس پہنا اور احتیاطاً چھرا کمر سے لگا کر جھونپڑی سے باہر نکلا۔

نکھری ہوئی چاندنی نے وادی کا حسن دوبالا کر رکھا تھا ندی پگھلی ہوئی چاندی کی ایک سفید چادر معلوم ہوتی تھی۔ سبزے پر شبنم کے موتی اور درختوں کے پتے چاند کی کرنوں میں درخشاں نظر آتے تھے۔ اس نے تشویش اور اضطراب کی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ جھونپڑی سے چند گز کے فاصلے پر ایک چوڑی چٹان کے اوپر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سر پر ایک جھکی ہوئی صورت صاف نظر آ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی کراہنے کی دردناک آواز اس کے کانوں میں آئی۔

یکایک ہمجنس کے شوق ملاقات اور فطری ہمدردی نے نفرت کے تمام خیالات اس کے دل سے دور کر دئے اور ان کی جگہ ہمدردی نے لے لی!

"وہ ضرور بھٹکے ہوئے مسافر ہیں اور ان اُونچے پہاڑوں کو عبور کرتے وقت انہیں ضرور چوٹیں آئی ہونگی"

یہ سوچ کر وہ جلد جلد شبنم آلود گھاس کو روندتا ہُوا ان کی طرف بڑھا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ جھکی ہُوئی نوعمر نازنین لڑکی نے اسکے قدموں کی آواز سنکر سر اُٹھایا اور خوف سے چیخ اٹھی۔

لیٹے ہُوئے بوڑھے آدمی نے کراہتے ہُوئے اُٹھنے کی کوشش کی اور ابھی وہ بھاری پستول کا نشانہ باندھ ہی رہا تھا کہ ریاض زور سے بول اُٹھا۔

"میں دشمن نہیں ہوں۔ مدت سے تنہا اس وادی میں رہتا ہوں۔ وہ دیکھو میری جھونپڑی قریب ہے۔"

وہ اُنگلی سے اپنی جھونپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے ان کے قریب پہنچ گیا۔ ان الفاظ سے نازنین کی تسلی ہوگئی اور اُس نے جھپٹ کر بوڑھے میاں سے پستول لے لیا۔ اور اس کے پٹیوں سے بندھے ہوئے سر کو اپنے درماندہ اور مرتعش ہاتھوں سے تھامنے لگی۔ اس نے رحم طلب نگاہوں سے ریاض کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اور بوڑھے آدمی کو جو زخموں اور چوٹوں سے چکنا چور ہو گیا تھا۔ اور جس کا لباس قریب قریب ہر جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس نے دیکھا تو بوڑھے کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ اس کا ہونٹ کسی نوکدار پتھر پر گرنے کے سبب آدھے سے زیادہ پھٹ گیا تھا۔ اور اس پر خون جم رہا تھا۔ اور وہ ابتک تشویشناک نگاہوں سے ریاض کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گو اس کا خوف فی الجملہ کم ہو چکا تھا۔

اور جب ریاض نے شفقت سے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ تو بوڑھے کو بالکل تسکین ہو گئی۔ اسکے خون آلود ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگی۔ اور اُس نے ضعیف آواز سے بولنے کی کوشش کی۔

"میں چور چور ہو رہا ہوں۔ - - - - پانچ دن رات کا خطرناک سفر۔ چوٹیں۔ نادان بچّی ——"

یہ کہکر وہ تھک گیا۔ اور ریاض نے اسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ اور استفسارانہ طور پر نازنین کی جانب نظر کی جو اس عرصہ میں چٹان کے ایک کونے پر اپنے پھٹے ہُوئے کپڑوں کو چھپانے اور اپنے نازک جسم کی چوٹوں کے درد کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چاند کی روشنی میں اس کا سفید چہرہ نور کی قندیل تھا۔

"تم بھی بہت تھکی ہُوئی اور زخمی معلوم ہوتی ہو، ذرا اور ہمّت کرو تو بڑے میاں کو جھونپڑی میں لے چلیں۔ وہاں تمہیں آرام ملیگا۔"

نازنین نے جھینپی ہوئی نظروں سے رضامندی کا اظہار کیا۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ملکر بوڑھے آدمی اور دو ہلکی ہلکی گٹھڑیوں کو جھونپڑی تک لیجانے کے لئے مستعد ہو گئے۔ ریاض نے بوڑھے کو سہارا دیا۔ جو ہلکے ہلکے کراہتا ہوا اپنے پاؤں پر اس کے ساتھ چل نکلا۔ خوشبودار ہوا کے جھونکے وادی میں آزادی کے ساتھ سرسرا رہے تھے۔ اگرچہ لڑکی کے پاؤں بھی بہت زخمی تھے۔ لیکن وہ اپنی ٹوٹی ہوئی چپلی کو گھسیٹتی ہوئی دونوں گٹھڑیوں سمیت ریاض کے پیچھے پیچھے جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔

ریاض نے گھاس کے بستر پر بوڑھے کو لٹا دیا۔ اور خود جھونپڑی کے دوسرے حصے میں پتھر رگڑ کر آگ روشن کی۔ اور دن کا بھنا ہوا گوشت اور پھل دونوں کے آگے رکھ دیئے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ہونٹ کی سوجن کے سبب بوڑھا کچھ کھا نہیں سکتا تھا! ریاض نے جلد جلد اس گوشت کی یخنی بنائی۔ اور گرم گرم بوڑھے کو پلائی۔ اور بوڑھے کے زخم دھونے کے لئے لڑکی کو گرم پانی دیا۔ خود جھونپڑی کے دوسرے حصے میں اپنا پھٹا ہوا کمبل بچھا کر ان کے مصائب پر غور کرتا ہوا سو گیا۔

(۵)

آفتاب نے مشرق کی پہاڑیوں سے سر نکالا۔ اور وادی پھر ایک دفعہ اس کے نور سے معمور ہو گئی۔ ریاض ذرا دیر سے اٹھا۔ اور اپنے زخمی مہمانوں کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے لئے جھونپڑی کے اس حصہ میں داخل ہوا۔

لڑکی نے بوڑھے آدمی کو گٹھڑیوں کے سہارے بٹھا دیا تھا۔ اور خود اس کے زخموں کو دیکھ رہی تھی۔ بوڑھا اس وقت رات کی نسبت بہت زیادہ اچھی حالت میں ہو گیا تھا۔ اس نے ریاض کے سلام کا جواب نہایت شستہ زبانی اور تپاک سے دیا۔ نازنین نے شرمگیں اور شکر گزار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں۔

ریاض نے سوال کیا "بڑے میاں اگر تکلیف نہ ہو تو اپنے اس ناگوار سفر کا حال مجھے بتائیے۔ میرا خیال ہے کہ آپ راستہ بھول کر اس طرف آنکلے ہیں۔"

بوڑھا افسردہ تبسم کے ساتھ بولا "بیٹا تو نے میرے اور میری بچی کے ساتھ جو مہربانی کا سلوک کیا ہے اس سے مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ تو کسی شریف شخص کا فرزند ہے۔"

پھر اس نے اپنی سفید اور لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے محسن سے اپنا حال چھپانا نہیں چاہتا۔"

ریاض اس فقرے سے بہت متعجب ہوا۔ اور اس کے ضعیف چہرے کی طرف تشویشناک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

بوڑھا بولا۔ بیٹا در اصل میں پنجاب کا رہنے والا ہوں اور ان بلند اور ویران پہاڑوں سے مجھے کچھ مناسبت نہیں

بدقسمتی اور صحبتِ بد کی وجہ سے اوائل عمر ہی میں مجھ کو چوری کی عادت پڑ گئی۔ اور بالآخر میں ڈاکو بن گیا تھا۔"

پھر اس نے ریاض کو پریشان دیکھ کر کہا۔ "نہیں نہیں ڈرو نہیں۔ میں جوانی کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں نے کئی ڈاکے مارے۔ میری گرفتاری کے لئے انعام مقرر ہو گئے! اور میں وہاں سے بھاگ کر ان پہاڑوں میں آ گیا۔ اور ایک دور افتادہ گاؤں میں زمین خرید کر مکان بنا لیا۔ پھر میں نے وہاں ایک پہاڑی زمیندار کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اور ڈاکے اور رہزنی کے پیشے سے تائب ہو گیا۔ آج پندرہ سال ہوئے میرے گھر یہ ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام میں نے زینب رکھا۔ مگر افسوس!

اب اس کی آواز بھرا گئی۔ ریاض نے ہمدردانہ نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ تو اسکی آنکھیں پرنم تھیں۔ بوڑھے نے دم لیکر پھر اپنی داستان کو جاری رکھا۔ ہاں تو اسکی پیدائش کے وقت اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ میں نے خود اسے پالنا شروع کیا۔ یہ جوان ہو گئی۔ میں نے اسے سارا حال بتا دیا تھا۔ اس نے میرے لئے دعائیں کرنے اور مجھے تسلی دینے کے لئے اپنا خواب و خور حرام کر دیا۔ آج سات دن ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب کی پولیس نے میرا کھوج لگا لیا ہے۔ اور میں عنقریب گرفتار ہو کر پھانسی پر چڑھا دیا جاؤنگا۔ میں گھبرا گیا۔ مجھے اپنی جان کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ مگر اس پیاری بیٹی کے خیال سے میری پریشانی بہت بڑھ گئی۔ میں نے قیمتی اور ضرورت کی اشیاء ان چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں میں باندھ لیں اور ہم دونوں بھاگ نکلے۔ زینب نے مجھے جان بچانے اور بھاگ نکلنے کی ترغیب دی تھی۔ اور میرے ساتھ ان دور دراز پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی، قدم قدم پر مجھے موت سے بچاتی ہوئی کل شام تمہاری وادی کے سر بفلک برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزار لائی۔ اس سفر میں ہم نے دن اور رات کچھ نہیں دیکھا۔ میں کئی جگہ گر گر کر بچا اور اس سعادتمند بیٹی نے مجھ گنہگار راندۂ درگاہ کو ہر طرح آفات سے بچا کر یہاں تک پہنچایا۔ رات ہم یہاں پہنچے۔ میں زخمی ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ بھی زخمی اور تھکی ہوئی تھی لیکن اس باہمت نے میری ہر طرح خبر گیری کی۔ پھر تم آ گئے بیٹا یہ ہے میری رام کہانی۔ اوہو تم گھبرا گئے۔

ہاں بڑے میاں! میں آپ کے مصائب سے گھبرا گیا تھا۔ مگر اب آپ کچھ فکر نہ کریں۔ مجھے اپنا خادم سمجھیں۔ اس وادی میں کوئی نہ آنے پائیگا۔

میں کئی سال سے یہاں رہتا ہوں۔

پھر وہ ان دونوں کو اٹھا کر ندی کے کنارے لے گیا اور خود ان کے ناشتے کا سامان کرنے کے لئے درختوں کے پھل توڑنے میں مصروف ہو گیا۔ آفتاب بلند ہو چکا تھا۔ اور وادی کی ہر ایک چیز رات کی کلفت دور کر کے تر و تازہ

ہوگئی تھی۔ لڑکی نے اپنی گٹھڑی میں سے نیا لباس نکالا اور ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر نہانے لگی۔ پھر اس نے پھٹے ہوئے لباس کی بجائے سادہ پہاڑی لڑکیوں کا لباس پہن لیا۔ اور اپنے باپ کے زخموں کو دھونے اور ان پر پٹیاں باندھنے میں مصروف ہوئی۔ اور جب ریاض پھل لیکر واپس آیا تو اس کی نظر اس نازنین لڑکی پر پڑی۔ اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ دل ہی دل میں شرم سے کانپ اُٹھا۔

(۶)

ریاض نے سرگرمی سے اپنے بچھڑے ہوئے مہمانوں کی دلجوئی اور میزبانی کا حق ادا کیا اس نے پہلی مرتبہ اپنی تباہی کی داستان اپنے مہمانوں کے سامنے بیان کی۔ جسے سُنکر بُوڑھا بہت دیر تک اسکی برباد نوجوانی پر افسوس کرتا رہا۔

چند دن کی تیمارداری نے بُوڑھے کی صحت کو بحال کر دیا۔ اس عرصہ میں حسین زینب نے جس کے پاؤں کے زخم بھر چکے تھے۔ کھانا پکانے اور جھونپڑی کو صاف سُتھرا رکھنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

وادی میں شاید پہلی مرتبہ ایک پُراسراری رونق اور چہل پہل پیدا ہوگئی تھی۔

جب بُوڑھا بالکل تندرست ہوگیا تو اس نے وہاں سے بھی آگے جانے کا ارادہ کیا۔ ایک دن باپ بیٹی نے اپنی گٹھڑیاں باندھیں۔ اور ریاض سے رخصت ہونے کے لئے جھونپڑی سے باہر نکلے لیکن ان کے دل بھی اس وادی کے دامن پناہ سے محروم ہونے پر افسردہ تھے۔

ریاض اس وقت صبح صبح نماز سے فارغ ہو کر ندی کے کنارے خیالات میں محو تھا۔ اس کی طبیعت اتنی ہی مدت میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ اور قسمت نے اتفاقاً پھر ایک بار اس کے مایوس دل میں نجیر معلوم اور مبہم اُمیدوں کی لرزشیں پیدا کر دی تھیں۔

اس نے مدت کے بعد انسانوں کی صورتیں دیکھیں اور ان کی صدائیں سُنی تھیں۔

بُوڑھے کو جانے پر آمادہ دیکھ کر وہ پھر تنہا رہ جانے کے اندوہناک تصوّر سے مغموم ہوگیا۔ اور اس کی حسرتناک نگاہیں بُوڑھے آدمی اور حسین لڑکی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اور صرف یہ الفاظ بھرّائی ہوئی آواز میں اس کی زبان سے نکلے۔

"اوہو۔ کیا آپ نے کہیں جانے کا ارادہ کر لیا۔ . . . میں تو سمجھا تھا کہ میری مدتِ تنہائی ختم ہوگئی۔"

بُوڑھے نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اور زینب کی نگاہیں وفورِ ہمدردی سے پُرنم تھیں۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ بُوڑھا سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ اُس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ جو کسی غمناک خیال میں محو ہوگئی تھی۔

اس نے وادی اور اس کے محافظ پہاڑوں پر متفکر نگاہیں

ڈالیں۔ پھر وہ ریاض کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

بوڑھے کے دل کو خدا جانے کن جذبات نے متاثر کر دیا۔ وہ اپنے عزم میں متذبذب ہو گیا۔ آخر اس نے ریاض سے پوچھا۔ "بیٹا کیا تمہیں میرے یہاں رہنے میں تکلیف تو نہ ہو گی۔ کیا تمہاری اپنی اختیار کی ہوئی تنہائی میں خلل تو نہ آئیگا۔"

ریاض کے چہرے پر مسرت کی تمتماہٹ دوڑ گئی۔

"نہیں بابا مجھے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ میں آپ کو اپنے باپ کی جگہ سمجھونگا۔"

بوڑھے نے گٹھڑی زمین پر رکھ دی۔ اور کہا۔ "بیشک یہ وادی آسودگی اور حفاظت کا مقام ہے۔ اور میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔"

پھر زینب کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ بیٹی آؤ ہم اس شریف آدمی کو اپنی قسمت کا شریک بنالیں۔ کیونکہ میرے لئے اب انسانوں کی کسی بستی میں جا کر رہنا خطرناک ہے۔ جاؤ سامان کھول ڈالو۔ اور اسی وادی کو اپنا گھر سمجھو۔

دھوپ پھیلنے لگی۔ چشمے کی گرمجوش لہریں کناروں سے گلے ملیں۔ سوسن اور بنفشہ کی کلیاں مسکرائیں۔ وادی کی ہر چیز متبسم نظر آتی تھی۔ کیونکہ ریاض اور بوڑھا ڈاکو دوسرا جھونپڑا بنانے کی تجویز کر رہے تھے۔

(۷)

پرانی جھونپڑی کے پہلو میں ایک اور وسیع کاشانہ بنایا گیا۔ جس میں ایک عورت کے سلیقہ شعار ہاتھوں نے بہت سی آرائشی دلچسپیاں پیدا کر دیں۔ اب اس وادی کی فضا میں ایک کے بجائے تین انسانوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

ایک سال اور گزر گیا۔

ریاض اپنی گزری ہوئی مصیبتوں اور تلخ کامیوں کی یاد کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ اور اپنی طبیعت میں ایک خوشگوار روح نواز تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ وہ نفرت جو اسے انسانوں سے پیدا ہو چکی تھی۔ بالکل دور ہو گئی۔ اب وہ شہروں کے ہنگاموں کی کہانیاں شوق سے سنتا اور بوڑھے کے پاس بیٹھ کر متمدن دنیا اور اس میں بسنے والوں پر اتے زنی کیا کرتا۔ اسے جوانی کی ولولہ انگیز داستانوں میں پھر لطف آنے لگا۔ اس کی مردہ امنگوں میں از سرِ نو تازگیِ حیات پیدا ہوئی۔ اور اس کی نیندیں دلآویز اور لطیف خوابوں سے پھر آباد ہو گئیں۔

شفاف چشمے کی سرد اور نرم خیز لہریں لے شباب کے مستانہ جوش نغمے سنانے لگیں۔ پھولوں کے رنگ پہلے سے زیادہ شوخ ہو گئے۔ اور انکی نکہت میں پہلے سے زیادہ لطافت اور مستی محسوس ہونے لگی۔

اس کو کئی قسم کی نئی نئی چڑیاں نظر آئیں۔ جو اس وادی میں کسی اور جگہ سے ہجرت کر کے آگئی تھیں۔ اور اسکے

غلیل کے شکاروں کی تعداد تگنی ہو گئی تھی۔

یہ سب اس اسرار انگیز محبت پنہاں کا نتیجہ تھا جو اسے اس ڈاکو کی دوشیزہ لڑکی سے پیدا ہو گئی تھی۔

اگرچہ اس لڑکی کا آسمانی حسن فرشتوں سے خراج تحسین وصول کرتا تھا۔ لیکن اس کے اطوار و عادات بالکل سادہ اور فطرت کے حقیقی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

جب ریاض اور بوڑھا اپنے غلیل لیکر شکار کو نکل جاتے تو زینب کبھی اس جنت ارضی کی پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں میں گھومنے چلی جاتی۔ اور کبھی صاف شفاف چشمے میں نہانے کے بعد اپنے کاشانوں کو سجانے اور ان کو زیادہ آرام دہ بنانے میں مشغول ہو جاتی۔ وہ بے محابا اس وادی میں جس طرف چاہتی چلی جاتی اور رنگ برنگ کے پھولوں سے ہار بدھیاں اور چمپا کلیاں بنا کر خود ہی پہنتی اور خود ہی شرما کر ان کو توڑ ڈالتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ریاض اسے اس حال میں دیکھ لیتا اسوقت وہ شرما جاتی اور نظر بچا کر چھپ جانے کی کوشش کرنے لگتی تو ریاض وہاں سے ٹل جاتا۔

اس نے کبھی تنہائی میں اس سے کوئی غیر معمولی گفتگو نہ کی۔

لیکن بوڑھا ان دونوں کی دلی کیفیتوں کا حال تاڑ گیا تھا۔ ایک دن تیسرے پہر بلندیوں سے اترتے وقت وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ اور ریاض کی طرف دیکھنے لگا۔

ان کی پشت پر ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخوں میں دو بلبلیں نغمہ سرائی کر رہی تھیں۔ بوڑھے نے شفقت بھرے انداز سے کہا۔

"بیٹا ریاض میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں"

ریاض اس غیر معمولی اظہار شفقت سے شرما گیا۔

اس نے جواب دیا۔ "میں آپ کا غلام ہوں"

اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

بوڑھے نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا۔

"نہیں شرماؤ نہیں۔ میں تم سے بہت خوش ہوں میرا ارادہ ہے کہ کل شام سے پہلے پہلے زمین و آسمان اور خدا کو گواہ قرار دیکر زینب کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیدیا جائے"

ریاض زبان سے کچھ نہ بول سکا۔ اس کا سر جھک گیا اور شکریہ کے طور پر اس نے بوڑھے کا ہاتھ آہستہ سے دبایا۔

پھر وہ دونوں اپنا اپنا شکار اٹھا کر جھونپڑوں کی طرف چل دیے۔

وادی پر چاروں طرف مسرت کی شادابی برس رہی تھی۔ ہوا سے عطر سہاگ کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ زینب گنجان جھاڑیوں کی معطر ٹھنڈک میں پھولوں سے کھیل رہی

تھی۔ اور سُرخ پھُول اس کے نرم رُخساروں پر تیار ہو رہے تھے۔ اور جب وہ شرم سے سر جھکاتے ان کا خیرمقدم کرنے کو کُنج سے باہر نکل آتی تو اس چھوٹی سی جنت کی ننھا حور معلوم ہوتی تھی۔

(۸)

ریاض کی شادی کے ایک سال بعد بڑے میاں کا انتقال ہوگیا۔ جس سے دونوں میاں بیوی افسردہ رہنے لگے لیکن جلد ہی خُدا نے انہیں ایک خوبصورت بیٹا عطا فرمایا۔ جس کا نام اقبال رکھا گیا۔ اقبال کی ولادت نے بُوڑھے کی جُدائی کا قلق ایک حد تک دُور کردیا۔

ریاض کو اپنی موجودہ زندگی ایک مسلسل اور دلآویز خواب معلوم ہوتی تھی۔

لیکن سچ مچ وہ دُنیا سے دُور پھر ایک بیوی کا شوہر اور ایک بچّے کا باپ تھا۔ وادی اس کی سلطنت تھی جس کا وہ مختارِ کل تھا۔

اس کے پاس ہزاروں روپے کی اشرفیاں اور نوٹ تھے۔ یہ تمام رقم اسے زینب کے جہیز میں ملی تھیں لیکن وہ اسے بے مصرف خیال کرتا تھا۔ اس کی بیوی حسین، نیک اور محبت کرنے والی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی عام مناقشات خانگی سے قطعاً پاک تھی۔ اس کے لیل و نہار دورِ خورمی میں گزرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

آفتاب مشرق کے پہاڑوں سے اُبھرتا اور وادی میں مسرت اور شادمانی بکھیرتا ہوا چلا جاتا تھا۔

چاند نکلتا اور ان کی جھونپڑی کے اردگرد راحت ہی راحت پھیلا دیتا تھا۔

ننّھا اقبال بڑھتا گیا اور جھونپڑے سے باہر نکل کر ندی کے کنارے سبز گھاس پر کھیلنے کے قابل ہوگیا۔

وادی کی آبادی میں اور اضافہ ہوگیا۔ یعنی اقبال کی ولادت کے تین سال بعد ریاض کے گھر دوسرا لڑکا پیدا ہُوا جس کا نام اس نے شوکت رکھا۔ گویا اب وہ دو سے چار ہوگئے۔ بوڑھے کی موت کو آٹھ سال گزر گئے اقبال آٹھ برس کا اور شوکت پانچ برس کا ہوگیا۔

اور ان دونوں کو وادی کی چٹانوں پر کودتے پھاندتے درختوں پر چڑھتے اُترتے چشمے میں نہاتے دیکھ دیکھ کر زینب کے دل میں انکی تعلیم اور اُن کی آئندہ زندگی کے تفکرات نے اپنا نشیمن بنالیا۔

اب وہ گاؤں اور ننھیال کی یاد میں اداس رہنے لگی۔ اور اسے جب کبھی ریاض سے بات چیت کا موقع ملتا وہ دُنیا اور اپنے اعزہ و اقارب کے طول طویل قصّے لے بیٹھتی جنہیں سُنکر ریاض ششدر رہ جاتا اور کچھ نہ سمجھتا اگرچہ دشوار گزار سلسلۂ کوہسار حوصلوں کو پست کر دیتا تھا مگر آخر کار دونوں نے اولاد کی آئندہ زندگی کے خیال سے

اس سدابہار جنت کو چھوڑ کر متمدن دنیا میں چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک صبح جب وادی پر چھلتے ہوتے آسمان کے ستاروں کی چمک مدھم ہورہی تھی۔ اور مشرق سے آنے والا قافلہ سفیدۂ سحر کا غبار اڑا رہا تھا۔ ریاض اور اسکی بیوی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں پشت پہ سنبھالے دونوں بچوں کے ساتھ ایک پھولوں سے ڈھکی ہوئی قبر پہ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

وہ فاتحہ پڑھ کر تیزی سے چل نکلے۔ اور بلند چٹانوں پر چڑھنے لگے۔ کچھ فاصلہ طے کرکے وہ چاروں سستانے کے لئے ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ ریاض خاموش تھا۔ اُس نے آخری نگاہ وادی پر ڈالی۔ اس کی جھونپڑی کے کھلے ہوئے دروازے کے قریب چشمے کا صاف پانی ایک بہتا ہوا آنسو معلوم ہورہا تھا۔ اس کے قریب کی جھاڑیوں میں بلبل الوداعی ترانہ گا رہی تھی۔

ریاض نے پُرنم آنکھوں سے زینب کی طرف دیکھا تو اس کے بھی آنسو رواں تھے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

نوائے راز

اب یہ عالم ہے میری حیرت کا
آئینہ ہوں تمہاری خلوت کا

ہو بُرا مذہبِ محبت کا
مَیں نہ دوزخ کا ہوں نہ جنت کا

بارہا مجھ کو ہوگیا دھوکا
اپنی صورت پہ تیری صورت کا

ہجر کا دن بھی ہوگیا تاریک
لے اُڑا رنگ شامِ فرقت کا

مرنے والے سے بیکسی معلوم!
بوجھ بھاری ہے سنگِ تربت کا

عمر بھر دُکھ اُٹھا کے سمجھا میں
زندگی نام تھا مصیبت کا

جو کیا آپ ہی کیا اُس نے
لے دیا نام میری قسمت کا

دیکھتے حشر کیا ہو محشر میں
مَیں گنہگار ہوں محبت کا

داغِ دل سے ہے روشنی کوسوں
چاند ہوں مَیں فضائے غربت کا

رازؔ سے ملئے آپ خوش ہوں گے
آدمی ہے بڑی محبت کا

رازؔ

مجاہدین و شہدا

(ابو رشید عبدالمجید خاں صاحب سالک مدظلہٗ)

تمہیں سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمہاری مشعلِ وفا فروغ شش جہات ہے
تمہاری ضو سے پُرضیا جبین کائنات ہے
کواکبِ بقا ہو تم جہاں اندھیری رات ہے

یہ نکتہ بے نظیر ہے معارف و نکات میں
کہ فرق ہے تمہاری اور عوام کی ممات میں
تمہارا امتیاز ہے دوام میں ثبات میں
الگ ہو کائنات سے تو محو اس کی ذات میں
بقا ہے جس کی ذات کو وہ اِک خُدا کی ذات ہے

مجاہدوں کے بازوئے فلک فگن عجیب ہیں
بہادروں کے پنجہ ہائے تیغ زن عجیب ہیں
یہ جسم ہائے خونچکان و بے کفن عجیب ہیں
مجاہد و شہید کے یہ بانکپن عجیب ہیں
حیات بھی حیات ہے تو موت بھی حیات ہے

زکوٰۃ دے اگر کوئی زیادہ ہو تونگری
بکھیر دے اناج اگر تو فصل ہو ہری بھری
چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخلِ تاک کی
کٹیں جو چند گردنیں تو قوم کی ہو زندگی
لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکات ہے

بلائیں جن کی قوم لے تمہیں وہ شہسوار ہو
تمہیں وہ سرفروش ہو تمہیں وہ جانسپار ہو
تمہیں دفاع و احترام دیں کے ذمہ دار ہو
جو تم نہ ہو تو امن کی بنا نہ استوار ہو
تمہاری تیغ ضامن نظام کائنات ہے

تاریخ قدیم کا ایک ورق

زمانے گذر گئے، ولادت مسیح سے بہت پہلے کروسیس ایک وسیع خطۂ زمین کا بادشاہ تھا۔ اس کے پاس سونے چاندی کے انبار تھے اور وہ کئی قارونی خزانوں کا مالک تھا۔ اگنت سپاہیوں کا سپہ سالار اور لاتعداد غلاموں کا آقا تھا۔ اسلئے اس کو یقین تھا کہ وہ انسانی دُنیا کی بہترین خوشیوں کا سب سے بڑا سرمایہ دار ہے۔

لیکن ایک دن اس کی سلطنت میں ایک یونانی حکیم وارد ہوا جس کا نام حکیم سالون تھا۔ اس حکیم کی دانائی اور انصاف پسندی دُنیا کے ہر گوشے میں زبان زد خلائق تھی اس کی شہرت کروسیس کے کانوں تک بھی پہنچی۔ اس نے حکم دیا کہ اس شخص کو میرے حضور میں پیش کیا جائے۔

وہ قیمتی اور بھڑکیلی پوشاک پہنے اپنے زرّیں تخت پر متمکن تھا۔ اس نے سالون پر ایک غرور سے بھری ہوئی نگاہ ڈالی اور پُوچھا۔

"کیا تو نے میرے دربار کے حیرت زا اور چکاچوند پیدا کر دینے والے نظارے سے بہتر کوئی چیز دیکھی ہے۔"

سالون نے جواب دیا۔ ہاں۔ یقیناً۔ . . . . . مور۔ ہُدہُد اور بہت سے پرندے اپنے گوناگوں اور بوقلموں رنگوں میں بہترین نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اور اسقدر باصرہ افروز ہوتے ہیں کہ انسانی صناعیاں انکے آگے ہیچ ہیں۔

کروسیس خاموش ہوگیا۔ اس نے اپنے دِل میں سوچا "یہ کافی نہیں۔ میں اسے کچھ اور دکھاتا ہوں۔ ہاں وہ حیرانی کے سمندر میں غرق ہو جائیگا۔"

اس نے سالون کے سامنے اپنے خزانوں کے دروازے کھول دئے۔ اپنے مفتوح و مغلوب دشمنوں کے نام گنوائے۔ اپنے فخر عالم مقبوضات کے حالات بیان کئے۔ اور پھر اس نے حکیم سے دریافت کیا۔

"تو نے بڑی عمر پائی ہے اور دُنیا دیکھی ہے بتا۔ وہ کونسی زندہ ہستی ہے جس کو تُو خوشحال سمجھتا ہے۔"

سالون نے اسی بیخوف لہجے میں جواب دیا۔

"خوشحال! ہاں میں نے اس مزدور کو دُنیا میں بہت خوشحال دیکھا ہے جو ایتھنز کے بازاروں میں محنت مزدوری کیا کرتا ہے۔

بادشاہ حیرانیوں میں گم ہوگیا۔ اسے یقین تھا، کہ سالون میرا نام لیگا۔ لیکن جب اُس نے ایک مفلس کو خوشحال کہدیا، تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسے اپنے کانوں پر شبہہ ہُوا۔

تم نے ایک ذلیل آدمی کو کس طرح خوشحال کہدیا؟

کروسیس نے غلطی کو درست کرنے کے لئے کہا۔

سالون نے جواب دیا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی تمام زندگی مشقت میں گزاردی۔ وہ تھوڑے پر قانع ہے۔ اس نے نیک اور شریف بچوں کی پرورش کی ہے میں نے اس کو اپنے وطن کا خادم اور اپنے شہر میں نیکنام پایا ہے۔

کروسیس نے جب یہ سُنا تو چلا اُٹھا۔ تو کیا میری خوشحالی تمہارے خیال میں کوئی چیز نہیں۔ اور کیا میں اس ذلیل آدمی سے بھی اچھا نہیں جس کا تو نے نام لیا۔

اس کے جواب میں سالون نے کہا۔

اکثر ایک غریب آدمی امیر سے زیادہ پُرلطف زندگی گزارتا ہے کسی کو اس وقت تک خوشحال نہیں کہنا چاہیئے جبتک کہ وہ اپنی جان جان آفرین کے سپرد نہ کردے۔

بادشاہ نے ناراض ہوکر سالون کو اپنی سلطنت سے نکال دیا۔ وہ اس سے مطمئن نہ ہوا تھا۔

اس نے دل میں سوچا تشویش جائے جہنم میں جبتک کوئی زندہ ہے اسے عیش سے زندگی گزارنی چاہئے۔ وہ سالون کو بالکل بھول گیا۔

تھوڑی ہی مدت بعد بادشاہ کا لڑکا شکار کو گیا۔ بدقسمتی سے زخمی ہوکر واپس آیا۔ اور زخم مہلک ہونے کے باعث مرگیا۔ چند دنوں بعد اسے خبر ملی کہ شہنشاہ سائرس حملہ کرنے کے ارادے سے بڑھا چلا آرہا ہے۔

کروسیس نے مدافعت کی غرض سے ایک عظیم الشان فوج جمع کی۔ اور قلعے سے باہر نکلا۔

مگر غنیم زبردست تھا۔ وہ فتح پر فتح حاصل کرتا شہروں اور قصبوں کو جلاتا دارالسلطنت میں گھس آیا۔

اس وقت فاتح فوج نے شاہ کروسیس کے خزانوں کو لُوٹنا، مکینوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا شروع کردیا۔

کروسیس بھی ایک سپاہی کے ہاتھ لگا۔ اور وہ اس کے سینے میں خنجر بھونکنے والا ہی تھا کہ بادشاہ کا دوسرا بیٹا اپنے باپ کی حمایت کے لئے جوانوں کے انبوہ کو چیرتا پھاڑتا باہر کودا اور بے اختیار چلایا۔

" اسے ہاتھ نہ لگاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کروسیس ہے۔

بادشاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سپاہیوں نے کروسیس کی مشکیں کس لیں۔ اور کشاں کشاں فاتح شہنشاہ کے سامنے لے چلے لیکن سائرس فتح کے جشن میں اسقدر محو تھا کہ اس کے پاس قیدی سے

ملنے کے لئے ایک لمحہ بھی نہ نکلا۔ اور اس نے فوراً موت کا حکم صادر کر دیا۔

شہر کے وسط میں لکڑیوں کا ایک انبار جمع کیا گیا اور اس کے درمیان ایک بلند کھمبا گاڑ کر کروسیس کو اس کے ساتھ باندھا۔ اور لکڑیوں کو آگ دکھا دی۔

کروسیس نے حسرت انگیز نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں۔ اپنے پایہ تخت اور اپنے محل کی طرف دیکھا۔

آہ اس وقت اسے اس یونانی حکیم دانا کے الفاظ یاد آ گئے۔ اور اس کی آنکھوں سے پانی کی دو ندیاں بہنے لگیں۔ اس کے منہ سے یہ گلوگیر صدا نکلی۔

آہ - - - - سالون - - - سالون - - -

سپاہی اس جلتے انبار کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اور وحشیانہ خوشی سے چلا رہے تھے۔ کہ شہنشاہ سائرس قتل گاہ میں اپنی خوشی کو دوبالا کرنے کے لئے بنفس نفیس آموجود ہوا۔ اور جیسے ہی اس نے مقتل میں قدم رکھا کروسیس کے یہ دردناک الفاظ اس کے کانوں تک پہنچے۔ مگر اس نے کچھ نہ سمجھا اس لئے اس نے حکم دیا کہ کروسیس کو انبار پر سے اُتار لیا جائے۔

اور جب وہ سامنے آیا تو اس سے پوچھا۔ ابھی تُو نے کیا کہا تھا۔

کروسیس نے جواب دیا۔ "ہاں میں صرف ایک دانا کا نام لے رہا تھا۔ اسی دانا کا جس نے مجھے قبل از وقت ایک صداقت سے خبردار کیا تھا ——— اس صداقت سے جو دنیاوی دولتوں سے برتر ہے۔ ہاں ہماری ان تمام شاہی خوشیوں سے بدرجہا برتر۔

اور کروسیس نے اپنی اور سالون کی تمام گفتگو کا حال بیان کر دیا۔

وہ کہانی شہنشاہ سائرس کے دل کو لگی۔ اس نے سوچا آخر میں بھی انسان ہوں۔ اور مجھے معلوم نہیں کہ میرا انجام کیا ہونے والا ہے۔

اس نے کروسیس سے رحم کا برتاؤ کیا۔ اور اس کا دوست بن گیا۔ (ٹالسٹائی) نعیم

سزائے معصیت اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی
الٹی سیکشوں کو غرق کر دے حوض کوثر میں

دل کو اب آنکھ کی منزل میں بٹھا رکھیں گے
حسن گزریگا اسی راہگزر سے پہلے حفیظ

افشائے حقیقت

محبّت

آہ- محبّت! یہ ایک فرحت زا ہے یا ایک تکلیف دہ فرحت ہے- کوئی اس کی تشریح نہیں کر سکتا- یہ ایسی چیز ہے جو ہماری آسمانی امیدوں کو ابھارتی ہے لیکن امیدوں کے اس بحرِ ناپیداکنار کی عمیق ترین گہرائیوں میں بیم و رجا کی ایک بے چین موج بھی جاری رکھتی ہے- تاہم یہ خوف ایسا نہیں ہوتا جو انسانی دلوں کو بیزار کر دے- یہ ایک حوصلہ افزا تحریک ہے- جو یاس کی صورت شاذ ہی ختیار کرتی ہے- بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے یاس انگیز کہنا ہی غلطی ہے-

اس لئے جب محبت کے متعلق ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہمیں تکلیف ہے اور ہم اداس ہیں تو ساتھ ہی ہمیں اس بات کا اقرار بھی کرنا چاہیے کہ ہم مسرور و مطمئن بھی ہیں کیونکہ ہمارے قلب کی گہرائیوں میں امید ہر وقت جلوہ فگن رہتی ہے-

بیشک محبت ایک ایسا غیر محدود اور ناقابلِ تشریح جذبہ ہے- کہ اس میں بیک وقت متناقض محسوسات اور متضاد جذبات دیکھے جاتے ہیں-

عورت کی محبّت

آہ عورت کی فدائیت کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے؟ اس کی اتھاہ فیاضانہ دلسوزیوں کی حد کون لگا سکتا ہے؟

وہ غیر محدود جذبہ جس سے اس کا دل متاثر ہوتا ہے اسے کس چیز سے مشابہ کہا جاتے؟

کیا اسے وسعت پذیر ہوا سے تشبیہہ دی جائے؟ جس میں پھیلاؤ کی اتنی صلاحیت ہے کہ اس کا ایک مکعب انچ بے پایاں جسامت اختیار کر سکتا ہے-

ہاں ہمیں عورت کی محبت کو ہوا ہی سے تشبیہہ دینی چاہیے جسے عام لوگ خالی کہکر ایک فاش غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں- کیونکہ جس طرح ہوا رنگا رنگ کے پھولوں کی نکہت سے لدی ہوئی ہوتی ہے-

عورت کی محبت بھی ایسے روحانی جذبات سے معمور ہوا کرتی ہے- جو بذات خود ایک دلآویز عطر اور خوشبو دار مرہم ہوتے ہیں- اور جس طرح ہوا ساز فطرت کی لے اڑا کر ہمارے کانوں تک پہنچاتی ہے- اسی طرح عورت کی محبت اپنے نازک ترین اور لطیف ترین جذبات سے لبریز نغمات شیریں سروں میں سمع نواز ہوا کرتی ہے-

ان کے علاوہ ہوا جس طرح آفتاب کی کرنوں سے
صنعت حاصل کر کے اسے بکھیرتی ہے۔
اسی طرح عورت کی محبت پُر کیف آنکھوں اور جاں نواز
مسکراہٹ کی ضیا سے جلوہ ریز ہوتی ہے۔

مرد اور عورت

آہ۔ او نجس، نامرد، کمینے جو عورت پر ہاتھ اُٹھاتا ہے!
اُف او سنگدل مردود، جس کا دل عورت کے گرم آنسوؤں
سے بھی نہیں پگھلتا۔ اُن آنسوؤں سے جو صرف تیرے
وحشیانہ برتاؤ کی وجہ سے اُمڈ آئے ہیں۔
آہ کیا تو عورت کے جذبۂ محبت سے بے خبر ہے۔
یہی محبت ہے جو اسے تیری خاطر یا تیرے بچوں کی خاطر
جان پر کھیل جانے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے۔
لاریب اس میں کمزوریاں ہیں۔ اس کا قدم صراطِ مستقیم
پر ثابت نہیں رہتا۔ اس کا دل ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے۔
لیکن اے مرد! معاف کر دے۔ ہاں اسے معاف
کر دے۔ کیونکہ یہ ساری باتیں اس کی فدائیت، اس کی
محبت اور اس کی دلسوزیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔
عورت کی کمزوریوں کو اس کی محبت سے وہی نسبت
ہے جو سرسوں کے ایک دانے کو تمام کرۂ ارض سے۔
لیکن تو کہیگا کہ عورتوں میں گنہگار بیویاں، بدکردار بہنیں،
آوارہ بیٹیاں اور بدعنوان مائیں پائی جاتی ہیں۔ افسوس افسوس
یہ صحیح ہے آہ یہ سب کچھ درست ہے۔ لیکن اے "مرد"! اپنے
دل سے پوچھ اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھ اور بتا!
ہاں اے مرد بتا ان کو اس حالت تک پہنچانے والا کون
ہے۔ خدائے قدوس کی اس بدبخت مخلوق کو قعرِ مذلت
میں کس نے گرا دیا؟ اس کا جواب اگر انصاف کو سامنے رکھ کر
دیا جائے تو ان کا گناہ ایک خوفناک جرم کے کچل دینے والے
بوجھ کی طرح تیری ہی طرف لوٹ آتا ہے کیونکہ اس تمام
شیطنت کا فاعل تو ہے۔ بدکرداری کی مکروہ سے مکروہ
اور بدترین سے بدترین شکل کو دیکھ۔ جس کے ہر پہلو پر
بربادی اور تباہ کاری کے نقوش وضاحت سے عیاں
ہوں اور اس بیچاری گمراہ عورت کی کہانی کے آغاز تک
عروج لگا۔ جب اس کی دوشیزہ کشتیٔ عصمت کسی شیطانی
حظ کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی تھی۔ تجھ پر عیاں
ہو جائیگا۔ کہ اس وقت اس کا دل پرجوش، پاکیزہ اور دلسوز
محبت سے معمور تھا لیکن اس کو گمراہ کرنے والے کا
سفاکانہ دغا اور شقاوت ہے۔
ہاں اے مرد اس صنف کا سفاک سنگدل اور بدترین
دشمن خود تو ہے۔

(ترجمہ)

اختری۔ اے

ارشاداتِ گرامی

(ملک الشعراء حضرت مولنا غلام قادر صاحب گرامی مدظلہٗ)

نگاہ بخشد و دل بخشد و زباں بخشد — چرا گناہ نہ بخشد کسے کہ جاں بخشد
نگہ کنید کہ آں لاشریک لہ اینست — کہ عمرِ خضر دہد مرگِ ناگہاں بخشد
حکیم ہر چہ بہر کس دہد ز حکمتِ اوست — سکوں بہ نقطہ و گردش بآسماں بخشد
مرا باہِ سحر گاہ یک اثر ندہد — ہزار فتنہ بآں چشمِ نکتہ داں بخشد
ستم ظریفیِ آں چشمِ فتنہ مست مپرس — کہ با شکستہ دلاں ذوقِ امتحاں بخشد
ز دستِ یاس بجانم کجاست شمشیرے — کہ آرزوئے دلِ صیدِ نیمجاں بخشد
ز باغ آیۂ لاتقنطو گلے چینیم — گناہِ ما کہ نہ بخشید نیست ہاں بخشد

قبیلہ پروریِ دردِ عشق را نازم
کہ با گرامیِ ما چشمِ خونچکاں بخشد

حسین لڑکی کا لڑکپن

زلفیں یہ ناگنیں سی آنکھیں یہ کالی کالی
لب گل کی پتیاں ہیں صورت ہے بھولی بھالی
نازک بدن ہے اس کا یا نخلِ گل کی ڈالی
چہرے کا رنگ دیکھو - کہدو کہ پھول والی
رخ پر جو آرہی ہیں اُڑ کر لٹیں ہوا سے
سرکا رہی ہے ان کو کس نازکس ادا سے

دلچسپ ہیں ادائیں لیکن یہ بے خبر خود
دلکش نظر ہے لیکن واقف نہیں نظر خود
ماتھا ہے خود شگفتہ، لب پتلے پتلے تر خود
بالوں میں بن رہے ہیں گھونگر ادھر اُدھر خود
کتنا دہن ہے پیارا کتنا ہے تنگ دیکھو
آنکھوں میں لال ڈورے لائے ہیں رنگ دیکھو

اُلجھا ہوا پڑا ہے بالوں میں ایک پھندا
[illegible] ہو کان کی خبر کیا
کاجل بہا ہوا ہے اس کو نہیں ہے پروا
باچھوں میں جم گیا ہے کچھ رنگ پیک کا سا
چوٹی میں بندھ گئے ہیں وہ بال جو بڑے ہیں
کچھ چھوٹے چھوٹے اُڑ کر ماتھے پر آپڑے ہیں

کیں بند دونوں آنکھیں گرد آئی جب ہوا سے
جھونکا جو آیا پھیرا چہرے کو کس ادا سے
بالوں پہ جمتی ہے گرد۔ اُڑ اُڑ کے جا بجا سے
ذرے چمک رہے ہیں سر پر ذرا ذرا سے
کرتا کریب کا ہے۔ جھاڑی میں اُڑ کے اٹکا
دامن پھٹا اُلجھ کر کھینچا جو دیکے جھٹکا

کرتے کو دیکھ کر یہ پہلے تو مسکرائی
پھر کچھ جو دھیان آیا حیرت سی رخ پہ چھائی
پوچھے گی ماں کہاں سے کرتے کو پھاڑ لائی
یہ ڈر نہیں تو چھوٹی چہرے پہ کیوں ہوائی
کرتے کو دیکھتی ہے جھاڑی کو دیکھتی ہے
ماں سے یہ کیا کہیگی بس سوچ اسے یہی ہے

ٹہلی ہے بائیں جانب اب جھاڑیوں سے کٹ کر
جس راہ میں ہیں کانٹے نکلی ہے اس سے ہٹ کر
جس سمت جا رہی تھی اُس سمت سے پلٹ کر
اُس پیڑ کے تلے کیوں اب ہو رہی چمٹ کر
اُس رخ کی راہ پکڑے آتا ہے بیل ادھر سے
رستے کو اُس نے کاٹا بس بیل ہی کے ڈر سے

کیوں یہ چمک کے جھجکی کیوں کوئی وہم آیا
کیوں پاؤں لڑکھڑائے کیوں جسم تھرتھرایا
کیوں آسماں کو دیکھا۔ کیوں اس نے سر اٹھایا
کیوں رنگ ہو گیا فق کیوں دل نے خوف کھایا
چڑیاں جو اڑ کے نکلیں آئی صدا ہوا سے
یہ ڈر گئی ہے شاید پرواز کی صدا سے

کیوں اس کے ہوش اڑائے چڑیوں کے بال و پر نے
کیوں اس کے دل کو گھیرا اوہام پر خطر نے
صدمہ اسے دیا ہو جب خوف کے اثر نے
کھائی ہو چوٹ کتنی نادان کے جگر نے
سن سن کو سن کے اس پر کیا کیا گزر گئی ہو
ننھے سے دل کی دھڑکن بیچین کر گئی ہو

کندوں کو جوڑ کر وہ ٹوٹا اگن پہ شکرا
پنجے میں پڑ کے چیں چیں کرنے لگی ہے چڑیا
چیں چیں کو سن کے بھاگی۔ گھبرا گیا دل اس کا
ہے ایک پاؤں میں بوٹ اور ایک پاؤں ننگا
ہوش اوڑھنی کا کس کو بیخود ہے ننگے سر ہے
آدھی بدن پہ ہے وہ۔ آدھی زمین پر ہے

اڑتی ہے خاک سر پر کون اوڑھنی کو ڈالے
بیچاری دل سنبھالے یا اوڑھنی سنبھالے
جو کچھ سمجھے بوجھے جو پھر نہ بوٹے چالے
وہموں کو اسکے دل سے کیونکر کوئی نکالے
ابھی کا دل ہی کتنا۔ ڈرنے کی عمر ہی ہے
یہ خوف اسکے دل سے نکلے جو زندگی ہے

سنے خوف ابھی۔ نہیں تو ہے منتظر نظر کیوں
ہے سوچ ابھی نہیں تو تھلملے ہوتے ہے سر کیوں
شاید تھکی۔ نہیں تو اب تھام لی کمر کیوں
بے شک تھکی۔ نہیں تو بیٹھی تہ شجر کیوں
کس شے کو دیکھتی ہے ہنس ہنس کے یہ زمیں پر
پڑ جاتی ہے ہنسی سے کیسی شکن جبیں پر

سائے میں آرہی ہے پتوں سے دھوپ چھنکر
بن جاتے ہیں سنہرے کچھ پھول سے زمیں پر
کیا گل کھلا رہی ہے رفتار مہر انور
یہ پھول اس سے اچھا وہ پھول اس سے بہتر
چننا یہ چاہتی ہے اور جھینپ جاتی ہے پھر
چھوتی ہے انگلیوں سے اور مسکراتی ہے پھر

کیا جانے یہ کہ سورج کیونکر ہے جلوہ افگن
ہوتا ہے عکس جس کا بن بن کے پھول روشن
یہ پھول وہ نہیں ہیں جو ہوں بہار گلشن
یہ پھول وہ نہیں ہیں جن سے بھرے یہ دامن
سایہ ہے اس شجر کا اس وقت گلشن اس کا
پھولوں سے کھیلتا ہے کیا کیا لڑکپن اسکا

سایے سے ہٹ کے اب یہ آنچل اٹھا رہی ہے   چھوٹی سی اوڑھنی سے سر کو چھپا رہی ہے
ننھی سی آرسی پر نظریں جما رہی ہے   خود منہ چڑھا رہی ہے خود مسکرا رہی ہے
لائی ہوا جو اپنے دامن میں گرد بھر کے   آنچل سے منہ چھپایا آنکھوں کو بند کر کے
گھنگچی کا پیڑ ہے یہ اب جس کے پاس آئی   دیکھا جو گھنگچیوں کو خوش ہو کے مسکرائی
فطرت نے بچپنے کی سرخی جو اس کی بھائی   گھنگچی پڑی کوئی تو جھک کر وہی اٹھائی
مینائیں لڑ پڑیں دو۔ اُن پر جھپٹ پڑی یہ   دونوں وہ اڑ کے چل دیں۔ اور رہ گئی کھڑی یہ
چشمے کی راہ لی اب۔ شاید پئے گی پانی   پہنچی تو دیکھتی ہے چپ چپ کھڑی روانی
عکس فلک کی رنگت۔ سورج کی ضو فشانی   پانی تو ہے سنہرا۔ اور تہ ہے آسمانی
لہروں میں چلتی پھرتی سورج کی جو چمک ہے   اُس سے چمک رہی ہے بجلی کا اسکو شک ہے
چشمے کے اُس کنارے بگلے سفید آئے   وحشت سے دیکھتے ہیں وہ گردنیں اٹھائے
اس نے انہیں کی جانب اپنے قدم بڑھائے   جاتی ہے ہلکے ہلکے ان پر نظر جمائے
پر تولتے ہیں بگلے اڑتے ہیں بس ابھی تو   کس شوق سے چلی یہ بچپن کا کھیل دیکھو
بگلے اڑے تو پلٹی۔ چشمے پہ اب کھڑی ہے   ایسی کھڑی ہے گویا اک شاخ گل گڑی ہے
مینڈک پڑا ہے شاید اُس سے نظر لڑی ہے   مچھلی چمک کے اچھلی تو کیا اچھل پڑی ہے
ٹہلی دکن کی جانب سورج کا رخ بچا کے   پیڑوں کو دیکھتی ہے گردن اٹھا اٹھا کے
پانی میں کچھ بطیں ہیں۔ دیکھا اب اُن کو ہنس کر   وہ کنکری اٹھائی پھینکے گی اب انہیں پر
پھرتی ہے کھیلتی یہ۔ گھر سے نکل کے باہر   آتی نہ یوں اکیلی شاید قریب ہے گھر
بناوٹ سے پاک ہے وہ۔ جو چال ہے ادا ہے   وارفتگی ہے جتنی۔ سب سن کا مقتضا ہے
آہٹ قریب پا کر مجھ پر نگاہ ڈالی   میں دیکھتا ہوں اس کو یہ بات اس نے پا لی
آنکھیں اٹھا کے دیکھا اور پھر نظر جھکا لی   فطری حیا ہے کیسی دل کو لبھانے والی
لڑکی کی ذات ٹھہری غیرت سے آب گل ہیں   چہرے سے یہ پسینہ نکلی وہ شرم جس سے ولہیں

کیسی ہوئی شگفتہ بادل جو گھر کے آیا — دنیا سے دھوپ اڑائی سورج کا منہ چھپایا
ٹھنڈا ہوا دل اس کا سایہ جو اس نے پایا — آنچل جھکا ہوا تھا۔ رخ سے اسے ہٹایا
ماتھے پہ تھا پسینہ پونچھا اٹھا کے آنچل — دوسرا یا ہاتھ سے پھر۔ کاندھے پہ لا کے آنچل
گیلی زمیں پہ اب۔ اک کھیل یہ نکالا — کچھ خاک پر بنایا اور پھر بگاڑ ڈالا
گیندے کے پاس اب آئی پھولوں کو دیکھا بھالا — وہ ایک پھول توڑا اور زور سے اچھالا
اب نوچ نوچ پھینکیں گیندے کی پتیاں اب — چل نکلی ہے تو دیکھوں جاتی ہے یہ کہاں اب
جامن کا پیڑ وہ ہے اُس پر نگاہ ڈالی — خوشے ہیں جامنیں ہیں بھنوروں سی کالی کالی
رستے میں بہ رہی ہے چھوٹی سی ایک نالی — آنچل کو وہ سمیٹا اور اوڑھنی سنبھالی
نالی تو کیا ہے لیکن پھاندی جو یہ اچک کر — آنچل کا ایک کونا تر ہو گیا لٹک کر
اب کون چیز دیکھی جس پر نظر جھکی ہے — کیا ہے کہ سر سے لیکر یہ تا کمر جھکی ہے
چہرہ ادھر جھکا ہے گردن ادھر جھکی ہے — پھولوں کو مل کے گویا شاخ شجر جھکی ہے
ہاں وہ نکل پڑے ہیں سوراخ سے پتنگے — اک لطف ہو گئے ہیں اسکے لئے پتنگے
سیدھی کھڑی ہوئی ہے اب یہ اٹھا کے سر کو — دھیان آیا جامنوں کا دیکھا پھر اُس شجر کو
پھر ہلکے ہلکے ٹہلی۔ اور پھر چلی ادھر کو — اب جامنوں کی جانب مائل کیا نظر کو
ایک آنکھ میری جانب ایک آنکھ پیڑ پر ہے — یہ توڑنے کا ایما۔ دلچسپ کسقدر ہے
خوشہ تو جامنوں کا میں اس کو توڑ دوں گا — بھنگے سی مکھیوں کا وہ سامنے ہے چھتا
ایسی نہیں یہ جن سے کچھ ڈنک کا ہو کھٹکا — کیا صاف اور مزے کا ہوتا ہے شہد انکا
کچھ دیر کر کے دوں میں بہلے رہیں تو اچھا — کھیلے رہیں تو اچھا ٹہلے رہیں تو اچھا
بوندیں ستم کی آئیں۔ اب یہ چلی ہے گھر کو — ایسی کہاں لگی محبوب شے نظر کو
کیا کہئے اس لڑکپن اور حسن کے اثر کو — دونوں نے مل کے بانٹا میرے دل و جگر کو
اے شوق دیکھو دیکھو بچپن کا طور دیکھو — دامن میں اس نے رکھا چھتے کو اور دیکھو

شوق قدوائی

رُودادِ محبّت

مُصنّفہ ٹالسٹائی

مترجمہ راز چاندپوری

حِصّہ اوّل

پہلا باب

ترجمہ کا یہ مشکل کام مجھ جیسے عدیم الفرصت اور کم مایہ شخص کے لئے بہت مشکل تھا لیکن مخلص بے ریا حضرت مولانا عالی لکھنوی (مدظلہ) سے ابتدا میں ان کے اصرار سے تھا اور ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہو کر جس طرح ہو سکا اس کام کو پورا کیا ہے

ترجمہ کے متعلق میرے چند خاص خیالات ہیں، ان کو انشاءاللہ تعالیٰ کسی موقع سے پیش کرونگا فی الحال صرف اسقدر کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ ترجمہ لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ افسانہ کو میں نے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ افسانہ سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے اصلی نام بدلکر ہندوستانی نام رکھ دئے جائیں۔ تاکہ مغربی ناموں کی اجنبیت افسانہ کو غیر دلچسپ نہ بنا سکے۔ مگر بعض احباب نے میرے خیال کی مخالفت کی اور مجھے اُن کی آراء کا احترام کرنا پڑا۔

میں کارکنان ہزار داستان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے افسانہ کو ہزار داستان میں بالاقساط شائع کرنے کا وعدہ فرماکر میری دماغ سوزی اور جگرکاوی کا بہترین صلہ عنایت فرمایا۔

راز چاندپوری

سُونیا اور میں والدہ مرحومہ کے سوگ میں تھے۔ جنھوں نے گزشتہ موسم خزاں میں داعئ اجل کو لبیک کہا تھا اور ہم تمام موسم سرما کاٹیا کے ساتھ دیہات میں بسر کرچکے تھے ہماری اُستانی کاٹیا ہمارے خاندان کی ایک قدیم خیر خواہ تھی۔ جس کے آغوشِ محبّت میں ہم سب نے پرورش پائی تھی میں عہدِ طفلی ہی سے اُس سے واقف تھی۔ اور اُس سے محبت رکھتی تھی۔ سونیا میری چھوٹی بہن تھی۔

پوکر دسکوئی میں جہاں ہمارا قدیم مکان تھا۔ موسم سرما بہت سخت اور تکلیف دہ تھا۔ سردی کی اسقدر شدت تھی کہ ہمارے مکان کی کھڑکیوں پر برف کے تودے جم گئے تھے۔ کھڑکیوں کے آئینہ قریب قریب ہمیشہ پالے سے ڈھکے رہتے تھے اُن میں سے کوئی چیز نظر نہ آسکتی تھی۔ اور اس طرح ہم موسم بھر

مکان میں بند رہنے کے لئے مجبور ہو گئے تھے۔ شاذونادر ہی کوئی عزیز یا دوست ہم سے ملنے آتا تھا۔ اور اگر بھولے بھٹکے کبھی کوئی آجاتا تھا۔ تو اس کے آنے سے ہمارے گھر میں کوئی شادمانی نہ ہوتی تھی۔ اُنکے چہروں سے افسردگی ظاہر ہوتی تھی وہ بہت ہی آہستگی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ گویا وہ خوفزدہ ہوتے تھے۔ کہ اُن کی آواز سے کوئی جاگ نہ اُٹھے۔ اُن کے ہونٹ کبھی ہنسی سے آشنا نہ ہوتے تھے۔ اور وہ اکثر سرد آہیں بھرتے، عموماً مجھے اور خصوصاً دنیا کو سیاہ لباس میں ملبوس دیکھ کر اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔

موت اب بھی ہمارے گھر میں موجود تھی۔ اور روزِ اوّل کی طرح رنج و غم اور خوف کے آثار طاری تھے۔

امّاں کا کمرہ بند پڑا ہوا تھا۔ اور جب مَیں سونے کے کمرہ میں جانے کے لئے اس کے پاس سے ہو کر گزرتی تو مجھے بیحد صدمہ ہوتا۔ مَیں اُس سرد اور خالی کمرہ کو ضرور دیکھتی اور میرے دل پر ایک عجیب چوٹ لگتی۔

اس وقت میری عمر سترہ سال کی تھی۔ اور مجھے دنیا سے روشناس کرانے کے لئے امّاں کا ارادہ اُسی سال جبکہ ان کا انتقال ہوا شہر میں جانے کا تھا۔

امّاں کی موت میرے لئے ناقابلِ برداشت رنج و غم کا باعث تھی لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس امر کا بھی احساس تھا۔ کہ مَیں نوجوان اور حسین ہوں کیونکہ ہر شخص مجھ سے ایسا ہی کہا کرتا تھا۔ اس لئے ایک اور موسم سرما دیہات میں تنہا رہکر بسر کرنا میرے لئے افسوسناک تھا۔ سردی کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے اپنی تنہائی اور بیکسی کا تکلیف دہ خیال اسقدر بڑھ گیا کہ مَیں نے اپنے کمرہ سے نکلنا چھوڑ دیا۔ میں نے نہ کبھی پیانو کو ہاتھ لگایا اور نہ کبھی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھا کاتیا جب مجھ سے کوئی کام کرنے کو کہتی تو میں جواب دیتی کہ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اور نہ میرا دل اس کے کرنے کو چاہتا ہے۔ اور خود بخود میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ میں کیوں کوئی کام کروں۔ جبکہ میری زندگی کے بہترین لمحے اس طرح ضائع ہو رہے ہیں۔ اور اس سوال کے جواب میں بیساختہ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔

لوگ مجھ سے کہتے تھے کہ مَیں دبلی اور کمزور ہوتی جاتی ہوں اور میرا حسن تنزل پذیر ہو رہا ہے لیکن پھر بھی میرے دل پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس لئے کہ وہاں میرے دیکھنے والا ہی کون تھا؟ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری تمام زندگی اس تاریک خلوت خانہ اور بیکسی کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ جس سے نجات حاصل کرنے کی نہ مجھ میں طاقت تھی نہ خواہش۔

موسم سرما کے آخر میں کاتیا میرے لئے مضطرب رہنے لگی۔ اور اُس نے ارادہ کر لیا کہ موقع ہاتھ آتے ہی وہ مجھے لیکر کسی دوسری جگہ چلی جائے۔ لیکن یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے ہم کو روپیہ کی ض [illegible] ورثہ میں ہماری

والدہ نے ہمارے لئے چھوڑا تھا۔ اس کا ہم کو کافی علم نہ تھا اس لئے ہم برابر اپنے سرپرست کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ تاکہ وہ آکر ہمارے معاملات کو طے کرے۔

وہ مارچ میں آیا۔

ایک دن جبکہ میں گھر میں تنہا اس ایک تمنا کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ کاٹیا نے مجھ سے کہا "خدا کا شکر ہے کہ سرجیانی آگیا ہے۔ اُس نے ہماری خیریت دریافت کی ہے اور دوپہر کو وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیگا۔" اُس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پھر کہا "پیاری دلربا! اب تھوڑی سی ہمت سے کام لو۔ ورنہ اس حالت میں دیکھ کر وہ تمہاری نسبت کیا خیال کریگا۔ تم جانتی ہو کہ وہ تم دونوں بہنوں سے کسقدر محبت رکھتا ہے۔"

سرجیانی ہمارا ایک قریبی رشتہ دار اور والد مرحوم کا دوست تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا۔ اُس کے آنے سے نہ صرف ہماری تجاویز بدل جانے اور ہمیں دیہاتی زندگی کو خیرباد کہنے کا موقع ملنے کی امید تھی۔ بلکہ میں عہدِ طفلی ہی سے اُس سے محبت رکھنے اور اُس کی عزت کرنے کی عادی تھی اس لئے جب کاٹیا نے مجھ سے باہمت بننے کو کہا تو اس کو یقین تھا کہ مجھے بہ نسبت اپنے دوسرے دوستوں کے اُس کے سامنے اپنی افسردگی اور دل گرفتگی کا اظہار کرنے سے تکلیف ہوگی۔ نیز وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں اُس کے ساتھ صرف اُس رسمی عام خوش اخلاقی سے پیش نہ آونگی جس کے لئے گھر کا ہر شخص یعنی کاٹیا اور سونیا جس کا وہ دینی باپ تھا سے لیکر ایک معمولی ملازم تک تیار تھا بلکہ ایک بات کی وجہ سے جو والدہ مرحومہ نے مجھ سے کہی تھی۔ میری نگاہوں میں اُسکی وقعت بہت زیادہ تھی۔ ایک مرتبہ اماں نے کہا تھا کہ وہ میرے واسطے ایک ایسا شوہر پسند کرتی ہیں جیسا کہ سرجیانی ہے۔

اس وقت تو مجھے اماں کا یہ کہنا عجیب اور ناگوار معلوم ہوا تھا۔ کیونکہ میں جس شخص کو پسند کرتی تھی وہ سرجیانی سے بالکل مختلف الوضع تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں جو اس کی تصویر بنالی تھی وہ حسین اور نازک تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ اور چہرہ سے اُداسی ظاہر ہوتی تھی۔ برخلاف اس کے سرجیانی عنفوانِ شباب کی منزل سے گزر چکا تھا۔ وہ تندآور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اور جیسا کہ مجھے معلوم تھا وہ ہمیشہ ہشاش بشاش رہا کرتا تھا۔ تاہم اماں کا کہنا میرے دلنشیں ہو چکا تھا۔ چھ برس پہلے جب میری عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ وہ مجھ سے بے تکلفانہ "تو" کہہ کر مخاطب ہوتا میرے ساتھ کھیلا کرتا اور مجھ کو "کمسن حسین دوشیزہ" کے نام سے یاد کیا کرتا تھا۔ اس وقت میں اکثر خوفزدہ ہوکر دل ہی دل میں سوچتی کہ اگر کبھی یکبارگی وہ مجھے اپنی زوجیت میں لینے کی خواہش ظاہر کرے تو مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

دوپہر کے کھانے سے قبل جس کے لئے کاٹیا نے بالائی

کے سنبوے اور پالک کا ساگ تیار کیا تھا۔ سجیانی آ گیا۔ میں نے مکان کی کھڑکی سے اس کو ہلکی برف پر چلنے والی گاڑی میں آتے ہوئے دیکھا اور جیسے ہی وہ سڑک کے موڑ پر میری نظروں سے غائب ہوا میں جلدی سے ملاقات کے کمرہ کی طرف بڑھی۔ تاکہ اس پر یہ ظاہر نہ ہو کہ میں بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

لیکن میں نے جیسے ہی اس کے آنے کی آہٹ اس کی دلکش آواز اور کاٹیا کے پاؤں کی چاپ سنی میں اس کے خیر مقدم کے لئے آگے بڑھنے سے باز نہ رہ سکی۔ وہ کاٹیا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے اپنی گہری آواز میں سرگرم گفتگو تھا۔ اور اس کے چہرہ سے مسرت کے آثار ہویدا تھے۔

جیسے ہی اُس نے مجھے دیکھا وہ خاموش ہو گیا۔ اور بغیر سلام کئے ہوئے تھوڑی دیر تک مجھے غور سے دیکھتا رہا مجھے اس کا اس طرح دیکھنا کچھ اچھا نہ معلوم ہوا اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا ہے۔

اب اُس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے سادگی اور سچائی کے ساتھ کہا۔ "اخاہ! کیا در اصل تم ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اسقدر تبدیل ہو گئیں؟ تم کتنی بڑھ گئی ہو! وہ بچپن کی شوخی اور سادگی کیا ہوئی؟ اب تم ایک شگفتہ رنگین گلاب ہو"۔

اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور جوشِ ہمدردی میں اس زور سے دبایا کہ مجھے تکلیف ہونے لگی میں نے خیال کیا کہ وہ میرے ہاتھ پر بوسہ دینا چاہتا ہے۔ اور اس لئے میں اس کی طرف جھک گئی لیکن پھر بھی اس نے میرے ہاتھ کو صرف دبایا۔ اور اپنی تیز اور سادہ نگاہیں میری نگاہوں میں پیوست کر دیں۔

میں نے چھ سال کے بعد آج اس کو دیکھا تھا۔ اس دورانِ زمانہ میں وہ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اس کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ اور اس کا رنگ زیادہ سیاہ ہو چکا تھا۔ اب اس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھا لی تھیں۔ جو اس کے چہرہ پر کچھ بھلی معلوم نہ ہوتی تھیں۔ تاہم اس کی خوش اخلاقی راستبازی اسکی تیز اور چمکدار آنکھیں اس کی معصومانہ مسکراہٹ ابھی تک ویسی ہی تھی۔

پانچ منٹ کے اندر اس کی اجنبیت جاتی رہی۔ اور ہم سب کو محسوس ہونے لگا کہ گویا وہ ہمارے ہی خاندان کا ایک رکن ہے۔ حتّٰی کہ ملازم تک اس کے آنے سے خوش تھے کیونکہ وہ بخوشی اس کا ہر کام کرتے تھے۔

اس کا طرزِ عمل اُن ہمسایوں سے بالکل مختلف تھا۔ جو والدہ کے انتقال کے بعد آتے تھے۔ اور جبتک ہمارے مکان میں رہتے آہستہ آہستہ گفتگو کرتے اور اشکباری پر مجبور نظر آتے تھے۔ وہ بہت لسان اور شوخ تھا۔ مگر اماں کی بابت اُس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اوّل اوّل مجھے اس کی اس بے اعتنائی پر افسوس ہوا۔ اور ایک ایسے شخص

کے لئے جو ہمارے خاندان کا اسقدر ہمدرد ہو۔ یہ امر بہت ہی نا مناسب معلوم ہوا۔ مگر بعد ازاں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کی یہ بے پرواہی در اصل سچائی پر مبنی تھی۔ اور اس سلئے میں اس کی بہت ممنون ہوئی۔

شام کے وقت کاٹیا نے نشست گاہ میں والدہ کی قدیم جگہ پر چائے نوشی کا انتظام کیا۔ سونیا اور میں کاٹیا کے پاس بیٹھ گئے۔ ضعیف العمر گریگوری نے والد مرحوم کا ایک حقہ لاکر اس کو دیا اور وہ مثل عہد گزشتہ ادھر ادھر کمرہ میں ٹہلنے لگا۔

اس نے کہا "غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر میں کس قدر افسوسناک تبدیلیاں ہو گئی ہیں" اور اتنا کہکر وہ خاموش ہو گیا۔

سماوار پر کپڑا ڈالتے ہوئے کاٹیا نے ایک آہ سرد بھر کر کہا "ہاں" اسنے حسرت آمیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ اور قریب تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں۔

پھر اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا "میں سمجھتا ہوں کہ تم کو اپنے والد مرحوم یاد ہونگے"؟

میں نے جواب دیا "ہاں کچھ یوں ہی سے"

اُس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے، اور میری پیشانی اور بالوں کو متانت اور محبت کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا "اب تم ایک دوسرے کے لئے کس قدر آرام و سکون کا باعث ہوتے!" اور پھر اور بھی زیادہ آہستگی سے کہا "تمہارے والد میرے بہت پیارے دوست تھے" مجھے معلوم ہوا کہ اس کی آنکھیں بہت تیز اور روشن ہو گئی تھیں۔

"خیر خدا کی مرضی ایسی ہی تھی کہ اُس نے انکو (والد کو) بھی اپنے یہاں بلا لیا" کاٹیا نے کہا اور فوراً چائدان پر کپڑا ڈالکر اپنا رومال اٹھا لیا۔ اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

اُس نے منہ پھیر کر کہا "بیشک اس خاندان میں بہت خوفناک تبدیلیاں ہو گئی ہیں" اور پھر ایک لمحہ کے بعد سونیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا "سونیا مجھے اپنے کھلونے دکھاؤ" اتنا کہہ کر وہ ملاقات کے کمرہ میں چلا گیا۔ اور اُسکے جانے کے بعد میں نے اشک آلود نگاہوں سے کاٹیا کی جانب دیکھا۔

کاٹیا نے کہا "اوہو! وہ ہمارا کسقدر ہمدرد دوست ہے!"

سچ تو یہ ہے کہ اس سچے غمخوار دوست کے خیال سے مجھے اطمینان قلب نصیب ہوا۔ جب ہم نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سونیا کی نازک آواز اور سرجیائی کی مسرت آمیز دلگی جو وہ اس کے ساتھ کر رہا تھا سُنی۔ میں نے اُس کیلئے چائے انڈیلی، وہ پیانو کے پاس بیٹھ گیا۔ اور سونیا پیانو چھیڑنے لگی۔

اُس نے مجھے پکار کر کہا "ماریا! یہاں آؤ اور مجھے کوئی نغمہ سناؤ" میں نے اس کی اس سادہ دوستانہ خواہش کو بہت پسند کیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے پاس چلی گئی۔

اُس نے گیتوں کی کتاب کھول کر کہا "لو اس راگ کو

چھیڑ دو۔ دیکھیں تم کیسا پیانو بجاتی ہو" اور یہ کہتے ہوئے وہ چائے کا پیالہ ہاتھ میں لیکر کمرہ کے ایک گوشہ میں چلا گیا۔

بعض وجوہات کی بنا پر مجھے اس امر کا احساس ہوا۔ کہ اُس کے روبرو کامیابی کے ساتھ پیانو نہ بجا سکنے کا عذر کرنا بے سود ہوگا۔ اور سر تسلیم خم کر کے میں اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے پیانو پر بیٹھ کر اپنی پوری تابعیت کے ساتھ اس کو بجانے میں مصروف ہو گئی۔ اگرچہ میں اس کی نکتہ چینی سے بےخوف نہ تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ موسیقی کا ماہر بھی ہے اور دلدادہ بھی۔

یہ دھیمی گت اُن دھندلے خیالات کا آئینہ تھی جو میرے دماغ میں اس وقت پیدا ہوتے تھے۔ جب میں چائے کی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ معمولی طور پر میں نے اچھی طرح پیانو بجایا۔ لیکن اُس نے مجھ سے ایک دوسرا نغمہ چھیڑنے کو نہیں کہا۔

اُس نے پیانو کے نزدیک آکر کہا" نہیں، تم اس کو اچھی طرح نہیں بجا سکتیں۔ خیر کچھ پروا نہیں۔ تاہم تم نے پہلی بار کچھ بُرا نہیں بجایا۔ بیشک تم موسیقی کو بڑی حد تک سمجھتی ہو"۔

اس تعریف کو سُنکر جس میں دراصل تصنّع کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ مجھے اسقدر مسرت حاصل ہوئی کہ میں محجوب ہو گئی۔ میرے لئے یہ ایک نادر اور خوشگوار تجربہ تھا کہ ایک دوست جو رتبہ میں میرے والد کے برابر ہو۔ مجھ سے اس طرح متانت کیساتھ گفتگو کرے۔ گویا میں اُس کی ملاقات کے قابل تھی۔ اور اب میری حیثیت مثل ایک نادان بچہ کے نہ تھی۔ جیسا کہ پہلے ہُوا کرتا تھا۔

کاٹیا سونیا کو سُلانے کی غرض سے کوٹھے پر چلی گئی اور ہم دونوں ملاقات کے کمرہ میں بیٹھے رہے۔

اُس نے والد مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ کہ وہ دونوں کس طرح ایک دوسرے کے ہمدرد تھے۔ اور اُس زمانہ میں جبکہ میں بالکل کمسن تھی۔ وہ کیسی خوشگوار زندگی بسر کرتے تھے۔ اور تصاویر کی کتابوں اور گڑیوں سے مجھے خوش رکھتے تھے۔ اس کی گفتگو نے آج پہلی بار میرے باپ کو ایک ایسے صاف باطن، پاک طینت اور قابلِ محبت شخص کی شکل میں پیش کیا۔ جس کا مجھے کبھی پہلے خیال بھی نہ ہوا تھا۔

نیز اُس نے میری دلچسپی، میری تعلیم اور میری امیدوں کے متعلق استفسار کیا۔ اور اپنے مشورہ سے مجھے محروم نہ رکھا اب وہ ایک خوشرو اور بامذاق ظریف نہ تھا۔ جو کبھی مجھے پریشان کیا کرتا۔ اور میرے واسطے کھلونے بنایا کرتا تھا۔ بلکہ ایک متین، مستعد اور قابلِ محبت شخص تھا۔ جس کے ساتھ مجھے غیر ارادی طور پر محبت اور ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ جب میں اس سے ہمکلام ہوتی تو میرے قلب کو سکون اور مسرت حاصل ہوتی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی ایک ایک لفظ زبان سے نکلتے ہوئے اپنے دل میں ڈرتی تھی۔ اور اپنے

قلب پر ایک بوجھ سا محسوس کرتی تھی۔ کیونکہ میری خواہش تھی کہ میں اپنے آپ کو اس کی محبت کے لائق بناؤں جس کا ابتک سادگی کے ساتھ مجھ سے اس لئے اظہار کیا گیا تھا کہ میں اُس باپ کی بیٹی تھی جو کبھی اس کا گہرا دوست تھا۔

سونیا کو سُلا کر کاٹیا پھر ہمارے پاس آ گئی۔ اور میری بے پروائی و عدم توجہی کی اس سے شکایت کی جس کے متعلق میں نے اس سے کوئی ذکر نہ کیا تھا۔

اس نے مُسکرا کر جواب دیا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاٹیا مجھ سے اس کی خاص وجہ بیان کرنے سے قاصر رہی ہے" اور ملامت آمیز طریقہ سے اپنے سر کو حرکت دیکر میری جانب نظر کی۔

میں نے کہا۔ "اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ یہ میری حماقت ہے اور جلد دُور ہو جائیگی" دراصل مجھے اس وقت ایسا معلوم ہُوا کہ میری کمزوری نہ صرف دُور ہو جائیگی۔ بلکہ وہ پہلے ہی دُور ہُو چکی ہے اور اب مجھے اس کا کوئی احساس نہ تھا

اُسنے کہا "یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ تم تنہائی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتیں، کیا تم ایک حسین نوجوان خاتون نہیں ہو؟"

"بیشک میں ہوں" میں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔

وہ بولا "تو وہ بہت ہی بدقسمت نوجوان عورت ہے۔ جو صرف اس وقت خوش و خرم رہے۔ جبکہ اس کی تعریف کی جائے۔ اور جیسے ہی وہ تنہا زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ تو اس کی زندہ دلی کا جوش سرد پڑ جائے۔ اور وہ کسی کام میں دلچسپی نہ لے، گویا جو کچھ بھی ہو وہ صرف نمائش کے واسطے ہو اور حقیقت میں کچھ بھی نہیں"

میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھنے کی غرض سے کہا "لاریب، میرے متعلق تمہاری رائے بہت صائب ہے"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگا "نہیں نہیں، یہ بات بالکل بیکار نہیں ہے کہ تم مثل اپنے باپ کے ہو، تم میں ایک خاص بات ہے" اور پھر اُس کی مہربان اور تیز آنکھوں میں ایک خوشامدانہ چمک پیدا ہو گئی۔ اور مجھے ایک عجیب خوشگوار اور لطیف پریشانی محسوس ہُوئی۔

اب میں نے پہلی بار دیکھا کہ اس کا چہرہ جسکی علامات مسرت نے مجھ پر خاص اثر کیا تھا۔ ایک عجیب کیفیت کا آئینہ بن گیا۔ پہلے سنجیدگی اور متانت اور بعد میں اُداسی و غمگینی کے آثار اُس کے بشرہ سے ہویدا تھے۔

اُس نے کہا "تم کو بددل ہونے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ تم کو موسیقی سے دلچسپی ہے۔ اور تم اس کو سمجھتی ہو۔ کتابیں تمہارے پاس موجود ہیں۔ اور تمہارا مستقبل تمہارے سامنے ہے۔ صرف یہی وقت ایسا ہے جس میں تم اپنے آپکو اس قابل بنا سکتی ہو کہ آئندہ زندگی میں تم کو افسوس نہ کرنا پڑے۔ ایک سال کے بعد یہ موقع ہاتھ سے نکل جائیگا"

وہ مجھ سے مثل باپ یا چچا کے ہمکلام تھا۔ اور سب مجھے

محسوس ہوا کہ وہ متواتر اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ مجھے حقیر و ذلیل نظروں سے نہ دیکھے

مجھے اس بات کے احساس ہونے پر تکلیف ہوئی کہ وہ مجھے اپنے آپ سے حقیر سمجھتا ہے اور پھر اسی وقت مجھے اس امر سے مسرت بھی حاصل ہوئی کہ اس نے میری ہاں صرف میری خاطر سے اس طریقہ پر اپنی دوستی اور ہمدردی کا اظہار مناسب سمجھا۔ شام کے باقی وقت میں وہ کاٹیا سے خانگی معاملات کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور میرا ہاتھ تھام کر کہا "اچھا پیارے دوستو! الوداع!!"

کاٹیا نے دریافت کیا" ہم آپ سے پھر کب ملینگے؟"

اُس نے جواب دیا " اسی موسم بہار میں" (میرا ہاتھ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا) " اب میں ڈینی لوکا (جو ہماری دوسری ریاست تھی) جا رہا ہوں۔ میں وہاں تمہارے معاملات پر غور کرونگا۔ اور جو کچھ ہو سکیگا تمہارے واسطے انتظام کرونگا۔ پھر اپنے ذاتی کام سے ماسکو جاؤنگا۔ اور موسم گرما میں پھر ہم سب یہاں ایک جگہ ہونگے۔"

میں نے افسردگی کے ساتھ دریافت کیا۔ "تم اسقدر عرصہ کے واسطے کیوں جدا ہوتے ہو؟" در اصل میری خواہش تھی کہ ہم ایک دوسرے سے روزانہ ملتے رہیں۔ یکایک میرے جذبات میں تازگی و شگفتگی کی لہر دوڑ گئی۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ میری گزشتہ پژمردگی پھر عود کر آئیگی۔ غالباً اس کا اظہار میری نگاہوں اور آواز سے بھی ہو رہا تھا۔

اُس نے ایک ایسے لہجہ میں جواب دیا جس میں اعتنا اور تصنع کا نام نہ تھا۔ " تم اپنے کاموں میں مشغول رہنے کی حتی الامکان کوشش کرو اور بددل نہ ہو" پھر میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ " جب موسم بہار آئیگا تو میں تم کو تمہارے امتحان میں کامیاب ہونے کے لئے مدد دونگا"

نشستگاہ میں جہاں ہم دونوں کھڑے ہوئے تھے۔

ایک بار پھر اُس کی نگاہیں میری جستجو کرنے لگیں۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ میرے لئے اسقدر تکلیف برداشت کرے مجھے معلوم نہیں کہ وہ اپنے دل میں کیا خیال کریگا۔ اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ میں اس کو اس طرح اپنی جانب نظر جما کر دیکھتے ہوئے پسند کرتی ہوں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ بہت ہی اچھا لیکن اگر وہ صرف ——"

اسی حیرت و استعجاب کی حالت میں، میں اور کاٹیا آج بہت دیر میں سوتے اور ہم شام تک نہ صرف اُس کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ بلکہ اس امر پر بھی اظہار خیال کیا گیا کہ آنے والا موسم گرما اور نیز موسم سرما ہم کو کس طرح اور کہاں بسر کرنا چاہئے۔

میرا خیال اور وہی سوال کہ "کیوں ایسا کیا جاتا ہے؟"

پھر میرے ذہن میں نہ آیا۔ یہ بات اب میرے دل نشین ہو چکی تھی۔ کہ ہر شخص کو خوش و خرّم زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ مجھے یقین تھا کہ مستقبل ہمارے واسطے بہت سی خوشی اور مسرّت کا موجب ہوگا۔ اور یکایک ہمارا پُر کرو سکون کا پُرانا اور ویران مکان میرے خیال میں زندگی اور روشنی سے معمور ہو گیا۔

دُوسرا باب

موسم بہار آگیا۔

میری اگلی اُداسی اور پژمردگی رخصت ہو گئی تھی اور اس کی جگہ ایّامِ بہار کی خوابناک افسردگی اور مبہم امید و خواہشات نے لے لی تھی۔

اگرچہ اب میں موسم سرما کے شروع کی بہ نسبت بہتر طریقہ پر زندگی بسر کر رہی تھی۔ سونیا، موسیقی اور مطالعہ کتب کو میں نے اپنا رفیق بنا لیا تھا۔ لیکن پھر بھی میں اکثر باغ میں جاتی اور اِدھر اُدھر ماری ماری پھرتی یا بنچ پر بیٹھ جاتی۔ اس وقت میرا دماغ مختلف خیالات سے لبریز اور دل امیدوں سے بھرا ہوتا ہوتا تھا۔

بعض اوقات خصوصاً اس وقت جبکہ ماہتاب اپنی پُوری آب و تاب کے ساتھ سطح فلک پر جلوہ گر ہوتا۔ میں اکثر اپنے کمرہ کی کھڑکی کے پاس ساری ساری رات بیٹھی رہتی اور جب سپیدۂ سحر نمودار ہوتا تو عموماً میں صرف ایک لبادہ پہنکر بغیر کاٹیا کو بیدار کئے ہوئے، باغ میں جاتی اور شبنم آلود سبزہ کو پامال کرتی ہوئی تالاب کے کنارے تک چلی جاتی۔ ایک مرتبہ میں باہر میدان میں بھی گئی۔ اور سنسان رات میں تن تنہا باغ کا پُورا چکر لگایا۔

اب اُن فریبوں اور سحر کاریوں کا اعادہ کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ جنہوں نے اس وقت میرے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ حتےٰ کہ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی تو میں مشکل سے یقین کر سکتی ہوں۔ کہ میرے رنگین خوابوں کی اصلیت کیا تھی۔ وہ کسقدر عجیب اور حقیقت سے دُور تھے!

سرجیائی حسب وعدہ مئی کے آخر میں آگیا۔

وہ ایک دن شام کو اچانک آپہنچا۔ ہم چبوترہ پر بیٹھے ہوئے چائے نوشی کا سامان کر رہے تھے۔ نونہالانِ گلشن سبز مخملی لباس میں ملبوس ہو چکے تھے اور ہر ایک جھاڑی پر بلبلوں کا ہجوم تھا۔ سوسن کی طرہ دار شاخیں ارغوانی پتیوں سے ڈھکی ہُوئی تھیں۔ اور کلیاں نمودار ہونے کے آثار ظاہر تھے۔ لیمو کے تختہ کی روشیں غروب آفتاب کے وقت صاف و شفاف نظر آرہی تھیں۔ اور چبوترہ کے چاروں طرف خوشگوار تازگی بخش سایہ پڑ رہا تھا۔ سبزہ شام کی اوس سے بھیگ چکا تھا۔

باغ کے باہر میدان میں دن کے ختم ہونے کی علامات ظاہر تھیں۔ چراگاہوں سے مویشی واپس آرہے تھے۔ سادہ دل نکن آبپاشی کے آلات لئے ہُوئے چبوترہ کے سامنے تنگ راستہ سے گزرا۔ سونے سے بھلکر بہنے والے تازگی بخش چشمہ کے پانی سے زمین کے وہ گہرے حصے سیاہ نظر آنے لگے۔ جو درختوں کے تنوں اور ان کو روکنے والی لکڑیوں کے گرد بنے ہُوئے تھے۔

چبوترہ پر ہمارے نزدیک ایک سفید پارچہ پر چمکدار سماوار رکھا ہُوا جوش مار رہا تھا۔ ایک طرف بالائی، کیک اور خشک گوشت رکھا ہُوا تھا۔ کاٹیا کے فربہ ہاتھ ایک ہوشیار خاتون کی طرح چائے اچھالنے میں مصروف تھے۔ مَیں چائے کے تیار ہونے کا انتظار نہ کر سکی۔ کیونکہ غسل کے بعد مجھے بیحد اشتہا معلوم ہو رہی تھی۔ اور مَیں روٹی کا ایک ٹکڑا کھانے لگی جس پر بالائی لگی ہُوئی تھی۔ مَیں ہوا دار آستینوں کی گون پہنے ہُوئی تھی۔ اور میرے بھیگے ہُوئے بال رومال میں لپٹے ہُوئے تھے۔ سب سے پہلے کاٹیا نے کھڑکی میں سے اُس کو آتے ہُوئے دیکھا۔

"اہا! سرجیائی! ہم ابھی ابھی تمہارا ہی ذکرِ خیر کر رہے تھے"

مَیں یکایک چونک پڑی اور اپنی پوشاک تبدیل کرنے کے لئے بالاخانہ پر جانے ہی کو تھی کہ دروازہ پر اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

اُس نے مُسکراتے ہُوئے میرے سر اور سر سے بندھے ہُوئے رومال کو بغور دیکھ کر کہا "دیہات میں نمائش اور رسم و رواج کی پابندی سے کیا فایدہ؟ تم کو معلوم ہے۔ کہ گریگوری کے سامنے اس لباس کے پہننے سے تم کو باک نہیں تو مَیں بھی گریگوری سے کسی طرح برتر نہیں ہوں۔"

لیکن اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اُس نے ایک ایسے انداز سے مجھے دیکھا کہ گریگوری کبھی اس طرح دیکھنے کی جرأت نہ کرتا۔ اور اس احساس سے مجھے تکلیف محسوس ہونے لگی۔

مَیں یہ کہہ کر کہ "ابھی واپس آتی ہوں" اس سے رخصت ہُوئی۔

اُس نے چلّا کر کہا "آخر اس حالت میں رہنے سے کیا نقصان ہے۔ اس لباس میں تم ایک دہقانی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔"

جب بالاخانہ پر جلدی جلدی لباس تبدیل کر رہی تھی تو مَیں نے اپنے دل میں کہا "اوہو! اُس نے مجھے کیسے عجیب انداز سے دیکھا تھا! خیر خُدا کا شکر ہے کہ وہ آگیا ہے اور اب ہماری مسرتوں میں اضافہ ہو جائیگا۔"

بہ عجلت آئینہ پر نظر ڈال کر مَیں نیچے اتر آئی۔ اور بغیر اس امر کو پوشیدہ کئے ہُوئے کہ مَیں نے لباس تبدیل کرنے میں بہت جلدی سے کام لیا تھا۔ ہانپتی ہُوئی چبوترہ پر جا پہنچی۔ وہ ایک میز پر بیٹھا ہُوا کاٹیا سے ہمارے معاملات پر گفتگو

کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور سلسلہ کلام کو برابر جاری رکھا۔ اس کی رائے کے مطابق ہمارے معاملات قابل اطمینان حالت میں تھے۔ اور ہمارے لئے ضروری تھا۔ کہ ہم موسم سرما دیہات ہی میں بسر کریں۔ اور پھر سونیا کو تعلیم دلانے کی غرض سے پیٹر برگ یا کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔

کاٹیا نے کہا۔ "کیا ہی اچھا ہو اگر غربت میں تم ہمارے ساتھ رہو۔ کیونکہ اگر صرف ہم تنہا ہونگے تو ہمارے لئے فضائے غربت ویرانہ سے بدتر ہوگی۔"

اُس نے کچھ متانت اور کچھ ظرافت آمیز لہجہ میں کہا۔ "آہ! میں تمہارے ساتھ دنیا میں گشت لگا کر کسقدر مسرور ہونگا!"

میں نے کہا۔ "تو بہتر ہے چلئے ہم سب دنیا کا چکر لگائیں"

وہ مسکرایا اور اپنے سر کو حرکت دی۔

اُس نے کہا۔ "لیکن میری والدہ اور میرے معاملات کا کیا انتظام ہوگا۔ خیر یہ گفتگو فضول ہے اب مجھے بتاؤ کہ تم اپنا وقت کس طرح گذارتی رہی ہو۔ کیا تم زیادہ افسردہ و دل گرفتہ رہی ہو؟"

جب میں نے اس کو بتایا کہ جب سے وہ ہم سے جدا ہوا تھا میں نے کیا کیا کیا' اور اگلی افسردگی سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ اور کاٹیا نے میرے بیان کی تصدیق کی تو اُس نے میری تعریف کی۔ اُس کے چہرہ اور اُس کی گفتگو سے خوشامدانہ تعریف کا اظہار ہو رہا تھا۔ گویا اس کی نظر میں میری حیثیت صرف ایک بچّہ کی سی تھی۔ اور اس کو میری سرپرستی کا حق حاصل تھا میرے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا کہ میں نے نیکی کی راہ میں جو کچھ کیا تھا اس کی مفصل روداد ایمانداری سے اُس کے روبرو بیان کر دوں۔ اور مثل ایک مذہبی پیشوا کے اُس کے سامنے سب باتوں کا اعتراف کر لوں جن کو ممکن ہے کہ وہ پسند نہ کرے۔

شام کا وقت اسقدر خوشگوار اور فرحت بخش تھا۔ کہ جب چائے نوشی کا سب سامان اُٹھا لیا گیا تو بھی ہم چبوترہ پر بیٹھے رہے۔ اور سلسلہ گفتگو میرے لئے اسقدر پرمعنی تھا کہ مجھے مطلق معلوم نہ ہوا کہ کس طرح ہمارے گرد و پیش میں لوگوں کی گفتگو موقوف ہو چکی تھی۔ چاروں طرف سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ اور سبزہ پر شبنم گر رہی تھی۔ ہمارے نزدیک کی جھاڑیوں میں بلبلوں کی نغمہ طرازیاں ہماری آواز کو سنکر بند ہو گئی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ستاروں سے بھرا ہوا آسمان ہماری طرف جھک آیا ہے۔

اس وقت جبکہ ایک چمگاڈر خاموشی کے ساتھ شامیانہ کے اندر جو چبوترہ پر تنا ہوا تھا۔ داخل ہوئی۔ اور میرے سفید شال پر بیٹھ کر پھڑ پھڑانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ تاریکی پہلے ہی چھا چکی تھی۔ میں جلدی سے دیوار سے چمٹ گئی۔ میرے مُنہ سے چیخ نکلنے کو تھی کہ چمگاڈر اُسی پہلی سی خاموشی اور تیز پروازی سے شامیانہ سے نکل گئی۔ اور باغ کی فضائے تاریک

میں غائب ہو گئی۔ یکا یک اُس نے اپنی گفتگو کا رُخ بدلتے ہُوئے کہا۔ "آہ! مَیں تمہارے پوکر وسکوئی کو کسقدر پسند کرتا ہوں۔ کاش! مَیں یہاں اس چبوترہ پر بیٹھ کر اپنی تمام زندگی بسر کر سکتا!"

کاٹیا نے کہا تو پھر آپ یہاں کیوں نہیں قیام کرتے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "یہ تو درست ہے۔ لیکن زندگی خاموشی کے ساتھ بسر نہیں ہوتی۔"

کاٹیا نے دریافت کیا۔ "تو پھر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ تو اس قابل ہیں کہ ہر خاتون کے معزز شوہر بن سکیں۔"

"کیوں؟ کیا اس لئے کہ مَیں ایک پُرسکون زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں؟" اور اس کو ہنسی آگئی۔ اُس نے پھر کہا۔

"نہیں کاٹیا! اب تمہارے اور میرے لئے کوئی امید باقی نہیں ہے۔ عرصہ ہُوا کہ میرے تمام دوستوں نے اس خیال کو ترک کر دیا ہے کہ میں کبھی شادی کروں گا۔ اور بالآخر مَیں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میرے واسطے بھی یہی بہتر ہے۔ یہ واقعہ ہے۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک مصنوعی شادمانی کی حالت میں اسکے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے تھے۔

کاٹیا نے کہا۔ "بیشک یہ درست ہے، تم اپنی عمر کے چھتیس سال گزار چکے ہو۔ اور تمہارا دِل زندگی سے سیر ہو گیا ہے۔"

"آہ! مَیں اپنی زندگی کی کتنی منزلیں طے کر چکا ہوں! اب میری خواہش صرف اسقدر ہے کہ مَیں ایک پُرسکون زندگی بسر کر سکوں لیکن شادی کرنے کے واسطے کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ ——— ان سے پُوچھو ——— اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ان جیسی لڑکیوں ہی کو شادی کرنے کی ضرورت ہے۔ اور میرے اور تمہارے لئے ان کی خوشی میں حصّہ لینا کافی ہے۔"

اس کی آواز میں ایک قسم کی ایسی افسردگی پنہاں تھی کہ مَیں اس سے متاثر ہُوتے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور نہ مَیں نے کچھ کہا، نہ کاٹیا نے۔

اُس نے اپنی کُرسی کو گھما کر کہا۔ "فرض کرو کہ مَیں اتفاقیہ بدقسمتی سے ایک سترہ سالہ لڑکی سے شادی کر لوں۔ ہاں ایک ایسی لڑکی سے جیسی "دلربا" ہے یہ ایک قابلِ تعریف مثال ہے اور مَیں خوش ہوں کہ مجھے ایک ایسی ہی خوش و خرم لڑکی مثال دینے کے لئے دستیاب ہو گئی ہے۔"

مَیں ہنس پڑی، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسی مثال پر اظہار مسرت کرنے کی کیا وجہ ہے۔ اور نہ مَیں یہ سمجھ سکی کہ اس مثال سے اس کا کیا مطلب ہے۔

اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر ظرافت آمیز لہجہ میں کہا۔ "اچھا اب مجھے ایمانداری سے اپنے دِل پر ہاتھ رکھ کر

بتاؤ کہ کیا تمہارے واسطے یہ ایک آزمائش کا موقع نہ ہوگا۔ اگر تم ایک ایسے ضعیف العمر شخص سے شادی کرو جو اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہو، جس کی خواہش صرف یہ ہو کہ وہ ایک خاموش اور پُرسکون زندگی بسر کرے۔ دراں حالیکہ تم کو شوخ اور پُرجوش زندگی کی ضرورت ہے۔"

مجھے اس کا یہ کہنا ناگوار ہوا اور مَیں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کیا کہنا چاہئے۔

اس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، اس کو پیغام نہ خیال کرو۔ بلکہ سچائی کے ساتھ مجھے بتاؤ کہ جب تم سہ پہر کے وقت باغ کی روشوں پر چکر لگاتی ہو تو کیا ایک ایسے ہی شوہر کا خواب دیکھا کرتی ہو۔ اور کیا تم کو ایسے رفیقِ زندگی کے ملنے سے کوئی تکلیف نہ ہوگی؟"

میں نے جواب دینا شروع کیا "نہیں مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی ——"

اُس نے میرے مُنہ کی بات چھین لی۔ اور کہنے لگا۔ "اور نہ تم بالکل قانع ہوگی۔"

"لیکن اگر مَیں ——" اُس نے پھر میری بات کاٹ لی اور کاٹیا کو مخاطب کر کے کہا۔

"اچھا اب تم کو معلوم ہوا کہ اُنہوں نے جو کچھ کہا، سچ کہا۔ مَیں ان کی اس آزادی اور سچائی کا ممنون ہوں، اور خوش ہوں کہ ہم کو ایسی گفتگو کا موقع ملا۔ اب جہاں تک مجھ سے اس کا تعلق ہے۔ مَیں کہہ سکتا ہوں کہ ایسی شادی بہت زیادہ افسوسناک ثابت ہوگی۔"

کاٹیا نے کہا۔ "تم کیسے عجیب آدمی ہو۔ تم میں مطلقاً تبدیلی نہیں ہوئی۔" اتنا کہہ کر وہ شام کے کھانے کا انتظام کرنے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے ہمارے اردگرد خاموشی مسلط تھی۔ البتہ ایک بُلبل سہ پہر کے ابتدائی اوقات کی عادت کے خلاف نہایت اطمینان سے باغ میں نغمہ طراز تھی۔ رات ہو چکی تھی اور موسم بہار کا یہ پہلا موقع تھا کہ ایک دوسری بُلبل نشیب کی وادی میں بیٹھی ہوئی پہلی بُلبل کی ہمصفیر بنی ہوئی تھی۔ جو بُلبل ہمارے قریب تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو کر ہمہ تن گوش بن گئی۔ اور پھر نہایت دلکش سُریلی آواز سے چہچہانے لگی۔ رات کی خاموش فضا میں اُنہوں نے اپنی دلکش آواز بلند کی۔ یہ صرف اُنہیں کا حصّہ تھا۔ اور ہم کو یہ پُرلطف نغمے بہت ہی عجیب معلوم ہوئے۔

باغبان سونے کے لئے ایک خاص حصّۂ باغ میں چلا گیا۔ اس کے وزنی جوتوں کی آواز روشوں پر دھیمی دھیمی سُنائی دیکر بند ہو گئی۔ پہاڑوں کے دامن سے کسی کی سیٹی کی تیز آواز دوبار سُنائی دی۔ اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ پتّیوں کی کھڑکھڑاہٹ قریب قریب بند ہو گئی

تھی، چبوترہ پر تنا ہوا کرپچ کا شامیانہ یکبارگی متحرک ہوا اور ایک لطیف و رُوح پرور خوشبو چبوترہ پر پھیل گئی۔

مجھے اس گفتگو کے بعد جو اس سے ہو چکی تھی خاموش رہنا گوارا نہ تھا لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح آغاز کلام کیا جائے۔

مَیں نے اس کی طرف نظر کی۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں چمک رہی تھیں۔ اور میرے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔

اس نے کہا۔ "دُنیا میں زندہ رہنا ہی غنیمت ہے"

یہ سُنکر نہ معلوم کیوں میرے مُنہ سے بیساختہ آہ نکل گئی۔

اُس نے پُوچھا۔ "یہ کیا بات ہے ؟"

میں نے صرف اس کے الفاظ کو دُہرایا کہ "ہاں بیشک دُنیا میں زندہ رہنا ہی بہتر ہے"

ہم پھر خاموش ہو گئے۔ اور مجھے پھر اپنی بے بسی کا احساس ہُوا۔ مجھے خیال ہُوا کہ مَیں نے اس کی اس رائے سے اتفاق کر کے کہ وہ ضعیف العمر ہے اس کو ناخوش کر دیا ہے۔ مَیں اس کو مطمئن کرنے کے لئے مضطرب تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کس طرح اس کا اطمینان کروں۔

اُس نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔ "اچھا الوداع! اماں شام کے کھانے کے لئے میری منتظر ہونگی۔ مَیں آج اُن سے بالکل نہیں مِل سکا"

مَیں نے کہا۔ "لیکن مَیں تو تم کو اپنا نیا ترانہ سُنانا چاہتی تھی"

مجھے معلوم ہُوا کہ اُس نے سرد مہری سے جواب دیا کہ "پھر کسی وقت"

"اچھا، الوداع!"

اب مجھے پہلے سے زیادہ اس بات کا خیال ہُوا کہ مَیں نے اس کو ناراض کر دیا ہے۔ اور مجھے اس کا بیحد ملال ہُوا۔

کا ٹیانے اور مَیں نے دہلیز تک اس کی رفاقت کی ہم صحن میں کھڑے ہُوئے سڑک کی طرف دیکھتے رہے۔ جہاں وُہ جلد نظروں سے غائب ہو گیا۔

جیسے ہی اس کے گھوڑے کے قدموں کی آواز آنا بند ہوئی مَیں چبوترہ پر چلی گئی۔ اور میری نظریں فضائے باغ میں جذب ہو گئیں۔ شبنم آلود تاریکی میں جس نے شب کی ہنگامہ آرائیوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ مَیں عرصہ تک عالم خیال کے مناظر دیکھتی اور عجیب عجیب صدائیں سُنتی رہی۔

وہ دوبارہ اور سہ بارہ پھر آیا اور ہماری مغائرت آمیز گفتگو سے جو افسردگی پیدا ہو گئی تھی مطلقاً جاتی رہی۔

جب موسم گرما شروع ہُوا تو وہ ہم سے ملنے کے لئے ہفتہ میں دو تین بار آنے لگا۔ مَیں اُس کی ملاقات کی ایسی عادی ہو گئی تھی کہ اگر اس کے آنے میں کبھی معمول سے زیادہ وقت گزر جاتا تو میں پریشان ہو جاتی اور اس کی بے اعتنائی کی شکوہ سنج۔

وہ میرے ساتھ مثل ایک نوجوان دوست کے برتاؤ کرتا تھا۔ مجھ سے سوالات کرتا، میری ہمت بڑھاتا، نصیحت کرتا اور مجھے جوش دلاتا۔ بعض اوقات وہ مجھے ہدفِ ملامت بھی بناتا اور میرے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کرتا۔

لیکن باوجود اس تمام کوشش کے جو وہ میرے ہم پلہ رہنے کے لئے کرتا تھا۔ مجھے وہ سب کچھ معلوم تھا۔ جو اس پردہ میں نہاں تھا یعنی اُس کے نزدیک مجھے قبول کرنا غیر ضروری تھا۔ یہی خیال تھا جو میرے دماغ پر مسلّط تھا اور مجھے اس کی جانب متوجہ کرتا تھا۔

مجھے کاٹیا اور اپنے ہمسایوں سے معلوم ہُوا کہ علاوہ اپنی ضعیف العمر والدہ کی خبر گیری کرنے کے جس کے ساتھ وُہ رہتا تھا، اور نیز علاوہ ان ذمہ داریوں کے جو بحیثیت ایک جاگیردار اور ہمارے سرپرست ہونے کے اس پر عاید تھیں۔ چند دوسری خدمات بھی اُس کے خاندان کی قدامت اور عظمت کے لحاظ سے اس کے سپرد تھیں۔ مگر انکو وہ پسند نہ کرتا تھا۔

لیکن وہ کس طرح ان سب کاموں کو انجام دیتا تھا اس کی تدابیر ذمہ داریاں اور امیدیں کیا تھیں۔ اُس نے کبھی ان کے متعلق مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ جب کبھی دورانِ گفتگو میں مَیں اس کی ذات سے بحث کرنے لگتی تو وہ ترش رو ہوکر کہتا "معاف فرمائیے۔ اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" اور کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرنے لگتا۔

اوّل اوّل اس کے اس طرزِ عمل سے مجھے تکلیف ہُوئی مگر بعدازاں میں صرف اپنے ہی معاملات پر گفتگو کرنے کی ایسی عادی ہوگئی۔ گویا کہ یہ ایک بالکل فطری بات تھی۔

دوسری بات جو شروع شروع میں مجھے ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بعد میں باعثِ تسکین ثابت ہُوئی۔ میری ذاتِ خاص سے اس کی بے پروائی اور عدم توجہی تھی اس نے کبھی اشارے یا زبان سے میری خوبصورتی کا اعتراف نہ کیا تھا لیکن اس کے برخلاف جب کوئی شخص اس کے روبرو میرے حسن کی تعریف کرتا تو وہ محظوظ ہوتا اور مسکراتا۔ وہ اکثر میرے عیوب مجھ پر ظاہر کرتا اور میرا مذاق اُڑاتا تہوار کے موقعوں پر جب مَیں مروجہ پوشاک پہنتی اور کاٹیا مخصوص انداز سے میرے بال بناتی تو وہ ان پر نکتہ چینی کئے بغیر نہ رہتا تھا جس کی وجہ سے کاٹیا کے جذبات کو ٹھیس لگتی اور اس کے اس طرزِ عمل سے شروع شروع میں مجھے بھی پریشانی تھی۔

کاٹیا کو پُورا یقین تھا کہ وہ مجھ سے خوش ہے۔ مگر وُہ اس راز سے مطلقاً ناآشنا تھی۔ کہ وہ میرے متعلق یہ پسند نہیں کرتا تھا۔ کہ مَیں اُس کے روبرو ایک دلکش انداز میں ظاہر ہوں۔

لیکن مجھ کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس کا منشا کیا تھا

وہ اس امر کا یقین حاصل کر لینا چاہتا تھا کہ مجھے اپنی عشوہ طرازی سے کسی کا دل لبھانا تو مقصود نہیں ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہو گیا تو مَیں نے اس پر ظاہر کر دیا۔ کہ میری پوشاک یا بال یا ادائیں دوسرے لوگوں کے دل لبھانے کی تمنّا سے بے نیاز ہیں۔ لیکن یہ بات نقش بر آب ثابت ہوئی۔ کہ مجھے ایسی عمر میں اپنی سادگی اور سادہ دلی پر ناز تھا جبکہ یہ سادگی میرے واسطے فطری متصوّر نہ ہو سکتی تھی۔

مَیں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے محبّت رکھتا ہے۔ لیکن مَیں نے اپنے دل میں اس بات کو جگہ نہ دی کہ آیا وہ مجھ سے مثل ایک بچّہ یا مثل ایک عورت کے محبت رکھتا ہے۔ مَیں اس کی محبت کو وقعت کی نظر سے دیکھتی اور یہ سمجھ کر کہ وہ مجھے دُنیا میں بہترین لڑکی خیال کرتا ہے۔ مَیں یہ امید باندھنے سے باز نہ رہ سکی۔ کہ وہ ہنوز اسی فریب میں مبتلا رہے۔

مَیں نے غیر ارادی طور پر اس کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا اس طرح اس کو دھوکے میں رکھنا میرے لئے مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ مجھ کو معلوم ہو گیا کہ مجھے بہ نسبت اپنی جسمانی خوبی کے روحانی بہتری کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔

میرے بال، میرے ہاتھ، میرا چہرہ اور میری ادائیں، جیسی بھی بھلی یا بُری تھیں، مَیں جانتی تھی کہ وہ ان کو سمجھتا تھا اور ایک نظر میں پہچان لیتا تھا۔ اس لئے اگر مجھے اس کو فریب دینے کی خواہش بھی ہوتی میں اپنے انداز دلکشی اور ادائے دلفریبی میں کوئی اضافہ نہ کر سکتی تھی۔

لیکن میری رُوحانی کیفیت سے وہ واقف نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ اس سے محبت رکھتا تھا۔ اور وہ اس زمانہ میں مدارج ترقی طے کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کو دھوکا دے سکتی تھی اور مَیں نے اس کو فریب میں رکھا، کیونکہ جب مجھے اس امر کا علم ہو گیا تو پھر اس کا انتظام کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ بلا وجہ کی پریشانی جو مجھے پیشتر تکلیف دیتی تھی۔ اور خصوصاً اپنی بدنمائی کا احساس اب بالکل مفقود ہو گیا تھا۔

مجھے اس امر کا احساس تھا کہ وہ مجھے خواہ کیسی ہی حالت میں اور میری زندگی کا صرف ایک ہی رُخ کیوں نہ دیکھے مجھے کوئی غم نہیں، مَیں کیسے ہی حال میں کیوں نہ ہوں۔ کھڑی ہوں یا بیٹھی ہوئی۔ میرے بال خواہ درست ہوں یا پریشان، وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ اور مجھ کو یقین تھا۔ کہ وہ مجھ سے خوش ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنی عادت کے خلاف دوسروں کی تقلید کرتا اور میرے مُنہ پر میری تعریف کرتا تو مجھے کوئی مسرت اور خوشی حاصل نہ ہوتی لیکن اس کے برعکس مجھے کیسی مسرت حاصل ہوتی تھی جبکہ وہ کسی معمولی بات پر میرا مضحکہ اُڑاتا، مجھے غور سے دیکھتا، اور

ظرافت آمیز لہجہ میں کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے: "ہاں بیشک تم میں ایک خاص بات ہے۔ تم ایک حسین دوشیزہ ہو اور مجھے تم سے ایسا ہی کہنا چاہیئے۔"

اور پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ مجھے ایک ایسا انعام ملا۔ جس نے میرے دل کو فخر و مسرت سے لبریز کر دیا، بات یہ تھی کہ میں نے کہا تھا کہ میرے دل میں ضعیف العمر گریگوری کی اس محبت کی بہت وقعت ہے۔ جو اس کو اپنی لُسن پوتی سے ہے یا اس کا یہ سبب تھا کہ کسی نظم یا ناول کو پڑھ کر میرے آنسو نکل پڑتے تھے۔

اس وقت ایک غیر معمولی خیال، جس کے ذریعہ سے مجھے بھلائی بُرائی میں تمیز ہوتی تھی۔ اور میں سمجھ سکتی تھی کہ کونسی شے تعریف کے لائق ہے، بہت ہی عجیب معلوم ہوا۔ یقیناً میں اس زمانہ میں کچھ جانتی ہی نہ تھی۔

میری ابتدائی عادتیں اور دلچسپیاں عموماً اسکو پسند نہ تھیں۔ اس کے ابرو کی ایک ہلکی سی لرزش یا صرف اس کی ایک نظر مجھے آگاہ کر دیتی تھی کہ میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ اس کو پسند نہیں ہے۔ اور اُس کا افسوسناک اور ملامت آمیز انداز مجھے سمجھا دیتا تھا کہ جو باتیں پہلے مرغوب تھیں اب اُن سے نفرت ہوگئی ہے۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے صرف ایک اشارہ کافی ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھتا۔ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا۔ اور اس کی نگاہ میری زبان سے وہ خیال ادا کرا دیتی جو اس کے پیش نظر ہوتا۔ اُس وقت میرے تمام خیالات اور جذبات اُس کے خیالات و جذبات ہوتے تھے نہ کہ میرے، اور جب وہ میرے بن جاتے تھے تو میرے حق میں حیات بخش اور مسرت انگیز ثابت ہوتے تھے۔ بغیر احساس کے میں تمام چیزوں کو مختلف انداز سے دیکھنے لگی۔ یعنی کاٹیا اپنے خانگی ملازم سونیا اور خود اپنی ذات اور اپنے معاملات پر ایک جداگانہ طریقہ سے میری نظر پڑنے لگی

کتابیں جن کو میں پہلے محض وقت کاٹنے کے لئے پڑھتی تھی۔ اب یکایک میری دلچسپی کا باعث ہوگئیں۔ اور اس کا سبب صرف یہ تھا۔ کہ وہ اور میں دونوں انکے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے یا دونوں ملکر انکا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اور وہ میرے واسطے بہت سی کتابیں مہیا رکھتا تھا۔

اب سے پہلے جو وقت مجھے سونیا کو سبق پڑھانے میں صرف کرنا پڑتا تھا میرے لئے بار خاطر ہوتا تھا اور میں اس کو اپنا فرض سمجھ کر مجبوراً انجام دیتی تھی۔ لیکن جب وہ اُس کے اسباق سے دلچسپی لینے لگا تو وہ میرے لئے موجب مسرت بن گئے۔ اور میں اس امر کی جویاں رہنے لگی۔ کہ سونیا کہاں تک ترقی اور کامیابی حاصل کرتی ہے۔

ابتک میرے لئے ایک پورا ستانہ یاد کر لینا دشوار تھا

لیکن اب یہ سوچ کر کہ وہ اُس کو سُنیگا یا سُننے کے بعد تعریف کریگا۔ مَیں ایک ایک گیت کی چالیس چالیس بار مشق کرتی حتیٰ کہ غریب کاٹیا سُنتے سُنتے اُکتا جاتی۔ مگر مجھے اس کی مطلق پرواہ نہ ہوتی۔ پرانے نغمے کسی نہ کسی طرح اب مجھ کو خوشگوار معلوم ہونے لگے تھے۔ اور میرے دل پر ایک عجیب اور عمدہ اثر کرتے تھے۔

کاٹیا بھی جس کو مَیں اپنی ذات کی طرح چاہتی تھی میری نگاہوں میں پہلی سی نہ رہی تھی۔ پہلے پہل مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے لئے یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ ہماری ماں، ہماری خادمہ اور ہماری دوست اُسی طرح بنی رہے جیسی کہ اب تک تھی۔ مَیں اس کے انہماک محبت اور بے غرضی کی مدّاح تھی۔ مَیں اُس کے احسان کے گیت گاتی۔ اور ہمیشہ سے زیادہ اب اُس سے محبت کرنے لگی تھی۔

باہر اور گھر کے ملازم اور کنیزوں کے ساتھ پہلے سے بالکل مختلف طریقہ پر سلوک کرنے کی اب وہ مجھے تعلیم دیتا تھا۔ مجھے ندامت کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مَیں نے جن لوگوں میں رہ کر سترہ سال بسر کئے تھے ان کے متعلق اُن لوگوں کے مقابلہ میں جن کو مَیں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ بہت کم واقفیت رکھتی تھی۔ مجھے کبھی اس امر کا احساس نہ ہوا تھا کہ یہ لوگ بھی میری طرح رنج و غم اور دکھ سکھ رکھتے ہیں۔

اپنے باغ سبزہ زار اور کھیت وغیرہ میں جن کو مَیں مدت العمر سے دیکھتی رہی مجھے یکایک ایک نئی خوبی نظر آنے لگی۔ اس کا یہ کہنا کہ "دوسروں کے لئے زندہ رہنا صرف مسرتِ حیات کا موجب ہے" بیکار ثابت نہیں ہوا جبتک یہ سمجھ میں نہ آیا تھا اُس وقت تک مجھے اس کا یہ کہنا عجیب معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ اعتقاد غیرارادی طور پر میرے دلنشین ہو گیا۔ اس کی وجہ سے میری زندگی اب مسرت سے لبریز ہو گئی تھی۔ درآنحالیکہ میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ بجز اس کے کہ ہر خیال میں اس کا پرتو نظر آتا تھا۔ ہر وہ چیز جو عہدِ طفلی سے آجتک میرے واسطے ناکارہ اور بے سود رہی تھی۔ یکبارگی میرے لئے مفید ہو گئی۔ اُس کے سامنے آتے ہی ہر بات خودبخود ظاہر ہو جاتی تھی اور میری تمام روحانی طاقتیں بیدار ہو کر حیات سے آشنا اور مسرت سے لبریز ہو جاتی تھیں۔

مَیں اکثر بالاخانہ پر جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی اور نہ صرف مستقبل کی نادیدہ آرزوؤں، امیدوں اور خواہشات بلکہ موجودہ مسرت آمیز خیالات میں محو ہو جاتی۔ مجھے نیند نہ آتی بلکہ مَیں اُٹھ بیٹھتی اور کاٹیا کے پاس جا کر اپنا افسانۂ مسرت اُس کے گوش گذار کرتی۔ اب جب کبھی مَیں اس پر غور کرتی ہوں تو مجھے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی۔ جس کے سبب سے کاٹیا سے اس محبّت کی کہانی کا کہنا ضروری تھا۔ کیونکہ وہ اس

کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے کہتی کہ اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، نیز یہ کہ وہ بھی بہت خوش و خرم ہے۔ اور یہ کہہ کر میرا بوسہ لے لیتی۔ میں بھی اس کے کہنے کا یقین کر لیتی کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ خوش و خرم رہنا ہر شخص کا حق ہے۔

مگر کاتیا میں جلد سو رہنے کی کمزوری تھی۔ وہ مجھے عموماً بیرمی کیساتھ اپنے پاس سے جدا کر دیتی اور سو جاتی لیکن میں پھر بھی جاگتی رہتی اور اپنی مسرت کے اسباب پر غور کیا کرتی بعض اوقات میں اٹھ بیٹھتی، دوبارہ جناب باری میں سجدۂ نیاز پیش کرتی اور اپنے الفاظ میں خدا کا شکر ادا کرتی جس نے مجھے یہ مسرت عطا فرمائی تھی۔

میرے کمرہ میں خاموشی کی حکومت رہتی، صرف کاتیا کے خراٹوں کی متواتر آواز، گھڑی کی ٹک ٹک اور خود میرا بیخوابی کی حالت میں کروٹیں بدلنے اور شکر کے الفاظ میری زبان سے نکلنے یا ادھر ادھر گھوم کر اپنے گلے میں پڑی ہوئی صلیب کو بوسہ دینے سے کمرہ کی فضائے خاموش میں ترنم پیدا ہو جاتا تھا دروازے بند ہوتے، چٹخنیاں چڑھی ہوئی ہوتیں، کسی مقام پر مکھی یا مچھر کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی اور میری خواہش ہوتی کہ کاش میں ہمیشہ اپنے چھوٹے کمرہ ہی میں رہوں۔ صبح دیر سے نمودار ہوا کرے۔ اور میری روحانی فضا ہمیشہ میرے گرد رہے! مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے خواب، میرے خیالات اور میری دعائیں زندہ مخلوقات ہیں، جو تاریکی میں میرے ساتھ رہتی، میرے بستر کے اردگرد پرواز کرتی اور میرے اوپر سایہ فگن ہوتی ہیں۔

ہر خیال اس کا خیال اور ہر جذبہ اس کا جذبہ ہوتا تھا اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ محبت کا اثر ہے۔ میں سوچا کرتی تھی کہ کاش یہ حالتِ کیف ہمیشہ قائم رہے اور وہ اس سے کوئی اثر قبول نہ کرے!

(باقی باقی)

داستانِ پارینہ

اب شعر و شاعری کے زمانے کہاں رہے ۔۔۔ وہ اور لوگ تھے جو میرے ہمزباں رہے

اٹھ اٹھ کے [illegible] گئے پھر رواں رہے ۔۔۔ ہم گرد کی طرح سے پسِ کارواں رہے

جس سرزمیں پہ سایۂ [illegible] آسماں رہے ۔۔۔ اُس پر سکونِ قلب سے کوئی کہاں رہے

ہم بے بسی سے [illegible] دریائے شوق میں ۔۔۔ تنکے کی طرح موج کے بل پر رواں رہے

اچھا! جناب عشق ہیں!! تشریف لائیے!!!
خوب آئے آپ! آئیے حضرت!! کہاں رہے؟

وہ اور ہمارے پاس! خدا ساز بات تھی
ہم مدتوں خدا کی قسم بدگماں رہے

صاحب ہماری توبہ - ہمیں باز آ گئے
ہاں ہاں کے بعد پھر بھی نہیں ہے تو ہاں رہے

تھے حق شناس اور انا الحق نہ کہہ سکے
اہل زباں تھے ہم بھی مگر بے زباں رہے

سر سینکڑوں - جہاں میں سروں کی کمی نہیں
اُس آستاں کی خیر ہو - وہ آستاں رہے

اب اُس کو باغ کہتے ہوئے آ رہی ہے شرم
جس باغ کے یہ حضرت دل باغباں رہے

دیکھیں کسی کی قبر بھی رہتی ہے یا نہیں
ہر اک یہ چاہتا ہے کہ میرا نشاں رہے

پھر بھی رواں ہے جانب ساحل جہاز عمر
لنگر رہا کوئی نہ کہیں بادباں رہے

گزرے ہوئے شباب کے قصے نہ چھیڑئیے
وہ ہم نہیں رہے تو بھلا تم کہاں رہے

دیکھا تو اک مرض تھی سیہ مستیِ حفیظ
جس طرح کوئی خواب میں اُٹھ کر رواں رہے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

تجلیاتِ سُہا

اُسے چاہوں تو پہلے آپ اپنا امتحاں کر لوں
نظر کو یکقلم ناآشنائے این و آں کر لوں

نگاہِ لطف! اب تو ہی کوئی وارفتگی دیدے
کہ ہر اک لمحۂ عشرت کو اپنے جاوداں کر لوں

وہاں نازِ خود آرائی نظر اُٹھنا قیامت ہے
یہاں ذوقِ جنوں بیتاب کچھ گستاخیاں کر لوں

تمہیں سب جانتے ہیں میں ہی کچھ خاموش ہوں ورنہ
زباں کھولوں تو ساری انجمن کو ہمزباں کر لوں

ہجومِ جلوہ ہو، اک طور یا اک بتکدہ کیسا؟
مرا بس ہو تو اپنے قلب کو ہندوستاں کر لوں

کروں اُس انجمن میں جا کے گم ہوش و خرد آخر
سُہا اب جی میں ہے اتمامِ کارِ دوجہاں کر لوں

سُہا (علیگ)

شامِ برشگال

کیسا نظر فروز ہے، منظرِ شامِ برشگال — فرشِ زمیں ہے سبز سبز، رنگِ شفق ہے لال لال
پھٹ گیا پردۂ نظر، ابر برس کے کھل گیا — رنگِ فلک نکھر گیا، دامنِ عرش دھل گیا
چوٹی پہ کوہسار کی، تاج ہے گویا نور کا — ننھا سا اک نمونہ ہے، جلوۂ کوہِ طور کا
اُف رے فسوں طرازیاں، چشمِ فلک کی آب پر — کھیل ہے دھوپ چھاؤں کا گویا کسی سراب پر
بادِ صبا کی چھیڑ چھاڑ، موجوں سے جوئبار کی — شیشۂ آب میں شبیہ، دامنِ کوہسار کی
جنّتِ گوش ہے فضا، نغمۂ جوئبار سے — غلغلۂ طیور سے، زمزمۂ ہزار سے
مشک فشاں نسیم ہے، بادِ صبا ہے عطر بیز — پرتوِ حسنِ یار ہے صحنِ چمن میں جلوہ ریز
لالہ و یاسمن کی گود، پھولوں سے ہے ہری بھری — پھول وہ رنگ رنگ کے، پتیاں وہ ہری ہری
نشۂ بوئے گل سے ہیں وجد میں ساری ڈالیاں — پتے بجا رہے ہیں کیا ذوقِ خوشی سے تالیاں
جست میں آہوانِ دشت، رقص میں مور محو ہیں — نعرہ خوشگوار ہیں، بن بہن، چکور محو ہیں
جوششِ لطف سے ہوئیں دل میں امنگیں موجزن — چھایا ہے کیفِ بیخودی، مست ہیں سارے مرد و زن
خندۂ گل کو دیکھ کر، داغِ جگر بھی ہنس دئے — سبزے میں جان آگئی، [illegible]
پہلو میں دل تڑپ اُٹھا، سن کے صدائے پی کہاں — کیسی جگر خراش ہے اُف! یہ نوائے پی کہاں؟
ابر برس کے کہہ گیا، اشک بہانے کے لئے — یاد کسی کی آگئی، دل کو ستانے کے لئے

پھر اگر آئے یہ گھڑی، مجھ کو نہ رکھیو اے خدا!
شام ہو برشگال کی، اور میں اُن سے ہوں جُدا

سعید

وفا آموز

(۱)

ٹیلیفون کا الارم ہُوا۔ ایک دُبلا پتلا شخص جو پیکرِ غم بنا بیٹھا تھا۔ چونکنا ہُوا اور سیور کان سے لگایا۔ اور حسب ذیل پیغام وصول کرنے لگا۔

"وہ دونوں بلوسٹار ہوٹل کے صدر دروازہ کے بائیں بازو کے دوسرے کمرہ میں ہیں"

"بہت اچھا" کہا۔ اُس نے رسیور کو ہُک پر رکھا۔ کُرسی کو پیچھے دھکیل کر اپنے سامنے والی میز کی دراز میں سے ایک پستول نکالا۔ اور اُس کو میز پر رکھ کر دائیں طرف کے گوشہ کی جانب بڑھا۔ زمین دوز صندوق کھولا۔ دوسرا پستول نکالا۔ اور خاموش کن نکال کر دونوں پستولوں پر چڑھائے اور باحتیاطِ تمام دونوں کو جیب میں رکھ کر کمرہ سے نکل کھڑا ہُوا۔

(۲)

ہیرا ایک فیروزی رنگ کے سبک رفتار موٹر میں بیٹھی محسوس کر رہی تھی۔ کہ کسی کی نیلگوں آنکھیں اس کے چہرہ پر جمی ہُوئی ہیں۔ اس کا دل فضائے الفت میں تارِ نظر کی مانند مرتعش تھا۔ ہرمزکی آنکھیں ایک مدت سے اُسے خاموش پیغام سُنایا کرتی تھیں۔ اور جب وہ وفورِ محبت میں کہتا تھا کہ "کیا دیر ہے"۔ تو وہ تبسم آمیز لہجہ میں جواب دیدیا کرتی تھی۔ کہ "جلدی کیا ہے"۔

لیکن وہ عرصہ دراز سے علی التواتر اس معاملہ پر غور کر رہی تھی۔ کہ آخر کبتک اس دلچسپ شخص کو وارفتہ محبت بنائے رکھے۔

جمشید کے ساتھ دن بدن اُس کی زندگی ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ وہ بیچارہ اپنے کاروبار میں اسقدر محو رہتا تھا کہ ایک تشنۂ کامِ الفت کو سیراب کرنا اُس کے قبضۂ قدرت سے باہر تھا۔ اس لئے ہیرا کو اپنے وقت کا اکثر حصہ گوشۂ تنہائی میں گذارنا پڑتا تھا۔

جمشید بیچارہ اپنی عدیم الفرصتی کے باعث اس اہم ذمہ داری کے احساس کو کھو بیٹھا تھا جو ایجاب وقبول کے بعد فوراً عمر بھر کے واسطے عاید ہوجاتی ہے وہ نہ سمجھتا تھا کہ رہنے کے واسطے شاندار سے شاندار مکان۔ پہننے کے واسطے زرق برق ملبوسات۔ کھانے کے واسطے مرغ و مزعفر مہیا کرنے کے بعد ایک خاوند کا فرض اپنی بیوی کے لئے ختم نہیں ہوجایا کرتا ان کے علاوہ نہیں ان سے کہیں بڑھ کر وہ اس کی توجہ اس کی محبت کی محتاج ہوتی ہے۔

علاوہ بریں درسیات زمانہ کو ابھی اُس نے بنظرِ امعان مطالعہ نہیں کیا تھا۔ وہ ابتک اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ کہ حبالۂ ازدواج اور رشتۂ وفا ایک ہی چیز ہیں۔ اُس کو تجربہ نہ تھا کہ صنفِ نازک کی نازکدلی اور متلون مزاجی کیا کیا نہیں کر گزرتی۔

جمشید کی بزم سے ہیرا کا دِل بجھ چکا تھا۔ اُسکی رفاقت سے وہ بیزار ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ ایک ایسے شخص کی محبت قبول کرنے پر آمادہ ہو چلی تھی۔ جو مدت سے شمعِ اخلاص بن کر اُس کے فانوسِ دِل کو نورانی کر رہا تھا۔

اس شخص کے ساتھ اُس کی زندگی انتہائی لطف سے گزر گئی۔ لندن اور پیرس کے جگمگاتے ہوٹلوں کا نظارہ سفرہائے دُور دراز میں دلچسپ مقامات اور دلکش مناظر کی سیر، بزمہائے طرب میں باہمی مجالست وغیرہ کی یاد اُسکے دِل کو گُدگُداتی تھی۔ اور اُسے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ جمشید کے ہاں وہ اپنی زندگی ضائع کر رہی ہے۔

کہربائی کشش کبتک اپنا کام نہ کرتی۔ آخرکار اُسکے ہونٹ تبسم کے لئے کھلنے لگے۔ اُس کے رُخسا کی شرمیلی سُرخی سے ایک دیوانہ بنا دینے والی ادا ظاہر ہونے لگی۔ اُسکی آنکھیں مستقبل کے شاندار ہونے کی امید کی روشنی سے چمکنے لگیں۔

فریضۂ حسن نے جو چاہا سمجھا۔ اُس کا ایک ہاتھ نازنین کے داہنے ہاتھ پر گیا اور اُسے اُٹھا کر اپنے ہونٹوں پر اسرارِ محبت عیاں کرنے کے لئے رکھ دیا۔

"احتیاط شرط ہے" وہ تبسم آمیز لہجہ میں بولی۔

"لیکن" ہرمز کے مُنہ سے عیارانہ انداز سے نکلا۔

ہیرا اس کا مطلب سمجھ گئی یعنی وہ یقین دلا رہا ہے کہ جمشید کے جہازِ اُلفت سے وفا کا لنگر کاٹ کر غرق کر دینے کے بعد وہ بحرِ الفت کے تلاطم خیز طوفانوں سے محفوظ ہو جائینگے لیکن وہ ابھی اس کے واسطے تیار نہ تھی۔ اس لئے اُسنے پہلو بدل کر کہا۔ "کیا عجب منظر ہے۔ نیلگوں آسمان پر سفید سفید بادل، بہار کی کیف آور بہار۔ سورج کی روشنی کا مستانہ وار لیٹنا ...."

"اور پھر تم اور میں" ہرمز نے قطع کلام کر کے کہا۔ نازنین کی آنکھیں جُھکیں۔ ہونٹ ملے، ہاتھ بڑھے۔

(۳)

یوں تو کم و بیش ایک سال سے ہرمز اور ہیرا محوِ اُلفت تھے لیکن پیرس سے وفد کی واپسی کے وقت سے تو دونوں بزمِ محبت کے شمع و پروانہ بن گئے۔

ہیرا نے اکثر جمشید کو یہ کہتے سُنا تھا کہ اس عظیم الشان سیاسی وفد میں ہرمز کی شمولیت ذاتی قابلیت کی بنا پر نہ تھی بلکہ وہ اس کے لئے اپنے ذوی الاقتدار چچا کا مرہونِ منت تھا۔ واقعہ خواہ کچھ ہی ہو، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وفد کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے وہ بزمِ شہرت میں

ایک نمایاں جگہ پر متمکن ہو گیا تھا۔

اس کے برعکس جمشید فاتیز الرام۔ ہر دلعزیز اور واقعی جوہر قابل تھا۔ وہ اس سے مستغنی تھا۔ کہ کسی دوست یا کسی رشتہ دار کا بار احسان اپنی گردن پر اٹھانے۔ گزشتہ ششماہی سے اُس کا کاروبار اتنا ترقی پر تھا۔ کہ اُس کو سانس لینے کی فرصت بھی نہ تھی۔

ہیرا شمع انجمن تھی نہ کہ چراغ خانہ۔ جمشید کی ظاہری سرد مہری نے اُس کو بزم احباب مجاز کا موقع دیدیا تھا۔ ادھر جمشید بیچارہ بھی اس گرمئ محفل سے بیزار ہو گیا تھا۔ رشتہ ازدواج اب ان دونوں کے واسطے ایک گلوگیر حلقہ بن گیا تھا۔ جس کو توڑنے کے لئے دونوں مشتاق تھے۔ مگر پہل کون کرے اور کس طرح؟

جمشید کا ہڈی سے پنجر لگ گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی روشنی روز بروز اس طرح گھٹتی چلی جارہی تھی جس طرح نیم فسردہ انگر کجلا کجلا کر اپنی چمک کھو بیٹھتا ہے۔

اس کے خلاف ہیرا کے ہونٹ ہر وقت شوق انگیز مسکراہٹ سے بجلیاں گراتے رہتے تھے۔ بے حجابی کی سشاطہ شوخی کا غازہ ملکر اُس کے چہرہ کو چمکاتی تھی۔ وہ کبھی اکیلی نہ رہتی تھی۔ یا تو وہ شمع کی طرح محفل افروز رہتی یا خلوت راز میں ہرمز کی ہمنشیں۔

بہت ایسے تھے جو انگشت بدنداں تھے کہ آخر جمشید کی آنکھیں نہیں، جو وہ نہیں دیکھتا یا کان نہیں جو وہ نہیں سنتا۔

ہیرا نے موٹر کو بائیں جانب موڑ کر ٹھیرا لیا اور بلو سٹار ہوٹل کے گول زینہ کے ذریعے سب سے بالائی منزل پر چڑھی۔ دائیں جانب مڑی اور ایک کمرہ چھوڑ کر دوسرے کمرہ میں داخل ہوئی ہرمز نے اُس کی پیروی کی دروازہ بند کر دیا گیا

"آخر کار پیارے ہم آگئے"۔ ہیرا ملائم لہجہ میں بولی۔

مخمور محبت ہرمز کی نیم باز آنکھیں ہیرا کے چہرہ پر پڑیں۔ اور جم گئیں۔ اُس کے تقوی شکن حسن کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرنے کا عادی تھا۔ "ہیرا تم سی حسینہ میں نے آجتک نہیں دیکھی"۔

اور آج اُس کا منشا تھا کہ ہیرا اپنے برق فگن لبوں سے اُسکی قسمت کا فیصلہ کر دے۔

ہوٹل کے ملازم نے کھانا چنا اور چلدیا۔ یہ دونوں کھانے میں مصروف ہوئے۔ ہرمز ہیرا کی طرف جھکا۔ اور ہیرا نے اُس کے خیالات کے مطالعہ کے لئے اُس کے چہرہ پر نگاہ ڈالی۔

"پیاری ہیرا اب اس کا خاتمہ . . . ."

تمہارا اس سے کیا مطلب ہے ہیرا نے تجاہل عارفانہ سے کام لیکر جواب میں پیشقدمی کی۔

"تم جانتی ہو کہ اس طرح گزارہ نہیں ہو سکتا۔ سال بھر سے میں امیدوار ہوں اور تم بھی مائل بہ کرم معلوم ہوتی ہو۔ کیا تم میری محبت قبول نہیں کر چکی ہو۔ ایک ایسا شخص جو تمہاری

خاطر خواہ قدر نہ کرے۔ قطع تعلق کر لینے کے قابل ہے۔"

ہرمز کے اس جواب سے ہیرا کا چہرہ چمکا۔ پہلے کبھی وہ اتنی دلکش معلوم نہ ہوئی تھی۔ اس کے رخسار پر عرق کے قطرے ایسے معلوم ہوتے تھے۔ جیسے پھولوں پر شبنم ڈھلکتی ہے۔ اس کی آنکھیں مخمور ہو گئیں۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ اس کی نازک گردن اور بھی لمبی معلوم ہونے لگی۔ ہرمز کے ساکت ہاتھوں میں جان آئی۔ اس نے ہیرا کے ساعد سیمیں کو اٹھایا۔ ہیرا کی نبض زور زور سے چل رہی تھی۔

"ہیرا کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں تمہارا پرستار ہوں۔ میری زندگی تمہاری ایک "ہاں" پر موقوف ہے۔ میں ہر وقت تمہاری رضا جوئی کرونگا۔ تمہارے قدموں پر دنیا کی تمام بیش قیمت اشیاء لا ڈالونگا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ ہرمز نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھ کر بولا کہ آج تم وعدہ کر لو۔ کہ اپنی قریب ترین فرصت میں جمشید سے آزادی حاصل کر کے مجھ سے شادی کر لو گی۔ پھر مہر سکوت اس کے ہونٹوں پر لگی۔ اور ایک عرصہ تک اس کی نگاہ واپسین ہیرا کے چہرہ پر جمی رہی۔ دونوں محو تماشہ تھے۔ اور پیکر شوق بنے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

(۴)

اس عالم خاموشی میں دروازہ کھلا۔ اور آہستہ سے بند کر دیا گیا۔ ہیرا کا خاوند کمرہ میں کھڑا ہوا قفل کی کنجی کو پھرا رہا تھا۔ ہرمز کا رنگ فق ہو گیا۔ ہیرا سہم کر کرسی پر گر پڑی۔ ہرمز کرسی سے الگ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جمشید کے چہرہ پر گڑ گئیں

یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کی اسے ہرگز امید نہ تھی اس میں خطرہ کا احتمال تھا۔ جس نے اس کی رگوں میں دوران خون کو بند کر دیا تھا۔ جمشید نے ہرمز کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ نہایت آہستہ اور متانت سے بولا۔

"اپنے ہاتھ میز پر رکھو" یہ نرم الفاظ اپنے اندر وہ سختی لئے ہوئے تھے۔ کہ ہرمز کا تمام بدن لرز گیا۔ وہ اس کو ملک الموت کا پیغام سمجھا۔ اس کے ہاتھ میز پر آگئے۔

ہیرا کی آنکھیں اٹھیں۔ اور جمشید کے چہرہ کو تمتایا ہوا دیکھ کر جھک گئیں۔ اس کی پیشانی کے شکنوں میں اس نے ایک گہرا اضطراب مضمر پایا۔

جمشید کی آواز ذرا اونچی ہوتی۔ اس نے کہا: "میں تم دونوں کی ایک عرصہ سے ٹوہ میں ہوں۔" پھر ہرمز کی طرف متوجہ ہوا۔ "مجھے بخوبی معلوم ہے کہ تم اس کو مجھ سے انقطاع تعلق کی ترغیب دے رہے ہو۔ میں دروازہ پر کھڑا تمہارے دلخوش کن وعدوں کو سن رہا تھا۔ مجھے یہ بھی خبر ہے کہ تمہارے وعدے اس حسین عیارہ پر جادو کا کام کر رہے تھے۔ مجھ سے یہ بھی پوشیدہ نہیں کہ یہ خوبصورت بلا مجھ سے بیزار ہے لیکن یہ میری ملکیت ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے بہترین چھ سال اس کے لئے ضائع کئے ہیں۔ دنیا کی ہر نعمت میں نے اسکے

لئے بہم پہنچائی ہے۔ اگر وہ پھر بھی مجھ سے مطمئن نہیں ہے۔ تو میرا قصور نہیں۔ وہ میرے وقت کی بھی طالب ہے۔ جس کے بغیر میں اُس کے عیش و عشرت کے سامان مہیا نہیں کر سکتا لیکن میں یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ اس شے کی طالب کسی اور سے ہو۔ تم جیسا خون آشام شخص گولی سے مار دینے کے قابل ہے۔

کیا تمہاری غیرت اسی کی مقتضی ہے۔ کہ تم جیسا شخص جو اعلےٰ سوسائٹی کا فرد ہونے کا مدعی ہو۔ دُنیا کی بڑی سے بڑی سلطنتوں میں اپنی سلطنت کی نیابت کرتا ہو۔ ملک کے بہترین حلقوں میں خیر مقدم کا طالب ہو۔ اور پھر رات کو چوروں کی طرح آتے۔ اور ایک شخص کے بہترین مقبوضہ کو چرا لے جاتے۔

بیوی انسان کی بہترین ملکیت ہے۔ اُس کی تمام زندگی کا سہارا ہے۔ اُس کے واسطے وہ غلامی سے بھی عار نہیں کرتا۔ دُنیا کی تمام دولت سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ دُنیا کے بہترین تحائف اُس کے قدموں پر ڈالنے کی فکر کرتا ہے عفت مآب اور باوفا بی بی دُنیا میں اُس کے لئے جنّت ہوتی ہے۔

میرے ساتھ تم نے بدترین سلوک روا رکھا ہے۔ میری بضاعت میری مایۂ حیات۔ میری بیوی کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ اور مجھ کو جیتے جی جہنم میں جھونک دیا ہے۔

تم دُنیا کے ہر شخص کی لعنت کے قابل ہو تم ننگ انسانیت ہو۔ تم ذلیل سے ذلیل موت کے مستحق ہو۔

جمشید کی آواز درد انگیز تھی۔ اور پھر جب وہ ہیرا کی طرف مخاطب ہونے لگا۔ تو وہ لرز گئی۔ "اس تمام کی تم ذمہ دار ہو۔"

تُم نے اپنے عہد کو بھلا دیا۔ شادی کے مراسم کی ادائیگی کے وقت تم نے دُنیا کے تمام مردوں کو چھوڑ کر مجھے قبول کیا تھا۔ نباہ کا اقرار کیا تھا۔ اطاعت کا وعدہ کیا تھا۔ اور رشتہ محبت، بند حیات کے انقطاع تک کے لئے جوڑا تھا۔

تم نے میری زندگی کا بہترین زمانہ لیا ہے۔ میری جملہ کوششوں کے ثمرات سے متمتع ہوتی ہو۔ اور پھر دوسرے شخص کو مجھ پر ترجیح دیتی ہو۔ تم اس سے بھی زیادہ ذلیل موت کی مستحق ہو۔ تمہاری موت اتنی حسرتناک ہونی چاہئے کہ دوسری عورتوں کو اُس سے عبرت ہو۔ اور دُنیا کی تمام عورتیں تم سے اجتناب کریں۔

ہیرا اور ہرمز، دونوں نقش بدیوار تھے۔ دونوں کے لبوں پر مہر سکوت لگی ہوئی تھی۔

جمشید نے اپنی جیب سے دونوں پستول نکالے اور اُن دونوں کے چہروں کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ دونوں سہمے ہوئے تھے۔ الفاظ کی موجیں گوناگوں خیالات کو لاتی تھیں لیکن ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے پاش پاش ہو جاتی تھیں۔

اس مہرِ خاموشی کو جمشید کے ان الفاظ نے توڑا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ مجھ جیسا شخص جس پر ایسا وقت پڑا ہو وہ کیا کریگا۔ سنا یا ہُوا خاوند ستانے والے شخص کو اور دل دُکھانے والی بیوی کو گولی سے مار کر خودکشی کر لیا کرتا ہے۔ عام طور پر یہی ہُوا کرتا ہے لیکن میں اِن دونوں میں سے کوئی سا طریقہ بھی اختیار نہ کرونگا۔"

پھر ہیرا کی طرف متوجہ ہو کر اس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھا۔ "ہیرا تم ہی اس کی واحد ذمہ دار ہو۔ تمہارے ایما کے بغیر اس شخص کی کوئی مجال نہ تھی جس جرم کا ارتکاب اس بے غیرت شخص نے کیا ہے۔ اس میں تم بھی شریک ہو نہیں تم ہی اسکی ذمہ دار ہو۔ اس لئے تم ہی اس کی سزا کی مستوجب ہو۔ چونکہ تمہاری ان حرکتوں نے میری رُوح کو صدمہ پہنچایا ہے۔ اسلئے تمہاری رُوح کو سزا ملنی چاہیئے۔ قتل جیسے سوہان روح جرم کا اقدام تم کو کرنا ہوگا۔ یعنی ہم دونوں میں تم کو ایک کو منتخب کرنا پڑیگا جس کے ساتھ تم اپنی باقی زندگی گزارنی چاہو۔ اور دوسرے کو قتل کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد پھر ایک مرتبہ خوفناک خاموشی طاری ہو گئی۔ ہیرا کے جسم میں حرکت کا نام نہ تھا۔ ہرمز پڑا دوسری کرسی پر کانپ رہا تھا۔ اس خاموشی میں پھر وہی بارعب آواز گونجی۔

"میں ہر ممکن انتظام کر آیا ہوں۔ اس پستول پر خاموش کن چڑھا ہے۔ اس سے مطلق کوئی آواز نہیں نکل سکتی۔"

یہ کہکر اُس نے ہیرا کے ساکت ہاتھوں میں پستول دیدیا۔ اور تحکمانہ لہجہ میں بولا۔

"دیر نہ کرو۔ اس کی آواز کوئی نہ سنیگا۔ باہر میری موٹر کار کھڑی ہے۔ جو ہرمز کی کار سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہے جس میں تم سوار ہو کر فی الفور واپس جا سکتی ہو۔ پولیس کی دستبرد سے نہایت آسانی سے بچ سکتی ہو۔ آج ہی ایک جہاز جانے والا ہے۔ دو نشستیں میں نے لے چھوڑی ہیں۔ روپیہ کا بھی کافی انتظام کر دیا ہے۔ جو تمہاری ہر ممکن ضرورت کو رفع کرنے کے لئے کفایت کر سکتا ہے۔ یہ سب سہولتیں تمہارے لئے پیشتر ہی بہم پہنچا دی گئی ہیں۔"

اُس نے بائیں ہاتھ سے نوٹوں کی دو بڑی بڑی گڈیاں نکال کر زمین پر پھینکدیں اور کہا۔ "میری تمام عمر کی کمائی پڑی ہے کچھ کم لاکھ کے نوٹ ہیں۔"

یہ کہکر وہ خاموش ہو گیا۔ اور ہیرا کی جانب امیدوارانہ انداز سے دیکھنے لگا۔ عالمِ بے اختیاری میں اُس نے پھر وہی کہا جو بار بار کہہ چکا تھا۔ یعنی

"جب تم اس شخص کے ساتھ جس کو تم منتخب کر لو یہاں سے چلنا چاہو گی تو باہر موٹر کار موجود ہے۔ کسی کو خبر نہیں ہو سکتی گرفتاری حدِ امکان سے باہر ہو گی۔ انتخاب تمہاری اپنی مرضی پر منحصر ہے۔"

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ اور پیکرِ انتظار بنکر ہیرا کے چہرہ اور

ہاتھوں کو تکنے لگا۔

ہرمز نے نہایت ہی خوفزدہ حالت میں بھرائی ہوئی آواز پہلی مرتبہ نکالی۔ ہیرا۔ یہ دیوانہ یہ پاگل .... اس سے بچ نکلنے کے لئے جلدی کچھ کرو۔ اور اس سے پہلے کہ یہ مجھ پر گولی چلائے اس کا خاتمہ کر دو۔

خوف کے مارے وہ کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز چیخ سے مبدل ہو گئی تھی۔ اس کی تمام جسارت کافور ہو چکی تھی۔ گو وہ تن و توش میں جمشید سے زیادہ توانا معلوم ہوتا تھا لیکن وہ محض شیر قالین نکلا۔ اس وقت وہ اپنی جان بچانے کے لئے ایک عورت کے نازک ہاتھوں پر انحصار کئے بیٹھا تھا۔

جمشید حسرت آمیز لہجہ میں پھر بولا " ہیرا اٹھو تم نشانہ نہایت صحیح لگاتی ہو۔ میں نے آج ہی کے دن کے واسطے تمہیں سکھایا تھا۔"

ہیرا کھڑی ہو گئی۔ کاٹو تو خون نہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ ہر عضو بدن سے جان نکل چکی تھی۔ صرف آنکھوں میں زندگی کی روشنی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں جمشید کے چہرہ سے اٹھ نہ سکتی تھیں۔ " کیا تمہارا یہی مطلب ہے جو تم نے کہا " ہیرا بولی کیا میں نے کبھی کوئی ایسی بات آج تک زبان سے نکالی ہے۔ جو میں دل سے نہ چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں تجربہ نہیں کہ میرا ظاہر ہمیشہ میرے باطن سے مطابقت رکھتا ہے۔" جمشید نے جواب دیا۔

" لیکن میں تو ہرگز ایسا نہ کرونگی " وہ نہایت ہی کوشش سے بولی۔

" تم کو ایسا کرنا ہوگا " جمشید کا جواب تھا۔ ہیرا نے اتنی جرأت نہ پائی کہ ان خشمگیں الفاظ کے خلاف کر سکے۔

" آگے بڑھو انتخاب کرو۔ پھر نشانہ لگاؤ۔ آنکھوں کے درمیان کا حصہ بہترین جگہ ہے۔ اس پر نشانہ پڑنے کے بعد جانبری مشکل ہوتی ہے۔"

بزدل ہرمز پھر کانپتا ہوا بولا۔ " ہیرا تم جانتی ہو۔ مجھے تم سے انتہائی الفت ہے۔ دنیا میں کوئی شے ....

پھر انتہائی کوشش سے اس نے کہا۔

" خدا کے لئے ہیرا مجھے بچاؤ۔ یہ دیوانہ ہے۔" جمشید بالکل خاموش تھا۔ مگر اس کی آنکھیں ہیرا کے ہاتھ پر تھیں۔

ہیرا نے ہرمز کی طرف دیکھا۔ اور اس کی آنکھیں ایک روشنی سے منور ہو گئیں۔ ہرمز کی بزدلانہ حرکت سے یکایک ہیرا کا دل اس سے حد درجہ متنفر ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو دبایا۔ اور پستول اس کی طرف پھرانے لگی۔

خدا کے لئے ہیرا۔ ہرمز نے چیخنے کی کوشش کی۔

" مجھے مت مارو " مجھ پر رحم کرو۔ یہ کہہ کر وہ جمشید کے قدموں پر گر پڑا۔ " خدا کے لئے مجھے یہاں سے نکالو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ کہ آئندہ تمہاری بیوی کی طرف آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھونگا۔"

جمشید نے اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور نہایت آہستگی سے بولا۔ " یہ فیصلہ صرف ہیرا کریگی۔ کہ وہ کس کو

قتل کرے اور کس کے ساتھ باقی عمر بسر کرے۔" ہیرا جلدی کرو"

جمشید کے یہ الفاظ سنکر ہیرا کے ہاتھ میں پھر حرکت محسوس ہوئی اور پستول کا رُخ پھر ہرمز کی طرف کر دیا گیا۔ گویہ دونوں اس کی نازک اُنگلی کے اشارہ پر اپنی قسمتوں کو منحصر کئے۔ اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر ہرمز کی رحم کی متلاشی آنکھیں بزبانِ حال سے درخواست کر رہی تھیں۔ اور مارے خوف کے بند ہو رہی تھیں۔

جمشید نے دوسرا پستول سنبھالا۔ لیکن اس طرح کہ اُن دونوں میں سے کوئی بھی اُس کو نہ دیکھ سکا۔

ہیرا کے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ لیکن تغیرِ رنگ عزم کے بدل دینے کا پتہ بھی دیتا تھا۔ ہرمز کی جان لینے کا خیال معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کے دل سے نکل گیا تھا۔ وہ کسی دوسرے کی جان لینا نہیں چاہتی تھی۔

جمشید اُس کی کیفیات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکایک ہیرا نے پستول اپنے سینے کی طرف موڑا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں لیکن اس سے پہلے کہ اس کی انگلیاں اُسکے دلی ارادہ کی تکمیل کے لئے ہلیں۔ جمشید کے پستول کی آواز آئی۔ لیکن نہایت آہستہ۔ ہیرا کے ہاتھ سے اس کا پستول زمین پر گر پڑا۔ اور ساتھ ہی وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ کچھ دیر کے بعد اُس کی آنکھیں کھلیں مگر پھر بند ہو گئیں۔

جمشید نے اپنا پستول میز پر رکھا اور ہرمز سے کہا۔

"وہ اپنے امتحان میں کامیاب نکلی۔ مگر تم ناکام رہے۔ جاؤ نکل جاؤ۔ اور اپنی ذلیل زندگی کو قعرِ مذلت میں غرق کر دو۔"

ہرمز یہ سُنتے ہی باہر کی طرف بھاگا۔ جمشید نے ہیرا کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ہیرا نے آنکھیں کھول دیں۔ جو بہت دیر تک جمشید کے چہرے پر جمی رہیں۔

"تم نے مجھے مرنے نہ دیا۔ ظلم کیا۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ جمشید نے جواب دیا۔ کہ میرا یہ مقصد ہرگز نہ تھا میں مدت سے اس کی مشق کر رہا تھا۔ کہ کسی دوسرے کے ہاتھ پستول دیکر اس پر اس طرح نشانہ لگاؤں۔ کہ وہ شخص محفوظ رہے۔ اور پستول بیکار ہو جائے۔

مجھے یہ خوفناک رویہ تمہیں بیدار کرنے کے لئے اختیار کرنا پڑا۔ ہیرا کو لمبے لمبے سانس آنے لگے۔ اس کا چہرہ اُس کے چہرہ کے اور زیادہ قریب ہوا اُسنے نہایت ہی آہستہ لہجہ میں یہ الفاظ کہے۔

"میں اندھی ہو گئی تھی۔ میں نے اتنی۔ . . . کیا میں معاف . . . .

"ہاں ہاں مجھے تم سے انتہائی محبت ہے۔

پھر ہیرا نے آنکھیں بند کر لیں اور جمشید کے آغوش میں بیہوش ہو گئی۔

رمزی

فرہاد

(وادیٔ بے ستوں میں)

وہ گرفتارِ بلائے عشق، وہ شیدائے یار
بے ستوں کی وادیوں میں پھر رہا ہے بیقرار

ہے فضائے بے ستوں جولانگۂ ابرِ مطیر
جھومتے پھرتے ہیں بادل ہر طرف مستانہ وار

دے رہی ہے دعوتِ مدہوشی و خود رفتگی
بن رہی ہے کیف افزا آجکل موجِ بہار

چپہ چپہ ہے سراپا مظہرِ جوشِ نمو
پتہ پتہ ہے عروسِ نامیہ کا تاجدار

قطرہ قطرہ بن رہا ہے بیخودِ صہبائے لطف
ذرہ ذرہ ہو رہا ہے سرخوشِ کیفِ بہار

گونج اٹھی ہے ترنم سے فضائے آسماں
طائرانِ خوش نوا ہیں نغمہ سنجانِ بہار

اہلِ بینش کی نظر کو مژدۂ نظارگی
یعنی تا حدِ نظر پھیلا ہوا ہے سبزہ زار

وجد میں لاتی ہے دِل کو ہر صدائے لطف خیز
رُوح پرور، دِل کشا ہے نغمہ زارِ آبشار

ہے ہر اک ذی رُوح اس دم بیخودِ کیفِ طرب
کر رہا ہے سجدۂ شکرِ خدا مستانہ وار

یہ بہارِ رُوح افزا، مایۂ عیش و نشاط
اہلِ دِل کے واسطے ہے عشق کی سرمایہ دار

ہے مقدر جن کا یاور، جن کی قسمت ہے جواں
اُن کے دل ہیں آجکل لذت کشِ کیفِ بہار

وہ مگر مایوسِ عشرت ہاتھ میں تیشہ لئے
ایک سنگِ سخت پر بیٹھا ہوا ہے سوگوار

جسم ہے اُس کا سراپا مظہرِ رنج و الم
حسرتِ دل کی جبینِ شوق ہے آئینہ دار

کوئی مونس ہے، نہ ہمدم ہے، نہ ہے کوئی رفیق
اِک خیالِ یار ہے ہر وقت اس کا غمگسار

شوق میں جھکتی ہے پتھر پر کبھی اس کی جبیں
سر اُٹھاتا ہے کبھی سجدہ سے ہو کر بیقرار

یاس میں ڈوبی ہوئی اس کی نگاہِ شوق ہے / دیکھتا ہے ہر طرف حسرت سے وہ دیوانہ وار
دل سے کہتا ہے کبھی، اے دشمنِ جانِ حزیں! / اِک گھڑی دم لے ٹھہر، کیوں اسقدر ہے بیقرار
وصلِ شیریں لاکھ ہو دشوار، ناممکن نہیں / چند روزہ اور ہے یہ گردشِ لیل و نہار
کٹ چکا ہے بیستوں، تھوڑی سی ہمت اور بھی / اُٹھ، کمر کو باندھ، تا کہ جلد ہو تو کامگار
دل کو یوں سمجھا بجھا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے وہ / اور ہو جاتا ہے تیشہ تول کر مصروفِ کار

شاد ہے وہ اپنے دل میں وصل کی امید سے / اس کو کیا معلوم، کیا ہے مرضیِ پروردگار
ناگہاں آتی ہے گھبرائی ہوئی اِک پیرزن / اور دیتی ہے پیامِ مرگ ہو کر بیقرار
یعنی کہتی ہے کہ اے دلدادۂ مہر و وفا! / آہ! وہ شیریں ادا، وہ دلربا، وہ گلعذار
حسن کا جس کے ہے تیرا قلبِ مضطر آئینہ / یاد نے جس کی بنا رکھا ہے تجھ کو بیقرار
چل بسی وہ آج دنیا سے سوئے قصرِ جناں / وا اسے بے خبر! ہے کس لئے مصروفِ کار
سن کے اُس مکار زن کا یہ پیامِ جاں گداز / مار لیتا ہے یکایک سر میں تیشہ دلفگار

سچ ہے اہلِ مدعا ہونا مصیبت ہے بڑی / کوئی دنیا میں نہ ہو یارب کبھی امیدوار
آرزومندی سے اچھا ہے دلِ بے آرزو / آرزومندی میں دل رہتا ہے وقفِ اضطرار
آرزو ہے دشمنِ دل، دشمنِ جانِ حزیں / آرزو رکھتی ہے انساں کو ہمیشہ دلفگار
زندگی کے چار دن ہیں آرزو کے چار حرف / زندگی بھر آرزو رکھتی ہے دل کو بیقرار

ہے مبارک وہ کہ جو ہے بے نیازِ آرزو
ہے مبارک اُس کا جینا جو نہیں امیدوار

سیّد رازؔ

امریکن بیوی

نواب چھٹن صاحب خاندانی رئیس تھے۔ دھن دولت، روپیہ پیسہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ اُن کے باپ تھے تو پُرانی روش کے آدمی، لیکن زمانہ شناس بھی پرلے سرے کے تھے۔ وہ نوابوں کی طرح صرف ظاہری شان و شوکت میں روپیہ برباد نہ کرتے تھے۔ بلکہ بے ضرورت خرچ کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے بیٹے کو پڑھایا لکھایا، انگریزی کی انتہائی تعلیم دلا کر بیرسٹری پاس کرنے کی نیت سے انگلستان بھیجدیا۔

چھٹن صاحب انگلستان سے مع الخیر واپس آگئے مگر گئے تھے ہندوستانی قالب میں، وہاں سے آئے صاحب بن کر۔ نوابی شان و شوکت کا سودا اُن کے دماغ میں نہ تھا لیکن صاحبیت کی خو بو ضرور تھی۔ دو منزلہ سہ منزلہ مکان کے بجائے اُنہوں نے ایک بنگلہ میں سکونت اختیار کی۔ ہندوستانی کپڑوں اچکن اور پاتجامہ کے بجائے سوٹوں کی کثرت سے کئی بکس بھر گئے۔ قیمتی ہلکی فٹن اور سائیس کے بجائے موٹر اور شوفر آگئے۔ غرض اُن کی معاشرت بڑی حد تک انگریزی تھی۔ وہ تو خیریت یہ تھی کہ باپ نے پیش بینی کرکے انگلستان بھیجنے سے قبل ہی چھٹن صاحب کی شادی کر دی تھی۔ ورنہ صاحبیت کی تکمیل ہو جاتی۔ اور انگلستان سے دیگر سامانوں کے ساتھ ساتھ سایہ سنبھالتی ہوئی ایک سیمیں بدن، اور حور وش بھی ساتھ آتی۔

چھٹن صاحب آدمی تیز تھے۔ طبیعت بھی رسا پائی تھی۔ قانون کو خوب سمجھتے تھے۔ اور محنت سے جی نہ چراتے تھے۔ اتنی خوبیاں جمع ہونے پر بھی اگر وہ اپنے پیشہ میں ناکام رہتے تو تعجب تھا۔

ان کی معاشرت بالکل انگریزی تھی۔ لیکن صرف ایک حد تک۔ بدقسمتی سے ان کو بیوی ملی تھیں مسلمان۔ وہ خود میاں کے حدود مملکت میں دخل نہ دیتی تھیں۔ لیکن زنانخانہ میں میاں کی ذرا بھی دال نہ گلنے دیتیں۔ جو حصہ زنانخانہ سے متعلق تھا بالکل ہندوستانی مذاق کے موافق آراستہ تھا۔ گھر ایک تھا۔ میاں بیوی ایک تھے مگر طبیعتیں جداگانہ تھیں۔ اس لئے مکان کا ایک حصہ دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ بیرونی حصہ فرنگی مآب تھا، اور اندرونی حصہ ہندی تھا۔

(۲)

بنگلہ کی یہ قطع چھٹن صاحب کو بُری تو ضرور معلوم ہوتی تھی لیکن اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ نہ بیوی فرنگن بننا چاہتی تھیں، نہ میاں ہندوستانی۔ اس طرح میاں بیوی عرصہ تک

بسر کرتے رہے۔ ایک سال بیوی کو ہیضہ ہوا اور باوجود ڈاکٹروں کی انتہائی کوششوں کے کسی طرح جانبر نہ ہو سکیں چھٹن صاحب کو بیوی کی موت پر افسوس تو ضرور ہوا۔ لیکن خدا کی مرضی میں چارہ ہی کیا تھا؛ صبر کر کے بیٹھ رہے۔

لیکن آدمی جوان تھے۔ بیوی کو مرے ابھی سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ چاروں طرف سے نکاح ثانی کے تقاضے ہونے لگے چھٹن صاحب نے ماں باپ، بھائی بہن دوست آشنا سب کو نفی میں جواب دیا۔ وہ شادی کے خلاف نہ تھے لیکن وہ اب پھر کسی ہندوستانی عورت سے جو ان کی طبیعت سے کوئی نسبت نہ رکھتی ہو شادی نہ کرنا چاہتے تھے خاندان کے بڑے بوڑھوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ اب ان کا ارادہ غیر ملک کی عورت سے شادی کرنے کا ہے۔ تو ان لوگوں نے بہت شور و غل مچایا۔ دلائل و براہین سے چھٹن صاحب کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن شاید چھٹن صاحب اپنا تمام استقلال اسی موقع پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی رائے پر قائم رہے۔

خاندان والے اپنی اپنی کوششیں کر کے خاموش ہو رہے۔ ہمارے فرنگی نما ہندوستانی بیرسٹر نے اس عرصہ میں بہت کفایت شعاری سے کام لیا تھا۔ اور بہت کچھ روپیہ پس انداز کر لیا تھا۔

جب روپیہ جمع ہو گیا تو دیر کس بات کی تھی؛ چھٹن صاحب نے نئی دنیا کا قصد کیا کہ وہاں چلکر اس عورت سے شادی کرونگا جو انتہا درجہ کی مالدار اور خوبصورت ہو۔

غرض دو چار ماہ اور گزر گئے سامان سفر درست کیا گیا۔ اور بیوی کے مرنے کے ٹھیک دو برس بعد چھٹن صاحب عازم امریکہ ہوئے۔

(۳)

کچھ دن تک چھٹن صاحب، امریکہ کی شاندار اور بلند عمارتوں، لائبریریوں، چھاپہ خانوں اور کارخانوں کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد وہ اُس بازار میں گئے۔ جہاں ان کو محبت کا سودا کرنا مقصود تھا۔ اُنہوں نے سوسائٹی میں رہنے جلنے کے نئے طریقے اختیار کئے۔ وہ لوگوں کو دعوتیں دیتے مہمان بلاتے ان کو ہندوستان کے رسوم و رواج بتاتے غرض ہر طرح وہ اس طبقہ میں اپنا رسوخ بڑھاتے جس میں سے انہیں اپنی رفیق زندگی کی تلاش تھی۔

چھٹن صاحب، دوسروں کی دعوتوں میں شرکت کرتے حور وش دوشیزہ لڑکیوں سے ہاتھ ملاتے، سیمیں بدن، اور نازک نازک مسوں کے گلے، کمر اور بغلوں میں ہاتھ ڈال کر رقص کرتے۔ دعوتوں میں شراب کا بھی دور چلتا۔ اور چھٹن صاحب اس خیال سے کہ یہاں کا یہی دستور ہے۔ خود بھی مے نوشی جائز سمجھ لیتے۔ وہ تھیٹر میں مسوں کا ساتھ دیتے۔ اور بائیسکوپ کی اعلیٰ سے اعلیٰ کمپنیوں کے تماشوں میں شریک ہوتے۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھٹن صاحب کی نسبت یہ مشہور ہونے لگا کہ یہ کوئی ہندوستانی نواب یا رئیس ہیں۔ جو محض تفریح کی خاطر امریکہ آئے ہوئے ہیں۔

چھٹن صاحب نے اس عرصہ میں ایک حسین اور دولتمند عورت مس مارتھا کو منتخب کیا۔ اور اپنی جگہ پر یہ منصوبہ باندھا کہ اگر اُس نے منظور کیا۔ تو ہم لوگ بہت جلد ایک دوسرے سے عقد کر لینگے۔

(۴)

امریکہ کی عورتیں ہندوستانی اور خاصکر مسلمان عورتوں کی طرح بیکار زندگی نہیں بسر کرتیں۔ وہ تجارت اور ملازمت کے علاوہ کارخانوں میں بھی کام کرتی ہیں۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اگر مردوں سے زیادہ نہیں تو ان سکے بماجھ ترقی کئے ہوئے ہیں۔

مس مارتھا بہت بڑی تاجرہ تھی۔ اس کے خود کئی کارخانے تھے۔ ایک بہت بڑا پریس تھا۔ وہ مختلف کمپنیوں کی ڈائرکٹرس تھی۔ اور کئی بینکوں سے اُس کا لین دین تھا۔ اس کی مجموعی ماہانہ آمدنی پندرہ بیس ہزار ڈالر سے کم نہ تھی چھٹن صاحب کا انتخاب اس لحاظ سے ضرور اچھا تھا کہ مس مارتھا حسین تھی، دولتمند تھی اور نہایت آزاد خیال۔

مس مارتھا نے چھٹن صاحب کو اس بات کا بہت کم موقع دیا۔ کہ وہ اظہارِ الفت کر سکتے۔ لیکن وہ ان سے بظاہر نہایت اخلاق سے پیش آتی۔ اور انتہائی مصروفیتوں کے باوجود چھٹن صاحب کو اُس کی ملاقات نصیب ہو جایا کرتی۔

ایک دن مس مارتھا نے چھٹن صاحب کو اپنے کارخانے وغیرہ دکھلانے کی اجازت مانگی چھٹن صاحب فوراً راضی ہو گئے۔ دوسرے دِن مقررہ وقت پر یہ ایک کارخانے میں پُہنچے۔ اور وہاں کی شان شوکت، چہل پہل دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

مس مارتھا ایک چاندی کی کُرسی پر بیٹھی تھی۔ داروغۂ عام اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ احکام صادر کرتی جاتی تھی۔ وہ ان کو دماغ میں محفوظ رکھتا جاتا تھا۔ قریب ہی دو تین محرّر بیٹھے ہوئے، اُن خطوط کو چھانٹ رہے تھے۔ جو نہایت ضروری تھے۔ اور جو مالکہ کے روبرو پیش ہونے کو تھے۔ ایک منشی صرف ٹیلیفون پر مامور تھا۔ اس غریب کی حالت بہت خراب تھی۔ کیونکہ ہر لحہ اس کو غیر معلوم لوگوں سے بات چیت کرنی پڑتی تھی۔

(۵)

مس مارتھا نے چھٹن صاحب کو تمام کارخانے وغیرہ دکھلائے۔ اپنی آمدنی کا حساب بتایا۔ اور اپنے نوکروں کی فہرست دکھا کر کہنے لگی۔ "کیا ہندوستان میں بھی لوگ اتنی ہی محنت کرتے ہیں جتنی ہم لوگ کرتے ہیں؟" چھٹن صاحب نے کہا۔ "نہیں ہندوستانی لوگ محنت سے جی چُراتے ہیں

اور اسی وجہ سے افلاس کا شکار بنے ہوئے ہیں۔"

غرض ایک دن موقعہ پاکر چھٹن صاحب نے اُس سے اپنا سارا دردِ دل کہہ سُنایا۔ اور شادی کی درخواست کی

مس مارتھا نے چھٹن صاحب کو ایک خاص انداز سے دیکھا اور بولی۔ "مسٹر چھٹن! آپکے طرز و برتاؤ سے میں سمجھ گئی تھی کہ آپ شادی کا جھگڑا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے میں نے مختلف طریقوں سے آپ پر یہ ظاہر کر دینا چاہا تھا۔ کہ آپ اس خیال کو چھوڑ دیں۔ آپ لوگ اُس دُنیا کے رہنے والے ہیں۔ جو قدامت پرست ہے۔ نئی دُنیا کے حالات سے آپ کو واقفیت نہیں۔ نہ آپ وقت کی قدر کر سکتے ہیں نہ روپیہ کی۔ میں ایک بات آپ کو بتاتی ہوں۔ جس سے شاید آئندہ بھی آپ کو فایدہ پہنچے۔ کبھی اس کا خیال بھی نہ کیجئے گا کہ نئی دُنیا کی کوئی عورت محض شکل و صورت پر ریجھ سکتی ہے یہاں عورتیں بالکل آزاد ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اُلفت و محبت محض ڈھکوسلا ہیں۔ مرد خود غرضی سے عورتوں کو اپنے دام میں پھانستے ہیں۔ اگر کوئی چیز عورتوں کو تاہل کا بار اُٹھانے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ تو وہ دولت ہے آپ دیکھتے ہونگے کہ اکثر حسین جمیل لڑکیاں بُوڑھے بدصورتوں سے شادی کر لیتی ہیں اس کی وجہ کیا یہ ہوتی ہے کہ وہ اُن سے محبت کرتی ہیں؟ نہیں بلکہ وہ ان کی دولت سے محبت کرتی ہیں۔

"مسٹر چھٹن! دولت، امریکہ کے مردوں، عورتوں، دونوں کا خدا ہے۔ اور وہ اسی کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس دولت ہے تو آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ورنہ کچھ نہیں اگر آپ کی آمدنی چالیس ہزار ڈالر ہوتی تو مجھ کو آپ سے شادی کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔ لیکن آپ کاہلی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ آپ کے لئے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی ریاست کافی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ کوئی اور صورت اختیار کریں۔"

چھٹن صاحب اس تقریر کو غور سے سُنتے رہے خاتمہ پر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "مس مارتھا میں تہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے مجھ کو میری غلطی سے آگاہ کر دیا۔ اور میری آنکھوں پر سے ایک پردہ ہٹا دیا۔ آپ یقین رکھئے کہ اب میں کسی امریکن عورت کو شادی کا پیغام نہ دُونگا۔ ہم لوگ واقعی پُرانی دُنیا کے رہنے والے ہیں۔ قدامت پرستی ہمارے خمیر میں داخل ہے۔ لیکن ہم دولت کی پرستش نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں دولت کی بنا پر آدمی رذیل سے شریف نہیں بن سکتا۔ ہمارے ہاں کا اصول تو یہ ہے کہ مرد و عورت شادی کے بعد ایک دوسرے کی پرستش کریں اور اس طرح زندگی بسر کریں۔ گویا ایک جان دو قالب ہیں۔"

یہ کہکر چھٹن صاحب نے مس مارتھا سے ہاتھ ملایا۔ اور اُس سے رُخصت ہو گئے۔ تیسرے دن اُنہوں نے نئی دُنیا کو وداع کہا اور پھر ہندوستان واپس آ گئے۔ (ماخوذ)

عالی

عید اور شوہر کی یاد

وہی پارسال کے دن وہی پُوربی ہوائیں
وہی عید کا زمانہ وہی رُت وہی گھٹائیں

وہی زور بجلیوں کا وہی شور بادلوں کے
بچھے جا بجا زمیں پر ہرے فرش مخملوں کے

وہی بلبلوں کے نغمے وہی کویلوں کی کوکو
وہی جوہی اور چنبیلی وہی بھینی بھینی خوشبو

وہی غمزدہ پپیہا وہی "پی کہاں" کے نالے
وہی ادھ کھلی سی کلیاں وہی بھونرے کالے کالے

وہی سرو اور اُس کی عادت کہ کبھی پھلے نہ پُھولے
وہی باغ اور اُس میں وہی لڑکیوں نے جھولے

وہی بھولی بھولی شکلیں وہی وضع سیدھی سادھی
کوئی پانچ گز کی ساری بندھی آدھی اوڑھے آدھی

وہی نور کے گلے ہیں وہی رس بھری ہیں تانیں
وہی گیت چھوٹے چھوٹے شب غم کی داستانیں

وہی اُن کے قہقہے بھی وہی کُودنا اُچھلنا
وہ پھسل پھسل کے گرنا وہ پھر اٹھتے ہی پھسلنا

وہی پھوار ہلکی ہلکی کہ یونہی سی نم زمیں ہو
ہے سماں غرض وہی سب مگر ایک تم نہیں ہو

مجھے یاد ہے بخوبی گئے سال تم یہیں تھے
مرے بھولے بھالے جی کو یہ ہزار غم نہیں تھے

سر شام وہ تمہارا مجھے صحن میں بُلانا
یہی چاند عید کا پھر بڑے شوق سے دکھانا

مرا بار بار کہنا کہ "کدھر کو ہے کہاں ہے"
کبھی اپنی آنکھیں ملنا کہ "یہاں بہت دھواں ہے"

بڑی دیر تک تمہارا پتے نت نئے بتانا
مگر آ کے تنگ آخر وہ ذرا بگڑ سا جانا

مرا قہقہہ لگانا تُمہیں اس طرح ستا کر
وہ تمہارا جھینپ جانا مرے مدعا کو پا کر

مگر اب جو تم نہیں ہو تو خوشی میں کیا مناؤں
یہ بتا دو عید کے دن میں تمہیں کہاں سے لاؤں

مجھے بیوقوف پاگل کوئی لاکھ بار کہہ لے
مری اس میں کیا خطا ہے جو یہ دل کہیں نہ بہلے

تمہیں جب نہیں تو کیونکر ہو مری نجات غم سے
مری عید اور خوشی سب ہے فقط تمہارے دم سے

تمہیں دل کی آرزو ہو تمہیں دل کا مدعا ہو
مرا خاک جی لگے پھر تمہیں مجھ سے جب جدا ہو

یہ خبر تو کب ہے مجھ کو کہ کشش وہ کیا ہے تم میں
مگر اتنا جانتی ہوں مرا جی پڑا ہے تم میں

(ڈاکٹر) سعید

آخری ارمان

مارس لیبلانک کے ایک افسانے جیوش لیمپ کا ترجمہ

پہلا باب

(۱)

شرلاک ہومس کے مکان کی نشست گاہ میں آتشدان کے سامنے شرلاک ہومس اور ولسن روبرو بیٹھے تھے۔

اس زبردست سراغرساں کا پائپ ختم ہوچکا تھا ۔ اس نے قریبی طاق پر جلی ہوئی تمباکو کی راکھ جھاڑی۔ ۔ ۔ اور اسے از سر نو بھر کر دیا سلائی سے سلگایا۔ اپنے بھاری لبادہ کے دامن لپیٹ کر گھٹنوں پر ڈالے۔ اور بڑے مزے کے ساتھ دھوئیں کے ان حلقوں پر توجہ کرنی شروع کردی جو خوبصورتی کے ساتھ چکردار حلقے بناتے ہوئے چھت کی طرف اٹھ اٹھ کر غائب ہو رہے تھے۔

ولسن یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کی مثال اس وقت ایک ایسے وفادار کتے کی تھی۔ جو نہ جھپکنے والی پلکوں سے اپنے مالک کی ہر حرکت کو بغور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہو۔ اور جس کی ساری توجہ صرف اپنے آقا کے اشارہ پر لگی ہو۔ کاش کہ شرلاک ہی اس خاموشی کا قفل توڑتا۔۔ ؟ کاش وہ اپنے اس گہرے انہماک کا راز ولسن پر ظاہر کرتا۔ آخر وہ کونسا خوشگوار و پرلطف خیال تھا جس میں شرلاک اس درجہ منہمک تھا کہ اس نے ولسن کو بھی شریک بنانا گوارا نہ کیا۔

شرلاک بدستور خاموش رہا۔

ولسن نے خود ہی گفتگو چھیڑی۔

"آجکل معاملات بالکل سرد ہیں۔ کوئی بھی مقدمہ ایسا نہیں جس میں ذرا کارروائی کے لئے ہاتھ پیر ہلانا پڑیں۔"

شرلاک پھر بھی خاموش رہا۔ اور اس کی خاموشی بے حد تکلیف دہ معلوم ہونے لگی۔ دھوئیں کے حلقے اب زیادہ گنجان ہوکر بھکا بھک ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ ولسن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس وقت شرلاک اپنی تمباکو نوشی سے وہی پرلطف سرور حاصل کر رہا ہے جو انسان کو صرف ان مواقع پر حاصل ہوتا ہے۔ جب ان کے دماغ ہر قسم کے تفکرات سے پاک ہوتے ہیں۔

اذیت دہ خاموشی سے گھبرا کر ولسن کھڑکی کی طرف بڑھا۔ باہر سڑک پر مکان کا غم انگیز چھجا اور سیاہ بادلوں سے گھرا آسمان دکھائی دیا۔ موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ یکایک سڑک پر ایک گاڑی گزری۔ اس کے بعد دوسری۔ ولسن نے جھٹ سے نوٹ بک نکال کر ان دونوں کے نمبر لکھ لئے۔ کوئی اس مرد آدمی سے سوال کر بیٹھتا کہ آخر یہ کیوں لکھے تو وہ کیا جواب دیتا۔

عین اسی وقت دروازہ پر ہرکارہ نے دستک دی اور اس کے ذرا ہی دیر بعد دو رجسٹری شدہ لفافے لیکر اندر داخل ہوا۔

جب شرلاک ان میں سے ایک کو کھولکر اسکی عبارت پڑھ چکا تو ولسن نے سوال کیا۔ "آخاہ آپ تو بہت خوش نظر آتے ہیں۔"

"اس میں ایک بہت ہی دل خوش کن تجویز ہے ابھی تم مقدمہ کے لئے رو رہے تھے۔ یہ لو خود ہی آگیا۔ لو پڑھ لو۔"

ولسن نے خط لیا۔ اور پڑھنے لگا۔ یہ عبارت نظر آئی۔

۱۸۔ رو مریلو۔ شہر پیرس

مہربانم

میں یہ تحریر صرف جناب کے تجربہ و امداد سے فایدہ اُٹھانے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ میرے یہاں ایک زبردست چوری کی واردات ہوگئی ہے۔ اور اس وقت تک جو کچھ بھی تفتیش و تحقیقات کی گئی اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سب بے سود ثابت ہوگی۔

میں اس ڈاک کیساتھ آپ کو چند اخبارات کے پرچے بھی روانہ کر رہا ہوں۔ جن کے مطالعہ سے آپ کو اس قصّہ کے مفصل واقعات معلوم ہونگے۔ اب اگر آپ اس کو اپنے ہاتھ میں لینا پسند کریں تو میں بہت خوشی سے اپنے مکان پر جناب کا انتظار و خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مزید برآں آپ منسلکہ چک پر جتنی رقم چاہیں اپنے ہاتھ سے تحریر کر دیں۔ بلا تامل آپ کے اخراجات کیلئے روانہ خدمت کیجائیگی۔ براہ عنایت بذریعہ تار اطلاع دیجئے۔ کیا میں آپکی تشریف آوری کا انتظار کروں

میں ہوں جناب کا سچا بہی خواہ و خیر اندیش

بیرن وکٹر ڈی امبلی وبل"

"بھئی واہ" شرلاک بولا۔ "یہ آیا بڑے موقعہ سے۔ لاؤ۔ کیوں نہ پیرس کا ایک اور چکر لگاؤں۔ میں آرسین لوپن کے مشہور مقابلہ کے بعد سے آجتک گیا بھی نہیں۔ یہ عمدہ موقعہ ہے۔ کہ میں ذرا ٹھنڈے دل سے پیرس کو بھی اچھی طرح دیکھ لوں گا

یہ کہتے ہوئے اس نے چک کو چاک کر کے چار ٹکڑے کر دیا۔ اس طرف ولسن جس کے شانہ کا زخم جو مذکورہ بالا مقابلہ میں اُسے پہنچا تھا۔ ہنوز اچھا نہیں ہوا تھا۔ پیرس اور

پیرس کے رہنے والوں پر چار حرف بھیجتا تھا۔
شرلاک نے جھلا کر دوسرا لفافہ کھولا۔
یکایک غصّہ کی چیخ اُس کے لبوں سے نکلی۔ اور جس وقت اُس نے خط پڑھنا شروع کیا۔ بھویں تن گئیں۔ اور جب وہ ختم کر چکا۔ تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے مکڑا سی بتی سی بنا دی اور غصّہ سے زمین پر پھینک دیا۔
"ارے۔ ہائیں۔ کیا معاملہ ہے؟" ولسن نے تعجب سے پوچھا۔
اُس نے وہ گولی اٹھائی اور انتہائے حیرت کیساتھ اُسے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ عبارت یہ تھی۔
مکرم بندہ
آپ کو خوب معلوم ہے کہ میں آپ کا کیسا زبردست مداح اور آپ کی شہرت کا کس درجہ بہی خواہ ہوں۔ لہٰذا اگر آپ میری صلاح دوستانہ قبول فرمائیں تو میں یہ عرض کرونگا کہ آپ اس معاملہ میں دست اندازی نہ کریں جس میں آپ سے امداد کی درخواست کی گئی ہے۔ آپ کی مداخلت سے سخت نقصان واقع ہوگا۔ اور آپ کی تمام کوششوں کا حسرتناک نتیجہ نکلیگا۔ اور جناب کو لامحالہ علی الاعلان اپنی شکست کا اقرار کرنا پڑیگا۔ میری دلی خواہش ہے۔ کہ آپ اس ذلت سے محفوظ رہیں۔ اور میں اس خلوصِ دوستی کی بنا پر آپ سے استدعا کرتا ہوں۔ کہ آپ اپنی آگ کی گرمی کو چھوڑ کر ناحق دردسر مول لیں۔

ذرا ڈاکٹر واٹسن صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ اور آپ بھی آداب نیاز قبول فرمائیے۔
آپ کا خیر سگال دوست
آرسین لوپن
"آر۔ سین۔ لوپن" ولسن نے بوکھلا کر۔ اٹکتے ہوئے اعادہ کیا۔
شرلاک نے میز پر مٹھیاں دے ماریں۔
"اوہ۔ میں اس ظالم سے سخت تنگ آگیا ہوں۔ وہ میرا مضحکہ اس طرح اڑاتا ہے۔ گویا کسی مدرسے کے لونڈے سے مذاق کر رہا ہو۔ اُف میں اور علی الاعلان اپنی شکست کا اعتراف کروں۔ کیا میں وہی شرلاک ہومس نہیں۔ جس نے اُسے نیلگوں ہیرا واپس کرنے پر مجبور کر دیا۔"
"وہ آپ سے کچھ خوف کھاتا ہے" ولسن کہنے لگا۔
"کیا واہیات بکواس کرتے ہو۔ آرسین لوپن کسی سے نہیں ڈرتا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ وہ مجھے چیلنج دے رہا ہے مگر اُسے بیرن ڈی امبلی ویل کے خط کا حال کیسے معلوم ہو گیا۔"
"یہ میں کیسے بتلاؤں۔ مرد آدمی۔ تم بھی عجیب احمق پن کے سوالات کر رہے ہو۔"
"میں۔۔۔ میں یہ سوچتا۔۔۔ میں یہ خیال کرتا تھا کہ۔۔۔"

"کہ میں کوئی ساحر یا جادوگر ہوں۔ کیوں یہی نا؟"

"نہیں میں نے اکثر آپ کو تعجب خیز کرامات کرتے دیکھا ہے۔"

"بالکل غلط۔ کوئی شخص کرامت نہیں دکھا سکتا علی ہذا میں بھی ایک انسان ہوں۔ میں غور و خوض تفتیش اور نتائج سے کام لیتا ہوں۔ بیوقوفوں کی طرح خیالی باتوں کا پابند نہیں۔"

ولسن نے اس وقت بہت ہی سنجیدگی اختیار کر لی۔ مبادا وہ بھی شرلاک کے نشگین انداز سے کرہ میں ادھر اُدھر چہل قدمی کرنے پر کچھ خیالی باتیں ظاہر کر کے بیوقوفوں کے زمرہ میں آ جائے۔ مگر جب شرلاک نے گھنٹی بجا کر نوکر سے سفری بیگ لانے کو کہا۔ تو ولسن کی بھی ہمت بڑھ گئی کیونکہ اب خیالی گنجائش ختم ہو چکی تھی۔ اور غور و خوض، تحقیق و نتائج سے یہ بدیہی ظاہر تھا کہ شرلاک نے کسی سفر کی تیاری کر دی ہے اس طبعی تحریک کے زیر اثر اُس نے ایک ایسے شخص کی طرح سوال کیا۔ جس کو کسی غلطی کا شک نہ ہو۔

"ہالملاک۔ کیا آپ پیرس جا رہے ہیں۔"

"شاید"

"اور کیا آپ کا یہ سفر بجائے بیرن ڈی اہلی ویل کے لوپن کے جواب میں ہے؟"

"شاید"

"اچھا" ہالملاک میں آپ کے ساتھ چلونگا۔"

"آہا۔ قدیم دوست" شرلاک نے رُک کر کہا۔ "کیا تمہیں خوف نہیں۔ کہ کہیں اس مرتبہ تمہارا بایاں ہاتھ بھی داہنے ہاتھ کی طرح نہ زخمی ہو جائے۔"

"جب آپ موجود ہیں تو مجھے کیا ڈر۔"

"خوب۔ واللہ تم نہایت لاجواب آدمی ہو۔۔۔ خیر ہم آرسین لوپن پر ظاہر کر دینگے۔ کہ اُس نے ہم کو یوں چیلنج دیکر سخت غلطی کی۔ اچھا، ولسن۔ جلدی کرو۔ اور پہلی ہی ٹرین پر مجھ سے آ کر مل جاؤ۔"

"کیا آپ اُن اخبارات کا بھی انتظار نہ کرینگے جن کا حوالہ بیرن کے خط میں ہے۔"

"کیا فایدہ"

"اچھا تو کیا بیرن کو خط روانہ کر دیا جائے۔"

"نہیں۔ آرسین لوپن کو میرے آنے کا حال معلوم ہو جائیگا اور یہ میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ ولسن۔ اس مرتبہ ہم کو بہت ہی احتیاط کے ساتھ اپنا کھیل شروع کرنا چاہئے۔"

× × × × × ×

(۲)

اسی سہ پہر کو یہ دونوں دوست ڈوور کی ایک کشتی میں سوار نظر آتے۔ ان کو بہت فاصلہ طے کرنا پڑا۔ چنانچہ اس ایکسپرس ٹرین میں جو کیلے سے پیرس کو جاتی ہے۔ شرلاک

برابر تین گھنٹے آرام کی نیند سوتا رہا۔ ولسن برابر گاڑی کے دروازہ کی نگرانی کرتا رہا۔ اور اپنے دل ہی سے باتیں بناتا رہا۔ جس وقت شرلاک کی آنکھ کھلی۔ تو طبیعت نہایت بشاش و چست تھی۔ آرسین لوپن سے پھر دو دو ہاتھ ہونے کے خیال سے اسے بیحد مسرت تھی۔ اور اس کا اظہار وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو مل مل کر اس طرح کر رہا تھا۔ گویا کوئی شخص کسی نامعلوم مسرت کا دل ہی دل میں لطف حاصل کر کے مسرور ہو رہا ہو۔

"کچھ ہو" ولسن بولا۔ "ہم جان لینگے کہ ہم زندہ واپس ہوسکے۔"

اور اس نے بھی اسی طرح ہاتھ مل کر اظہار خوشی کرنا شروع کر دیا۔

اسٹیشن پر اتر کر شرلاک نے بستر اور ولسن نے بیگ اٹھا لئے۔ اور ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ دیکر دونوں اپنا اپنا بوجھ لئے بڑے اسٹیشن سے باہر نکلے۔ اور سڑک پر آئے۔

"ولسن کیا پیارا دن ہے۔ یہ آفتابی حسن واللہ۔ پیرس بھی ہم لوگوں کے استقبال کے لئے آج دلہن بنا معلوم ہوتا ہے۔"

"بھیڑ بھاڑ تو دیکھئے۔"

"ولسن۔ اچھا تو ہے۔ ہمارا کوئی خیال بھی نہ کریگا۔ اور اس اژدھام میں ہمیں کوئی پہچان بھی نہ سکیگا۔"

"مگر مسٹر شرلاک، مجھے یقین ہے کہ . . . ؟"

عقب سے آنے والی آواز کو سنکر وہ ٹھٹکا۔ یہاں پر اس کو نام لیکر آواز دینے والا کون ہوسکتا ہے؟

ایک خاتون ایک ... نیرہ اور حسین خاتون جسکی سادی پوشاک اس کی شرافت اور تمول کی شاہد تھیں۔ اس کے دوش بدوش چل رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر رنج و تفکر کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے دوبارہ کہا۔

"یقیناً میں مسٹر ہالملاک شیرس سے مخاطب ہوں۔"

اس ملاقات کو مشکوک سمجھ کر اسنے جھنجھلا کر پوچھا "تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

وہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

"مسٹر ہالملاک شیر میری باتوں پر غور کیجئے۔ یہ بڑا اہم معاملہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ رومر یلو تشریف لیجا رہے ہیں۔"

"اچھا پھر"

"میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں، رومر یلو نمبر ۱۸ آپ ہرگز . . نہیں۔ آپ ہرگز تشریف نہ لیجائیں . . . میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ اس پر افسوس کریں گے۔ اس لئے کہ میں آپ سے اس کے بارے میں کہتی ہوں۔ آپ کو یہ خیال نہ کرنا چاہئے۔ کہ اس سے میری کوئی غرض ہے۔ بلکہ میں ایک دلیل رکھتی ہوں۔ اور میں خوب سمجھتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

اُس نے اس کو ایک طرف دھکا دیکر ہٹا دینا چاہا لیکن
وہ بدستور کھڑی رہی۔

"میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ سختی نہ برتئے
افسوس، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کو کس طرح یقین دلاؤں!
میری طرف دیکھئے۔ اور میری آنکھوں پر غور کیجئے۔ انکی سنجیدگی
راستی کی شاہد ہے۔"

بیباکی سے اُس نے آنکھ اُٹھاکر دیکھا جو اس کے دل
کی سچی ترجمان، خوبصورتی، نیک نیتی اور پاکیزگی کی گواہ تھیں۔
ولسن نے اپنا سر جھکا لیا۔

اس نے کہا۔ "نوجوان خاتون بہت متین معلوم
ہوتی ہے"

اُس نے انکسار سے جواب دیا۔ "فی الحقیقت
میں ایسی ہی ہوں۔ آپ مجھ پر ضرور یقین فرمائیں۔"

ڈاکٹر ولسن نے جواب دیا۔ "میڈم موازل میں تو یقین
کرتا ہوں مگر"

آہا۔ آپ مجھ کو کس قدر خوش کرتے ہیں۔ کیا آپ کے دوست
بھی مجھ پر یقین کرتے ہیں یا نہیں؟ میں اس کا احساس کرتی
ہوں۔ مجھے اس کا یقین کامل ہے۔ میں کیسی خوش قسمت ہوں۔
سب کام درست ہو جائینگے! - - - اوہو میرا کیا اچھا
خیال ہے! مسٹر ہالملاک شیر سنئے۔ بیس منٹ بعد ایک
ٹرین یہاں سے کیپلے جائیگی۔ اب آپ ضرور اُس پر پہنچئے
جلدی کیجئے۔ میرے ساتھ تشریف لائیے۔ راستہ یہ ہے۔ اور
آپ کے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔"

اُس نے مسٹر شیر کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی
اُس نے اس کو بازو سے پکڑ لیا۔ مگر شیر نے ایک ایسی آواز
میں جس کو اُس نے حتی المقدور ملائم بنانے کی کوشش کی۔
کہا۔ "دوشیزہ خاتون مجھے معاف کیجئے۔ اگرچہ میں آپکی
خواہش پورا کرنے کے ناقابل ہوں۔ لیکن اُس کام سے جسے
میں نے اپنے ہاتھوں میں لیا ہے کبھی نہیں پھر سکتا۔"

"میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ میں آپ سے منت کرتی
ہوں۔ افسوس، کاش آپ اتنا جانتے!"

وہ آگے بڑھا اور تیزی سے چل دیا۔

ولسن پیچھے رہ گیا اور لڑکی سے کہا۔

"خاطر جمع رکھو۔ وہ معاملہ کو اختتام تک پہنچائیگا۔ وہ
ابھی تک کبھی ناکامیاب نہیں ہوا۔ - - -"

یہ کہکر شیرس کے پیچھے اُس تک پہنچنے کے لئے دوڑا۔

ہالملاک شیر
بمقابلہ
آرسین لوپن

یہ الفاظ سیاہ موٹے خط میں لکھے ہوئے پہلے ہی قدم پر
ان کو نظر پڑے۔ یہ اُن کے قریب تک گیا۔ ایسے آدمیوں کا
ایک جلوس جن کے سامنے اور پشت پر اشتہار کی تختیاں

لٹک رہی تھیں۔ ایک قطار میں چار ہاتھا۔ اُن کے ہاتھوں میں بید تھے۔ جن کو وہ ہم آہنگ آواز کے ساتھ زمین پر کھٹکھٹاتے جاتے تھے۔ ان کے سامنے تختیوں پر مذکورہ بالا مضمون درج تھا۔ اور پشت پر لٹکنے والی تختیوں پر حسب ذیل خبر شائع ہوئی تھی:۔

شیر اور لوپن کا مقابلہ
انگلستان کے بہادر کی آمد
رومرلیو کے پراسرار واقعہ میں محکمۂ خفیہ کے مشہور افسر کی پوری تفصیل
ایکو ڈی فرانس میں ملاحظہ کیجئے۔

ولسن نے اپنا سر ہلایا۔

"ذرا سُنئے، ہالملاک، میرا خیال تھا کہ ہم لوگ پوشیدہ سفر کر رہے ہیں! اب میں رومرلیو جمہوری سلطنت کے محافظ (آرسین لوپن کی مشہور کنیت) کو حاکمانہ خیر مقدم کے لئے تیار پاکر متعجب نہ ہونگا۔"

شیر نے غراکر کہا: "ولسن، تم جس وقت عقلمند بننے کی کوشش کرتے ہو تو تمہاری سمجھ دو دماغوں سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔"

شرلاک اُن آدمیوں میں سے ایک کی طرف مصمم ارادہ کر کے بڑھا کہ اُس کو اپنے طاقتور ہاتھوں سے پکڑ کر مع اس کے اشتہارات کے پارہ پارہ کر ڈالے کہ اسی اثنا میں ایک مجمع ہنستا اور مذاق کرتا ہوا اشتہار والوں کے گرد جمع ہو گیا۔ جوش غیظ کو روکتے ہوئے شیر نے ایک شخص سے دریافت کیا

"تم کو کب کرایہ پر رکھا گیا؟"

"آج ہی صبح کو"

"تم اپنے گشت پر کب روانہ ہوتے؟"

"ایک گھنٹہ قبل"

"کیا اشتہارات تیار تھے؟"

"جی حضور! جب ہم لوگ آج صبح دفتر پہنچے تو یہ شائع شدہ وہاں موجود تھے:۔"

تو گویا آرسین لوپن نے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا کہ شیر جنگ کو منظور کر لیگا! اس آرسین لوپن کا خط ثابت کرتا ہے۔ کہ اُس نے خود جنگ کی خواہش کی اور یہ اس کے ارادوں کا ایک حصّہ ہے۔ کہ وہ اپنے مقابل سے ایک بار اور طاقت آزمائی کرے۔ کیوں؟ بھلا وہ کونسی ممکن صورت ہو سکتی ہے جس نے اُسے دوبارہ مقابلہ کے لئے تیار کیا؟"

ہالملاک شیر نے ایک لمحہ تامل کیا۔ بیشک ایسی گستاخیاں ظاہر کر کے لوپن قطعی کامیابی کی امید رکھتا ہے۔ اور کہیں ایسا تو نہیں کہ ابتدائی جواب میں اس طرح عجلت کر کے وہ ایک پھندے میں پھنس رہا ہو؟ پھر اپنی تمام قوت حافظہ کو

جمع کرکے اُس نے چلّا کر کہا۔ "ولسن آگے بڑھو! کوچوان روپرٹو نمبر ۱" اُبھری ہوئی رگوں اور بندھی ہوئی مٹھیوں کیساتھ وہ جھپٹ کر ایک گاڑی میں سوار ہو گیا۔

× × × × × × × ×

(۳)

محلہ رو مریلو سامان عشرت سے آراستہ و پیراستہ ذاتی مکانات کا مجموعہ ہے۔ اس کی پشت پر مانشو پارک واقع ہے۔ نمبر ۱ ان مکانات میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ بیرن ڈی اپلی ویل نے جو مع اپنی بیوی بچوں کے یہاں رہتا ہے۔ اس کو نہایت قیمتی اشیاء سے ایک صنّاع آرام پسند دولتمند ہونے کی حیثیت سے سجایا ہے۔ مکان کے سامنے ایک احاطہ ہے۔ جس کے دونوں جانب ملازموں کے دفتر ہیں پشت پر ایک باغ ہے جسکے درخت کی شاخیں پارک کے درخت کی شاخوں سے دست و گریباں رہتی ہیں۔ دونوں انگریزی جاسوسوں نے گھنٹی بجائی۔ احاطہ کو طے کیا۔ ایک خادم اُن کی رہبری کرتا ہوا مکان کی دوسری جانب ایک چھوٹے گول کمرہ میں لے گیا۔

دونوں بیٹھ گئے اور کمرہ کی قیمتی اشیاء پر ایک سرسری نظر دوڑائی۔

ولسن نے آہستہ سے کہا۔ "کیا خوب چیزیں ہیں۔ خوبصورت پسندیدہ اور حسب موقع۔ ہر شخص نہایت آسانی سے اندازہ کر سکتا ہے کہ ان اشیاء کو جمع کرنے والے اشخاص ضرور سن رسیدہ ہیں۔ شاید پچاس سال ...."

اس کا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ ایم۔ ڈی امبلیولی مع اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہوا۔

ولسن کے خیال کے برخلاف وہ دونوں نوجوان تھے عمدہ پوشاکوں سے ملبوس طرز گفتگو اور اخلاق نہایت پسندیدہ تھے۔ دونوں نے تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "فی الحقیقت آپ کا اس طرح آنا سرف عنایت و مہربانی پر مبنی ہے۔ آپ کی اس تکلیف فرمائی سے ہم لوگ بہت خوش ہیں۔ اس لئے کہ آپ کی آمد ہمارے لئے باعث راحت ثابت ہوگی"

ولسن نے جس کو کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا خیال کیا۔ "فرانسیسی باشندے کتنے خلیق ہیں۔"

"لیکن وقت دولت ہے،" بیرن نے چلّا کر کہا۔ "اور خاصکر آپ کا مسٹر شیرس۔ ہم کو اصل مقصد پر آنا چاہئے! آپ معاملہ کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں؟ کیا آپ اطمینان بخش نتیجہ برآمد کرنے کی امید رکھتے ہیں؟"

"معاملہ کو قابل اطمینان صورتوں میں لانے کے لئے درخواست کرتا ہوں۔ اُس کی نوعیت کیا ہے۔"

"یہ محض ایک چوری کا ارتکاب۔"

"کس دن"

"شنبہ کو" بیرن نے جواب دیا۔ "شنبہ کی شب یا یکشنبہ

کی صبح ؟"

" تو گویا چھ دن گزر گئے۔ اچھا آگے چلئے۔"

" میں سب سے پہلے آپ سے یہ عرض کرونگا کہ میری بیوی اور میں اگرچہ امرا کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں لیکن باہر بہت کم جاتے ہیں۔ ہمارے اوقات بچوں کی تعلیم، لوگوں کے خیر مقدم اور مکان کو خوبصورت بنانے میں صرف ہوا کرتے ہیں۔ شام کا زیادہ تر حصہ اس کمرہ میں صرف ہوتا ہے۔ جو میری بیوی کا خاص کمرہ ہے۔ اور جس میں ہم نے چند خوبصورت اشیاء جمع کر رکھی ہیں۔ ہاں، گزشتہ شنبہ کو تقریباً گیارہ بجے میں نے بجلی کی روشنی گل کر دی۔ اور حسب معمول میں اور میری بیوی اپنے اپنے بستر پر چلے گئے۔"

" یہ کمرہ کہاں ہے ؟"

" اس کے بعد دوسرا کمرہ، وہ سامنے والا دروازہ۔ صبح کو یعنی یکشنبہ کو میں علی الصباح اٹھا۔ چونکہ سوزی۔ میری بیوی، ابھی تک سو رہی تھی۔ اس لئے میں اس کے کمرہ میں ہر ممکن آہستگی سے داخل ہوا تاکہ وہ جاگ نہ اُٹھے۔ خیال کیجئے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ کھڑکیاں کھلی ہیں جنہیں ہم رات کو بند چھوڑ گئے تھے !"

"شاید نوکر ؟"

صبح کے وقت ہمارے گھنٹی بجانے سے قبل کوئی شخص اس کمرہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں ہمیشہ سامنے والے دروازہ کی جس سے بڑے کمرے کا راستہ ہے چٹخنی بند کرنے کی احتیاط رکھتا ہوں اس لئے کھڑکیاں ضرور باہر سے کھولی گئیں۔ اسکے علاوہ میرے پاس ایک ثبوت بھی ہے۔ داہنی سمت کا دوسرا شیشہ کاٹا گیا ہے۔"

" اور کھڑکی ...."

" کھڑکی جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں۔ پتھر کے ستون پر قائم ہے۔ ایک چھوٹے برآمدہ میں کھلتی ہے۔ ہم یہاں فرش اوّل پر ہیں۔ اب یہاں سے مکان کی پشت پر باغ اور وہ کٹہرے جو اسے پارک مانشو سے جدا کرتے ہیں۔ دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے یہ امر یقینی ہے کہ آدمی پارک مانشو سے آیا۔ ایک سیڑھی کے ذریعہ کٹہروں پر چڑھ کر چھجّے کے اوپر پہنچ گیا۔"

" آپ کہتے ہیں، یہ امر مسلمہ ہے ؟"

" دونوں جانب کنارے کی ملائم زمین پر ہم نے سیڑھی کے دو بالائی ڈنڈوں کے نشانات پائے ہیں اور اسی کے مشابہ دو نشانات چھجّے کے نیچے ہیں۔ مزید براں پیل پایہ پر بھی دو ہلکے نشانات ظاہر ہیں۔ جو صریحاً سیڑھی کے لگانے سے پیدا ہو گئے ہیں۔"

"کیا پارک مانشو شب کے وقت بند نہ تھا؟"

"بند؟ نہیں!... لیکن... ہاں... نمبر ۱۴ پر ایک عمارت ہے۔ جس کی طرف سے راستہ نکال لینا آسان ہے۔"

بالملاک شبر ایک لمحہ غور کرنے کے بعد بولا:۔

"ہم کو وقوع واردات پر غور کرنا چاہیئے آپ فرماتے ہیں واردات اسی کمرہ میں ہوئی جس میں ہم اس وقت موجود ہیں؟"

"ہاں، ٹھیک اسی مقام پر آویزاں تصویر اور طلائی بُت کے درمیان ایک چھوٹا جیوش لیمپ رکھا تھا۔ جو غائب ہو گیا۔"

"بس صرف وہی"

"ہاں وہی"

"افسوس!... اس جیوش لیمپ میں کیا خصوصیت تھی؟"

"یہ ایک ایسے نمونہ کا لیمپ تھا۔ جس میں تیل بھر کر بتی سے روشن کیا جاتا تھا اور جو زمانہ سلف میں مروّج تھا تیل والے حصّہ کو دو یا زیادہ حصّوں میں منقسم کر کے بتیاں لگا دی جاتی تھیں"

"جب کل اتنی ہی کائنات ہے تو کچھ زیادہ قیمتی چیز نہ تھی۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔ لیکن زیر بحث لیمپ میں ایک پوشیدہ جگہ ایسی بھی تھی۔ جس میں ہم شاندار قیمتی زیور جڑاؤ چیزیں، ہیرے، جواہرات اور نقدی وغیرہ رکھتے تھے۔"

"اس عادت سے آپ کا کیا مقصد تھا؟"

"مسٹر شبر۔ اس کا اظہار صرف الفاظ سے میرے لئے بہت مشکل ہے۔ شاید ہمارے لئے ایسے خفیہ مقامات میں رکھنا کچھ باعثِ دلچسپی تھا۔"

"کیا اس کے متعلق کسی کو بھی علم نہ تھا؟"

"نہیں کسی کو نہیں۔"

"بیشک چور کے سوا" شبر نے قطع کلام کر کے کہا۔ "لیکن صرف جیوش لیمپ چرانے کے لئے اُس نے اتنی زحمت نہ گوارا کی ہوگی۔"

"بیشک۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ جب ہمیں خود خفیہ مشین کا علم محض حسن اتفاق سے ہو گیا تھا۔ تو اس کا حال چور کو کیسے معلوم ہو گیا۔"

"حسن اتفاق سے شاید یہ کسی اور پر ظاہر ہو گیا ہو۔ کسی نوکر کو۔ مکان میں کسی داخل ہونے والے کو۔ خیر آمدم برسرِ مطلب۔ کیا آپ نے پولیس کو اطلاع کر دی ہے؟"

"یقینی۔ حاکم تحقیقات اپنی تفتیش ختم کر چکا ہے۔ بڑے بڑے اخبارات سے تعلق رکھنے والے روزنامچہ نویس

بھی اپنی تحقیقات ختم کر چکے ہیں۔ لیکن جیسا میں آپ کو لکھ چکا ہوں یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ یہ مسئلہ کبھی حل ہو سکیگا۔"

شیر اُٹھا۔ کھڑکی قریب گیا۔ دریچہ کے کواڑ۔ برآمدہ اور کھمبے کا معاینہ کیا۔ پھر کے دونوں نشانات کو اپنی خورد بین کے ذریعہ سے دیکھا۔ اور مسٹر ایم۔ ڈی میلی وین سے نیچے باغ میں چلنے کے لئے کہا۔

جب وہ باہر پہنچے۔ شیر ایک بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور نیم باز نظروں سے چھت کی طرف غور کرنے لگا۔ پھر ایکبارگی ان نشانات کی طرف چلا۔ جو سیڑھی کے بالائی ڈنڈوں سے زیریں برآمدہ زمین پر نمودار ہو گئے تھے۔ اور جو اصلی نشان قائم رکھنے کے لئے لکڑی کے دو چھوٹے ڈھکنوں سے بند تھے۔ اُس نے ڈھکنوں کو علیحدہ کیا۔ اور اپنے گھٹنوں پر اسقدر جھک کر کہ خم شدہ کمر اور اُسکی ناک زمین سے صرف چھ انچ فاصلہ پر رہ گئیں۔ غور وخوض اور پیمائش کی۔ کٹہروں پر بھی اُس نے سرسری طور پر یہی عمل کیا اور تحقیقات ختم کر دی۔

(۴)

یہ دونوں کمرۂ خاص کو واپس آئے۔ جہاں میڈم ڈی امیلی ویل اُن کی منتظر تھی۔

شیر چند منٹ کی خاموشی کے بعد یوں گویا ہوا۔

"مانشیوری لی بیرن، جب سے آپ نے اپنا قصہ شروع کیا۔ میں دراصل واردات کی صرف دو پہلوؤں پر متحیر تھا۔ سیڑھی کو استعمال کر کے شیشہ کی علیحدگی اور ایک چیز کو اُٹھا کر باہر چلا جانا۔ نہیں یہ چیزیں ایسی آسانی سے نہیں واقع ہو سکتیں۔ یہ بالکل صاف اور واضح ہے۔"

"آپ کے اس کہنے کا مقصد ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"میرے کہنے کے یہ معنی ہیں کہ جیوش لیمپ کا سرقہ آرسین لوپن کے زیر اہتمام ہوا ہے۔"

"آرسین لوپن"! بیرن نے چلا کر کہا۔

لیکن واردات آرسین لوپن کی غیر موجودگی اور بلا کسی شخص غیر کے اندر داخل ہوتے ظہور میں آئی ہے شاید ایک ملازم برساتی نالی کے ذریعہ جسے ہم باغ سے دیکھ چکے ہیں۔ اپنے بالاخانہ سے برآمدہ میں اُتر گیا۔"

"لیکن آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت ؟"

"آرسین لوپن کمرہ سے خالی ہاتھ نہیں جا سکتا تھا۔"

"خالی ہاتھ! ہائیں! اور یہ لیمپ جو غائب ہے؟"

"لیمپ کا سرقہ کرتے ہوئے یہ کیا ضرور تھا۔ کہ وہ ہیرے و جواہرات سے جڑی ہوئی بلاس کی ڈبیا! اور موتیوں کا ہار چھوڑ جاتا۔ صرف دو مرتبہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت تھی۔ لیکن اُس کا ایسا نہ کرنا یہ معنے رکھتا ہے۔ کہ اس نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا۔"

"پھر بھی سیڑھی کے نشان ؟"

"محض فرضی۔ انسان کی عقل کو فریب دینے کے لئے۔"

"بیل پایوں کے نشانات؟"

"بالکل جعلی! وہ کاغذ سے بنائے گئے ہیں۔ دیکھئے، یہاں کاغذ کے چند ٹکڑے پڑے ملے ہیں۔ جن کو میں نے اُٹھالیا ہے۔"

"سیڑھی کے بالائی ڈنڈے کا نشان"

"قطعی مصنوعی! اُن مستطیل سوراخوں کو جو زیریں برآمدہ اور کٹہرے کے قریب ہیں۔ ذرا ملاحظہ کیجئے۔ شباہت ایک سی ہے لیکن ایک جگہ وہ متوازی ہیں۔ اور دوسری جگہ نہیں دونوں سوراخوں کا درمیانی فاصلہ ناپئے۔ ان کی صورتوں میں اختلاف ہے۔ زیریں برآمدہ ۹ انچ کا فاصلہ ہے۔ اور کٹہرے کے پہلو میں ان کا فاصلہ گیارہ انچ ہے۔"

"اس سے کیا نتیجہ آپ نے اخذ کیا؟"

"چونکہ ان کا خاکہ یکساں ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ کسی زاویہ نما لکڑی کے ڈنڈے سے بنائے گئے ہیں۔"

"سب سے بہتر ولیل لکڑی کا ڈنڈا ہی ہوگا۔"

"جی، یہ لیجئے۔" شیر نے کہا۔" میں نے اس کو باغ میں ایک چوبی ناند کے پیچھے پایا ہے۔"

بیرن اندر آیا۔ شرلاک کو اُس کے مکان میں داخل ہوتے صرف چالیس منٹ کا عرصہ گزر تھا۔ اس سے قبل ابتک جو کچھ تفتیش کی بنا پر یقین کیا گیا تھا۔ اُس کا ذرا سا نشان بھی خود واقعات کی دلیل پر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ حقیقتاً ایک مختلف حقیقت روشنی میں آئی۔ جو ہالملاک شیر کی قابلیت اور بیدار مغزی کا نتیجہ تھی۔

بیگم امیلی ویل نے کہا۔ "مسٹر شیر ہمارے آدمیوں کے خلاف اتہام بالکل ناممکن ہے۔ یہ سب قدیم خاندانی ملازم ہیں۔ اور اُن میں سے ایک بھی ہم کو فریب دینے والا نہیں ہے۔"

"اگر ان میں سے کوئی آپ کو دھوکا نہیں دیتا ہے۔ تو اس کی بابت آپ کا کیا بیان ہے۔ کہ یہ خط مجھ کو اُسی دن اور اُسی ڈاک سے ملا جس سے کہ آپ نے بھیجا تھا؟"

اور اُس نے وہ خط جو آرسین لوپن نے لکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

بیگم ڈی امیلی ویل چپ ہوگئی۔ اسکی زبان بند ہوگئی۔

"آرسین لوپن! ... اُس نے کس طرح جانا؟"

"کیا آپ نے کسی سے اپنے خط کے بارہ میں تذکرہ نہیں کیا تھا؟"

"نہیں کسی سے نہیں۔" بیرن نے کہا۔" یہ خیال ہم کو گزشتہ شام کو کھانا کھاتے وقت ہوا تھا۔"

"ملازموں کی موجودگی میں"

"وہاں صرف ہمارے دو بچے تھے۔ اور اس وقت بھی نہیں، صوفی اور ہنریٹا میز پر نہ تھے۔ سوزین کیا یہ لوگ

بھی تھے ؟"

بیگم ڈی اسلی ویل نے سوچ کر کہا۔ "نہیں، وہ تو میڈموازل کے پاس چلے گئے تھے"۔

"یہ میڈموازل کون ؟" شیر نے دریافت کیا۔

"ان کی اُستانی۔ الائیس ڈیمن"

"کیا وہ آپکے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوتی ؟"

"نہیں، وہ خود اپنے کمرہ میں کھانا کھاتی ہے"

ولسن کو کوئی خیال پیدا ہوا۔

"خط جو میرے رفیق بالملاک شیر کو لکھا گیا تھا ڈاک میں ڈالا گیا تھا !"

"یقیناً"

"اُس کو ڈالا کس نے ؟"

ڈومنیک نے، جو میرے ساتھ شش میرے گھر کا آدمی کے تقریباً بیس سال سے ہے"۔ بیرن نے جواب دیا۔ "اس پہلو پر آپ کی تفتیش صرف تضییع اوقات ہوگی"۔

ولسن نے ذومعنی الفاظ میں کہا۔ "تلاش میں وقت کبھی ضائع نہیں ہوتا"۔

یہاں پر ابتدائی تحقیقات ختم ہوئی اور شیر نے رخصت کی اجازت چاہی۔

ایک گھنٹہ بعد اس نے ڈی اسلی ویل کے بچوں صوفی اور ہنریٹا دو خوبصورت شش سالہ لڑکیوں کو کھانے پر دیکھا۔ گفتگو بہت معمولی ہوئی۔ شیر نے بیرن اور اُس کی بیوی کی پسندیدہ گفتگو کا ایسی کرخت آواز میں جواب دیا کہ اُنہوں نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔ قہوہ لایا گیا۔ شیر اپنی پیالی پی کر کرسی سے اُٹھا۔

اسی اثناء میں ایک ملازم ٹیلیفون کے دفتر سے اس کے نام کا ایک لفافہ لایا۔ شیر نے اس کو کھولا اور پڑھا :۔

"میری دلی تعریف قبول کیجئے۔ اتنے تھوڑے عرصہ میں جناب کا نتیجہ پر پہنچ جانا میرے دماغ کو پراگندہ کر رہا ہے۔ مَیں بالکل پاگل ہو رہا ہوں"۔

آرسین لوپن

وہ اپنی گھبراہٹ کی علامت کو نہ روک سکا۔ اور تار بیرن کو دکھلا کر اُس نے کہا۔ "کیا آپ کو یقین نہیں کہ آپ کی دیواریں بھی آنکھ اور کان رکھتی ہیں ؟"

"مَیں اس کو نہیں سمجھ سکا"۔ بیرن ڈی اسلی ویل نے حیرت سے کہا۔

"نہیں لیکن جہانتک مَیں خیال کرتا ہوں۔ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرتا جب وہ ہماری حرکات وسکنات نہ دیکھتا ہو۔ اور نہ کوئی لفظ ایسا ہے جو اُس کے کان نہ سُن سکتے ہوں"۔ (باقی باقی)

شمیم بلہوری

جذباتِ احسن

عشق ہے حُسن کا مدّاح خریدار نہیں / حُسن ہے دِل کا طلبگار دِل آزار نہیں
کوئی ہمدرد نہیں، کوئی مددگار نہیں / بیکسی یوں تو وفادار ہے غمخوار نہیں
پاؤں پھیلاتے ہیں کس بہنے پہ اے جوشِ جنوں / دامنِ دشت نہیں۔ وادیٔ پُر خار نہیں
تنکے چنوانی ہے بُلبل کو خموشی اِس کی / یہ غنیمت ہے کہ گُل قابلِ گفتار نہیں
بوالہوس تیری نظر کی ہو رسائی کیونکر / جلوۂ طور ہے یہ جلوۂ رُخسار نہیں

حُسن خود لیتا ہے چہرے کی بلائیں احسن
دیکھ پھر دیکھ کہ یہ جلوۂ رُخسار نہیں

سیّد احسن (بی اے بی ٹی)

محسوساتِ اقدس

یہ قسمت تھی یہ تھا سرمایۂ سود و زیاں اپنا / حسینوں کی وفا بن کر مٹا نام و نشاں اپنا
ابھی سے دعوتِ شورِ تبسم دی ہے قاتل نے / ابھی پھیلا نہیں ہے دامنِ زخمِ نہاں اپنا
خضر بھی ساتھ دے سکتے نہیں مجنوں تو مجنوں ہے / چلا ہے عشق کے جس راستے پر کارواں اپنا
ہوا باندھی ہے پھر یارب ہوائے سجدہ ریزی نے / سرِ شوریدہ ہو جائے نہ وقفِ آستاں اپنا
بپا کرتی قیامت چشمِ سوزن کی نظر بازی / بہت کوتاہ نکلا دامنِ زخمِ نہاں اپنا

اُڑا تصویر سے بھی رنگ مثلِ ہوش اے اقدس
وفورِ ضعف سے پورا کھنچا نقشہ کہاں اپنا

محمد عباس اقدس

حسیات

(۱) فقیر کے جھولے نے کہا۔ میاں بٹوے! میرے اور تمہارے درمیان بہت تھوڑا فرق ہے۔ آؤ تبادلہ کر لیں۔ بٹوے نے تنگ مزاجی سے جواب دیا۔ پہلے وہ فرق دُور کر لو۔

(۲) پیاسا گدھا جھیل کے کنارے پر گیا۔ اور یہ کہتا ہُوا واپس آگیا۔ اوہو پانی کیسا سیاہ ہے۔ جھیل نے مُسکرا کر کہا۔ ہر ایک گدھے کو سفید پانی سیاہ نظر آتا ہے۔

(۳) وقت کہتا ہے جس نے دُنیا کو پیدا کیا وہ مَیں ہُوں۔
گھڑی کہتی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا وہ مَیں ہُوں۔

(۴) مرد کہتا ہے۔ مَیں طاقتور ہوں۔ جو چاہوں کر سکتا ہوں۔
عورت ذرا شرمیلی آواز سے کہتی ہے "شرم" مرد کہتا ہے تمہیں قدم قدم پر روکا جاتا ہے۔
شاعر کہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت خُوبصورت ہے۔

(۵) غروب ہوتا ہُوا سُورج پُوچھتا ہے میرے کام کا کون ذمہ دار ہوگا۔
خاموش دُنیا میں کوئی جواب نہیں دیتا۔
مٹی کا چراغ ایک کونے سے بولتا ہے۔ جناب! مَیں!!

(۶) چُلبلے سمندر۔ اس لاتناہی سلسلۂ تقریر کے کیا معنی؟
سمندر نے جواب دیا۔" یہ ازلی سوال ہے۔"
پہاڑوں کے قدیمی سلسلے۔ تیری خاموشی میں کونسا راز مضمر ہے۔
"یہ ابدی خاموشی ہے"

(۷) لفظ کہتا ہے۔ اے کام۔ جب مَیں تجھے دیکھتا ہوں۔ مجھے اپنی تنگدلی پر شرم آتی ہے۔ کام کہتا ہے۔ مَیں اپنے افلاس کو خُوب جانتا ہُوں۔ مجھے تم جیسی سیر چشمی کہاں نصیب۔

(۸) میں اپنی قسمت سے پوچھتا ہوں۔ کونسی طاقت ہے جو بیدردی سے مجھے دھکیل رہی ہے؟
قسمت کہتی ہے۔ اپنے گرد دیکھو۔
جب میں پھر کر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی ہستی پیچھے سے دھکیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

(۹) موت ڈراتی ہے۔ میں تیرے عزیزوں کو لے جاؤنگی
چور کہتا ہے۔ تیری دولت میرا حصّہ ہے۔
قسمت کہتی ہے۔ میں تجھ سے سب کچھ چھین لونگی۔
بدنامی کہتی ہے۔ میں تیری شہرت وعزّت ضائع کردونگی۔
شاعر کہتا ہے۔ مگر کون ہے جو میری خوشی مجھ سے چھین سکتا ہے؟

(ٹیگور) ولی امینی

غزل

میرا مضموں سوارِ توسنِ طبعِ رواں ہوکر
زمینِ شعر پر پھرتا ہے گویا آسماں ہوکر

کھٹک جاتے ہیں چشمِ برق میں میرانشاں ہوکر
غضب ڈھاتے ہیں یعنی چند تنکے آشیاں ہوکر

نہاں تھیں بجلیاں جو دامنِ ابرِ بہاراں میں
گریں سب آشیانے پر جفائے باغباں ہوکر

خدا محفوظ رکھے یہ حسیں دل لے ہی لیتے ہیں
کسی پر مہرباں ہوکر کسی سے سرگراں ہوکر

اجی کیا شمع کیا پروانہ دونوں جل بجھے آخر
کوئی آتش فشاں ہوکر کوئی آتش بجاں ہوکر

زمینِ آرزو پر یاس نے کیا گل کھلائے ہیں
بہار آئی ہے اس گلشن میں تاراجِ خزاں ہوکر

دمادم شعبدے ہم کو دکھاتا ہے کوئی جلوہ
کہیں شیخِ حرم ہوکر کہیں پیرِ مغاں ہوکر

یہی عالم رہا تو دیکھنا اس ضعف کے ہاتھوں
رہیگا دامنِ فریاد اِک دن دھجّیاں ہوکر

سُن اے جوشِ جنوں تقلیدِ مجنوں کی نہیں اچھی
مبادا ہم بھی رہ جائیں کسی دن داستاں ہوکر

نہ پایا اور کچھ بھی جز خدا کعبے میں اے اختر
بہت نادم ہوئے ہم بتکدے سے بدگماں ہوکر

اختر

قیمت سالانہ چھ روپیہ　　رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴　　قیمت ششماہی ۳ؔ فی پرچہ ۱۰ؔ

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر:۔ حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹرز:۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۵　اشاعت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۴ء　نمبر ۲

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تیری ہستی سے یہ روشن ہوا — ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تاکجا
تھا سراپا روح تو بزمِ سخن پیکر تیرا — زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تیری بربط سے ہے سرمایہ دار — جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار — تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر — محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے تیرے انداز پر — خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[1] میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں — ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں — آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

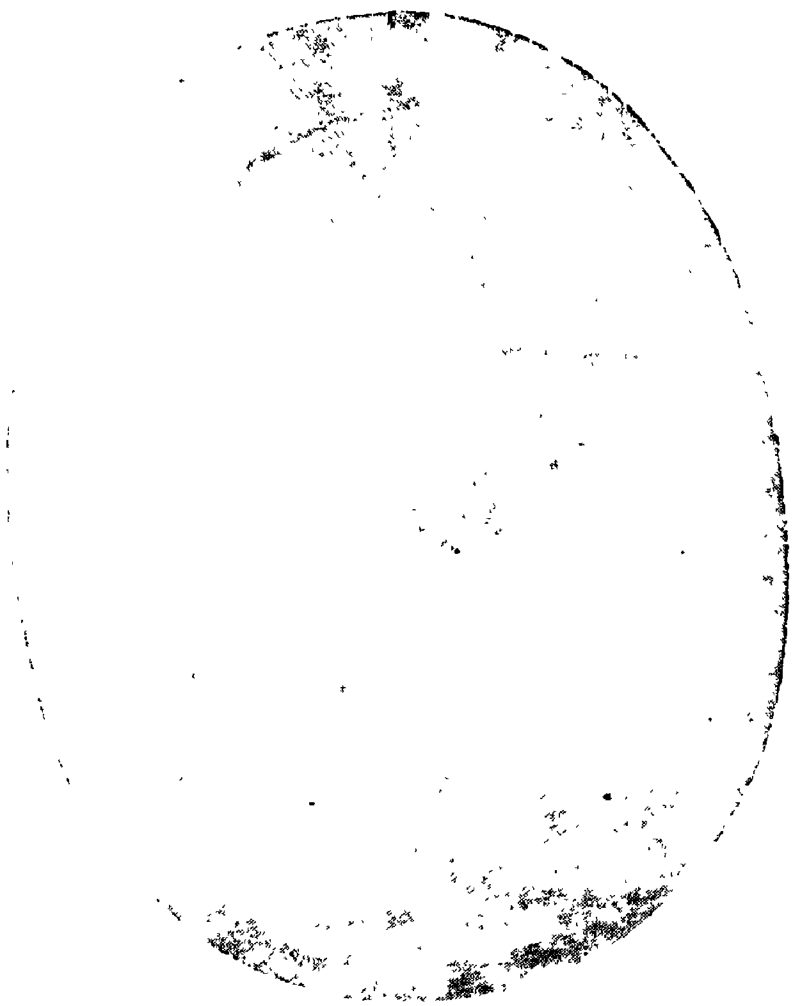
گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دلسوزیِ پروانہ ہے

اے جہاں آباد اے گہوارۂ علم و ہنر — ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرہ ذرہ میں تیرے خوابیدہ ہیں شمس و قمر — یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

علامہ اقبال مدظلہ

[1] ویمر میں جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے مدفون ہے



MIRZA GHALIB.



سہاگ کی رات

رُخصت کے وقت عجیب سماں تھا میرا خسر اور اس کے دونوں بیٹے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے گیس کی روشنی میں ان کے افسردہ چہروں پر حزن و ملال کے جذبات کا سایہ پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔

مَیں نے خیال کیا کہ شادی بھی کیا عجیب چیز ہے اس میں خوشی اور غم کے دو حیرت انگیز نظارے دوش بدوش نظر آجاتے ہیں۔

انجن نے سیٹی دی۔ مسافر جو باہر ٹہل رہے تھے جلد جلد ریل کے درجوں میں سوار ہونے لگے۔ میرے خسر نے کانپتا ہوا ہاتھ میرے سر پر پھیرا۔ اور میرے والد سے مصافحہ کیا میرے برادران نسبتی کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے مَیں نے بسجندہ پیشانی ان کو سلام علیک کہی۔

ڈاک گاڑی چل کھڑی ہوئی مسافروں کی چیخ پکار اور خوانچہ فروشوں کی سامعہ خراش صداؤں کے درمیان خدا حافظ کی تین آوازوں نے ہمیں رخصت کیا۔ لاہور کا سٹیشن انبوہِ کثیر کے ساتھ متحرک نظر آنے لگا۔

مَیں کچھ دیر تک کھڑکی سے باہر سر نکالے خاموشی سے لالٹینوں اور عمارتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ میرے دِل میں مسرت کے سمندر موجیں مار رہے تھے۔ مَیں صحرائے ہستی میں ایک خوش نصیب مسافر کی طرح ریگستان کی جلتی دُھوپ سے نکل کر ایک ایسے گلزار پُر بہار میں جا رہا تھا۔ جہاں طرح طرح کے سایہ دار درخت میووں سے لدے کھڑے تھے۔ جہاں سرد پانی کے مصفا چشموں کے کنارے رنگین اور معطر جھاڑیوں میں خوش الحان پرند مبارکباد کے ترانے الاپ رہے تھے۔

میری زندگی کا بالکل نیا اور نہایت خوشگوار دور شروع ہو گیا تھا۔ میرے جامِ مسرت میں برائے نام بھی تلخی نہ تھی۔ میری خورمی کے افق پر کوئی تاریک دھبہ نہ تھا۔ مجھے اپنی امیدیں مُسکراتی دکھائی دیتی تھیں۔

تمنّاؤں کے بعد میری شادی ہُوئی تھی۔ اور مَیں اپنی دُلہن کے ساتھ اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔

وفورِ خیالات نے میرے دماغ کو بیک وقت جوشِ مسرت اور فکرِ شعر کا جولانگاہ بنا رکھا تھا۔ اور مَیں اس ہنگامے کے درمیان کبھی کبھی ایک آدھ دل افروز مصرعہ گنگنانے لگتا تھا گاڑی میانمیر کے سٹیشن پر رُکی۔ ہمارا کمرہ ریزرو تھا جس میں صرف ہم چار شخص آرام کر رہے تھے مقابل کی نشست پر

میرے والد لیٹے ہوئے سونے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اُن سے اگلی نشست پر میری والدہ اور سب سے آخری نشست پر میری دُولہن اپنے رنگین لباس پر ایک گرم لبادہ اوڑھے سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔

گاڑی پھر چلنے لگی۔

مَیں نے ایک سرسری نگاہ شوق اس پر ڈالی۔ وہ ایک حسین گٹھڑی معلوم ہوتی تھی۔ اور میری دزدیدہ نگاہیں اسکے گھونگھٹ میں سے گزر کر ان رسیلی اور لجائی ہوئی آنکھوں کو ڈھونڈ رہی تھیں جن میں میرے پرجوش پیغام محبت کا جواب پوشیدہ تھا۔

والدہ نے کروٹ بدلی۔ اور بہو کو سو جانے کی تاکید کر کے محوِ خواب ہو گئیں۔

کھڑکیاں بند تھیں سرد ہوا سے بچنے کے لئے مَیں نے اپنے مقابل کی کھڑکی بھی بند کر دی۔ میری آنکھوں پر غنودگی کا ہلکا سا بوجھ تھا۔ مَیں نے اخبار اُٹھایا اور گدیلے سے ٹیک لگا کر لیٹے لیٹے پڑھنے لگا۔

شاید گاڑی بہت ہی تیز جا رہی تھی۔ اتنی تیز کہ اس کی حشر انگیز گڑگڑاہٹ کے تسلسل نے سکون کی صورت اختیار کر لی۔ یکایک مجھے معلوم ہوا کہ بجلی کی تیز روشنی مدھم ہو رہی ہے مَیں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی۔

والد کی نفیر خواب بلند تھی۔ والدہ پر بھی نیند کی بیہوشی طاری تھی۔ شاید میری دُلہن بھی بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ کیونکہ اس کا گھونگٹ جو تھوڑی دیر پیشتر اس کے حسنِ رخشاں کے چھپانے میں بخل سے کام لے رہا تھا اب اپنے فرض سے کسی قدر غافل ہو گیا تھا۔ مَیں کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکنے لگا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے۔ اور ایک سیاہ کملی کے ٹکڑے نے چاند کو لپیٹ لیا تھا ریل گنجان جنگل سے گزر رہی تھی۔ درختوں کے جھرمٹ دیووں کے لشکر کی چھاؤنی معلوم ہوتے تھے۔

دفعتاً مَیں اُچھل پڑا۔۔۔۔۔۔۔ آہٹ۔۔۔۔۔ مجھے ہیبتناک آہٹ اپنی گاڑی کے خانے کے اندر معلوم ہوئی۔ مَیں نے مڑ کر دیکھا تو دو آدمی پہلی کھڑکی کھول کر چلتی گاڑی میں سوار ہو گئے تھے۔ ان کی صورتیں خوفناک تھیں ان کی آنکھوں میں خون تھا۔ ان کے ہاتھوں میں چھرے تھے۔ کسی نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔ "ڈاکو" اور میرا دل اُچھل کر گلے میں آرہا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔

ہاں وہ ڈاکو تھے۔ ان میں سے ایک نے سامان اُوپر کے تختے سے اُتار اُتار کر گاڑی کے نیچے پھینکنا شروع کر دیا۔ اور دوسرا بیباکی سے میری بیوی کی طرف بڑھا۔

تعجب اور خوف نے مجھ پر غلبہ پالیا۔ میرا سانس نزع رُکا

سے چلنے لگا۔ بیشک میں اس غیر متوقع خطرے سے کسی قدر سہم گیا تھا۔ لیکن یکایک دُلہن کی چیخ نے میری غیرت کو بیدار کر دیا۔ میں اٹھ کر جھپٹا۔ اور اپنے محوِ خواب والدین کی نشستوں کو پھلانگ گیا۔

ڈاکو نے میری بیوی کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے چھرا اٹھایا ہی تھا کہ میں بجلی کی طرح اس پر جا پڑا۔ اور اس سے چھرا چھین کر پھینک دیا۔

نہ جانے کیوں میرے مُنہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ ہم دونوں میں کشمکش شروع ہوئی۔ میں خاصا طاقتور ہوں لیکن دوسرے ڈاکو نے میری کلائی اس زور سے پکڑی۔ کہ میں تھوڑی دیر کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اور ہانپنے لگا۔

دُلہن بیہوش ہو گئی تھی۔ پہلا ڈاکو جو اب میری گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس کی جڑاؤ بالیاں کانوں سے نوچنے لگا۔

دُنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ میں ڈاکو کی گرفت سے شعلۂ جوالہ کی طرح نکلا۔ اور دوسرے ڈاکو پر جا پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اور اس زور سے دبائی۔ کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ ان کی روشنی مدھم ہو کر رہ گئی۔ میری پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ میں بیدم ہو گیا تھا۔

لیکن دوسرا ڈاکو...... آہ میں اُسے بھول گیا تھا میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی.......

اُف میں نے ایسا رُوح فرسا واقعہ دیکھا۔ جس نے میری رگوں میں خون جما دیا۔

اُس نے میری بیوی کو دونوں ہاتھوں میں گٹھڑی کی طرح اُٹھا لیا تھا۔ اور کھڑکی کے قریب پہنچ چکا تھا۔

بے اختیار ایک چیخ میرے مُنہ سے نکلی لیکن چشم زدن میں اس نے میری بیوی کو گاڑی سے نیچے پھینک دیا۔ اور میرے اُٹھتے اُٹھتے خود بھی چلتی گاڑی سے کود کر غائب ہو گیا۔

میں دیوانہ وار کھڑکی کی طرف جھپٹا۔ گاڑی بہت تیز جا رہی تھی۔ اور جنگل تاریک تھا۔ درخت دیوزاد ڈاکوؤں کی طرح سیاہ گٹھڑیاں سروں پر اُٹھائے بھاگتے معلوم ہوتے تھے آسمان پر سیاہ بادلوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اور ستارے اس ہیبتناک نظارے کو دیکھ کر سہم گئے تھے۔ فضا دم بخود تھی۔

میں نے مڑ کر گاڑی کے اندر ایک نگاہ ڈالی۔ میرے والدین بدستور سو رہے تھے۔ گویا کوئی واقعہ ہی نہیں گزرا۔ نشست کے نیچے ڈاکو کی نعش اپنی منحوس اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

میرے سینے سے ایک آہِ دلدوز نکلی۔ کچھ سوچنے یا والدین کو بیدار کرنے کے لئے وقت نہ تھا۔ میں برق رفتا

گاڑی کے پائدان پر کھڑا ہو گیا۔ بدن کو تولا۔ اور چھلانگ مار دی
میں ایک جھاڑی پر جا گرا تھا۔ میرے کوئی چوٹ نہیں
آئی۔ نہ کوئی آواز پیدا ہوئی۔ میرے دیکھتے دیکھتے چشم زدن میں
گاڑی میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اٹھا اور تیر کی طرح
پیچھے کی طرف بھاگا۔

ہولناک جنگل، اور اندھیرا، اور ہیبتناک سناٹا۔

میں دیوانہ وار ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے
بھاگ رہا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کچھ دکھائی
نہ دیتا تھا۔ خاردار جھاڑیوں میں میرا لباس الجھ الجھ جاتا تھا۔
لیکن میں دوڑتا رہا — بے تحاشا . . .

دم پھولا ہوا تھا۔ ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ مگر
کوئی مجھے کھینچ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کتنی دور
آ گیا۔ کہاں پہنچ گیا۔ میری گم شدہ دولت کہاں مردہ پڑی
ہے۔ اس کا کیا حشر ہوا۔

اچانک میرے پاؤں کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ اُف
میں سر سے پاؤں تک لرز کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ
ٹھوکر کے ساتھ ہی کراہنے کی ایک ہلکی سی آواز میرے
کان میں آئی۔

چاند کے چہرے سے بادلوں کا نقاب سرک گیا
تھا۔ اور اس کی اندوہناک روشنی میں میری بیوی کا مرجھایا
ہوا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

یہ میری نئی نویلی دلہن تھی۔ جو عالم بیکسی میں ایک مظلوم انداز
سے گھاس پر بیہوش پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خون کے
دھبے تھے۔ اس کے لمبے سیاہ بال ایک جھاڑی میں اُلجھے
ہوئے تھے۔

آہ یہ وحشتناک جنگل۔ یہ ہو کا مقام۔ درندوں کا مسکن۔
اور ایک ننھی سی جان۔

"شاید وہ مر گئی ہو۔"

میں کانپ گیا۔ اور بے اختیار میں نے پہلی مرتبہ اس
کا نام لیکر پکارا۔ میری آواز جنگل کی اتھاہ خاموشی میں ڈوب گئی
کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے جھک کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا
امید کی لہر میرے دل میں تھرتھرائی۔ اس کا سینہ متحرک تھا۔
مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ زندہ ہے۔ میں نے اُلجھے ہوئے دوپٹے سے
اس کے چہرے اور کانوں کا خون صاف کیا۔ میں نے دیکھا
کہ اس کو زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ شاید جھاڑی میں گرنے کی
وجہ سے اس کی جان بچ گئی تھی۔ لیکن کانٹوں نے اس کے
پھول سے رخساروں پر کچوکے لگا دئے تھے۔ اور سرخ سرخ
نشان چاند کی روشنی میں ایسے معلوم ہوتے تھے۔ گویا سفید
گلاب پر پیازی دھاریاں۔

اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ لب کھلے ہوئے تھے میری
آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے اس کے اُلجھے ہوئے
بال جھاڑی سے الگ کئے۔ اس کشمکش میں ایک چڑیا پرونکو

پھڑپھڑاتی ہوئی۔ جھاڑی سے اڑی۔ اور بیتابانہ میرے سر کے گرد چکر لگا کر تاریک سکوت میں غائب ہوگئی۔

اس کی پرواز سے میں چونک اٹھا۔ مجھے خوف نے گھیر لیا۔ میری بیوی بیہوش پڑی تھی۔ اور میں اس ہیبتناک ویرانے میں اسے تنہا چھوڑ کر پانی کی تلاش میں نہ جاسکتا تھا

سوچنے کے لئے میں نے کبھی اس سے زیادہ اپنے دماغ پر زور نہیں دیا۔ لیکن مجھے معلوم نہ ہوسکا۔ کہ میں کس جگہ پر ہوں۔ بادل روشنی پر پھر قابو پاگئے۔ اور گیدڑوں کے شوروغل نے اس وحشتناک مقام کو اور بھی بھیانک بنادیا۔

میں نے ریلوے لائن کی طرف دیکھا۔ پھر ستاروں کی طرف نظر دوڑائی۔ نصف شب کے آثار معلوم ہوتے تھے۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں سے سٹیشن کتنی دور ہے۔ لیکن میں نے اپنی بیوی کو کندھوں پر لاد لیا۔

میرے دماغ میں غمگین اور متضاد جذبات کے طوفان بھرے ہوئے تھے۔ اور میں اپنے حسین بوجھ کو اٹھائے ریل کی پٹڑی پر چلا جارہا تھا۔ اس امید میں کہ شاید کوئی سٹیشن مل جائے۔ اور اسکی جان بچ جائے۔

"اگر یہ مرگئی"

آہ یہ خیال خوفناک تھا۔ دنیا پھر میرے لئے مرجھا رہی تھی۔

"بیکار زندگی۔ سویرے اٹھ بیٹھنا۔ کھانا کھالینا۔ پانی پی لینا۔ سو رہنا۔ ایسی زندگی اب تو نہ ہوسکیگی"

نہ جانے میں ان خیالات میں محو کبتک چلتا رہا۔ یکایک میری بیوی پھر کراہی۔ میں نے اسے پٹڑی پر لٹا دیا۔ لیکن وہ بدستور بیہوش تھی۔

فضا اور زیادہ تاریک ہوگئی تھی۔ میں نے اُسے پھر اُٹھایا۔ اور بادوباراں کے خوف سے چلتا رہا چلتا رہا۔

پٹڑی کے دونوں طرف جھاڑیاں ہوا سے ہلنے لگیں آسمان پر ہر طرف بادل اُمڈ اُمڈ کر آگئے۔ بجلی چمکنے لگی۔ وہم ہزارہا قسم کی صورتیں میرے سامنے پیش کرنے لگا۔ گیدڑوں کی چیخ پکار اور درندوں کے خوف نے میرے خون کو منجمد کردیا۔ میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔

اگرچہ تھکان نے مجھے نیم مردہ بنادیا تھا لیکن فرض کا احساس محبت کا جذبہ اور شاید جان کا خوف مجھے دوڑائے لئے جاتا تھا۔ تند ہوا کا جھکڑ درختوں کو اکھاڑے ڈالتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ فطرت نے میری امیدوں کے خلاف سازش کرلی ہے۔ اب مینہ اور اس کے ساتھ اولے پڑنے شروع ہوگئے۔ اور قریب تھا کہ میں مایوس ہوکر گر پڑوں۔

میں نے اپنی مجبور اور عاجز نظریں پٹڑی پر دور تک دوڑائیں۔ مجھے دور سے سگنل کا سرخ لیمپ چمکتا دکھائی دیا۔ میرے قدم اور بھی تیز ہوگئے۔

سردی سے ٹھٹھرتا ہوا اور پانی میں شور بور، اپنی دولت کو اُٹھائے ہوئے میں اس چھوٹے سے سٹیشن کے ذلیل مسافر خانے میں داخل ہو گیا۔ جہاں صرف ایک لالٹین جل رہی تھی۔ مجھے کسی متنفس کے سانس تک کی آواز کسی طرف سے سُنائی نہ دی شاید یہاں رات کے وقت کوئی گاڑی نہ ٹھہرتی تھی۔ سٹیشن ماسٹر کا کمرہ اندر سے بند تھا۔ وہ سو رہا ہوگا۔ باہر مینہ اور اولے پڑ رہے تھے۔ میں نے بیوی کو ایک بنچ پر لٹا دیا اور خود ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

خشک گھاس کا ایک ڈھیر مسافر خانے کے کونے میں پڑا تھا۔ میں اسے خوش قسمتی سمجھا۔ میں نے اسے اُٹھایا اور بنچ کے قریب فرش پر جمع کر دیا۔ پھر لالٹین میں سے بتی نکالی اور بڑی مشکل سے ہوا کے جھونکوں سے بچاتا ہوا اسے گھاس کے پاس لے آیا۔ اور آگ لگا دی۔ مصیبت نے مجھے سردی سے محفوظ رکھنے کی یہ ترکیب سکھا دی تھی۔

خاطر خواہ اثر ہوا۔ دلہن کے سفید چہرے پر تشنج کے جو آثار پیدا ہو گئے تھے۔ دُور ہونے لگے۔

میں نے مسافر خانے کے گھڑے سے پانی کا ایک چلو لیکر اس کے حلق میں چند قطرے ٹپکائے۔ اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میں اس وقت خلا میں معلق ہوں۔ آگ کی روشنی میں اس کے سفید زخمی چہرے پر رنگ آتے جاتے معلوم ہوتے تھے۔ اور میں امید و بیم کی تصویر بنا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

باد و باراں نے طوفان برپا کر رکھا تھا ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ آگ کے شعلے کبھی ادھر کبھی اُدھر لپکتے تھے۔ جنگل کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ لیکن مجھے معلوم ہوتا تھا۔ کہ دُنیا سکوت میں غرق ہو گئی ہے۔ میرا سانس بھی تھکا ہوا چل رہا تھا۔

"آہ میری دلہن! ابھی تو گھر بھی نہ پہنچی۔ بات بھی نہ کی آہ شادی تیرے لئے مصیبت کا پیغام ہو گئی"

جوشِ گریہ سے میرا گلا بھر آیا تھا۔ اور زبان خاموش تھی مگر میرا رواں رواں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا میرے کلیجے میں ایک گداز آمیز درد اُٹھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی تک بیہوش تھی۔ میں نے اس کے حنا آلیدہ ہاتھ جن پر چھلّوں اور پہنچیوں کے بیرحمی سے اُتارنے کے باعث چرکے لگے ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھ میں لیکر ملنے شروع کئے۔

ایک بار پھر وہ ہلکے سے کراہی میں ہمہ تن چشم بن کر اسکے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ آنکھیں کھول رہی تھی۔ میں نے اس کا نام لیکر پکارا۔ اس نے میری صدا پہچان لی نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اور شرم کی سرخی نے اس کے چہرے پر ہلکا سا غازہ مل دیا۔

وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا کر آہستگی سے سرک

لے گئی۔ شاید وہ گھونگٹ نکالنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے پھر پکارا۔ "پیاری منہ سے بولو۔ شرم کا وقت نہیں ہے۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ تمہیں ہوش تو ہے؟"

اُس نے حیرانی سے آگ اور مسافر خانے کی دیواروں کی جانب دیکھا۔ خوف پھر اس کے دماغ پر مستولی ہو گیا تھا۔ اس نے جھجک کر دونوں ہاتھوں سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کانپ رہی تھی۔

میں نے تسلی کے لہجے میں کہا۔ "تم بالکل سلامت ہو اب کوئی خطرہ نہیں۔ دیکھو میں تمہارے پاس موجود ہوں کیا تم میں اُٹھنے کی ہمت نہیں۔ تمہارے کپڑے بھیگ رہے ہیں۔"

یہ کہکر میں اُسے اُٹھانے لگا۔ وہ کراہتی ہوئی اُٹھ بیٹھی لیکن میرے آغوش سے علیحدہ ہو گئی۔ اور شرمائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ بولنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن کسی خیال سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آیا۔ اُس نے پوچھا۔

"ہم کہاں ہیں؟"

میں اسے جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ یکلخت ایک زور کا دھماکا ہوا۔ میری بیوی کے لبوں سے خوفناک چیخ نکلی۔ ایک ہیبت ناک روشنی سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور ایک نامعلوم صدمے نے مجھے منہ کے بل گرا دیا۔

"یہ بجلی تھی۔"

میں جلدی سے اُٹھا۔ لیکن آہ۔ میری دلہن کی جھلسی ہوئی نعش راکھ پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ اسکے کپڑے سلگ رہے تھے۔

میں مردے کی طرح سکتے کے عالم میں وہاں پڑا رہا۔ آخر ایک شخص کے جھنجھوڑنے سے مجھے ہوش آیا۔ وہ مجھے پکڑے ہوئے اِدھر اُدھر گھسیٹ رہا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک کچھ نہ سمجھا لیکن رفتہ رفتہ تمام روح فرسا حقیقت مجھے یاد آ گئی۔ دو تین سٹیشن کے خلاصی یا کانٹے والے سیاہ کپڑے پہنے اور ایک بابو جو شاید سٹیشن ماسٹر تھا۔ لالٹین پکڑے میرے گرد کھڑے تھے۔ میرے قریب ہی میری بیوی کی جلی ہوئی نعش پڑی تھی۔ اس کے اردگرد جھلسی ہوئی اینٹیں اور چونا پڑا تھا۔ مسافر خانے کی سنگین چھت میں شگاف نظر آ رہا تھا۔

میرے جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ شادی کے تمام کپڑے پھٹ گئے تھے۔ بال اُلجھے ہوئے اور خاک آلودہ تھے۔ بابو نے مجھے پوچھا۔ "تم کون ہو اور یہ عورت کون تھی؟"

میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ میری آنکھوں کے سوتے کھل گئے۔ ایک خلاصی بولا۔ شاید وہ بجلی اسی عورت پر گری ہے۔ توبہ توبہ گنہگاروں کو دنیا ہی میں سزا مل جاتی ہے۔

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے تھے؟ میں بولا:۔ "میں مصیبت زدہ ہوں مجھے ڈاکوؤں نے لُوٹ لیا ہے"

وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ سٹیشن ماسٹر نے کہا۔

"تم اس عورت کو ایسی اندھیری رات میں کہاں سے بھگا کر لاتے ہو۔ اس کا زیور کہاں ہے؟"

میں بہت متعجب ہوا۔ اس شخص کو ایک شریف آدمی کی مصیبت پر ہنسنے کا کیا حق تھا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ بکو مت نہ کرو۔ یہ میری بیوی ہے جسے میں نے... ڈاکوؤں نے چلتی گاڑی سے گرا دیا تھا۔ میں اسے بچانے کے لئے گاڑی سے کود پڑا۔ اور اسے جنگل میں سے اٹھا کر یہاں لے آیا۔ یہاں اس پر بجلی گر گئی۔

لیکن مجھے ان لوگوں کے چہروں سے معلوم ہوا کہ میری کہانی کا انہیں یقین نہ آیا تھا۔

بابو نے خلاصیوں کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے اُٹھانے لگے۔

بابو نے کہا: "گاڑی ابھی آتی ہے تمہیں پولیس کے سپرد کر دیا جائیگا وہاں سب حال کُھل جائیگا۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا اور نہ مزاحمت کی اُنہوں نے مجھے بنچ پر بٹھا دیا۔ اور میری بیوی کی لاش بھی میرے پاس رکھ دی ایک آدمی مجھ سے کچھ دُور ہٹ کر بیٹھ گیا۔

بارش ختم ہو چکی تھی۔ اور دُھلے ہُوئے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے میں نے اپنے حواس فراہم کئے۔ اور اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے لگا۔ آہ مجھے زندگی اور مستقبل جہنّم معلوم ہونے لگے۔

میں بہت جلد ایک فیصلے پر پُہنچ گیا۔

گاڑی کی دھمک پلیٹ فارم کے بالکل نزدیک سُنائی دی۔

میں نے جُھک کر اپنی دُلہن کے جلے ہُوئے ہونٹوں کا پہلا اور آخری بوسہ لیا۔ اور ایک دیوانے کی طرح دوڑا۔ خلاصی چیختا ہوا میرے پیچھے بھاگا۔ انجن بالکل سامنے آگیا تھا۔

خلاصی کے بازو نے میرے شانے کو جکڑ لیا۔ لیکن میں نے جست لگائی۔ اور پٹڑی کے درمیان آگیا۔

اور انجن کی ٹکر سے میرا سر پاش پاش . . . .

میں نے یکایک بیدار ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ والد میرا شانہ ہلا ہلا کر مجھے جگا رہے تھے۔

"اُٹھو اُٹھو۔ اپنے شہر کا سٹیشن آگیا۔"

اتنے میں گاڑی رُکی۔ پلیٹ فارم پر میرے رشتہ دار اور دوست دُلہا دُلہن کے خیر مقدم کے لئے کھڑے تھے۔ باجے سے مبارکباد کی سریں نکل رہی تھیں۔ ہر طرف صبح صادق کا نور پھیلا ہُوا تھا۔

میں نے تشویش سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ والدہ دُلہن کو برقعہ اُڑھا رہی تھیں۔ دُلہن کے زیوروں کی جھنکار اور ہنسی قہقہوں کے درمیان میں اُٹھ بیٹھا۔

واقعی میں نے خوفناک خواب دیکھا تھا۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

برسات

آئی ہے برسات چھائی ہے برسات
کوہ و دمن پر۔ دشت و چمن پر۔ شہر او بن پر
دوشیزہ جوبن بے ساختہ پن
رنگیں جوانی سبز اور دھانی
گلپوش جلوے مدہوش نغمے
دلکش فضائیں ٹھنڈی ہوائیں
اُودی گھٹائیں
لاتی ہے برسات
آئی ہے برسات چھائی ہے برسات

گھر گھر کے آیا ہر پھر کے چھایا
تُند اور دھواں دھار۔ تاریک و بسیار۔ ابر گہر بار
بجلی چمکنا نظروں میں جھپکنا
توبہ یہ کڑکا سینوں کا دھڑکا
بوندوں کی بھرمار مینہ موسلا دھار
ہر سمت یکدم جل تھل کا عالم
پُر لطف موسم
حق نے دکھایا
گھر گھر کے آیا ہر پھر کے چھایا

بیٹھے ہیں میخوار نشوں میں سرشار
گھر بار برباد۔ میخانے آباد۔ بندش سے آزاد
جیبیں ہیں خالی ہمت ہے عالی
پروا نہیں ہے دھڑکا نہیں ہے
دینا ہے ساقی قرض آج خود ہی
دریا دلی سے سو دلبری سے
اپنی خوشی سے
بے حیل و تکرار
بیٹھے ہیں میخوار نشوں میں سرشار

آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے
مہ پیکروں نے۔ برق افگنوں نے۔ سیمیں تنوں نے
گیت اُن کے پیارے میٹھے رسیلے
ہلکی صدائیں سادہ ادائیں
گل پیرہن ہیں غنچہ دہن ہیں
خود مسکرانا خود منہ چڑھانا
پھر جھینپ جانا
الھڑ پنے سے
آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے

اٹھلا رہی ہیں اترا رہی ہیں
حورانِ ارضی۔ خوبانِ ہندی۔ رونق گھروں کی
نازک دوپٹے رنگین ہلکے
سر پر سنبھالے شانوں پہ ڈالے
مینہ لاکھ برسے جی لاکھ ترسے
جھانکیں نہ در سے شوہر کے ڈر سے
اپنی نظر سے
شرما رہی ہیں
اٹھلا رہی ہیں اترا رہی ہیں

بے فکر آزاد خوشباش دلشاد
نادان انجان۔ کرتی ہیں سامان۔ پکتے ہیں پکوان
نوخیز کمسن ہم عمر ہمسن
ننھے فرشتے اور ناطے رشتے!
گڑیا کی شادی ملکر رچا دی
ڈھولک بجانا مل مل کے گانا
سب کچھ بھلانا
ماں بھی نہیں یاد
بے فکر آزاد خوش باش دلشاد

گلشن کی دُنیا ہے مست گویا
جوشِ نمو سے۔ اور رنگ و بو سے۔ حق ہو سرہ سے
کوئل کی آواز مستی کی غماز
ہر برگ بینوش ہر شاخ مدہوش
پھولوں کی بستی ہے غرق مستی
میکش پپیہے ہیں مست پی کے
بُلبل کے نغمے
مستی سراپا
گلشن کی دُنیا ہے مست گویا

زاہد کی گھاتیں بے کیف باتیں
عقبیٰ کے جھگڑے۔ جنّت کے قصّے۔ پینے کے طعنے
یہ بھی رہا خوب! واللہ کیا خوب!
رند اور ہٹ جائیں! ہم اور پلٹ جائیں!
میخانہ چھوڑیں! شیشوں کو توڑیں!
دل پر کریں جبر! عشاق اور صبر!
یہ رت ہو یہ ابر!
یہ دن یہ راتیں!
زاہد کی گھاتیں بے کیف باتیں

ابوالاثر حفیظ جالندھری

سازندہ

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میں پیرس کے ایک چھوٹے سے غیر معروف کوچے میں سکونت پذیر تھا۔ سائنس کے شغف نے مجھے زاویہ نشین بنا رکھا تھا۔ اور میں وہاں رات بھر اپنے کام میں منہمک رہتا تھا۔ دن کو ایک لائبریری میں چلا جاتا۔ جو نزدیک ہی تھی۔ ان نوجوانوں کی طرح جو اپنے کام کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ میں کفایت شعارانہ بلکہ زیادہ صحیح یہ کہ درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا ایک نواحی پارک کی سیر میری تفریح کے لئے کافی تھی۔ جہاں غریبانہ کپڑے پہنے میں لوگوں سے گھل مل کر ان کی عادات کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ میں سودا سلف کے معاملات میں ان سے ربط ضبط پیدا کرتا اور ہوٹلوں میں ان کے ساتھ تاش کھیلتا۔

چونکہ فطرت نے بھی یہ ملکہ کسی حد تک عطا کر رکھا تھا لہٰذا میں نے جلد ہی انسانی خصائل کے پہچاننے میں مہارت حاصل کر لی کوئی شخص خواہ کسی پوشاک میں ملبوس ہو اور مجھے دھوکا دینے کی کتنی ہی کوشش کرے میں فوراً بھانپ لیا کرتا تھا۔ کہ وہ کیسا آدمی ہے اور اسکی گزشتہ زندگی کس طرح گزری ہے بعض اوقات میں اپنی اس قوتِ مشاہدہ کی بدولت اپنی نظروں میں ایسا ہی امیر کبیر معلوم ہونے لگتا تھا جیسا کہ خلیفہ بغداد اپنے مال و متاع کی موجودگی میں۔ الغرض میں ہر روز شام کے وقت کسی دلچسپ آدمی کی تلاش میں چکر لگایا کرتا تھا۔

کبھی کبھی مجھے اپنی کوشش کا صلہ مل جاتا۔ ایک رات مجھے خاص طور پر کامیابی ہوئی۔ میں نے ایک مزدور کو اپنی بیوی کے ہمراہ کسی محفل سماع سے واپس آتے دیکھا۔ اور دل بہلانے کی غرض سے ان کے پیچھے چل پڑا تاکہ خفیہ طور پر انکی گفتگو سنوں وہ اپنے تھیٹر کے مشاہدات کا ایک عجیب پیرایہ میں ذکر کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے ان کے ذاتی معاملات گفتگو کا موضوع بن گئے۔ ان کا بچہ انکے ساتھ گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ بچہ ان سے چھوٹنے کی زبانی اور عملی کوشش میں مصروف تھا۔ اور کھیل کے متعلق سوال پر سوال کئے جاتا تھا۔ مگر اس کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ مالی معاملات اور ہفتہ آئندہ کی آمدنی کے خرچ کا بہترین طریق معرضِ بحث میں آ گیا۔ بہت سی تجاویز جانبین نے پیش کیں۔ "آلو کتنے مہنگے ہیں؟ اور صبح ہی نانبائی نے کہا تھا۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

پھر وہ اس بات پر بحث کرنے لگے۔ کہ آیا مرد جو محنت مشقت کے لئے مارا مارا پھرتا ہے بہتر ہے یا عورت جو گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نہیں رکھتی؟ مباحثہ گرم ہو گیا۔ پھر وہ تلخ کلامی پر آ گئے۔ اور دونوں اپنی اپنی اور ایک دوسرے کی عجیب و غریب عادات و خصائل کا حال ظاہر کرنے لگے۔

میں تخیل کے زور سے اپنے تئیں ان کی سی زندگی بسر کرتے دیکھنے لگا۔ پھٹے ہوئے چیتھڑے۔ ٹوٹا ہوا جوتا اور دُنیاوی افکار کا طومار۔ رہنے کے لئے ایک نمدار شکستہ جھونپڑا کھانے کو سرد آلو اور خشک روٹی اور تفریح کے لئے تین آنے فی ٹکٹ خرچ کرنے پر تھیٹر کا تماشہ اور وہ بھی شاید سال بھر میں ایک بار۔ میں خیال ہی خیال میں دوسروں کے مصائب تکالیف کا اندازہ ایسا مکمل کر لیتا ہوں۔ کہ وہی آلام خود مجھے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اور اپنے تئیں دوسروں کی حالت میں تصور کرکے ان کے واقعات پر غور کرنے کی مجھ میں اتنی قابلیت پیدا ہو گئی ہے۔ گویا میں اور وہ ایک ہی شخصیت ہیں۔

کیا یہ کوئی عجیب دماغی قابلیت ہے؟ اس میں کوئی فایدہ بھی ہے یا نہیں؟ کیا یہ مجھے اپنی اور دوسروں کی مدد کے قابل بنا سکتی ہے؟ آیا اس کا غلط استعمال بھی ممکن ہے؟

مگر میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ مجھے اسکی تہ تک پہنچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ مجھے یہ قابلیت حاصل ہے۔ اور میں اس کا بہترین استعمال کرونگا کوئی بھی اپنی قابلیتوں کا بُرا استعمال کرنے کی خواہش نہیں رکھتا اگر کوئی غلط راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کا سبب عموماً اتفاق ہوتا ہے یا اخلاقی کمزوری۔

لیکن اس قابلیت کی مشق سے میں اس مخلوق کو جان گیا تھا۔ جسے انسان کہا جاتا ہے۔ میں ان کے نیک خصائل اور کمزوریاں سمجھ گیا تھا۔ ان میں بہادر۔ مخترع اور مختلف علوم کے ماہر پائے جاتے تھے۔ لیکن انہیں میں بدکار۔ چور۔ جفاکار شرابی اور افیونی نظر آتے تھے۔ اور ایسے آدمی بھی ملتے تھے۔ جن کا افلاس نے کچومر نکال رکھا تھا۔ پیرس تکلیفوں کا شہر ہے۔ اور میں نے اسے کارناموں۔ گناہوں اور غم انجام واقعات سے بھرا ہوا پایا ہے۔ اس میں دونوں اوصاف ہیں۔ خوبصورت بھی ہے اور خوفناک بھی۔

لیکن دنیا کے تمام اخبارات ملکر بھی سچائی کو پورے طور پر ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی وجہ نہایت صاف اور سادہ ہے۔ یعنی تصور سچائی پر رنگ چڑھا دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم وہی ظاہر کرنا چاہتے ہوں جو ہم نے دیکھا ہے۔ لیکن ہمارا تصور فوراً اس واقعے میں دخل حاصل کرکے اس کے ساتھ شیر و شکر ہو جاتا ہے۔ فرض کرو ہم صرف اتنا نہیں کہ "کل رات ایک عورت ڈوب مری" جب تک ہم نے اس واقعہ کو نہ دیکھا ہو ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ صحیح ہے لیکن اگر ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہوں تو پھر ہم اسے اتنے اختصار کے ساتھ بیان کرنے پر قانع نہ ہونگے۔ چونکہ واقعہ کا ہمارے دل پر ایک خاص اثر ہوا ہوگا۔ اس لئے ہم اسے رنگین الفاظ کا جامہ پہنائے،

کوشش کرینگے۔ سچائی ہماری نظروں کے سامنے نہیں آتی وہ انسانی مصائب کے ذلیل اور عمیق غاروں میں پنہاں رہتی ہے۔ کوئی اسے وہاں ڈھونڈنے نہیں جاتا میں نے خود ابھی تک یہ تکلیف گوارا نہیں کی۔

میں حیران ہوں کہ ابھی تک میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہا اور وہ کہانی جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ شروع نہیں کی۔ تمام واقعات جو میری نظر سے گزر چکے ہیں میرے دماغ کے تھیلے میں ایک مجموعہ پریشان کی طرح پڑے ہیں۔ جب ضرورت ہوتی ہے ان میں سے کوئی سا نکالنے لگتا ہوں۔ لہٰذا یہ کہانی میں نے اس لئے شروع نہیں کی کہ یہ کسی لحاظ سے بہترین ہے۔

ایک دن مکان کی مالکہ نے مجھے اپنے ایک رشتہ دار کی شادی پر مدعو کیا۔ میں اس کی بہت عزت کرتا۔ وہ باوجود سخت محنت کے بھی تھوڑا کماتی تھی۔ اور اس کے خاوند کی روزانہ مزدوری پانچ شلنگ تھی۔ ان کے تین بچے تھے۔ اور میں نے ایسی محنتی اور دیانتدار ہستیاں آجتک نہیں دیکھیں۔ جب میں پیرس کے کسی اور حصے میں بھی سکونت پذیر ہوتا۔ وہ میرے جنم دن کی تقریب پر ضرور آتی۔ اور میرے لئے پھول اور نارنگیاں بطور تحفہ لاتی۔ تاہم بیچاری کی آمدنی بہت کم تھی۔

غریبی نے ہم دونوں کو یکجا کر دیا تھا۔ مجھے زیادہ کرایہ ادا کرنے کا مقدور نہ تھا۔ اور وہ زیادہ کما نہیں سکتا تھا تاہم اُس نے کبھی مجھے چھوڑ کر کوئی امیر کرایہ دار ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لئے میں بھی کرایہ وقت پر ادا کر دیتا تھا۔ خواہ قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔

میں نے اس خیال سے کہ ان غریب مگر نیک لوگوں کی سادہ خوشی سے مجھے ایک خاص حظ حاصل ہوگا۔ شادی پر جانے کا وعدہ کر لیا۔

شادی کی ضیافت اور ناچ ایک میفروش کی دکان کے اوپر ایک بڑے کمرے میں ہوا جو اس موقع کے لئے خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ میں وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ اسی پچاسی آدمی اپنے فیتوں سے سجے ہوئے بہترین لباس میں وہاں جمع تھے۔ ناچ شروع ہوا۔ جلد ہی اتنا شور ہونے لگا۔ اور سب کے سب رقص و سرود میں ایسے محو ہو گئے گویا دوسرے دن قیامت آنے والی تھی۔ اور وہ اس مقولے پر عمل پیرا تھے "کھاؤ پیو اور عیش کرو کیونکہ کل تم مر جاؤ گے"۔ ان کی پھبتیاں عامیانہ اور عریاں تھیں لیکن اتنی سوقیانہ اور خطرناک نہ تھیں۔ جتنے کسی شریف گھرانے کی تربیت یافتہ نوجوان دوشیزہ کے شرمیلے اور دزدیدہ اشارے

ہر فرد بشر محو شادمانی تھا۔ گویا خوشی ایک متعدی مرض تھی۔ کمرہ نہایت عجیب معلوم ہوتا تھا۔ دیواریں بدنما سرخ

نقش ونگار سے مزین تھی۔ اور ہوا شراب کی بدبو سے آلودہ سٹیج پر تین اندھے بیٹھے تھے۔ جن میں ایک تو نفیری بجا رہا تھا۔ دوسرا شہنائی اور تیسرا العوزہ۔

ان کو اس شام کے لئے پانچ شلنگ فی کس دیئے گئے تھے۔ اس لئے ان سے اعلٰے قسم کے نغموں کی توقع فضول تھی۔ وہ جس وقت جو کچھ چاہتے اور جس طرح چاہتے الاپ دیتے۔ تاہم انہوں نے سب کو خوش کر لیا۔ کیونکہ شخص خود بخود خوش ہونے پر آمادہ تھا۔

مَیں اس کونے میں پہنچا جہاں یہ تینوں بیٹھے تھے۔ مجھے خانہ بدوش سازندوں سے خاص اُنس ہے۔ کیونکہ یہ ایک پُراسرار طبقہ ہے۔ جو آدھا تو اس دُنیا کا معلوم ہوتا ہے اور آدھا اس خطے کا جہاں سے ان پر موسیقی نازل ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مَیں ہمیشہ اپنے تئیں ان ہی کا ایک فرد سمجھتا ہوں۔ اور آج رات تو اپنی اسی عجیب قابلیت کی بدولت مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میری روح شہنائی نواز کے جسم میں حلول کر گئی ہے۔

نفیری اور العوزہ بجانے والے تو واقعی عوام میں سے معلوم ہوتے تھے لیکن شہنائی نواز کے خط وخال غیر معمولی طور پر مؤثر اور دلکش تھے۔ اس کا چہرہ ڈینٹے کے بنائے ہوئے سنگ مرمر کے بُتوں سے مشابہ تھا۔ لیکن سُرخی کی جھلک بھی موجود تھی۔ سر پہ گھنے نقرئی بال تھے۔ بشرے پہ رنج والم کے آثار اور آنکھوں میں غیر معمولی جذبات کی چمک کبھی کبھی وہ اپنے نغموں کی دھن میں والہانہ طور پر محو ہو جاتا تھا۔ وہ اطالوی معلوم ہوتا تھا۔ اور اگرچہ بے پروائی سے شہنائی بجا رہا تھا اور کوئی مشکل سُر نکالنے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ تاہم یہ امر بالکل درست ہے۔ کہ وہ اپنے ساتھیوں سے زیادہ کاریگر تھا۔

استقلال اور بزرگی اس کے چہرے سے عیاں تھی وہ ایک طباع شخص تھا لیکن غیر معروف۔ تاہم اس گل ویرانہ میں ایک خاص کشش تھی جو دلوں کو اپنی طرف مائل کر لیتی تھی۔ اس کا سر بہت بڑا تھا۔ جو اس کے عالی دماغ ہونے کی دلیل تھی۔ مجھے وہ کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنی ذلیل حالت کے احساس پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اس سرد مہری کے زمانے میں اپنی قابلیت ہی اس کے لئے باعثِ تسلی تھی۔

اس کے چہرے پر ان ولولہ انگیز جذبات کے نشان موجود تھے۔ جو کبھی تو انسان کو ایک مشہور ومعروف شجاع یا فرشتہ بنا دیتے ہیں۔ اور کبھی چور اور مسرف۔ اس کے استخوان گویا ایک پنجرہ تھا۔ جس میں ایک شیر ژیاں خوابیدہ تھا جو رہائی کی تمام کوششوں میں ناکام رہنے پر دبک کر بیٹھ گیا ہو۔ غصے میں اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں سے اس طرح شعلے نکلتے معلوم ہوتے تھے گویا رات کے وقت رہزن ہاتھوں میں مشعلیں لئے غار سے برآمد ہوتے ہیں۔ یا اس

اس کے تمام خیالات پر قبضہ جماتے بیٹھی تھی۔ اس کا دل بجھ چکا تھا۔ پیشانی کے بل اور چہرے کی جھریاں گزشتہ جوش و خروش کے خروج کا پتہ دیتی تھیں۔

دوسرے دونوں نوازندے وقتاً فوقتاً اپنے سازوں کو گلے سے لٹکا کر ساغرو مینا کی طرف ہاتھ بڑھاتے، اور بڑے اشتیاق سے پیاس بجھاتے لیکن جب وہ شہنائی نواز کے سامنے کچھ پیش کرتے تو وہ ایک انداز ممنونیت سے سر ہلا کر انکار کر دیتا۔

ان دونوں کو مشغول مینوشی دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا۔ "دوست تمہارا وطن کہاں ہے؟"

اس نے اطالوی لہجے میں جواب دیا۔ "وینس"

"کیا تم مادر زاد نابینا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا کوئی حادثہ وقوع پذیر ہوا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"میں مادر زاد اندھا نہیں ہوں"

"میں نے وینس کی بابت اتنا کچھ سن رکھا ہے کہ میرا جی وہاں جانے کو ترستا ہے"

بوڑھے کے دل میں جذبات نے ہلچل ڈال دی وہ کہنے لگا "اگر میں آپ کے ساتھ جاؤں تو آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہو"

پھر وہ تینوں نغمہ نوازی میں مشغول ہو گئے۔ اور جب وہ دیہاتی رقص کے ساتھ ساتھ اپنے سازوں کے سُر ملا رہے تھے اپنے کام میں مصروف تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ

بوڑھا کچھ میری نسبت سوچ رہا ہے۔ اور خیال کرتا ہے کہ میرے دل میں اس نے دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ وہ اب اتنا اندوہگیں نہیں تھا۔ بلکہ جب وہ شہنائی کو الگ طرف رکھ کر ایک کھردرے رومال سے پیشانی پونچھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بھی عیاں ہوئی۔

میرے پوچھنے پر اس نے اپنی عمر بیاسی سال بتائی۔ میں نے پوچھا کہ لوگ تمہیں "مجسٹریٹ" کے نام سے کیوں پکارتے ہیں۔ اس نے کہا میں اٹلی کے ایک اونچے گھرانے کا فرد ہوں۔ اور ایک دفعہ حاکم اعلیٰ منتخب ہوا تھا۔

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"یہاں تو مجھے بوڑھا کینٹ کہتے ہیں لیکن میرا اصلی اطالوی نام مارکو فاسینوکین شہزادہ واریس ہے"

"اوہو! تو کیا تم مشہور و معروف فاتح فاسینوکین کی اولاد میں ہو؟"

"ہاں وہی۔ ہاں اس وقت کونسل سے بچنے کے لئے کین کا بیٹا وینس میں پناہ گیر ہوا اور اس نے اپنا نام "طلائی کتاب" میں درج کرایا تھا لیکن اب کتاب اور کین دونوں دنیا سے ناپید ہو چکے ہیں" اس موقع پر اس نے تمام دنیاوی چیزوں حتیٰ کہ حب وطن اور انسانی فطرت سے نہایت حقارت ظاہر کی۔

میں نے کہا۔ لیکن اگر تم وینس کے حاکم تھے تو اسوقت

تم ضرور امیر آدمی ہو گے۔ تمہارا مال و منال کس طرح ضائع ہوا؟"
یہ سنکر اس نے اپنا معزز سر اٹھایا۔ اس کے انداز سے بیکسی ٹپک رہی تھی۔
اُس نے کہا "مجھ پر ایک نہایت ہی ناگوار حادثہ گزرا تھا"
میری تجسس کی خواہش اور بھی پُر زور ہو گئی لیکن میں اس سے دوسرا سوال پُوچھنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ ایک ناواجب حرکت ہے۔ مزید براں وہ مجھے کچھ تھکا ہوا بھی معلوم ہوتا تھا۔ لہذا میں منتظر رہا۔ کہ وہ خود ہی گفتگو شروع کرے۔
لیکن میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور تمام واقعات کی ندرت پر غور کر رہا تھا۔ میں نے تصوّر میں وینس کا نقشہ باندھا۔ اور عالم خیال میں منڈی اور بندرگاہ لیڈو کی سیر کرنے لگا۔ میں نے وہاں کا فلک نما گرجا دیکھا۔ اور شاہی محلسرا کے مختلف نقش و نگار سے آراستہ جھروکوں کا معائنہ کیا پھر گزشتہ اطالوی امرا کے ظلم و ستم اور زوال اور اس زوال کے اسباب یعنی ان کی جسمانی اور اخلاقی پستی پر غور کرنے لگا۔
یکایک فاسینوکین نے شہنائی بجانی بند کر کے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ اٹھا اور میرے پاس آکر بولا۔
"آؤ چلیں"
میں خوشی اور تعجب سے اچھل پڑا۔
میں نے اسے اپنا ہاتھ دیا اور ہم چل کھڑے ہوئے۔
گلی میں پہنچکر وہ یوں گویا ہوا "کیا تم مجھے وینس پہنچاؤ گے؟ تم مجھ پر اعتبار کرو گے؟ تم لندن اور امسٹرڈم کے متمول ترین سوداگروں سے بھی زیادہ دولتمند ہو جاؤ گے۔ ہاں! روس چائلڈ سے بھی زیادہ امیر! الف لیلہ کے شہزادوں جتنے دولتمند!"
میں نے خیال کیا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے لیکن میں اس کی شخصیت اور استقلال سے مرعوب ہو کر اسکے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ مجھے ایک باغیچہ میں لے گیا اور فصیل کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چاندنی میں اسکے نورانی بال چمک رہے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یکایک وہ یوں گویا ہوا۔
"میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے تم اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ لیکن بخدا میں نے بالکل سچ کہا ہے ...... غالباً تمہاری عمر بیس سال یا اس سے زیادہ ہوگی ...... ہاں میں بھی کبھی تمہاری عمر کا تھا۔ نوجوان۔ خوبصورت رعنا ...... لیکن میری پہلی ہی بیوقوفی بدترین تھی۔ یعنی "محبت" ...... میری محبت ایسی تھی جس سے آجکل کے لوگ ناآشنا ہیں۔ ایک نظرِ عنایت کے وعدے پر میں صوفے کے نیچے چھپنا گوارا کرتا۔ اور اس بات سے بھی بے پروا ہو جاتا کہ اگر پکڑا گیا تو طرح طرح کے عذابوں سے مارا جاؤنگا میں ایک نوجوان اور خوبصورت مگر کتخدا عورت کے

تیر نظر کا گھائل تھا۔ اس کے خاوند کا نام سگرِیڈو تھا۔ وہ علی کونسل کا ممبر تھا۔ اور بیوی پر لٹو۔

ایک دن جب ہم عشق و محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ اچانک سر پر آپہنچا۔ ہم دونوں بیگناہ تھے۔ مگر اسے یقین نہ آیا۔ وہ مجھ پر کود پڑا۔ میں بغلی ڈوب گیا۔ اس کا وار خالی رہا۔ میں بالکل نہتا تھا۔ مگر محض مدافعت کے خیال سے اس سے لپٹ پڑا اور اسے نیچے گرا کر سینے پر چڑھ گیا۔ پھر اس کے گلے پر گھٹنا ٹیک کر زور سے دبایا۔ حتیٰ کہ جان نکل گئی۔

میں نے بیانکا سے کہا۔ کہ وہ میرے ساتھ فرار ہو چلے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ دوست! عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں.....

لہٰذا میں اکیلا ہی چل پڑا۔ میں مجرم قرار دیا جا چکا تھا اور میری جائداد ضبط ہو کر میرے وارثوں کے لئے محفوظ رکھی گئی تھی۔ لیکن میں اپنے جواہرات اور اعلیٰ قسم کی تصاویر کپڑوں میں چھپا کر لے آیا تھا۔ میں ایک اور ملک میں چلا گیا۔ جہاں میرا خیال تھا کہ اطمینان سے بسر ہو گی۔

"کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ عورتیں جب حاملہ ہوتی ہیں تو اس بچے پر، جو پیٹ کے اندر ہوتا ہے، اپنے خیالات اور افعال کا اثر ڈال سکتی ہیں؟ کم از کم میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب میری والدہ حاملہ تھی تو اسے سونے سے بیحد محبت تھی۔ کیونکہ میں خود ہمیشہ زر کا شیدائی رہا ہوں۔ اور کچھ نہ کچھ سونا اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اب بھی میرے پاس کسی قدر موجود ہے۔"

یہ کہکر اس نے چند طلائی سکے جیب سے نکال کر مجھے دکھائے۔

پھر اس نے داستان کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں اگرچہ اندھا ہوں لیکن جہاں کہیں بھی سونا محسوس کر سکتا ہوں۔ میں ہمیشہ جوہریوں کی دکانوں پر ٹھیر کر مختلف اشیا کے رنگ چشم تصور سے دیکھتا ہوں ..... بس بس سونے کی خواہش میں جواری بن گیا۔ میں فطرتاً چور یا ڈاکو نہیں ہوں۔ بلکہ دوسروں نے مجھے لوٹا اور تباہ کر دیا۔

اب میرے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ میں نے مایوسی کے دلخراش اثر کو گھٹانے کے لئے بیانکا سے ملنے کا ارادہ کیا۔ بھیس بدل کر وینس پہنچا اور چھ ماہ اس کے گھر میں چھپ کر عیش و مسرت سے گزارے۔ میں سمجھتا تھا کہ مرتے دم تک یونہی گزر جائیگی...... لیکن اس کے ہونہار عشاق میں سے ایک کو کچھ شبہ سا ہو گیا۔ ایک دن ہم اکٹھے بیٹھے تھے کہ وہ اچانک آن وارد ہوا۔ ہم دونوں الجھ پڑے لیکن میں نے اُسے مارا نہیں صرف ایک شدید زخم لگا کر چھوڑ دیا۔

میری مسرت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور میں پھر ترک وطن پر مجبور ہوا۔

اب میں زندگی کی مسرتوں میں اندھا دھند کود پڑا۔ میں لوئی پانزدہم کے دربار میں مشہور و معروف عورتوں کے درمیان دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی بیانکا کے حسن و محبت اور شانِ رعنائی کو نہ پہنچتی

تھی۔ اس لئے میرے دل میں پھر اس سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں تمام خطرات سے بے پرواہ محل میں داخل ہوا لیکن دشمنوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اور موت کا حکم صادر ہو گیا۔ بیانکا نے میرے ساتھ مرنے کا قصد کیا ......

عورتیں عجیب خیال کی واقع ہوتی ہیں۔ مفرور ہونے سے تو انکار کر دیا تھا۔ اور اب میرے ساتھ مرنے پر آمادہ تھی۔ خیر اسے قتل کر دیا گیا۔ اور مجھے ایک شکارے میں ڈال کر خلیج کے پاس ایک خوفناک محبس میں لے گئے۔

میرا نیچہ ٹوٹ گیا تھا لیکن میں نے قبضہ چھپا رکھا تھا کہ شاید کسی وقت کام آ جائے۔ میں بائیس سال کا نوجوان تھا۔ تنومند اور دلاور میرے ڈوئل کے زخم جلد ہی بھر آئے لیکن جب مجھ میں کچھ جان آئی تو معلوم ہوا کہ موت کا فتوےٰ صادر ہو چکا ہے۔ اور جلد ہی میرا سر اڑا دیا جائیگا۔

میں نے مہلت حاصل کرنے کی خاطر بیماری کا بہانہ کیا۔ اور رہائی کی تدابیر سوچنے لگا۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ دیوار میں سوراخ کر کے نہر میں کود پڑوں۔ اور تیر کر پار نکل جاؤں۔ میرے لئے بچ نکلنے سے ڈوبنے کا امکان زیادہ تھا۔ کیونکہ میں تر [illegible] ں نہیں تھا۔ کہ غوطہ لگا کر سطح پر ابھر آؤں ممکن ہے۔ تیر [illegible] وقت آنے سے پہلے ڈوب جاؤں شاید پانی شور کرتا ہوا دیوار تک آ جاتے۔ اور مجھے شل ایک چوہے کے بہا لے جاتے۔

حفاظت کی خواہش انسان کو بہت سی تدبیریں سمجھا دیتی ہے۔ اس کے خیال میں کوئی تدبیر بھی ناممکن سمجھ کر رد نہیں کی جا سکتی۔ اس کا دماغ حیرت انگیز تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک پتھر دیکھا جس پر عربی حروف کندہ تھے۔ بلاشک یہ پتھر کسی قیدی نے بعد میں آنے والوں کی اطلاع کے لئے چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس پر مندرجہ ذیل سر نوشت تھی۔

"دائیں کونے میں دروازے کے نزدیک ہی میں نے دو پتھر اکھاڑے ہیں۔ میں نے ایک گیارہ فٹ لمبی اور تین فٹ گہری سرنگ بنانی بھی شروع کر دی ہے۔"

خوش قسمتی سے ہماری کوٹھری میں کوئی محافظ نہیں تھا۔ اور میرے ساتھی کو سویرے ہی سو جانے کی عادت تھی۔ یہ بھی میری تقدیر کی خوبی تھی۔ کہ میرے لئے کسی دوسرے نے کام شروع کر رکھا تھا۔ وہ بیچارہ تو اپنا کام ختم کرنے سے پہلے ہی راہی ملک عدم ہوا لیکن اس کے شروع کئے ہوئے کام سے فایدہ میں نے اٹھایا۔

میں نے پتھر کو ذرا الٹایا دوسری طرف اسکے دفینے کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دفینہ حاصل کرنے میں قریباً ایک مہینہ لگیگا...... میں سونے کا خیال دل میں لئے نہایت تندہی سے کام میں لگا ہوا تھا......

ا ہا ہا! سونا!! جواہر!!! میں دفینہ حاصل کرونگا میں آزادی

حاصل کرونگا۔ . . . . .

ایک دن میرے نیچے کا شکستہ پھل کسی لکڑی کے تختے سے ٹکرایا۔ تختے میں سوراخ ہوگیا۔ کام آسان ہو رہا تھا۔ میں برہنہ جسم کام میں لگا ہوا تھا تاکہ میرے اعضا بغیر کسی رکاوٹ کے کام کئے جائیں اور جس دن مجھے عدالت میں پیش ہوتا تھا۔ اس سے پہلی رات میں اپنے کام کو بھوت بنکر چمٹا ہوا تھا۔ . . . یکایک میرا اوزار لکڑی کے پار ہوگیا۔ دوسری طرف کوئی رکاوٹ نہ تھی میں نے سوراخ میں سے جھانکا۔ کچھ فاصلے پر ایک غار نظر آیا جس میں سونے کا انبار لگا ہوا تھا۔

حاکم اعلےٰ اور کونسل کا ایک ممبر دوسری طرف باتیں کر رہے تھے۔ مجھے ان کی آواز صاف سُنائی دیتی تھی۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ اعلےٰ حکام اور تمام ریاست کی پوشیدہ دولت یہیں مدفون تھی۔

جب ہمارا محافظ آیا تو میں نے اسے اس بات پر آمادہ کرلیا۔ کہ وہ رہائی حاصل کرنے میں میری مدد کرے اور جسقدر سونا اٹھایا جاسکے لیکر خود بھی میرے ساتھ ہی بھاگ نکلے۔

وہ فوراً آمادہ ہوگیا۔ ایک جہاز لیونٹ کی طرف روانہ ہونے کو تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہوچکے تھے اور ایک رات ہم دونوں وینس کے پوشیدہ خزانے میں بیٹھے تھے۔

آہا۔ وہ بھی کیا رات تھی

مجھے سونے سے بھرے ہوئے چار صندوقچے ملے باقی سب چاندی کے چمکدار ٹکڑوں سے پُر تھے۔ . . . . . .

میں نے خیال کیا کہ محافظ پاگل ہوگیا ہے۔ کیونکہ وہ فرطِ خوشی سے کبھی ناچتا تھا اور کبھی گاتا یا ہنسنا شروع کردیتا تھا میں نے اُسے دھمکایا کہ اگر تم نے اس طرح حواس کھودئے یا ذرا بھی شور کیا تو گلا گھونٹ دونگا۔

خوشی کے جوش میں اس نے جواہرات نہیں دیکھے تھے میں ادھر ٹوٹ پڑا اور ٹھونس ٹھونس کر جیبیں بھرلیں۔ تاہم میں تیسرا حصہ بھی نہ اُٹھا سکا۔

میں نے سوچا کہ جواہرات دوبارہ کاٹ کر درست کرنے پڑینگے۔ ہم اپنی تمام حرص وہوا کے باوجود بھی صرف تین ہزار پونڈ اُٹھا سکے۔ اور ہمیں چھ بار شکارے تک آنا جانا پڑا۔ سونے کی ایک تھیلی ملاحوں اور پہرے داروں کو دی گئی۔

پو پھٹتے ہی ہم نکل کھڑے ہوئے۔ اور کچھ دیر بعد سمندر میں پہنچ گئے۔ آہ! جب وہ رات وہ تذبذب اور وہ زرو جواہر سے بھری ہوئی جگہ یاد آتی ہے۔ تو میں آپے میں نہیں رہتا گویا مجھے طلائی بخار ہوگیا تھا۔

سمرنا سے ہم فرانس کو روانہ ہوئے۔ راستے میں تقدیر نے یاوری کی اور میرا ساتھی قیدی بھی فوت ہوگیا۔ اگرچہ میں اسوقت اس واقعہ کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

کئی دن تک ہم میں بولنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ کیونکہ گزشتہ واقعات سے تھک کر چور ہو چکے تھے۔ محافظ جیل کا دماغ پھر گیا تھا۔ لہٰذا ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

اپنی آدھی دولت لندن اور امسٹرڈم میں فروخت کر کے میں میڈرڈ پہنچا۔ پانچ سال وہاں رہا پھر پیرس میں آ گیا۔ جہاں میں عیش و مسرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ لیکن اسی عیش و مسرت میں میری صحت خراب ہو گئی۔ بلاشبہ ابھی میرے گزشتہ مصائب اور تذبذب کا اثر کلی طور پر زائل نہیں ہوا تھا۔ مجھے تعیش کی زندگی میں اندھا دھند کودنے سے پہلے کچھ عرصہ آرام کرنا چاہیے تھا۔

اس وقت مجھے ایک عورت سے محبت ہو گئی۔ میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے حسب و نسب سے آگاہ کر دیا۔ وہ بھی فرانس کے ایک زبردست گھرانے سے تھی۔ وہ میڈم ڈی بیری کی دوست تھی۔ اور خود بھی بااثر اور بارسوخ تھی۔ ...... لیکن کیا تم میری بات کا یقین کرو گے؟ نابکار عورت نے میرا سب سرمایہ لوٹ لیا۔ اور کھک کر کے بٹھا دیا مجھ میں کمزوریاں تھیں۔ جیسا کہ مجھ سے زیادہ بہتر آدمیوں میں بھی ہیں...... کمبخت عورت نے مجھے الّو بنایا۔ میں کیا کرتا؟ میں لوگوں کو اپنا اصل نام نہیں بتا سکتا تھا۔ اور نہ حکام ہی سے داد خواہ ہو سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے پر مجھے وینس بھیج دیا جاتا جہاں موت یقینی تھی۔ میں اسی سوچ میں رہتا تھا کہ انہی دنوں میں بغاوت شروع ہو گئی۔

کاش میں نے فرار ہونے سے پیشتر جیل کا نقشہ بنا لیا ہوتا! مجھے اب یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کونسا جیل ہے اور کہاں واقع ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو جب نپولین نے جمہور کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ میں فوراً وینس جاتا اور اس خزانے کا بہت سا حصہ دستیاب ہو جاتا۔

مگر آخر کار مجھے یہی کرنا پڑیگا۔ میں ضرور وینس جاؤنگا۔ اور باقی خزانہ حاصل کر کے چھوڑونگا! میں نہیں جانتا کہ مجھے یہ کام کس طرح شروع کرنا چاہیے۔ مگر تم میری مدد کرو ......

میں نے سرکاری امداد حاصل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ میں نے شہنشاہِ آسٹریا کو بھی لکھا۔ مگر وہ سب مجھے دیوانہ خیال کرتے ہیں۔

ہاں! آؤ وینس چلیں۔ ہم مانگتے کھاتے وہاں جا پہنچینگے ...... اور کروڑپتی بنکر آئینگے ...... اور تم میرے وارث اور شہزادہ وارثیں ہو گے۔

بوڑھے کی یہ کہانی سنکر میں سکتے کے عالم میں گم سم بیٹھا تھا ...... مجھے یہ سب کچھ شاعرانہ تخیل معلوم ہوتا تھا۔

کچھ عرصہ تک میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور بلاشبہ فاسینوکین مجھے بھی ان لوگوں جیسا شکی خیال کرنے لگا جو اسکی داستان سن چکے تھے۔ اس نے حقارت افسوس اور یاس سے بھرے ہوئے فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا ...... پھر شہنائی

اُٹھا کر لطالوی دھن نکالی...... لیکن اب وہ بوڑھوں کی طرح نہیں بلکہ ایک ایسے نوجوان امیر کی طرح نغمہ نوازی کر رہا تھا۔ جو محض دل بہلانے کے لئے رقص و سرود سے شغف رکھتا ہو۔

میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

بیشک امیر وہی جو اس خندۂ تقدیر سے ناواقف تھے۔ ایک پُرشکوہ خاندان کی اس آخری نشانی کے دردناک نغموں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

لیکن یکایک اس جوانی کے رنگ پر سونے کی چمک جھلکی۔ فاسینوکین بولا۔ میرا خزانہ ہر وقت تاباں و درخشاں میری نظر کے سامنے رہتا ہے...... جواہرات نہایت اعلیٰ قسم کے تھے...... انکی چمک میری روح کی گہرائیوں کو روشن کر دیتی ہے۔

...... میں نے اپنا خزانہ ڈھونڈ لیا تھا...... اب پھر اسے حاصل کروں گا۔

یکایک وہ دوزانو ہو کر محوِ دعا ہو گیا۔ "میں دیوتاؤں کے حضور میں دُعا کرتا ہوں کہ مرنے سے پہلے وہیں پہنچ جاؤں۔"

میں نے کہا میں تمہارے ساتھ جاؤنگا۔

اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ آخر مجھے ایک آدمی مل ہی گیا۔

میں ہاتھ میں ہاتھ دئے اسے باہر لے آیا۔ اور عین اس وقت جبکہ محفلِ شادی سے واپس آنے والے شور و غوغا کرتے ہوئے گذر رہے تھے ہم نے مصافحہ کیا۔

بوڑھے نے پوچھا "کیا ہم کل روانہ ہوں؟"

میں نے جواب دیا۔ "جسوقت بھی ہمارے پاس کچھ روپیہ ہو جائے"

وہ بولا۔ "مگر ہم پیدل جا سکتے ہیں...... مانگتے کھاتے...... ایسا خزانہ حاصل کرنے کے لئے کوئی بات بھی ناممکن نہیں۔"

لیکن انہی سردیوں میں فاسینوکین کا انتقال ہو گیا۔

(ترجمہ) ہری چند شرما اختر

آتش بجام

خوشا! وہ صبحِ طرب، مدینہ میں جبکہ میرا قیام ہوگا
میری جبینِ نیاز ہوگی، درِ رسولِ انام ہوگا

شرابِ وحدت کے خم لنڈھا کر، کہا یہ ساقی نے مسکرا کر
وفورِ سوزِ نفس سے یہ بادہ خود ہی آتش بجام ہوگا

جنابِ موسیٰ خیال رکھنا، حواس اپنے سنبھال رکھنا
کہ آج فاراں کی چوٹیوں پر کسی کا دیدارِ عام ہوگا

نہ چھیڑ اے بادِ یاس کو تے امیدِ دیدِ نبی میں ہم کو
کہ تیری اٹکھیلیوں کے باعث ہمارا جینا حرام ہوگا

یہ رحمتیں ہیں میرے نبی کی، یہ اس کی بندہ نوازیاں ہیں
کلیدِ خلدِ بریں کا مالک سنا ہے عشقی غلام ہوگا

قریب ہے وہ بہار پرویز جسکو سینچا ہے خونِ دل نے
اِک ایک برگِ کمال پر باغبانِ یثرب کا نام ہوگا

پرویز شامی

افکارِ آزاد

ممنون ہوں کہ چشمِ عنایت نہیں رہی
مرہون ہوں کہ فکرِ عداوت نہیں رہی

اب درگزر کہ جبر کی غایت نہیں رہی
اب رحم کر کہ صبر کی طاقت نہیں رہی

اندازہ کر کہ اب نہ وہ شکوے نہ وہ گلے
آگاہ ہو کہ اب کوئی حسرت نہیں رہی

میں اور وہ اضطراب کہ اللہ کی پناہ
تو اور وہ اجتناب کہ غایت نہیں رہی

اب وہ تعلقات نہ اب وہ توجہات
وہ تو نہیں رہا کہ وہ عادت نہیں رہی؟

اب حالِ دل نہ پوچھ کہ تابِ بیاں کہاں
اب مہرباں نہ ہو کہ ضرورت نہیں رہی

غفلت روا سہی مگر اتنا خیال رکھ
وہ دل نہیں رہا، وہ طبیعت نہیں رہی

پھر ابتدائے جور کی ساعت قریب ہے
کچھ انتہائے لطف عنایت نہیں رہی

اِک پائمالِ جور سے امیدِ شکرِ جور؟
جا شکر کر کہ تابِ شکایت نہیں رہی

میں بدنصیب تیری نگاہوں سے کیا گرا
تیری نظر میں بھی مری عزّت نہیں رہی

دل اور ترے خیال سے راحت نہ پاسکے؟
شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی

اظہارِ اضطراب ہماری خطا سہی
تسکینِ قلب کس کی بدولت نہیں رہی؟

آزاد! کیا ارادۂ چون و چرا کروں
امرِ خلافِ حکم کی جرأت نہیں رہی

آزاد انصاری

خیالِ خام

صحنِ گلشن میں بھی قرار کہاں
آہ! وہ برگِ زر نگار کہاں!

شام ہے میں ہوں اور نومیدی
اب وہ فردوسِ انتظار کہاں!

اب کہاں ابتدائے عشق کے لطف
اب وہ گلہائے نوبہار کہاں!

ایک خاکسترِ سیاہ ہے دل
اب وہ شعلے کہاں! شرار کہاں!

آؤ آؤ کہ پھر ملیں نہ ملیں
زندگانی کا اعتبار کہاں!

اے اثرؔ کس خیالِ خام میں ہو
تم کہاں بزمِ شہریار کہاں!

اثر صہبائی

دولتمند جوگی

(۱)

دُنیا میں اللہ کا بندہ ایسا بھی اک دیکھا ہے — جو سچی دولت کا مالک تھا جس پہ امیری پھبتی تھی
اس کی حضوری میں حاضر تھی ایک سمندر کی دیوی — سیپوں والی، موتیوں والی، بیٹھی مالا جپتی تھی
لعل و جواہر دامن بھر بھر لیکے سمندر سے آئی — دُنیا اُس پہ عاشق تھی، جوگی کیلئے وہ تڑپتی تھی

(۲)

ایک سُنہری چادر اوڑھے سر سے لیکر پیروں تک — نکلیں سونے کی پریاں کچھ ڈرتی ڈرتی کانوں سے
ایک سہیلی تھی روپہلی ایک سہیلی مٹیالی — لے کے زمین کے مال خزانے آئی تھیں سب تہ خانوں سے
لیکن یہ اللہ کا بندہ پاس نہ تھا جس کے کچھ بھی! — دیکھا ان میں سے نہ کسی کو آنکھ اُٹھا کر بھی اس نے
فرق اتنا تو اسکے سکوں میں بیشک میں نے پایا ہے — دیکھ کے چاروں سمت کو اپنے آہ تو کھینچی تھی اس نے

(۳)

صبح نے کھول کے اپنا خزانہ گھر گھر سونا بانٹ دیا — پتہ پتہ سونے کا تھا کونپل کونپل سونے کی
موتی ہی موتی بکھرے پڑے تھے سارے کھیت کے پتوں پر — گویا کھیت میں سونے کے تھی فصل یہ موتی بونے کی

(۴)

شب بھر چاندی کے دریا میں صبح نہا کر نکلی تھی — سونے کے پیٹ میں جگمگ کرتے تارے کھا کر نکلی تھی
قدر نہ جانی مال کی اسکے اکثر سونے والوں نے — صبح اسی لئے جوگی کے گھر سیدھی آکر نکلی تھی
افسرؔ یہ اللہ کا بندہ پاس نہ تھا جس کے کچھ بھی — عاشق تھا سچے دِل سے فطرت کی عیش پسندی کا
دیکھ کے چاروں سمت کو اپنے کسبِ سکون کیا اس نے — راحت اسکو حاصل تھی احساس تھا دولتمندی کا

حامد اللہ افسر

سرابِ قسمت

شام کے وقت جب لندن کے کوچوں اور بازاروں میں برقی قندیلیں روشن ہونے لگیں۔ تو ذیل کے پُراسرار مضمون نے شام کو شائع ہونے والے اخبارات کی مانگ حد سے زیادہ بڑھا دی۔

"ایڈگر روڈ سے آگے ماربل آرچ سے سترہ میل کے فاصلہ پر ایک سنسان گلی ہے۔ اور گلی کے عقب میں ایک وسیع العضا میدان ہے۔ اس میدان کے عین وسط میں ایک نیا مکان ہے۔ جس کے سات کمرے بالکل خالی ہیں۔ کمروں کی ناگفتہ بہ حالت زبان حال سے بتا رہی ہے کہ اس مکان میں مہینوں سے کوئی مکین نہیں۔ آٹھویں کمرہ میں ایک میز ہے۔ جس کے گرد چھ کرسیاں ہیں۔ دیواریں بالکل عریاں ہیں۔ کسی کھڑکی میں پردہ کا نام نہیں۔ صرف ایک کھڑکی میں پُرانا سا زرد پردہ لٹکا ہُوا ہے۔ میز پر ایک برقی لیمپ رکھا ہے۔ بھدے سے میز پوش پر دستر خوان بچھا ہے۔ مختلف الالوان شرابوں سے بوتلیں بھری رکھی ہیں۔ گوناگوں فواکہ سے طشتریاں بھری ہیں۔ بوقلموں کھانے چُنے ہُوئے ہیں۔ خالی گلاس اور طشتریاں ہر کرسی کے سامنے رکھی ہُوئی ہیں۔ میز کے ایک کنارے پر خوانِ صدر رکھا ہُوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی شادی کی تقریب ہے۔ یہ خوان بالکل اچھوتا ہے۔ لیکن باقی سب کھانوں میں ہاتھ پڑا ہُوا ہے بعض بوتلیں بھی ایسی ہیں۔ جو کھولی جا چکی ہیں۔ پانچ کرسیاں بالکل خالی ہیں۔ چھٹی کرسی میز کے اس گوشہ پر رکھی ہُوئی ہے۔ جو کھڑکی کے مقابل ہے۔ پانچ مہمان جس پُراسرار طریقے سے آئے اُسی طرح غائب ہو گئے۔ چھٹی کرسی پر ایک آدمی دریائے تفکر میں غرق بیٹھا ہُوا ہے بوقلموں نعمتیں مطلق اُس کی توجہ اپنی جانب منعطف نہیں کر سکتیں۔ گو وہ برقی لیمپ کی جانب ٹکٹکی لگاتے دیکھ رہا ہے۔ لیکن ایسی تیز روشنی اُس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا نہیں کر سکتی۔ اس آخری مہمان کی پیشانی پر پستول کی ایک گولی کا نشان ہے۔"

مندرجہ بالا مضمون کی اشاعت سے چھ مہینے پیشتر لارڈ فرانسس گولڈی اور میں ایک رسٹورنٹ میں چائے پی رہے تھے۔ دفعتہً اُس کی زبان پر یہ الفاظ آئے۔

"بابو تمہیں یاد ہے کہ ہم نے اس شخص کو جو ہم سے پیچھے چوتھی میز پر بیٹھا ہُوا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟"

میں اپنی حس مشترک پر ہر ممکن دباؤ ڈال رہا تھا تاکہ

وہ خزانہ خیال سے اس شخص کی شبیہ پیش نظر کردے کہ میرے ساتھی نے بے صبری سے کہا۔ کیا تم ریڈرف کو بھول گئے۔"

میں۔" ریڈرف۔ ریڈرف۔"

فرانسس۔ ہاں۔ ہاں جس کو ہم نے انقلاب روس کے بعد ماسکو میں دیکھا تھا۔ جب وہاں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ اور جب ہمیں بھی اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ تو اس نے نہایت آسانی سے اپنے ساتھ ہم دونوں کی جان بچانے کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہاں ایک ذی اثر ہستی ہے۔ گو ابتک یہ راز نہیں کھلا کہ اُس کو وہاں اتنا اقتدار کیوں اور کس طرح حاصل ہو گیا تھا۔ اور ہاں تعجب کی بات تو یہ ہے کہ آجکل میں اُسے اس شان و شوکت سے زندگی بسر کرتے دیکھتا ہوں۔ اس کی حرکات سے معلوم ہوتا ہے۔ گویا قارون کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

میں۔ اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو وہ اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں معلوم ہوتا اور پریشان بھی نظر آتا ہے۔

فرانسس۔ میں تو ریڈرف کو اُن لوگوں میں سے سمجھتا ہوں جو ہماری طرح افلاس کی تنگ و تاریک گھاٹیوں میں سے گزر کر امارت کے بہترین دلخوش کن مناظر کی سیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہی نہیں۔ بلکہ یقین ہے۔ کہ آج شام کو یہ ضرور ہم سے ملنے آئیگا۔ کیونکہ اس کے دل میں ایک راز ہے۔ اور اسے مجھ سے کہے بغیر نہ بنیگی۔ اور میں تمہیں یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ وہ راز اس انگوٹھی کے متعلق ہے۔ جسے آج وہ خلاف معمول زیب انگشت کئے ہوئے ہے۔

ہم فارغ ہوکر واپس مکان پر پہنچے۔ فرانس تو سو گیا لیکن میں کبھی تو اس کی اصابت رائے پر انگشت بدنداں تھا اور کبھی پچھلے واقعات کو خیال میں مربوط کر کے اچانک کہہ اُٹھتا تھا۔ کہ فرانسس کو اس قسم کی عقدہ کشائیوں میں کمال حاصل ہے۔ اُس کی سراغرس طبیعت سے بعید نہیں کہ اُس نے ریڈرف کے متعلق پوری معلومات حاصل کر لی ہوں۔

میں خود ہزار ہا اندازے لگاتا تھا۔ لیکن ایک خیال دوسرے کو فوراً مسترد کر دیتا تھا۔ اس مایوسی کی بنا پر میں پورے شوق سے شام کی آمد کا منتظر تھا۔ کیونکہ شام کی آمد ریڈرف کی آمد اور اُس راز سربستہ کے انکشاف کی مترادف تھی۔

بارے شام ہوئی ریڈرف آیا اُس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا ملیح چہرہ خوشی سے کندن سا دمک رہا تھا۔ اس جوان رعنا کا ہر عضو تناسب تھا کہ نگاہیں حیران ہوکر ٹھٹک جاتی تھیں۔ وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور سیگار کا ایک لمبا کش لیکر بولا۔

مسٹر فرانسس میں تمہیں نہایت دولتمند معلوم ہوتا ہونگا۔
واقعی میں خود بھی سمجھتا ہوں۔ کہ دُنیا کے خزانوں پر میں تنہا قابض ہوں لیکن یہ میں خود بھی نہیں سمجھتا کہ کس طرح چند ماہ پیشتر میں نہایت تنگدستی کے عالم میں تھا۔ نہ میرا کوئی دوست تھا نہ مددگار۔ مجھے میرا مستقبل نہایت تاریک معلوم ہوتا تھا۔ ایک صبح مجھے ایک رجسٹرڈ لفافہ ملا جس میں پانسو پونڈ کے نوٹ ملفوف تھے۔ ساتھ ہی ایک رقعہ بھی تھا۔ جس پر نہ تو بھیجنے والے کا پتہ مرقوم تھا اور نہ ہی کسی کے دستخط ثبت تھے۔ بلکہ ٹائپ کی ہوئی ایک سطر تھی جس کا مضمون یہ تھا
"ہر ماہ کی ساتویں تاریخ کو پانسو پونڈ کی رقم بلاناغہ تمہارے پاس پہنچتی رہیگی بطلق فکر نہ کرو"

فرانسس (نہایت متعجب ہوکر) کیا واقعی

ریڈرف۔ یقیناً۔ اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اچانک دستِ غیب نے مجھے حضیض افلاس سے نکال کر اوجِ امارت پر متمکن کر دیا ہے۔ تو آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

میں۔ اور تمہیں یہ رقم ماہ بماہ وصول ہوتی رہتی ہے۔

ریڈرف۔ ساتویں تاریخ کی صبح کو پہلی ڈاک سے بصیغہ رجسٹری معہودہ رقم وصول ہو جاتی ہے۔ اور ایک ٹائپ شدہ سطر بھی ہوتی ہے۔ لیکن اُس کا مضمون پہلے سے مختلف ہوتا ہے۔
"بلاخوف وخطر خرچ کرتے رہو۔ بھیجنے والے پر بھروسہ رکھو۔ مستقبل پر امید باندھے رہو۔"

اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے

فرانسس۔ عجیب پُراسرار عطیہ ہے

ریڈرف۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم اس رقم کو خرچ کرتے یا نہیں۔

فرانسس۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کیوں خرچ نہ کیا
مفت راچہ گفت

میں۔ ریڈرف تم بڑے خوش قسمت ہو۔

فرانسس۔ میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں اور ہاں کیا تم اپنے ہر دوست سے یہ واقعہ بیان کر دیتے ہو۔

ریڈرف۔ نہیں۔ صرف تم ہی ایک ایسے شخص ہو جس سے میں نے یہ ذکر کیا ہے۔ نہیں معلوم کیوں خواہ مخواہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنا رازداں بنالوں۔ کم ازکم ایک شخص پر ضرور یہ راز افشا ہونا چاہیئے۔ تاکہ آڑے وقت پر آڑے آئے۔ کیا تم بھی یہی مشورہ دیتے ہو۔ کہ خوب اللے تللے رہیں

فرانسس۔ یقیناً میں تو یہی مشورہ دونگا۔

ریڈرف کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مدت سے جس دودلی میں مبتلا تھا۔ اب اُسے اس سے نجات مل گئی تھی اور اس لئے وہ خوش خوش واپس چلا گیا۔

ریڈرف کے چلے جانے کے بعد فرانسس فوراً میری طرف

مخاطب ہوا۔ "بابو تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

مَیں۔ میری عقل مطلق کام نہیں کرتی۔ ایک نامعلوم شخص سے ایسی معتدبہ رقم کا ہر ماہ وصول ہونا حیرت افزا ہے۔

فرانسس۔ موجب حیرت تو ضرور ہے لیکن تمہارا اندازہ کیا ہے؟

مَیں۔ ایک راز ہے۔ جس سے غالباً آخر میں خوفناک نتائج پیدا ہونگے۔

فرانسس۔ تمہارے شکوک نہایت گہرے ہیں۔

مَیں۔ کیا تمہارا یہ خیال نہیں۔

فرانسس۔ نہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ کوئی شخص جو ریڈرف کی سود و بہبود کا متمنی ہے۔ اُس کی دوستی کا حق ادا کر رہا ہے یا اُس نیکی کا جو کبھی اُس نے کی ہو اتنے کھلے دل سے بدلہ دے رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بھیجنے والی ایک متمول عورت ہو اور وہ اس کی محبت میں غرق ہو۔ اور عنقریب وہ اس راز کا انکشاف کر دے۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اُس نے ضرور کوئی نہ کوئی ایسا کام کیا ہوگا جس سے وہ اس گرانبہا صلہ کا مستحق ہو گیا۔ واللہ عالم بالصواب۔

تین مہینے گزر گئے۔ ممکن نہیں کہ ایک شخص تین ہزار پونڈ سالانہ خرچ کرے۔ اور انگشت نمانہ ہو۔

ریڈرف سوسائٹی کے اعلےٰ ترین طبقہ سے ربط ضبط رکھنے لگا۔ عمائد شہر اُس کی گرمجوشی سے آؤ بھگت کرنے لگے۔

ایک شب کو لارڈ فرانسس اور مَیں ویسٹ اینڈ تھیٹر میں اُس سے دو چار ہوئے۔ سلسلۂ گفتگو اس نے خود ہی اس طرح شروع کیا۔

لارڈ فرانسس غالباً اب تم مجھے ورزیادہ قابل مبارکباد تصور کرو گے۔ کیونکہ گورنمنٹ نے خود بخود مجھے ایک اعلیٰ عہدے پر ممتاز کر دیا ہے۔ اور بلاشبہ اس عہدہ پر فائز ہونا ایک قابل رشک مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

فرانسس۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی زبردست ذی اثر ہستی کا طفیل ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو۔ کہ تم اس کے لئے کس کے رہین منت ہو۔

ریڈرف خاموش ہو گیا۔ اور چاروں طرف دیکھنے لگا فرانسس نے اس سوال کو دہرایا۔ تو اُسے جواب ملا۔

ریڈرف۔ مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ محض عطیۂ آسمانی ہے

فرانسس۔ خوب۔ مگر یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی تمہارا دوست۔ . . . .

فرانسس کو اسی اثنا میں ایک لیڈی کے سلام کا جواب دینا پڑا۔ ریڈرف نے بھی نظر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ معاً اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ کبھی اُس کو اور کبھی فرانسس کو دیکھتا تھا۔ بدقت تمام اُس نے انتہائی ضبط سے کام لیکر یہ سوال کیا۔

فرانسس کیا تم اس حسینہ کو جانتے ہو۔

فرانسس۔ کچھ یونہی سی واقفیت ہے۔

ریڈرف۔ یہ کون ہے۔

فرانسس۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ کہ اس کا نام ڈیفرسٹ ہے۔ اور وہ دریائے حسن کی ایک گوہر نایاب ہے۔ اور حد سے زیادہ متین بلکہ کچھ غمگین بھی رہتی ہے۔ تم اس کے متعلق اتنے شوق سے کیوں پوچھ رہے ہو۔

ریڈرف۔ میں نے اس کو ایک دو مرتبہ دیکھا ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس کے بے پناہ حسن نے میرے بحر جذبات میں جزر و مد پیدا کر رکھا ہے۔ تم کو وہ غمگین دکھائی دیتی ہے۔ لیکن میں اُس کی آنکھوں میں ہیرے کی چمک پاتا ہوں۔ کیا تم مجھے اس سے متعارف کرا سکتے ہو۔

فرانسس۔ قریب تریں فرصت میں۔

ریڈرف۔ شکریہ۔

یہ لفظ اس نے کہا اور چپ چاپ اُٹھ کر چل دیا۔ جب فرانسس نے یہ محسوس کیا کہ اب اُس کے پاس میرے سوا اور کوئی متنفس نہیں۔ تو وہ بولا ہمارے دوست کا راز اب کُھلتا جا رہا ہے۔"

میں۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ پانسو پونڈ ماہوار کی دریادلِ معطی یہی لیڈی ہے۔

فرانسس۔ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر بھی یہ امر موجب حیرت رہ جاتا ہے۔ کہ وہ خود اتنی زیادہ خوش پوش معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے لباس سے ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اتنی متمول ہوگی۔

میں۔ ممکن ہے کہ وہ دوسرے عطیہ کا وسیلہ ثابت ہوتی ہو۔

فرانسس۔ ہاں یہ ضرور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اس کی رفتار و گفتار سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعلےٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والی ہے۔ لیکن اس کا لباس اس خیال کی تکذیب کرتا ہے۔ اس میں بھی کوئی بھید معلوم ہوتا ہے مجھ پر نظر پڑنے سے پیشتر وہ نہایت غور سے ہمارے دوست کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی ریڈرف نے کہا تھا کہ ایک لیڈی دو ایک مرتبہ راستہ کاٹ کر دانستہ میرے سامنے سے گزری ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ لیڈی ہمارے دوست کے متعلق اس سے زیادہ جانتی ہے۔ جتنا کہ وہ خود اس کی بابت واقفیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ محض قیاس ہے۔ ریڈرف بُری طرح اسکے عشق میں گرفتار ہوگا۔ اتنا میں ضرور کہونگا۔

ریڈرف کا راز روز بروز زیادہ دلچسپ اور اہم ہوتا چلا جاتا ہے۔ آؤ ہم بھی اس کے متعلق تحقیقات شروع کریں۔

میں۔ تم کس طرح شروع کرو گے۔

فرانسس۔ ریڈرف کے زمانہ ماضی کے متعلق جتنا

زیادہ علم ہم کو دستیاب ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ ہمارے لئے اس راز کو سمجھنا آسان ہوگا۔

قریباً چار مہینے بعد ایک دن شام کو جب میں اور فرانسس بیفکروں کی طرح سیگار کے لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔ اور آکسفورڈ سٹریٹ کی چہل پہل کا لطف اٹھا رہے تھے۔ یکلخت فرانسس نے مہر سکوت کو توڑا اور اس طرح کلام کا سلسلہ شروع کیا۔ ہمارے عجیب وغریب دوست ریڈرف کے متعلق مجھے تین باتیں معلوم ہوئیں جو بذاتِ خود تینوں اہم ہیں۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ جتنا زیادہ اس ڈور کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں اتنی ہی زیادہ یہ الجھتی چلی جاتی ہے۔ اور سرا ملنا ناممکن ہوتا چلا جاتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ان تینوں باتوں سے ایک نہایت غیر معمولی بات سمجھ میں آتی ہے۔ بشرطیکہ میرا اندازہ غلط نہ ہو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ریڈرف اس فرانسیسی حسینہ ڈیفرسٹ کے دام محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لاکھوں میں ایک ہے لیکن تعجب تو یہ ہے کہ اُس کی افسردہ دلی۔ اس کی سنجیدگی سمندِ ناز پہ تازیانہ کا کام دے گئی۔ بہرحال وہ اس کا پرستار ہے۔

مَیں۔ وہ اس کی محبّت کو قبول کرتی ہے۔

فرانسس۔ ابھی نہیں۔ اس کے خلاف وہ اُس سے گریز کرتی ہے۔ یہ خوشی ابھی اس کے حصہ میں نہیں آئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابھی تمہارے آنے سے گھنٹہ بھر پہلے ریڈرف میرے پاس آیا۔ خوشی سے اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اُس نے خبر سُنائی کہ ابھی ابھی اُسے "سر" کا خطاب ملا ہے۔

میں۔ بلا درخواست

فرانسس۔ بالکل اُس کو تو کبھی یہ اعزاز خواب میں بھی نہ دکھائی دیا تھا۔ جس طرح کہ پانسو پونڈ ماہوار کی رقم اور منصب جلیلہ خدائی عطیات تھے۔ ایسے ہی یہ تیسرا آسمانی عطیہ ہے۔ جس کا ذمہ دار وہی نامعلوم دوست ہو سکتا ہے جو ریڈرف کا اتنا زیادہ خیرخواہ ہے۔

تیسری بات کے متعلق مَیں مدت سے تگ ودو میں تھا۔ اور بہ ہزار محنت وجانکاہی اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ اُس کی زندگی کے گزشتہ حالات کی بہم رسانی ہے جو کچھ تو خود اس کے مُنہ سے کچھ دیگر ذرائع سے معلوم کئے گئے۔ اس کی زندگی کا نہایت اہم واقعہ اس کی پانچ اور آدمیوں کے ساتھ گرفتاری ہے۔ یہ اُس کا اپنا بیان ہے۔ کہ روس کے انقلاب پسندوں کی ایک جماعت نے ان سب کو ایک سازش کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ لیکن اُس نے اِس بات کو صیغۂ راز میں رکھا ہے کہ باقی پانچوں کے خلاف اُس نے خفیہ شہادت دی لیکن کس طرح

آزادی حاصل کی۔

وہ پانچوں مختلف قومیت کے آدمی تھے اور ان میں سے تین تو حد درجے کے متمول اور ذی جاہ افراد تھے۔ یہ قابلِ تاسف بات تھی۔ کہ اُنھوں نے ایک غیر ملک کی سیاسیات میں مداخلت کی۔ مَیں نے اُن سب کے نام بھی معلوم کئے ہیں۔ فاتبر۔ زینا اور کونٹ چارنو۔ باقی دو کے لئے سزائے موت تجویز کی جا چکی تھی۔ لیکن وہ معاف کر دئے گئے تھے۔

بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ گرانبہار تو م دیکر انھوں نے اپنی جان بخشی کرائی تھی۔ چوتھا شخص آئرلینڈ کا باشندہ تھا جس کا نام ہلارون تھا جو نہایت ہی ہوشیاری سے بچ نکلا تھا۔ پانچواں ایک فرانسیسی لیفارج نامی تھا۔ جسے موت کی سزا دی گئی تھی۔

" بابو۔ یہ ہیں کل معلومات جو مَیں بہم پہنچا سکا۔ تم ان سے کیا نتائج اخذ کرتے ہو"

مَیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ریڈرف اگر خطرہ میں نہیں ہے تو محفوظ بھی نہیں لیکن اس واقعہ کو اسکی موجودہ خوش نصیبی سے تو کوئی بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔

فرانسس۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ اشخاص جن کو اس نے بیوفائی سے مصیبت میں گرفتار کرایا۔ اس کی سود و بہبود کے کیوں خواہشمند ہوتے۔ اور اس کو نفع پہنچانے میں کس لئے کوشاں ہوتے لیکن اگر بفرض محال اس واقعہ میں اور اُس کی موجودہ حالت میں ذرا سا تعلق مان بھی لیں تو دو عطیے اور ریڈرف کو ملنے چاہئیں۔ کیونکہ پانچ اشخاص تھے۔

مَیں۔ لیکن لیفارج مر چکا ہے۔

فرانسس۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے اور ممکن ہے۔ کہ ہلارون مفلس اور نادار ہو لیکن یہ سب قیاسیات ہیں۔

مَیں۔ بیشک اور ہاں پھر تمہارا یہ بھی تو خیال ہے کہ ڈیفرسٹ اُس کے واسطے فرشتۂ رحمت ہے اور تینوں عطیات کی معطی نہیں تو کم ازکم ان کے حصول میں وسیلہ ضرور ہے۔

فرانسس۔ مَیں یہ خیال چھوڑ چکا ہوں۔ یہ اس کی حیثیت اور قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ ہر عورت کے قبضۂ اختیار سے بالاتر ہے۔

مَیں یہ سُنکر خاموش ہو گیا۔ فرانسس نے سیگار کے خاکستر کو کرسی کے بازو پر مسلا۔ اور کہنے لگا۔" مَیں نہیں سمجھ سکتا اس میں کیا راز مضمر ہے۔ لیکن دل ضرور گواہی دیتا ہے کہ اس کے انکشاف میں مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو جائیگی۔

تیسرا غیبی عطیہ اُس کے واسطے اور زیادہ موجب شہرت ہوا۔ روسلئے عظام اُس کو آنکھوں پر بٹھانے لگے قاعدہ ہے کہ متواتر شاندار کامیابیاں ایسے شخص کے لئے جو نااہل ہو۔ موجب تباہی نہیں تو کم ازکم اُس کے آزار کی

طرف مائل ضرور ہوجایا کرتی ہیں لیکن ریڈرف اس سے مستثنےٰ معلوم ہوتا تھا۔ اکثر سنا گیا ہے۔ کہ شادی مرگ ایسے اشخاص کے لئے معمولی بات ہوتی ہے۔ لیکن ریڈرف بہ ثبات عقل و صحت نفس سب کام کر رہا تھا۔

لارڈ فرانسس اور میں ایک دن پھر تھیٹر میں گئے اور جب کھیل کے اختتام پر وہاں سے نکل رہے تھے۔ تو ناگہاں فرانسس کی آنکھیں ایک شخص پر پڑیں اور وہ اُسے بغور دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا تو ریڈرف تھا۔ فرانسس سے نہ رہا گیا۔ آخر اُسے جا ہی پکڑا۔

پہلا سوال جو فرانسس نے کیا وہ یہ تھا۔

"ریڈرف مجھے بخوبی معلوم ہے کہ تمہیں کیا نیا واقعہ پیش آرہا ہے۔

ریڈرف۔ اچھا تمہارا کیا قیاس ہے۔

فرانسس۔ قیاس کیا یقین اور عین الیقین ہے کہ آخر کار ڈیفرسٹ تم پر مہربان ہو ہی گئی۔

ریڈرف۔ ہاں وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہوگئی

فرانسس۔ "میں پھر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں"۔

لیکن اس نے یہ تہہ دل سے مبارکباد ایسے خلوص اور گرمجوشی سے پیش نہیں کیا۔ جیسا کہ اس سے قبل وہ کیا کرتا تھا۔

ریڈرف۔ شکریہ۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ آج میرا بخت رشک طالع سکندر ہے۔

فرانسس۔ بیشک یہ چوتھا غیبی عطیہ ہے۔

اس کے بعد ایک عالم سکوت طاری ہوا میں اس وجہ سے اور بھی زیادہ پریشان تھا کہ آخر اس کو ریڈرف نے توڑا۔

ریڈرف۔ کل میری شادی ہے۔

فرانسس جیسے چونک اُٹھا۔

"کیا کہا کہ کل؟ ......"

ریڈرف (قطع کلام کر کے) جی ہاں کل شادی ہے۔ میرا اور ڈیفرسٹ کا معاملہ کوئی آج کا نہیں۔ بلکہ ماہ گزشتہ ہی اس نے مجھے ہدایت کردی تھی۔ کہ میں اسے صیغہ راز میں رکھوں۔

فرانسس۔ تو کیا شادی کی تقریب صیغہ راز میں نہ رہیگی۔

ریڈرف۔ بالکل

فرانسس لیکن تم نے مجھ سے کہہ دیا ہے۔

ریڈرف کے چہرہ پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ رخصت ہونے لگا لیکن جاتے جاتے وہ درخواست کرنے لگا۔

"خدارا اسکی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ڈیفرسٹ کی خواہش ہے کہ یہ صیغہ راز ہی میں رہے۔ اسکے مذہب کی رو سے جو میں نے اختیار کرلیا ہے۔ وقت تقریب اور محل تقریب دونوں کسی کو نہ بتلانے چاہئیں۔

فرانسس۔ کہاں ہوگی۔

ریڈرف۔ خود مجھے ابتک معلوم نہیں۔

فرانسس نے میری طرف دیکھا۔ میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ریڈرف بھی سکتہ کے عالم میں تھا۔ اور وہ نیچی نظریں کئے فرش پر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ کہ اچانک اُس کا چہرہ ایک خاص خوشی کی روشنی سے چمکا اور وہ اس طرح بولا۔ میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ کل انتظام دُلہن پر چھوڑ دینا بھی ایک عجیب معاملہ ہے۔ لیکن کیا کروں اُس کی خواہش یہی ہے اور وہ وعدہ بھی کرتی ہے۔ کہ مناسب موقعہ پر اس کی تفصیلات سے پوری پُوری آگاہی دیدے گی

فرانسس۔ اب آپ کی کوئی آرزو ایسی نہیں رہی جو پُوری نہ ہوگئی ہو۔

ریڈرف۔ بیشک

فرانسس۔ اچھا۔ اجازت۔ آج کی رات انتہا درجہ کی اندھیری ہے۔ اس شب دیجور میں ہر شخص اپنے مکان پر جلد از جلد پُہنچنا چاہتا ہے۔

ریڈرف چلدیا اور فرانسس میری طرف مخاطب ہُوا۔ بابو ان تمام باتوں کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

میں۔ تم بہت بے چین معلوم ہوتے ہو۔

فرانسس۔ حد سے زیادہ

میں۔ کیا یہ انتہا سے تعجب کا مقام نہیں ہے۔ کہ ریڈرف اُن تمام باتوں کو ہمیں صاف صاف بتادے جن کو چھپانے کی اس سے ڈیفرسٹ نے درخواست کی ہو۔

فرانسس۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ اُس کی یہ عین خواہش ہے کہ ہم اس محلِ تقریب کے آس پاس موجود رہیں۔ گو اُس نے صریح الفاظ میں اس کی خواہش تو نہیں کی لیکن اُس کی آنکھیں اس کی ملتجی معلوم ہوتی تھیں۔

میں۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ وہ بے چین ہے۔ خوفزدہ ہے۔ اور کسی خطرہ ......

فرانسس۔ یہ تو یقین ہے۔ کہ اُسے کچھ معلوم نہیں۔ اور وہ ایک عجیب دو دلی میں مبتلا ہے۔

میں۔ تو تم ضرور جاؤ گے ؟

فرانسس۔ یقیناً اگر کسی تدبیر سے ہم دونوں وہاں پُہنچ سکیں۔

نہیں معلوم فرانسس کو کہاں سے معلوم ہوگیا تھا۔ کہ ڈیفرسٹ ہلبورن ہوٹل میں ہے۔ عین وقت پر وہ ہوٹل کے دروازہ پر جا پُہنچا۔ مجھے موٹر میں چھوڑکر وہ اُترا اور گھات میں لگا رہا۔ اور جونہی اُس نے ریڈرف اور اس کی حسین معشوقہ کو ایک موٹر کار میں سوار ہوتے دیکھا وہ بھاگ کر میرے پاس آیا۔ اور فوراً موٹر حرکت میں آیا۔

موٹر کار اتنی کثرت سے تھے کہ تیز کرنے کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ اور اسپر برف باری غضب کی تھی۔ اس وجہ سے بھی موٹر کاریں سست رو تھیں۔ ہم آہستہ آہستہ آکسفورڈ سٹریٹ

سے گزرے۔ یہاں سے نکلتے ہی فرانسس نے مجھے تاکید کی "بابو تمہاری آنکھیں ریڈرف والے موٹر پر جمی رہیں میں موٹر چلاتا ہوں"۔

ماربل آرچ پر پہنچکر ہم ایڈگر روڈ کی جانب مڑے اور اس تمام راستے کو طے کیا۔ اب ہمیں اپنے موٹر کو کم از کم سو گز کے فاصلے پر رکھنا پڑا۔ تاکہ ہمارے تعاقب کا راز نہ کھلے اچانک اگلی موٹر گاڑی زاویہ قائمہ پر مڑی۔ اور ایک تنگ سی گلی کے پاس جاکر غائب ہوگئی۔

"بابو اترو اور دیکھو کہ موٹر گاڑی کہاں گئی ہے" فرانسس نے کہا۔

میں اترا اور آگے بڑھا۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ موٹر ایک میدان میں روکا گیا ہے۔ جس کے دونوں پہلوؤں پر گھنی جھاڑیاں ہیں۔ موٹر کو ایک طرف کر دیا گیا۔ اور ریڈرف اور اس کی معشوقہ بائیں طرف ایک لکڑی کے دروازہ میں داخل ہوئے۔

قریب ہی ایک چھوٹا سا اینٹوں کا مکان تھا۔ وہ دونوں اس مکان میں چلے گئے۔

میں پاشنہ کوب واپس آیا۔ اس نے پہلے ہی موٹر کو درخت کے نیچے کھڑا کر دیا تھا۔ اور نہایت بے صبری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اپنے معلومات بیان کئے۔ ہم دونوں اس گلی کی طرف مڑے۔ اور چشم زدن میں اس مکان کے دروازہ پر تھے۔ کچھ دیر انتظار کیا کہ دیکھیں آخر ہوتا کیا ہے۔ لیکن کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی۔ اب حیران تھے۔ کہ کیا کریں۔ کس طرح ایسی جگہ پہنچیں جہاں سے ہم چھپکر کل حالات دیکھتے رہیں۔ مجبوراً یہ مشورہ ہوا کہ چھجے تک پہنچیں۔ اور وہاں کسی جگہ چھپکر محو تماشا ہو جائیں۔

یہ خیال فوراً حرکات میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر پہلے فرانسس اوپر جا پہنچا۔ اور پھر ہاتھوں سے مجھے کھینچ لیا۔

تھوڑی دیر تک ہم دونوں خائف رہے کہ مبادا کھڑکی جو بالکل مقابل تھی کھلے۔ اور اس میں سے کوئی نمودار ہو۔ آوازیں تو سنائی دینے لگیں۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوا کہ دیکھیں کس طرح، کھڑکی پر زرد سا پردہ پڑا ہوا تھا لیکن خوش قسمتی سے ذرا چھوٹا تھا۔ اس لئے جھک کر آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

اندر کی طرف جھانکا تو ایک کمرہ نظر پڑا۔ جس کی دیواریں بالکل عریاں تھیں۔ وسط میں ایک میز بچھی ہوئی تھی۔

ایک بھدے سے میز پوش پر شادی کی ضیافت کا سامان رکھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے گرد چھ کرسیاں رکھی تھیں۔ اور ہر ایک کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا۔

یہ دیکھ کر میرے بدن میں ایک قسم کی سنسنی دوڑ گئی کہ ان میں سے چار آدمیوں کے چہرہ آدھے آدھے سیاہ مخمل کی نقاب سے پوشیدہ تھے۔ پانچویں کرسی پر ریڈرف تھا۔ جو

کھڑکی کے مقابل والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اسکی داہنی طرف ڈیفو سٹ بلوہ ریز تھی۔

ریڈرف کی آنکھیں ڈیفوسٹ کے نورانی چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ خوشی کے مارے اُس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں گویا رسوم شادی ادا کی جا چکی تھیں۔ اس سوال کا جواب اثبات میں معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ ضیافت اڑ رہی تھی پادری کہاں ہے؟ شاید رخصت کر دیا گیا ہو۔

اچانک تمام مجلس پر ایک خوفناک خاموشی طاری ہوگئی اور چند سنٹ بعد ان چاروں میں سے سب سے زیادہ بلند شخص کرسی سے اُٹھا۔ اور نہایت ہی کرخت آواز میں حضارِ مجلس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"حاضرین دولہا اور دلہن کے واسطے ہمارے عطیات کہاں ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ پیش کئے جائیں ریڈرف میں اپنا تحفہ اس سے قبل پیش کر چکا ہوں۔ میں تمہیں ایک اجنبی معلوم ہوتا ہوں لیکن تم مجھے خوب جانتے ہو۔ میں ان میں سے ایک شخص ہوں۔ جنہوں نے قسم کھائی ہے۔ کہ تمہارے نیرِ اقبال کو خط نصف النہار پر چمکتا دیکھیں اسی مقصد کے حصول کے لئے میں ماہ بماہ پانسو پونڈ کی رقم تمہارے پاس بھیجتا رہا ہوں۔ آنکھیں اوپر اُٹھاؤ۔ اور بنظرِ غور میری صورت دیکھو۔

یہ کہکر اس نے نقاب اُلٹ دیا۔ ریڈرف کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اُس نے خوف کے مارے میز کے ایک کنارے کو پکڑ لیا۔ اُس کی زبان میں لکنت آگئی۔ نہایت دبی ہوئی آواز میں اُس نے کہا۔

ک۔ ک۔ کونٹ ر۔ ر۔ چ۔ چ۔ چارنو - - - - - -

دوسرا شخص اُٹھا۔ وہ نسبتاً کمزور بدن کا تھا۔ وہ اس طرح گویا ہوا۔

میرے معزز دوست ریڈرف میری ناچیز پیشکش بھی خدمت عالی میں گذرانی جا چکی ہے۔ وہ منصب جلیلہ جس پر آپ ممتاز ہوتے ہیں۔ میری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے میں بھی تمہارا جام صحت پیتا ہوں۔ اگر اجازت دو تو میں آپکے ایک ناچیز معاون کو آپ کے پیشِ نظر کر دوں۔ ریڈرف کی ایک چیخ نکلی۔

ز۔ ز۔ زینا۔ تم یہاں . . . .

پورے طریق سے یہ فقرہ اس سے ادا نہ ہوا تھا کہ تیسرا شخص اُٹھا۔ یہ لحیم شحیم اور پست قد تھا۔

اُس کی آواز رعد کی طرح گونجی۔ "لو تمہاری قسمت پلٹنے میں میرا بھی حصّہ ہے۔ "سر" کا خطاب میرے ہی اثر کا نتیجہ ہے یہ خطاب ایسا معمولی نہیں کہ کسی کو مل جائے۔ اور وہ محسودِ جہاں نہ ہو۔ میں بھی تمہارا جام صحت نوش کرتا ہوں۔

خدایا فاسبر۔ فاسبر۔ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا میں اپنی آنکھوں پر یقین کر لوں۔ وہ بیہوش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد جب

پیش آیا تو اپنی داہیں طرف ڈیفرسٹ کی طرف دیکھا۔ چاہا کہ اس سے کچھ کہے لیکن اُس نے کرسی ایک طرف کو کھینچ لی۔ اور انتہائے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور ایک عجیب انداز سے بولی۔

"اب تم میری طرف دیکھتے ہو۔ آخر کس لئے۔ کیا وہ خوشی جس کی موجب میں ہوئی ہوں کسی حالت میں اُن لوگوں کے عطیات سے کم ہے۔ کیا میں نے ان سب کے ساتھ متفقہ کوشش نہیں کی۔ کہ تمہیں آسمان وجاہت پر پہنچا دوں۔ کیا اس سے زیادہ بھی تم حرص و آز رکھتے ہو۔

میں تمہاری آنکھوں میں ایک سوال پڑھ رہی ہوں۔

'میں کون ہوں؟' اس کا جواب سن لو لیفارج مقتول قیدخانے کے پتھروں پر پڑا ہوا ہے۔ وہ عورت جس کے کیف محبت نے اُسے بیخود کر دیا تھا۔ اور جو خود بھی اُس کے جام اُلفت سے سرشار تھی میں ہی ہوں۔

میں اپنے تعارف کی اور زیادہ ضرورت نہیں سمجھ سکتی۔ قریب تھا کہ ریڈرف ایک چیخ مارے کہ چوتھا آدمی اُٹھا۔ وہ میز کے دوسرے کنارے پر تھا۔

اُس نے نہایت ہی سخت الفاظ میں کہا۔ ٹھیرو ٹھیرو کیا میں ہی ایسا بدنصیب رہونگا۔ کہ اس عظیم الشان تقریب پر کوئی تحفہ پیش نہ کرسکوں۔ نہ میرے پاس مال و دولت ہے نہ طبقۂ بالا میں میرا کسی قسم کا اثر

بعد ازآں حضار مجلس سے خطاب کر کے کہا کہ آپ صاحبان نے اس شخص کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ جس کی خاطر خواہ عزت کرنے کے واسطے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔

اس کی پیشانی کو فرخندہ اختری کی روشنی سے آپ لوگوں نے روشن کر دیا ہے۔ کیا میں بھی اپنی بساط کے موافق اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں۔

اُس نے نقاب کو اپنے چہرہ سے اُتار کر زمین پر پھینک دیا۔ ریڈرف پر اتنا خوف طاری ہوا کہ وہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی نہ بول سکا۔ صرف ایک لفظ اسکی زبان سے ادا ہوسکا۔ جو ہلارون تھا۔

یہ شخص پھر چند الفاظ اپنی زبان پر لایا جن سے ریڈرف کے بدن پر لرزہ پڑ گیا۔

'دیکھو میرا تحفہ یہ ہے' یہ کہکر اُس نے انتہائے سرعت سے بجلی کی طرح اپنی جیب سے ایک پستول نکالا۔ اور ریڈرف کی پیشانی کو نشانہ بنایا۔

پستول کی آواز سنتے ہی میں نے پردہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کہ اس کو ہٹا کر کود پڑوں لیکن میرے ساتھی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا کہ اگر اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو جلدی کرو ہماری موجودگی اُن لوگوں کو معلوم ہوگئی۔ دیکھو وہ کھڑکی کی طرف جھپٹ رہے ہیں۔ ایک منٹ کے بعد ہم دونوں اپنی موٹر گاڑی میں تھے۔ جسے فرانسس انتہائی تیزی سے چلا

رہا تھا۔ جب تعاقب کے خوف سے رہائی پائی۔ تو فرانسس نے کہا۔

"بابو ہم کو دیر ہوگئی۔ میں بھی اس میں حصہ لینا چاہتا تھا لیکن اُس آئر لینڈ کے باشندے کی باتیں بڑی فریب دہ تھیں۔ وہ اچانک اپنا کام کر گزرا۔ خیر جان بچی لاکھوں پائے، وہ چاروں تو خیر اُس کے خون کے پیاسے تھے ہی لیکن ڈیپوسٹ خوبی شیرنی سے کسی حال میں کم ثابت نہیں ہوئی۔

اُف کتنی گہری سازش تھی۔ انتقام کی کیا عجیب صورت تھی۔ اپنے شکار کو عرصۂ اتلاف بنانے سے پہلے اسے کس طرح دولتِ دنیوی سے مالامال کیا گیا۔

میرے خیال میں پولیس اس کی تحقیقات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریگی۔ ہم بھی اس راز کے انکشاف کو سراغرس پولیس پر چھوڑتے ہیں۔ دیکھیں پولیس کہانتک اس کی سراغرسانی میں کامیاب ہوتی ہے۔

رمزی پانی پتی

سوز وساز

راز کیا اس دل میں ہے کیوں اے خدا جلتا ہوں میں؟
صورتِ قرطاسِ مکتوبِ وفا جلتا ہوں میں

گرچہ ہوں پروانہ لیکن شمع سے نا آشنا
ہائے کیا بے آرزوئے بے مدعا جلتا ہوں میں

ہر طرف نورِ محبت موجزن ہونے لگا
مثلِ شمعِ روشنِ ظلمت رُبا جلتا ہوں میں

رشک سے دیکھا ہے سوزِ نالہ انگیزِ سپند
کیا یہ آتش ہے کہ جس میں بے صدا جلتا ہوں میں

منزلِ لیلیٰ کو ہر گم کردہ رہ پانے لگا
رات بھر مثلِ چراغِ رہنما جلتا ہوں میں

آج کیوں تصویرِ خاموشی ہوں میں آتش نوا ؟
شعلہ آسا اِک زبانِ بے صدا جلتا ہوں میں

یہ تپش بھی ہوگئی صرفِ جنونِ جستجو
اک نفس مثلِ شرارِ نارسا جلتا ہوں میں

جب تری اُلفت سے ہے سوزِ شرارِ زندگی
کیوں کُنشتِ غیر میں پھر اے خدا جلتا ہوں میں؟

حامد علی خاں

کوئل سے خطاب

اے خجستہ مہماں خوش آمدی خوش آمدی　　مَیں نے یہ تیری کُہک گلزار میں اکثر سُنی
پیاری کوئل سچ بتا کیا تو پرندہ ہے کوئی　　حورِ جنّت ہے پری ہے یا فرشتہ ہے کوئی
یا تو صرف آواز ہے جو گونجتی ہے کان میں　　کوہ میں وادی میں آبادی میں اور میدان میں
فرشِ سبزہ پر کبھی جب باغ میں ہوں بیٹھتا　　کان میں آتی ہے تیز اور رس بھری تیری صدا
تو چمن کے واسطے لاتی ہے پیغامِ بہار　　تیری آمد پر ہوا صحرا بھی رشکِ لالہ زار
تیری ہستی باعثِ آبادیِ ویرانہ ہے　　گوشِ گل تیری صدا کے راز سے بیگانہ ہے
یہ صدا بھولے ہوئے قصّے سُناتی ہے مجھے　　ہائے بچپن کے دنوں کی یاد آتی ہے مجھے
ہائے کیا دن تھے چمن میں جب لبِ جُو بیٹھ کر　　تیری کو کو سن کے ڈھونڈتا تھا میں ہر سو نظر
جھاڑیوں میں دیکھتا شاخوں کے اندر جھانکتا　　اور تیری جستجو میں دشتِ صحرا جھانکتا
تیری صورت سے مگر یہ آنکھ بیگانہ رہی　　میرے مستقبل کی صورت ہے مگر صورت تیری
ہاں تو اک آواز ہے اک راز ہے امید ہے　　ہاں ترے ملنے کی دھن ہے آرزوئے دید ہے
تجھ سے اے فرخندہ پیکر اس چمن کی سرزمیں　　موسمِ گل میں بنی ہے رشکِ خلدِ بریں

ولی یمنی

جذباتِ وارث

بنا دے کیا کیا اے نقشبندِ آب و گل تو نے　　کہ جب یوں توڑنا تھا کیوں دیا تھا مجھ کو دل تو نے
ٹھہر اے آہِ سوزاں خرمنِ گل پر گری بجلی　　لگا دی آگ آخر آشیاں کے متّصل تو نے
وفورِ گریۂ خوں دید کی حسرت نہ نکلے گی　　نگاہِ شوق کو تو کر دیا ہے پا بہ گل تو نے
تصادم کوہِ غم کا اور دل اک شیشۂ نازک　　مرے پہلو میں یا رب کیوں نہ رکھ دی کوئی سل تو نے
یہ درد انگیز نالے اور یہ حسرت آفریں آہیں　　کوئی پوچھے تو وارث کیوں دیا تھا اسکو دل تو نے

وارث

رودادِ محبّت

مصنفہ ٹالسٹائی حصہ اول مترجمہ راز چاندپوری

تیسرا باب

ایک دن فصل کٹنے کے زمانہ میں کاٹیا، سونیا اور میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد باغ میں چلے گئے۔ اور اپنی پسندیدہ جگہ پر جا بیٹھے۔ جو لیمو کے درختوں کے سایہ میں تھی۔ اور جہاں سے پتلی وادی صاف نظر آتی تھی۔ اور جس کے بعد جنگل اور کھیتوں کا دلفریب منظر دکھائی دیتا تھا۔

سرجیائی دو دن سے ہم سے ملنے نہ آیا تھا۔ آج ہم کو اُس سے ملنے کی امید تھی۔ کیونکہ ہمارے گماشتہ نے کہا تھا۔ کہ وہ آج میرے ساتھ باہر جائیگا۔ دو بجے کے قریب ہم نے اُس کو گھوڑے پر سوار رائی کے کھیت میں ہو کر جاتے ہوتے دیکھا۔ کاٹیا نے مالن سے کچھ شفتالو اور شاہ دانے لانے کو کہا۔ جو اس کو بہت مرغوب تھے۔ اور پھر مسکرا کر میری طرف نظر کر کے وہ آرام کے ساتھ بینچ پر دراز ہو گئی اور اونگھنے لگی۔

میں نے لیمو کی ایک سرسبز و شاداب شاخ توڑ لی۔ جس سے میرا ہاتھ تر ہو گیا۔ میں اس شاخ سے کاٹیا کو ہوا دینے لگی۔ اور کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گئی اگرچہ بار بار میں کتاب سے نظر ہٹا کر میدان کی اس سڑک کی طرف دیکھتی تھی جس طرف سے وہ ہمارے پاس آنے والا تھا۔

سونیا ایک پرانے لیمو کے درخت کی جڑ پر بیٹھی ہوئی اپنی گڑیوں کے واسطے گھر بنا رہی تھی۔ گرمی کی شدت اور ہوا کی تیزی تھی۔ بادلوں کے مجتمع ہو جانے سے تاریکی پھیل گئی تھی اور صبح سے برق و رعد نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا میں اپنی عادت کے مطابق رعد کی آواز سے مضطرب تھی۔ لیکن دوپہر سے بادل منتشر ہونے شروع ہو گئے تھے سورج تیزی سے چمک رہا تھا۔ اور صرف آسمان کے ایک حصّہ میں رعد کی کڑک آہستہ آہستہ سُنائی دیتی تھی۔ بادل اُفق پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور بجلی کی شوخ و خمیدہ لہریں وقتاً فوقتاً اُس ابر میں تیرتی ہوئی اور زمین کی طرف آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جو افق سے کچھ اُوپر تھا۔ یہ بالکل ظاہر تھا۔ کہ کم از کم ہم آج اس طوفان باد و باراں سے

بچے رہینگے۔

باغ سے پیچھے سڑک پر گٹھوں سے لدے ہوئے مویشی نظر آرہے تھے۔اور خالی چھکڑے دوسرے گٹھوں کو لانے کے لئے تیزی کے ساتھ جارہے تھے۔ جن کے ساتھ رنگ برنگ کے لباس میں ملبوس کسانوں کے گروہ تھے۔

گرد وغبار نہ نیچے بیٹھتا تھا اور نہ اپنی جگہ سے ہٹتا تھا۔ بلکہ جھاڑیوں کے پیچھے باغ کے درختوں کے صاف و شفاف پتّوں کے درمیان رُکا ہوا تھا۔

دُور فاصلہ پر خرمن میں آدمیوں کی آواز اور پہیّوں کی گڑگڑاہٹ سُنائی دیتی تھی۔اور خشک پتّیوں کی کھڑکھڑاہٹ جو باڑہ کے قریب اُڑتیں اور پھر ہوا میں بلند ہو کر بیضاوی شکل کے مکان کی صورت میں نمایاں ہوتیں اور باہر نکلی ہوئی چھتوں کا نمونہ پیش کرتی تھیں۔ جن کے گرد کسانوں کا مجمع تھا۔

خاک آلود میدان میں گاڑیاں اِدھر اُدھر متحرک تھیں۔ زرد گٹھوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ آدمیوں کی آوازیں اور نغموں کی صدائیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔

ایک جانب میدان بالکل صاف اور چٹیل تھا۔اور جھاڑیوں کی قطاریں دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ داہنی طرف کچھ فاصلہ پر آدھے کٹے ہوئے بدنما کھیتوں میں چمکدار رنگین پوشاکیں پہنے ہوئے عورتیں نظر آرہی تھیں، جو گٹھوں کو باندھ رہی تھیں۔اُن کے ہاتھ سرگرم کار تھے۔حتےٰ کہ کھیت بالکل صاف ہو گئے۔اور سڈول گٹھے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ہموار جگہ پر پہنچا دئے گئے۔

میرے دیکھتے دیکھتے موسم گرما موسم خزاں میں تبدیل ہو گیا۔سوائے ہمارے باغ کے محبوب کُنج کے گرد وغبار اور گرمی ہر طرف پھیل گئی۔اس گرد وغبار اور دُھوپ میں ہر چہار طرف محنتی لوگ باتیں کرتے ہوئے اِدھر اُدھر مصروف کار تھے۔

لیکن کاٹیا اپنی کتان کا رومال مُنہ پر ڈالے ہوئے آرام سے سانس لے رہی تھی۔اور ٹھنڈک میں بینچ پر مزے سے محوِ خواب تھی۔ طشتری میں رکھے ہوئے شاہ دانے سیاہ، رسیلے اور خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ہماری پوشاکیں خوشرنگ اور صاف تھیں۔ دُھوپ کے عکس پڑنے سے گھڑے کا پانی چمک رہا تھا۔اور میں فرطِ مسرت سے بیخود تھی۔

میں نے اپنے دل میں کہا" میں کیا کروں۔کیا مجھے الزام دیا جا سکتا ہے کہ میں کیوں شاد وخرم ہوں،لیکن میں اپنی مسرت میں کس طرح کسی کو شریک کر سکتی ہوں۔اور کس کو میں اپنی تمام خوشی اور سب کچھ حوالہ کر سکتی ہوں؟"

آفتاب بید کے درختوں کی چوٹیوں کے پیچھے وادی میں غروب ہو رہا تھا۔ گرد وغبار کھیتوں پر جم رہا تھا۔اور

فضائے آسمان سورج کی ترچھی شعاعوں سے روشن ہو رہی تھی۔ بادل بہت دور نکل گئے تھے۔ خرمن کے پیچھے درختوں کے درمیان سے تین نئے اانک کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ اور کسان اُن کے پاس سے جُدا ہو رہے تھے۔ چھکڑے گڑگڑاتے ہوئے آخری بار کھیتوں کی طرف جارہے تھے۔ کسانوں کی عورتیں اپنے شانوں پر کانٹے رکھے اور پیٹیوں میں بید کی شاخیں لگائے گاتی ہوئی گھروں کی جانب جارہی تھیں۔ مگر سرجیائی ابھی تک نہ آیا تھا۔ اگرچہ بہت پہلے میں نے اس کو سڑک پر اپنے گھوڑے پر سوار آتے ہوئے دیکھا تھا۔

یکایک درختوں کے کنج میں سے اس کا درانفذ ظاہر ہوا۔ اس طرف سے اُس کے آنے کی مجھے امید نہ تھی۔ وہ نالے کے گرد گھومتا ہوا آیا تھا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ وہ اپنی ٹوپی ہاتھ میں لئے ہوئے جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا میری جانب آیا۔ جب اُس نے کاٹیا کو سوتے دیکھا تو خاموش دبے پاؤں میرے پاس آیا۔ مجھ کو فوراً معلوم ہوگیا کہ وہ اس وقت اس عجیب اور ناقابلِ بیان جوشِ مسرت کی ایک خاص حالت میں تھا جس کو میں بہت پسند کرتی تھی۔ اور جس کو ہم "وحشیانہ ذوق و شوق" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ مثل اس طالب علم کے تھا۔ جس نے ابھی ابھی مدرسہ کی پابندی سے رہائی پائی ہو۔ اس کا تمام جسم سر سے پاؤں تک اطمینان و مسرت اور طفلانہ خوشی کا منظر تھا۔

اُس نے میرے نزدیک آکر اور میرا ہاتھ دبا کر آہستہ آہستہ کہا۔ "میری نوجوان حسینہ! تم کیسی ہو۔ تمہاری طبیعت ناساز تو نہیں۔ کیا تم بخیریت ہو؟" میرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا۔ "ہاں آج میں اپنے ابتدائی جذبات سے مکیف ہوں۔ آج میں ایک تیرہ سالہ لڑکا ہوں۔ میرا دل کھیلنے کودنے اور درختوں پر چڑھنے کو چاہتا ہے۔"

اُس کی تبسم نگاہوں کو دیکھ کر اور یہ معلوم ہونے پر کہ یہ وحشیانہ جوش متعدی ہے میری زبان سے بیساختہ نکلا۔ "تم وحشیانہ حالتِ شوق میں ہو۔"

اُس نے اپنی ایک آنکھ چھپا کر اور متین صورت بنا کر کہا۔ "بیشک، لیکن تم کاٹیا کی ناک پر کیوں ضرب لگا رہی ہو؟"

بات یہ تھی کہ جب میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور شاخ کو برابر ہلا رہی تھی تو میں نے یہ نہ دیکھا تھا کہ کاٹیا کے چہرہ سے رومال ہٹ گیا ہے۔ اور شاخ کی پتیاں اُس کے چہرے سے مس کر رہی ہیں۔

مجھے بیساختہ ہنسی آگئی اور میں نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن وہ کبھی اس بات کو تسلیم نہ کریگی۔ کہ وہ سو رہی تھی۔" میری آہستہ آہستہ گفتگو کرنے سے ظاہر تھا کہ میں چاہتی ہوں کہ کاٹیا بیدار نہ ہو۔ لیکن دراصل یہ وجہ نہ تھی۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس کے ساتھ سرگوشیاں کرنے میں لطف حاصل ہوتا تھا۔

اُس نے اپنے لبوں کو حرکت دی اور میری نقل اُتاری کیونکہ میں نے اس قدر آہستگی کے ساتھ مندرجہ بالا جملہ کہا تھا۔ کہ اس کو سُننا ناممکن تھا

شاہ دانوں کی طشتری دیکھ کر اُس نے خاموشی کیساتھ اس کو اُٹھا لیا۔ اور لیمو کے درختوں کے سایہ میں سونیا کے پاس جاکر اس کی گڑیوں پر بیٹھ گیا۔ سونیا پہلے تو ناراض ہوئی لیکن اُس نے جلد ہی اس کو اس حیلہ سے خوش کر لیا۔ کہ دیکھیں دونوں میں کون زیادہ شاہ دانے کھا سکتا ہے۔

میں نے کہا "اگر تم پسند کرو تو میں کچھ اور شاہ دانے منگاؤں یا تم خود لے آؤ۔"

اُس نے شاہ دانوں کی طشتری اُٹھالی۔ سونیا کی گڑیاں اس میں رکھ لیں۔ اور ہم دونوں ایک ساتھ وہاں سے اٹھ کر کنج میں چلے آتے۔ سونیا ہنستی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی۔ اور اس کے کوٹ کو کھینچنا شروع کیا۔ تاکہ وہ اس کی گڑیاں واپس کر دے۔ اُس نے گڑیاں واپس دیدیں۔ اور توجہ کے ساتھ میری طرف مخاطب ہوا۔

اُس نے ایسی آہستگی کے ساتھ مجھ سے گفتگو شروع کی۔ گویا کہ وہ ہنوز کسی کے جاگ اُٹھنے سے خائف تھا۔ اُس نے کہا "کیا تم حسین دوشیزہ نہیں ہو؟ گرد و غبار، گرمی اور کام کے بعد جیسے ہی میں تمہارے پاس آیا تو مجھ تک خوشبو کی لپٹیں آنے لگیں۔ وہ گلوں کی مہک نہ تھی۔ بلکہ وہ پہلی قسم کے پھول تھے۔ جو پیدا ہی ماں ہوتے ہیں اور جن سے برف کے پگھلنے اور بہار کی دوسری خوبصورت چیزوں کی خوشبو آتی ہے۔"

میں نے اُس خوشگوار اضطراب کو جو اس کی اس گفتگو سے میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ پوشیدہ رکھنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "خیر، یہ بتاؤ کہ اب فصل کی کیا حالت ہے"

اُس نے کہا "شاداں و فرحاں ایسے کسان جہاں کہیں ہم کو ملینگے خوش و خرم ملینگے جسقدر ان لوگوں سے مجھے واقفیت ہوتی جاتی ہے۔ اسی قدر میں ان کا شیفتہ اور دلدادہ ہوتا جاتا ہوں"

میں نے کہا۔ "ہاں، آج تمہارے آنے سے پہلے میں اپنے باغ سے ان کے کام کو دیکھ رہی تھی اور یکایک مجھے ندامت کا احساس ہوا۔ کیونکہ وہ اپنے کام میں مصروف تھا اور میں اطمینان سے بیکار بیٹھی ہوئی تھی" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرو" اس کے بعد دفعتاً وہ خود بہت سنجیدہ ہو گیا اُس نے جوشِ محبت میں اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالدیں اور کہنے لگا۔ "یہ ایک پاک شے ہے۔ خدا تم کو اس سے

محفوظ رکھے۔"

"بیشک، مَیں نے صرف تم ہی سے اس کا ذکر کیا ہے"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔لیکن ہم شاہ دانے کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟"

احاطہ مقفل تھا اور کوئی مالی موجود نہ تھا۔اُس نے خود ان سب کو اِدھر اُدھر کام کے لئے بھیجدیا تھا، سونیا چابی لانے کی غرض سے مکان کی طرف دوڑی۔لیکن وہ بغیر اس کا انتظار کئے ہوئے دیوار کے ایک گوشہ پر چڑھ گیا۔اور جال ہٹا کر دوسری طرف کو دگیا۔اُس نے اندر سے کہا "کیا تم کچھ شاہ دانے لوگی؟ لاؤ مجھے طشتری دیدو۔"

مَیں نے جواب دیا۔"نہیں مَیں خود شاہ دانے توڑونگی مَیں خود چابی لانے جاتی ہوں۔کیونکہ وہ سونیا کو نہ ملیگی۔"

لیکن اس وقت میری خواہش یہ تھی کہ مَیں دیکھوں کہ وہ وہاں کیا کر رہا ہے۔کیسا معلوم ہوتا ہے۔اور کس طرح چلتا پھرتا ہے۔جبکہ وہ یہ سمجھے ہوئے ہے کہ اس وقت مجھ کو کوئی شخص نہیں دیکھ رہا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مَیں اس کو اپنی نگاہ سے ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل ہونے دینا نہیں چاہتی تھی۔مَیں دبے پاؤں احاطہ کے دوسری طرف، جہاں کانٹے دار درخت تھے۔جا پہنچی۔اس جگہ دیوار زیادہ بلند نہ تھی۔مَیں ایک خالی ناند پر کھڑے ہو کر احاطہ کے اندر دیکھنے لگی۔دیوار میرے سینے سے نیچی تھی۔

میں نے احاطہ کے اندرونی حصّہ میں نظر دوڑائی پُرانے اور گٹھیلے درختوں اور اُن کے چوڑے دندانہ دار پتّوں کو دیکھا جن کے سایہ میں وزنی اور رسیلے شاہ دانے لٹک رہے تھے۔جال کے نیچے مَیں نے اپنا سر جُھکا کر دیکھا اور سرجیائی کو ایک پُرانے شاہ دانے کے درخت کی شاخ کے سایہ میں کھڑے ہوتے پایا۔

وہ یقیناً اس خیال میں تھا کہ مَیں جا چکی تھی اور اسکو دیکھنے والا کوئی موجود نہ تھا۔وہ برہنہ سر اپنی آنکھیں بند کئے ایک پُرانے درخت کے دو شاخے پر بیٹھا ہُوا شاہ دانے کے گوند کا ایک چھوٹا سا گولہ بنانے میں مصروف تھا۔یکایک اُس نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔اپنی آنکھیں کھولیں اور مُنہ ہی مُنہ میں کچھ کہکر وہ مُسکرایا۔وہ الفاظ جو اس کی زبان سے نکلے تھے۔اور اس کی مسکراہٹ اسقدر دلکش تھی۔کہ مجھے اس طرح چُھپکر اُسے دیکھنے سے افسوس ہُوا۔مجھے محسوس ہوا کہ اس کی زبان سے "دلربا" نکلا تھا۔

مَیں نے اپنے دل میں کہا "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اُس نے بہت آہستگی اور پیار سے پھر کہا "پیاری دلربا" مگر مَیں نے اس کے الفاظ صاف صاف سُن لئے۔میرا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔اور مجھے اس قدر مسرت حاصل ہُوئی کہ مَیں نے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ دیوار کو پکڑ لیا۔تاکہ مَیں گر نہ پڑوں۔اور میرا فریب

نہ کھل جائے۔ اُس نے میری حرکات کی آواز سُن لی۔ متحیّر ہو کر مجھے دیکھا۔ اور یکایک اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور مثل ایک بچّے کے وہ پشیمان سا ہو گیا۔

اُس نے مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اور اُس کا چہرہ اور زیادہ سرخ ہو گیا۔ تاہم جب اُس نے مجھے دیکھا تو اُس کو ہنسی آگئی۔ اور مَیں بھی مُسکرا دی۔ اس کا پُورا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

اب وہ مثل اُس ضعیف چچا کے نہ معلوم ہوتا تھا جو کبھی مجھ کو بہلایا کرتا تھا۔ اور نصیحت کیا کرتا تھا۔ بلکہ اب وہ ایک ایسا آدمی تھا جو نہ مجھ سے بڑا تھا نہ چھوٹا۔ جو مجھ سے محبت رکھتا تھا۔ اور ڈرتا بھی تھا۔ اور جس سے مجھ کو بھی محبت تھی۔ اور جس سے مَیں بھی ڈرتی تھی۔

ہم دونوں میں سے کسی کی زبان سے بھی کوئی لفظ نہ نکلا۔ بلکہ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مگر یکایک اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس کی آنکھوں سے چمک اور مسرت مفقود تھی۔ اور میری جانب اس کا تخاطب پھر سنجیدہ اور مربیانہ ہو گیا۔ گویا ہم کوئی غیر مناسب کام کر رہے تھے اب وہ اپنے ہوش و حواس میں آگیا تھا۔ اور مجھ سے بھی ہوش میں آنے کو کہہ رہا تھا۔

اُس نے کہا "بہتر یہ ہے کہ تم نیچے اُتر جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم گر پڑو اور چوٹ کھاؤ۔ اپنے بال درست کرو

تم کو معلوم نہیں کہ اس وقت تم کس حالت میں ہو"

مَیں نے متنفّر ہو کر اپنے دل سے پُوچھا۔ "وہ مجھ سے ظاہر داری کیوں کر رہا ہے؟ وہ میرے جذبات کو کیوں صدمہ پہنچانا چاہتا ہے؟ اس وقت یکبارگی ایک زبردست خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی۔ کہ مَیں اس کو پریشان کروں اور اپنی طاقت کو اس پر آزماؤں۔

مَیں نے کہا "نہیں مَیں خود اپنے ہاتھوں سے شاہ دانے توڑوں گی" اور ایک شاخ کو پکڑ کر جو نزدیک ہی لٹک رہی تھی۔ مَیں دیوار پر کھڑی ہو گئی۔ اور اپنے پیر اُوپر رکھ لئے جب مَیں دیوار سے زمین پر کود ی۔ تو اُس نے مجھے سہارا دینے کی مطلق کوشش نہ کی۔

"تم کیسی حماقت کر رہی ہو" اُس نے کہا اور اسکا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُس نے اپنے اضطراب کو غصّہ کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا۔ "دیکھو! ممکن تھا۔ کہ تمہارے چوٹ آجاتی۔ اور اب تم کس طرح یہاں سے باہر نکلو گی؟"

وہ اب پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔ لیکن اس وقت اس کے اضطراب سے بجائے مسرت کے مجھے خوف معلوم ہوا یہ اضطراب متعدی تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔ کہ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ اس لئے مَیں خجل ہو کر اُس کے پاس سے تھوڑی دُور جا کر شاہ دانے توڑنے لگی۔ اگرچہ اُنکے رکھنے

کے لئے میرے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ میں نے اپنے آپ کو ملامت کی۔ مجھے افسوس ہوا۔ میں خائف ہوئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری جلد بازی کی بدولت میرے متعلق اس کی رائے خراب ہوگئی۔ ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ اور یہ خاموشی ناگوار معلوم ہو رہی تھی۔

سونیا چابی لیکر آگئی۔ اور اس قید سے ہم کو نجات ملی۔ ابتک ہم دونوں میں سے کسی کی زبان سے کبھی کوئی لفظ نہ نکلا تھا۔ اور ہم دونوں نے سونیا کو مخاطب کر کے گفتگو شروع کی۔

جب ہم کاٹیا کے پاس واپس آئے تو اس نے یقین دلایا کہ میں سوتی نہ تھی۔ اور میں ہر ایک بات سُن رہی تھی تو مجھے اطمینان ہوا۔ اُس نے اپنا معمولی مربیانہ اور بزرگانہ لب ولہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ایسا کرنا اُسکے اختیار میں نہ تھا۔ اور وہ مجھے مطلقاً دھوکا نہ دے سکتا تھا۔ اس وقت مجھے وہ دل آویز گفتگو یاد تھی۔ جو آج سے پہلے اُس کے اور میرے درمیان ہو چکی تھی۔

کاٹیا اکثر کہا کرتی تھی۔ کہ بہ نسبت عورت کے مرد کے لئے محبت اور اظہار محبت کرنا بہت آسان ہے۔ کاٹیا نے کہا۔ کہ "مرد اپنی زبان سے اظہار محبت کرسکتا ہے لیکن عورت نہیں کرسکتی۔"

سرجیائی نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ مرد کو نہ اظہار محبت کرنا چاہئے۔ اور نہ وہ ایسا کرسکتا ہے۔"

"آخر اس کا سبب؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کہنا ہمیشہ غلط ہوگا کیس قسم کا مکاشفہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے محبت رکھتا ہے؟ جیسے ہی کوئی شخص اپنی زبان سے اظہار محبت کرتا ہے۔ وہ ایک قسم کا تیر چلاتا ہے۔ اور وہ غلام بن جاتا ہے کیونکہ وہ محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اظہار محبت کرتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً کوئی معجزہ ظاہر ہوگا یا کوئی غیر معمولی عجیب واقعہ پیش آئیگا۔ گویا بیشمار توپیں یکدم داغی جائینگی۔" اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پھر کہا۔ "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ لوگ جو دیانتداری سے اظہار محبت کرتے ہیں یا تو خود فریب میں ہوتے ہیں یا دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ جو بہت زیادہ بُرا ہے۔"

کاٹیا نے دریافت کیا۔ "مگر اظہار محبت نہ کیا جائے تو پھر کس طرح عورت کو معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اُس سے کوئی شخص محبت کرتا ہے۔"

اُس نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں۔ ہر آدمی کا طرز گفتگو جداگانہ ہوتا ہے۔ مگر محبت نام ہے ایک جذبہ کا اور اس کا اظہار جذبہ ہی کی صورت میں ہونا چاہئے۔ جب میں افسانے پڑھتا ہوں۔ تو مجھے ہمیشہ خیال ہوتا ہے کہ قیس و فرہاد لیلیٰ و شیریں سے اظہار محبت کرتے وقت

کسقدر مضطرب الحال ہوتے ہو نگے۔ اظہار محبت کے وقت
عاشق کو خیال ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ کسی غیر معمولی صورت
میں نکلیگا۔ لیکن عاشق یا معشوق دونوں میں سے کسی کے
لئے بھی کوئی نئی بات ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ پھر بھی اپنی حالت
پر بدستور قائم رہتے ہیں۔ اور ان کے لئے ہر شے اگلی سی
ہوتی ہے۔"

اس کی ظریفانہ گفتگو کے پردہ میں مجھے اصلیت کا
احساس ہوا۔ کہ اس کا خطاب میری جانب ہے۔ مگر کاٹیا
کی ان جھوٹے افسانوں کے سننے سے تسلّی نہ ہوئی۔

کاٹیا نے کہا" تم تو ہمیشہ بعید از عقل باتیں کیا کرتے
ہو سچ سچ بتاؤ کیا تم نے کبھی کسی عورت سے اظہار محبت
نہیں کیا؟"

اُس نے قہقہہ مار کر کہا" کبھی نہیں میری گردن کبھی
کسی حسین کے سامنے خم نہیں ہوئی۔ اور نہ کبھی ہوگی"

میں نے اُس کی گفتگو کو یاد کر کے اپنے دل میں کہا۔
"یقیناً اس کے لئے اب مجھ سے اظہار محبت کرنا ضروری
ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ لاکھ
بیگانہ بننے کی کوشش کرے۔ مگر میری آنکھوں میں خاک
نہیں ڈال سکتا۔

اُس شام اس نے مجھ سے بہت کم گفتگو کی لیکن اُس
کے ہر لفظ میں جو وہ کاٹیا یا سونیا کو مخاطب کر کے کہتا اور اس
کی ہر ادا اور ہر نظر میں مجھے محبت کی جھلک نظر آتی تھی اور میرا
خیال درست تھا۔ میرے لئے صرف یہ خیال تکلیف دہ تھا
اور مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا۔ کہ وہ اپنی گزشتہ بے غرضی
اور بے التفاتی کے اظہار کو ضروری سمجھتا ہے۔ درآنحالیکہ
حقیقت بے نقاب ہو چکی تھی۔ اور ہر طرح مسرور ہونے کا
موقع حاصل تھا۔ مگر شاہ دانوں کے تختہ میں داخل ہونے
پر مجھے سخت افسوس تھا۔ مجھے خیال تھا۔ کہ اس طرح میں
نے اپنے آپ کو اس کی نظر میں حقیر بنا لیا ہے۔ اور وہ مجھ
سے ناخوش ہو گیا ہے۔

چائے نوشی کے بعد میں پیانو پر جا بیٹھی اور اُس نے
بھی میرا ساتھ دیا۔

اُس نے مجھے ملاقات کے کمرہ میں لے جاتے ہوئے
کہا" مجھے کوئی نغمہ سناؤ۔ میں نے مدّت سے تمہارا کوئی ترانہ
نہیں سنا ہے"

میں نے یکایک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
" سرجیائی میں تم سے دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ تم مجھ سے
ناخوش تو نہیں ہو؟ کیا واقعی تم ناراض ہو؟"

اُس نے پوچھا" میں کیوں ناراض ہونے لگا"

میں نے حجاب آلود لہجہ میں جواب دیا" اس لئے کہ
میں نے آج سہ پہر کو تمہاری مرضی کے خلاف کام کیا تھا"

اُس نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ اپنا سر ہلایا اور ہنس پڑا۔

اُس کے بشرہ سے ظاہر تھا۔ کہ وہ مجھ کو ملامت کریگا۔ لیکن اُس میں اتنی ہمّت نہ تھی۔

مَیں نے پیانو کے نزدیک بیٹھتے ہُوئے کہا۔ "میرا اس سے کچھ مطلب نہ تھا۔ اب پھر ہم ایک دوسرے کے دوست ہو گئے ہیں، کیوں درست ہے؟"

اُس نے جواب دیا "کیوں نہیں؟ یقیناً ہم دوست ہیں"

ملاقات کے وسیع اور آراستہ کمرہ میں صرف دو شمعیں پیانو کے اُوپر روشن تھیں اور کمرہ کا باقی حصّہ تاریک تھا۔ موسم گرما کی صاف و شفّاف رات کی روشنی کھُلی ہُوئی کھڑکی کی راہ سے اندر آرہی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہُوئی تھی۔ کبھی کبھی کاٹیا کے قدموں کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ جو ایک تاریک کمرہ میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ اور سرجیائی کے گھوڑے کی ہنہناہٹ اور سبزہ زار پر اُس کے سُم پٹکنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ اُس کا گھوڑا کھڑکی کے نیچے بندھا ہُوا تھا۔

وہ میرے عقب میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اس لئے مَیں اس کو نہ دیکھ سکتی تھی۔ لیکن ہر جگہ ——— کمرہ کی دُھندلی روشنی میں، نغموں اور خود اپنی رُوح میں ——— مجھے اسکا جلوہ نظر آرہا تھا اس کی ہر نظر اور ہر حرکت میرے دِل پر اثر کر رہی تھی۔ اگرچہ مَیں ان کو دیکھ نہ سکتی تھی۔

مَیں نے وہ ترانہ چھیڑا جو وہ میرے واسطے لایا تھا اور جس کو مَیں نے اس کی ہدایت کے مطابق صرف اس کی خاطر سے یاد کیا تھا۔ مجھے اس کا مطلقاً احساس نہ تھا۔ کہ مَیں کیا بجا رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ مَیں نے اس کو اچھی طرح بجایا ہوگا۔ اور مجھے یقین تھا۔ کہ وہ اس سے مطمئن تھا اگرچہ مَیں اس کی طرف دیکھ نہ سکتی تھی لیکن مُجھے اُس مسرت کا احساس تھا۔ جس سے وہ متلذّذ ہو رہا تھا۔ وہ میری پشت پر بیٹھا ہُوا تھا۔ مگر مَیں اُس کی نگاہ کو برابر محسوس کر رہی تھی۔ جو وہ مجھ پر جمائے ہُوئے تھا۔

حالت بیخودی میں جبکہ میری اُنگلیاں پیانو پر رقصاں تھیں۔ مَیں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اُس کا سر شب کی تاریکی میں نمایاں تھا۔ وہ اپنے ہاتھ پر سر رکھے بیٹھا ہُوا تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

جب مَیں نے اس کو اس طرح محو دید دیکھا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور مَیں نے پیانو بجانا بند کر دیا۔ وہ مُسکرایا اور ملامت آمیز طریقہ سے اپنے سر کو جنبش دی۔ گویا وہ چاہتا تھا کہ مَیں برابر پیانو بجاتی رہوں۔

جب مَیں نے پیانو بجانا بند کیا۔ ماہتاب کی روشنی جو پہلے ہی سے سطح فلک پر پھیل چکی تھی۔ کمرہ کے اندر آرہی تھی۔ اور سیمیں شعاعیں فرش پر کھیل رہی تھیں۔

کاٹیا کی رائے میں، مَیں نے بہترین موقعہ پر پیانو بجانا موقوف کر دیا تھا۔ اور وہ اس امر پر اصرار کرنے لگی۔

کہ میں نے اچھی طرح نغمہ نوازی نہ کی تھی لیکن مسر جیانی نے کہا کہ میں نے آج سے بہتر کبھی پہلے نہیں بجایا۔ وہ کمرہ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ بار بار ڈرائنگ روم سے تاریک ملاقات کے کمرہ میں جاتا اور پھر واپس آتا۔ وہ ہر بار مجھے دیکھتا اور مسکراتا میں بھی مسکراتی اور قریب قریب قہقہہ لگاتی۔ اگرچہ مجھے اس ہنسی کا کوئی سبب معلوم نہ ہوتا تھا۔ میں اس روز بہت ہی خوش و خرم تھی۔

ایک بار جیسے ہی وہ دروازہ کے باہر گیا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں کاٹیا سے لپٹ گئی۔ جو پیانو کے نزدیک میرے پہلو میں کھڑی ہوئی تھی۔ اور میں نے اسکے اس جگہ بوسہ لینے شروع کر دئے۔ جو مجھے سب سے زیادہ پسند تھی یعنی اس کی گداز گردن اور زنخدان پھر جیسے ہی وہ کمرہ کے اندر واپس آ گیا۔ میں نے سنجیدگی اختیار کرنے اور اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کی۔

کاٹیا نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آج اس کو کیا ہو گیا ہے؟"

لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور وہ میری طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے

اُس نے ملاقات کے کمرہ میں جہاں وہ باغ کی جانب چھجہ دار کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ کہا۔ "دیکھو کیسی پیاری رات ہے!"

ہم اُس کے پاس چلے گئے۔ واقعی رات اس قدر خوشگوار اور باصرہ نواز تھی کہ میں نے آج سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ماہ کامل مکان کی آڑ میں ہماری پشت پر تھا اور اس لئے وہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ چھت ستوان اور چبوترہ پر تنے ہوئے شامیانہ کا نصف سایہ ریتیلی روشوں اور گھاس کے بیضاوی تختہ پر ترچھا پڑ رہا تھا۔ باغ کا باقی تمام حصہ روشن تھا۔ اور ماہتاب کی سیمین شعاعوں سے قطرات شبنم جگمگا رہے تھے پھولوں کے تختہ کے درمیان کا وسیع راستہ، جس کے اُس طرف ایک جانب بلند جھاڑیوں کا سایہ ترچھا پڑ رہا تھا۔ نظر افروز اور دلکش کن تھا اور کہر آلود فضا میں چمکدار پھروں کے ٹکڑے چمک رہے تھے۔

درختوں کے سایہ میں نارنگیوں کے تختہ کی صاف و شفاف بالائی سطح دکھائی دے رہی تھی۔ اور نالے سے بخارات اُٹھ رہے تھے۔ سوسن کے خاموش کنج، جن میں ہنوز اچھی طرح پھول نہ کھلے تھے، چاند کی روشنی میں روشن و منور تھے۔ تمام شبنم آلود پھولوں میں صاف فرق تھا۔ کنجوں میں روشنی اور سایہ اس طرح ملے ہوئے تھے۔ گویا وہ درختوں اور روشوں سے بنے ہوئے نہ تھے۔ بلکہ صاف و شفاف مکانات تھے۔ جو متحرک و مرتعش تھے۔

داہنی طرف مکان کے سایہ میں تاریکی ہی تاریکی تھی

مگر باوجود اس تاریکی کے مکان کے نزدیک چنار کی بلند چوٹیاں عجیب انداز سے تاریکی کے مقابل غیر متحرک اور صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیلگوں آسمان کی خاموش فضا میں بہت بلندی پر جا پہنچیں گی۔

مَیں نے کہا۔ "آؤ ہم باہر چلیں"۔

کاٹیا رضامند ہو گئی لیکن مجھ سے کہا۔ "تم اپنا بوٹ پہن لو"

مَیں نے جواب دیا۔ "کاٹیا! بُوٹ پہننے کی کیا ضرورت ہے۔ سرجیائی مجھے سہارا دیگا"

گویا اس طرح میرے پیر نم آلود نہ ہو سکینگے۔

لیکن اس وقت سب نے میرا مطلب سمجھ لیا اور کسی کو مطلق تعجب نہ ہُوا۔ اُس نے کبھی مجھ کو اپنے بازو پر سہارا نہ لینے دیا تھا لیکن اب مَیں نے اپنی خواہش کے مطابق ایسا کیا۔ اور اس کو بالکل تعجب نہ ہُوا۔ وہ اور میں دونوں باہر نکلے۔ اور چبوترہ پر جا بیٹھے۔ یہ دُنیا، یہ آسمان، یہ باغ اور فضا میری نظروں میں پہلے سے بالکل مختلف تھے۔

جب مَیں نے اس کُنج پر نظر ڈالی جس میں سے ہم گزر رہے تھے۔ تو مجھے خیال ہُوا کہ ہم ایک لحہ میں ٹھیر جائینگے اور عالمِ امکان ختم ہو جائیگا۔ لیکن یہ تماشہ ہمیشہ اس طرح قائم رہیگا۔ اور اس کی خوبصورتی میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

لیکن ہم برابر قدم بڑھاتے چلے گئے۔ اور حسن کی سحر طرازی ہماری سدِ راہ نہ ہُوئی۔ ہم اور آگے بڑھ گئے۔ وہاں بھی جیسا کہ خیال تھا باغ، درخت، روشیں اور خشک پتّیاں موجود تھیں۔ اور ہم صرف روشنی اور سایہ کو پامال کرتے ہُوئے روشوں پر گھوم رہے تھے۔ صرف خشک پتّیاں ہمارے پاؤں کے تلے کھڑکھڑا رہی تھیں۔ اور سرد ہوا کے جھونکے میرے چہرہ سے مس ہو رہے تھے۔ اُس وقت صرف وہ میرے پہلو بہ پہلو قدم اٹھا رہا تھا۔ اور اُس نے سلیقہ کے ساتھ میرے ہاتھ کو اپنے بازو پر رکھ لیا تھا۔ کاٹیا ادھر اُدھر ہوتی ہُوئی ہمارے پیچھے پیچھے چلی آتی تھی۔ آسمان پر صرف چاند اپنی پُوری آب و تاب کے ساتھ مصروف سیر تھا جسکی روشنی غیر متحرک شاخوں سے گزر کر ہمارے اُوپر پڑ رہی تھی۔

مگر ہر قدم پر فطرت کی سحر طرازیاں نظر نواز ہوتی تھیں۔ اور مجھے یقین نہ تھا۔ کہ ہم اور آگے بڑھ سکیں گے۔ مجھے اُن تمام چیزوں کا خیال بھی نہ تھا جو ہمارے چاروں طرف محیط تھیں۔

کاٹیا یکایک چلّا اُٹھی۔ "اوہ! مینڈک، مینڈک!"

مَیں نے اپنے دِل میں کہا۔ "یہ کون چلّایا اور کیوں؟"

لیکن مجھے فوراً ہی ہوش آگیا۔ اور معلوم ہُوا کہ یہ کاٹیا تھی۔ جو مینڈکوں سے ڈرتی ہے۔ مَیں زمین کی طرف دیکھنے لگی، ایک چھوٹا سا مینڈک اُچھلتا ہُوا میرے سامنے آیا۔ اور

ٹھیر گیا۔ اس کا چھوٹا سا سایہ صاف وشفاف روش پر پڑ رہا تھا۔

سر جیانی نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا تم کو خوف نہیں معلوم ہوتا؟"

مَیں نے اس کی طرف دیکھا۔ کُنج کے لیموں کے درختوں میں سے ایک درخت کاٹ دیا گیا تھا۔ اس جگہ پر جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ اُس کا چہرہ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اُس وقت وہ بہت ہی خوبصورت اور مسرور تھا۔

اُس نے کہا تھا "کیا تم کو خوف نہیں معلوم ہوتا" مگر اس کے الفاظ میں ایک راز نہاں تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ "پیاری خاتون! مَیں تجھ سے محبّت رکھتا ہوں۔ ہاں مجھے تجھ سے محبت ہے۔ مَیں تجھے پیار کرتا ہوں۔"

اُس کی نگاہوں اور اس کے بازو کی حرکت سے اسکا اظہار ہوا۔ اور روشنی، سایہ، ہوا اور ہر شے نے اُس کے الفاظ کو دُہرایا۔

ہم نے تمام باغ کا گشت لگایا۔ کاٹیا ہمارے ساتھ تھی وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی تھی۔ اور اُس کا سانس پھُولا ہُوا تھا۔ کاٹیا نے کہا کہ اب واپس چلنا چاہیے۔ اس پر مجھے افسوس ہُوا ـــــ افسوس ہُوا اُس غریب ضعیفہ کی حالت پر۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ ان جذبات سے کیوں متاثر نہیں جس سے ہم تھے۔ اور کیوں سب لوگ مثل اس رات کے اور مثل ہمارے مسرور نہ تھے!

ہم مکان پر واپس آگئے۔ لیکن باوجود دیر ہو جانے کے اُس نے رُخصت ہونے کی اجازت نہ مانگی۔ مرغ بانگ دے رہے تھے۔ گھر کے سب آدمی خوابِ راحت کے مزے لے رہے تھے۔ اور اس کا گھوڑا کھڑکی کے نیچے زور زور سے بے صبری کے ساتھ زمین پر ٹاپیں مار رہا تھا اور ہنہناتا تھا۔ کاٹیا نے ہم کو آگاہ نہ کیا کہ رات زیادہ گزر چکی ہے اور جب ہم ادھر اُدھر کی دلخوش کن گفتگو میں مصروف تھے ہم کو اس کا خیال بھی نہ تھا کہ صبح کے تین بج چکے ہیں۔

جب وہ ہم سے رُخصت ہُوا تو مُرغ سہ بارہ بانگ دے رہے تھے۔ اور آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہو چلا تھا وہ اپنے معمول کے مطابق کسی غیر معمولی بات کے اظہار کئے ہُوئے رُخصت ہُوا۔ لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ آج سے وہ میرا ہے۔ اور مجھے اُس کو ضائع نہ کرنا چاہیے جب مجھے اپنے دِل میں اس امر کا یقین ہو گیا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ تو مَیں نے کاٹیا سے پُورا قصّہ کہہ دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اور میری گفتگو کا اس پر بہت اچھا اثر پڑا۔ کہ مَیں نے اس کو اپنا راز دار بنا لیا۔ لیکن غریب کاٹیا اس رات کو پھر بھی سو گئی۔ اس کے برخلاف میں چبوترہ پر اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ اور باغ میں چلی گئی۔ مَیں اسکے ہر لفظ

کو دہراتی اور ہر انداز کو یاد کرتی ہوئی اُس کنج میں جا پہنچی جہاں وُہ اور میں دونوں ایک ساتھ رہ چکے تھے۔

مَیں رات بھر نہ سو سکی۔ اور اپنی زندگی میں آج پہلی بار یہ موقع نصیب ہوا کہ صبح تک بیدار رہی۔ اور طلوع سحر کا لطف اُٹھایا۔ اور اُس رات کے بعد آج تک میں نے پھر کبھی ویسی رات اور صبح نہیں دیکھی۔

مَیں نے اپنے دل سے کہا " وہ مجھ سے سادگی کیساتھ کیوں نہیں کہتا کہ اس کو مجھ سے محبت ہے۔ وہ ایسی مشکلات کا تصوّر کیوں کرتا رہتا ہے۔ اور اپنے آپ کو کیوں ضعیف العمر کہتا ہے۔ جبکہ ہر شے ایسی دلکش اور حسین ہے؟ وہ کیوں اس زرّیں وقت کو ضائع کر رہا ہے۔ جو غالباً پھر کبھی واپس نہ آئیگا۔ اس کو کہنا چاہیئے: مجھے تجھ سے محبت ہے' اس کو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بوسہ دینا چاہیئے اور پھر کہنا چاہیئے۔ میں تجھے پیار کرتا ہوں۔ الغرض اس کے لئے لازمی ہے کہ اُسکا چہرہ سُرخ ہو جائے۔ اس کی نگاہیں میرے سامنے جُھک جائیں۔ اور پھر مَیں اُس سے سب کچھ کہہ دوں یا نہیں، مَیں اس سے کچھ نہ کہوں بلکہ اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈالدوں اور اس کو اپنے سینہ سے لگا کر اشک ہائے مسرت برساؤں — لیکن فرض کرو کہ مَیں غلطی پر ہوں۔ اور وہ مجھ سے محبت نہ کرتا ہو" یکایک یہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔

مَیں اس کے تصوّر سے کانپ اُٹھی۔ خُدا جانے مَیں کیا کر گُزری ہوتی —— ہم دونوں کا وہ اضطراب جبکہ مَیں شاہ دانہ کے تختہ میں دیوار سے کود کر اس کے پاس پہنچی تھی۔ مجھے یاد آگیا اور میرا دل بھر آیا۔ میرے دل پر بہت ہی بار ہو گیا۔ میری آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ مَیں نے خُدا کے حضور میں سرِ نیاز جُھکانے کی کوشش کی اور مجھے ایک عجیب اطمینان و امید کا احساس ہوا۔ اپنی سالگرہ کے دن عشاء ربانی میں حصّہ لینے اور اس کی منسوبہ بن جانے کی نیّت سے مَیں نے اسی دن سے روزہ رکھنے کا ارادہ کر لیا۔

کیوں اور کس طرح ایسا ہو سکتا ہے؟ اس کا مجھے ذرا بھی خیال نہ ہوا۔ مگر اس وقت سے میرا اعتقاد مضبوط ہو گیا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور ایسا ہی ہوگا۔ کمرہ میں پہنچنے سے پہلے ہی کافی روشنی پھیل چکی تھی۔ اور لوگ بیدار ہونے لگے تھے۔

چوتھا باب (۴)

چونکہ یہ ایک مذہبی فرض تھا۔ اس لئے میرے اس ارادہ پر کہ مَیں ان ایام میں عشاء ربانی کی شرکت کیلئے تیاری کروں گھر میں کسی کو بھی تعجب نہ ہوا۔

اس ہفتہ میں سرجیائی ایک دن بھی ہم سے ملنے نہ آیا

اور مجھے اس کے نہ آنے پر تو تعجب تھا، نہ پریشانی اور نہ تکلیف بلکہ اس کے برعکس مجھے خوشی تھی۔ کہ وہ نہیں آیا۔ میں صرف اس امید پر خوش تھی، کہ میری سالگرہ کے دن وہ مجھ سے ملیگا

اس ہفتہ پھر میں ہر صبح کو سویرے اٹھتی رہی۔ اور جبتک گھوڑوں پر ساز نہ کسا جاتا میں باغ میں اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی اور کل کے گناہوں پر توبہ و استغفار کرتی۔ اور سوچتی کہ آج مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تاکہ میرا وقت اطمینان سے گزرے۔ اور میں گناہوں سے محفوظ رہوں۔

اس وقت مجھے گناہوں سے باز رہنا بہت ہی آسان معلوم ہوتا تھا۔ میرے نزدیک صرف کوشش کرنی ضروری تھی۔ جیسے ہی گاڑی میں گھوڑے جوت دئے جاتے میں کاٹیا یا کسی کنیز کو ساتھ لیکر اپنی فٹن میں گرجا کو جاتی۔ گرجا میں داخل ہوتے وقت مجھے خیال ہوتا کہ دعا اُن سب کے واسطے مانگنی چاہیے۔ جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ اور میں اسی خیال میں ڈوبی ہوئی دروازہ کی گھاس سے ڈھکی ہوئی ابتدائی دو سیڑھیوں پر چڑھ جاتی۔

دن کے اس حصہ میں آٹھ دس کسانوں یا غلاموں سے زیادہ کبھی گرجے میں نہ ہوتے جو عشاء ربانی کے لئے تیاریاں کیا کرتے۔ میں ان کے سلام کا جواب بہت ہی عاجزی سے دیتی اور خود الماری کے پاس جاکر اس بوڑھے سپاہی کی موم بتیاں نکال لاتی جو گرجے کے سامان کا محافظ تھا۔ اور ان کو پردہ کے سامنے لاکر رکھ دیتی اور اس کام کے انجام دینے سے مجھے بہت خوشی حاصل ہوتی تھی۔

مقدس دروازہ سے قربانگاہ کا وہ پردہ نظر آتا تھا۔ جس پر اماں نے بیل بوٹے بنائے تھے۔ پردہ پر دو زاویہ تھے۔ جو چمکدار ستاروں سے مزین کئے گئے تھے۔ اور ایام طفولیت میں مجھے بہت ہی بڑے معلوم ہوتے تھے۔ اور وہ فاختہ بھی تھی۔ جس کے گرد زرد رنگ کا ہالہ بنا ہوا تھا۔ اور جو ہمیشہ میری طفلانہ طبیعت کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

قربان گاہ کے قریب بپتسمہ دینے کا مخصوص برتن رکھا ہوا تھا۔ جہاں پر بارہا میں خود اپنے ملازموں کے بچوں کی دینی ماں ہونے کی حیثیت سے کھڑی ہو چکی تھی اور جہاں خود مجھ کو بپتسمہ دیا گیا تھا۔

ضعیف پادری اپنا چغہ پہنکر آتا جو اس سیاہ کپڑے کا بنا ہوا تھا جس سے میرے والد کی عبا بنی تھی۔ اور اپنے اُس قدیم لہجہ میں نماز پڑھاتا۔ جس کو میں ہوش سنبھالنے کے وقت سے اپنے گھر پر، سونیا کو بپتسمہ دینے کے وقت اپنے والد کی فاتحہ اور والدہ کے جنازہ پر سنتی رہی تھی۔

مغنی کی صدائے لرزاں مثل سابق قربان گاہ میں گونجتی اور وہاں پر وہی ضعیفہ عورت موجود ہوتی۔ جس کو جہانتک مجھے یاد ہے میں نے ہر عبادت کے موقع پر ہمیشہ گرجے میں دیکھا تھا۔ جس کی کمر خمیدہ ہوکر دوہری ہوگئی تھی۔ جو دیوار کے پاس

کھڑی ہو کر اشک آلود نگاہوں سے قربان گاہ کے پردہ کو دیکھا کرتی اور اپنے بدرنگ شال کو اپنے بے رونق ہاتھوں سے پکڑے ہوئے اپنے پوپلے منہ سے نماز ادا کرتی تھی۔

ابتدا ان سب باتوں میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو میرے اشتیاق کو اُکساتی۔ اور نہ وہاں کی صحبت ہی مجھ کو پسند تھی لیکن اب یہ سب باتیں مجھے مقدس، قابل احترام اور پُر معنی معلوم ہوتی تھیں۔

میں مناجات کا ہر لفظ غور سے سُنتی اور اپنے محسوسات سے اس کا جواب دینے کی کوشش کرتی۔ اور جب کبھی میں پورے طور پر اس کے معنی سمجھنے سے قاصر رہتی تو دل ہی دل میں خدا سے التجا کرتی کہ اس کا مطلب میرے دل پر ظاہر ہو جائے یا اس مناجات کی بجائے جس کا مفہوم میری سمجھ میں نہ آتا تھا میں اپنے دل میں کوئی اور دُعا پڑھتی۔

جب توبہ و استغفار کا وقت آتا تو گزشتہ زمانہ میرے پیش نظر ہوتا۔ اور وہ عالم طفلی کا معصوم زمانہ میری موجودہ روشن روح کے زمانہ میں اسقدر تاریک معلوم ہوتا کہ میری آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ اور میں خوفزدہ ہو جاتی۔ مگر اسکے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوتا کہ میرے پچھلے گناہ معاف ہو گئے ہیں یا اگر میرے گناہ ناقابل عفو ہوتے تو اس کے مقابلہ میں میری توبہ بھی زیادہ دردانگیز ہوتی۔

نماز کے بعد جب پادری کہتا "خدا کی رحمتیں تم پر نازل ہوں" تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ایک فطری احساس مسرت مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ اور یکایک ایک عجیب جوش انبساط میرے دل میں موجزن ہو جاتا۔

جب نماز ختم ہو جاتی تو نیک پادری میرے پاس آ کر مجھ سے کہتا "کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ شام کی نماز ہمارے گھر پر ہو۔ اور وہ پُوچھتا کہ اسے کب آنا چاہئے۔ میں اُس کی اس عنایت کا پُرجوش شکریہ ادا کرتی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ وہ صرف میری خاطر سے اس قسم کی تجویز پیش کرتا تھا اور میں اُس سے کہہ دیتی۔ کہ اچھا میں خود آؤنگی یا آپ کو اطلاع دیدونگی وہ دریافت کرتا "کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کرینگی؟"

میں نہ سمجھ سکتی کہ مجھے کیا جواب دینا چاہئے۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہ کہیں میں مغرور ہو کر گناہ کی مرتکب نہ بن جاؤں۔

نماز کے بعد سوائے اس وقت کے کہ کاتیا میرے ساتھ ہوتی۔ میں ہمیشہ فٹن کو خالی گھر واپس کر دیتی تھی۔ اور راہگیروں کو عاجزانہ سلام کرتی۔ کسی کو مدد دینے، کسی کو نصیحت کرنے کسی کی مُصیبت میں حصہ لینے، کسی کا بوجھ اُٹھوانے کسی بچہ کا جھولا جھلانے یا کسی کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنے کا موقع تلاش کرتی ہوئی پیدل گھر واپس ہوتی۔

ایک دن شام کے وقت میں نے اپنے گماشتہ کو کاتیا سے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ سمیون نامی کسان کچھ تختے اپنی لڑکی کا تابوت بنانے اور کچھ روپیہ فاتحہ کے انتظام کے لئے مانگنے

آیا تھا جو اُس کو دیدیا گیا۔

مَیں نے دریافت کیا "کیا وہ اس قدر غریب ہے!"

مجھے بہت افسوس ہُوا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک قسم کی خوشی بھی حاصل ہُوئی۔ کاٹیا کو یہ بتا کر کہ مَیں اِدھر اُدھر گھومنے جا رہی ہوں مَیں بالاخانہ پر گئی۔ اور اپنا سب روپیہ اُٹھا کر کے (اگرچہ وہ بہت تھوڑا تھا) نیچے اتری تنہا چبوترہ سے گزر کر باغ کو پار کرتی ہوئی گاؤں میں پہنچ کر سیمیون کے مکان پر جا پہنچی

سیمیون کا مکان گاؤں کی بالکل آخری حد پر تھا۔ بغیر اس کے کہ کوئی شخص مجھے دیکھ سکتا مَیں کھڑکی کے نزدیک گئی۔ روپیہ دہلیز پر رکھدئے۔ اور کواڑوں پر دستک دی۔

کوئی شخص مکان سے نکلا۔ اور اُس نے کھڑکی کھول کر مجھے پکارا لیکن مَیں مثل ایک گنہگار کے ترساں و لرزاں اپنے گھر کی طرف بھاگی۔

کاٹیا نے مجھ سے دریافت کیا کہ مَیں کہاں گئی تھی۔ اور میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا تھا۔ مگر مَیں نے یہ بھی نہ سنا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اور مَیں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یکایک مجھے اپنی یہ حرکت حقیر و مذموم معلوم ہونے لگی۔ مَیں نے اپنے کمرہ میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اور عرصہ تک اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ کیونکہ اس وقت مَیں کوئی کام کرنے یا کچھ سوچنے یا اپنے جذبات کو سمجھنے کے قابل نہ تھی۔

مجھے اُس مسرت کا اندازہ ہُوا جو اُس غریب کے تمام خاندان کو ہُوئی ہوگی۔ اور اُن دُعاؤں کا خیال ہُوا جو وہ اس شخص کے حق میں کرینگے۔ جس نے ان کو روپیہ دیا تھا۔ اور مجھے افسوس ہُوا کہ مَیں نے اپنے ہاتھ سے یہ رقم اُن کو کیوں نہ دی۔

مجھے اس کا بھی خیال ہُوا کہ اگر سرجیائی میری اس احمقانہ کمزوری کو سُنے گا۔ تو کیا کہیگا۔ لیکن مَیں مسرور تھی۔ کہ اس راز سے کوئی شخص کبھی واقف نہ ہوسکیگا۔ مجھے اس قدر خوشی تھی۔ کہ تمام چیزیں جن میں میری ذات بھی شامل تھی۔ میری نظروں میں بے وقعت معلوم ہونے لگیں۔ اور میرا دل جذبات انبساط سے اس قدر لبریز تھا کہ موت کا خیال بھی مسرت کا پیغام بنکر آیا۔ میں مُسکرائی۔ مَیں نے خُدا سے دُعا مانگی اور بے اختیار میرے آنسو نکل پڑے۔ اُس وقت اپنی ہستی اور دُنیا کی ہر شے کیلئے ایک ناقابل بیان جوش محبت میرے دل میں موجزن تھا۔

مَیں نے انجیل مُقدّس کی چند آیتیں پڑھیں جو نماز کی کتاب میں موجود تھیں۔ جس قدر یہ کتاب میری سمجھ میں آتی گئی اُسی قدر رُوحانی زندگی کا افسانہ دلکش معلوم ہونے لگا اور اس کے اصول اسی قدر دشوار اور خوفناک و عمیق جذبات و خیالات سے لبریز پائے گئے لیکن اسی وجہ سے جب مَیں نے کتاب کو علیحدہ رکھ کر اپنے خیالات اور تصوّرات کو اس زندگی کی طرف رجوع کیا۔ جو میرے گردو پیش تھی تو ہر چیز نہایت صاف اور سادہ معلوم ہونے لگی۔

سیدھی سادی زندگی بسر کرنا مجھے دشوار نہ معلوم ہوتا تھا اور ہر ایک سے محبت کرنا اور ہر ایک کا محبوب بننا بالکل معمولی بات نظر آتی تھی۔ سب مجھ پر مہربان تھے۔ اور مجھ سے محبت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ سونیا بھی جس کو روزانہ درس دیتی تھی پہلے سے بالکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ میری حالت کو سمجھنے اور مجھے تسلّی دینے کی کوشش کرتی۔ اور کبھی ناخوش ہونے کا موقع نہ دیتی تھی۔

سب میرے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے تھے۔ جیسا کہ مَیں خود ان کے ساتھ کرتی تھی۔ ان لوگوں کا خیال کرتے ہوئے جو مجھ سے ناراض تھے۔ اور اعتراف گناہ سے پہلے ان سے معافی مانگنا میرے لئے لازمی تھا۔ مجھے ایک نوجوان ہمسایہ خاتون یاد آئی۔ اب سے سال بھر پہلے چند مہمانوں کے سامنے مَیں نے اس کا مضحکہ اُڑایا تھا۔ اور اُس دن سے اُس نے مجھ سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ مَیں نے اس کو ایک خط لکھا۔ اس میں اپنے قصور کا اعتراف کیا۔ اور اُس سے معافی چاہی۔ اُس خط کے جواب میں اُس نے مجھے معاف کرتے ہُوئے مجھ سے بھی معافی مانگی۔ جب مَیں نے ان چند سادہ الفاظ کو پڑھا۔ جن میں اس وقت عمیق اور دلکش معانی پوشیدہ تھے۔ تو میری آنکھوں سے اشک ہائے مسرت ٹپکنے لگے۔ اور جب مَیں نے اپنی ضعیفہ دایہ سے معافی مانگی، تو وُہ رونے لگی۔

مَیں نے اپنے دل سے پُوچھا۔ "آخر سب لوگ مجھ پر اسقدر مہربان کیوں ہیں۔ اور مَیں اس محبت کی کس طرح مستحق ہوں؟" غیر ارادی طور پر مجھے سرجیائی کی یاد آئی۔ اور مَیں عرصہ تک اس خیال میں محو رہی۔ مَیں اس کے خلاف کچھ نہ کر سکی۔ اور مجھ کو یہ غیر مناسب نہ معلوم ہُوا۔ تاہم اس رات کی بہ نسبت جب کہ مجھے پہلی بار اس امر کا احساس ہُوا تھا۔ کہ مجھے اس کے ساتھ محبت ہے۔ اب میرے خیالات بالکل مختلف تھے۔ اُس کے متعلق میرے خیالات ویسے ہی تھے جیسے کہ اپنے متعلق تھے۔ اور وہ فطرۃً میرے مستقبل سے وابستہ ہو گیا تھا۔

اس کی بزرگی کا خیال جو اس کی موجودگی میں میرے دل و دماغ پر مسلّط رہتا تھا۔ بالکل مفقود ہو گیا تھا۔ مَیں اپنے آپ کو اس کا ہم پلّہ سمجھنے لگی تھی۔ اور اس روحانی ترقی کی بدولت جو مجھے حاصل ہو چکی تھی۔ مَیں اس کا مزاج پُورے طور پر سمجھ گئی تھی۔

ابتک جو غیر معمولی باتیں اسکے اندر نظر آتی تھیں اب وہ بالکل نمایاں اور ظاہر تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ صرف دوسروں کے لئے زندہ رہنے میں حقیقی مسرت ہے۔ اب پہلی بار مجھے اس کا یقین ہُوا۔ اور مَیں اس کے اس قول کی پُورے طور پر مؤید ہو گئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں ایک غیر فانی اور حقیقی مسرت کے مالک ہونگے۔ (باقی پھر)

آنسو

اشک کہتا ہے بتاؤ تو بھلا کیا مَیں ہوں — چیستاں ہوں نہ پہیلی نہ معما مَیں ہوں
سر بہ سر رنج و غم و یاس کی تصویر ہوں مَیں — ہمہ تن حسرت و اندوہ و تمنّا مَیں ہوں
عہدِ طفلی میں ملا داغِ یتیمی مجھ کو — اپنی پُھوٹی ہوئی تقدیر کو روتا مَیں ہوں
دِل کے ڈُوبے ہوئے ارمان ہیں لاکھوں مجھ میں — لوگ قطرہ جسے کہتے ہیں وہ دریا مَیں ہوں
آئینہ مجھ کو سمجھتے ہیں وہ حیراں ہوں مَیں — آنکھ جس پر سے نہ اُٹھے وہ تماشا مَیں ہوں
مجھ سے جاں باز کو غربت ہے بساطِ شطرنج — جو نہ لوٹے کبھی واپس وہ پیادا مَیں ہوں
ہو گیا آگ سے پانی کا نکلنا ثابت — دِل میں کچھ سوز ہو پیدا تو ہویدا مَیں ہوں
کوئی دم اور ہوں پھر خاک میں مل جاؤں گا — طفل سمجھو نہ مجھے عمر میں بُوڑھا مَیں ہوں
ہو گا دُنیا میں نہ مجھ سا بھی کوئی تر دامن — اپنی ہی شرم و خجالت کا پسینا مَیں ہوں
نوکِ مژگاں پہ مجھے گردشِ قسمت لائی — فلکِ چشم کا دُمدار ستارا مَیں ہوں
شورِ فریاد و فغاں کیوں نہ مرے ساتھ رہے — آرزوئے دِلِ مضطر کا جنازا مَیں ہوں

ننگِ مخلوق ہوں مَیں سامنے کیونکر آؤں
جی میں آتا ہے کہ ہیرے کی کنی کھا جاؤں

وسعتِ چشم ڈراتی ہے بیاباں ہو کر — چبھتے ہیں موئے مژہ خارِ مغیلاں ہو کر
شمعِ ہستی کو بُجھا دیتی ہے صرصر کی طرح — جنبشِ دستِ اجل جنبشِ مژگاں ہو کر
عالمِ یاس کے گوشوں میں لئے پھرتی ہے — گردشِ چشم مجھے گردشِ دوراں ہو کر
سامنے میرے ڈراتی مجھے مُنہ پھاڑ کے ہے — منزلِ ملکِ عدم چاکِ گریباں ہو کر
قفسِ موئے مژہ سے ہے رہائی مر کر — عمر کٹتی ہے مری قیدیِ زنداں ہو کر
آئینہ خانۂ عالم کو جو دیکھا مَیں نے — بن گیا آپ ہی آئینہ میں حیراں ہو کر

پانی سورج کو دیا کرتا ہوں ہندو بن کر — حج کیا کرتا ہوں کعبے کا مسلماں ہو کر
بارِ صد کوہِ الم کے بھی برابر اُترا — چشمِ گریاں نے جو تولا کفِ میزاں ہو کر

گر پڑا آنکھ سے منت کشِ مژگاں نہ ہوا
رل گیا خاک میں شرمندۂ احساں نہ ہوا

مزرعۂ عیش کو میں آگ لگا دیتا ہوں — بجلیاں خرمنِ عشرت پہ گرا دیتا ہوں
میری چپ میں بھی وہ غوغائے قیامت ہے بھرا — سینکڑوں فتنۂ خوابیدہ جگا دیتا ہوں
کیا ہے ساون کی جھڑی میری جھڑی کے آگے — آبروِ ابر کی پانی میں بہا دیتا ہوں
گر پڑوں چشمِ بتاشے سے اگر خاک پہ میں — کنگرہ عرشِ معلےٰ کا ہلا دیتا ہوں
میں برس جاؤں اگر ابرِ ندامت بن کر — حرف سب دفترِ عصیاں کے مٹا دیتا ہوں
میرا دربار زمانے میں ہے دُر بار ایسا — جھولیاں موتیوں سے بھر کے لٹا دیتا ہوں
گھر خدا کا نہ بچے اُٹھے جو طوفاں میرا — کعبۂ دل کی عمارت کو بٹھا دیتا ہوں
ابرِ رحمت مری ہر بوند مقرر سمجھو — شعلۂ برقِ جہاں سوز بجھا دیتا ہوں
بند کر دیتا ہوں دمِ تیغ دو دم کا دم میں — دمِ عیسےٰ کی طرح مردے جلا دیتا ہوں
لوگ اس واسطے غماز مجھے کہتے ہیں — جو چھپا رکھنے کی باتیں ہیں بتا دیتا ہوں
راز افشا نہ کروں یہ مرے بس کی نہیں بات — اپنے بدنام کنندوں کو دعا دیتا ہوں

رُخ کے آئینے میں جس وقت نظر آتا ہوں
آپ ہی حسن پہ اپنے میں پھسل جاتا ہوں

غم نصیبوں کا غم و رنج میں غمخوار ہوں میں — دکھ میں ساتھی ہوں مصیبت میں مددگار ہوں میں
نہیں معراج سے کم نوکِ مژہ کی سولی — بزمِ عشاق میں منصور ہوں سردار ہوں میں
ہے کبھی تارِ مژہ رشتۂ تسبیح مرا — اور کبھی دوش پہ باندھے ہوئے زنار ہوں میں
میں کبھی آگ کلیجے کی بجھا دیتا ہوں — خرمنِ دل پہ کبھی برقِ شرر بار ہوں میں

زندگی بخش کبھی ہوں مَیں مسیحا کی طرح
اور کبھی نرگسِ بیمار کا بیمار ہوں مَیں

ژالہ باری ہے کبھی کشتِ اِمل پر میری
دامنِ دل پہ کبھی ابرِ گہر بار ہوں مَیں

بزم میں فرطِ خوشی کی مَیں علالت ہوں کبھی
اور کبھی دل کے جنازے کا عزادار ہوں مَیں

کام کرتا ہوں گھروں میں کبھی دُنیا والے
خانقاہوں میں کبھی زاہدِ دیں دار ہوں میں

کبھی اک قطرہ ہے پانی کا حقیقت میری
کبھی اُمڈا ہُوا اک قلزمِ ذخار ہوں میں

تیرے ہی فضل و کرم پہ ہے بھروسا یارب
اِک خطا وار سیہ کار گنہ گار ہوں میں

توشہ کچھ پاس نہیں اپنی ندامت کے سوا
آسرا کوئی نہیں ہے تری رحمت کے سوا

خون کی جھڑیاں لگاتا ہے جو ساون میرا
رات دن پھولا پھلا رہتا ہے گلشن میرا

بستی ہے حسرت و ارمان کی دُنیا مجھ میں
قطرہ دریا ہے مرا دانہ ہے خرمن میرا

میرے طالب مجھے آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں
سُرمۂ چشمِ غزالاں ہے یہ جوبن میرا

بلبلِ گلشنِ رخسار بنا کر حق نے
شاخِ مژگاں پہ بنایا ہے نشیمن میرا

موسیٰ مردمکِ دیدہ کا محبوب ہوں میں
جلوۂ طور بنا ہے رُخِ روشن میرا

مَیں وہ مقبولِ الٰہی ہوں کہ ہنگامِ دُعا
دم بھرا کرتے ہیں سب شیخ و برہمن میرا

رازِ ہستی مری فریاد سے ہوتا ہے عیاں
نغمہ ہے مردِ خُدا کے لئے شیون میرا

دُور اُس دل سے ہوں جو سخت ہے لوہے کی طرح
پایہ پہنچا ئیگا کیا دیدۂ سوزن میرا

ہو چکیں صحبتیں پیغامِ قضا آ پہنچا
اب تو اے دستِ مژہ چھوڑ دے دامن میرا

رونے والے دمِ آخر تو گلے مِل لوں مَیں
پھر تو ڈھونڈے سے بھی پائیگا نہ مدفن میرا

حیف کیا جلد ملا خاک میں میرا تن و توش
زندگی ختم ہوئی چشم زدن میں اے جوش

جوش ملسیانی

انتقام

راجکمار آہستہ آہستہ اُٹھا۔ اور قیدی پر ایک تند نگاہ
ڈالکر بولا۔
"تم نے سُن لیا ہے نا؛ تم پر کیا الزام ہے؛ تم اس
الزام کا کیا جواب دینا چاہتے ہو؟"
پابہ زنجیر قزاق کھلکھلا کر ہنس پڑا۔
"عدالت گستری کا تماشا ختم کر۔ مجھے اپنی قسمت کا
فیصلہ اُسی وقت معلوم ہو گیا تھا۔ جب مَیں تیرے ہاتھوں میں
گرفتار ہوا تھا۔ مَیں نے تیرے بھائی کو موت کی میٹھی نیند سُلا
دیا۔ تو اس کے انتقام میں مجھے سزائے قتل دیگا۔ تو نے عدالت
کی زبان میں ثابت کر دیا ہے۔ کہ مَیں قزاق اور قاتل ہوں۔
جس طرح آج مَیں تیرے قلعہ میں پابزنجیر ہوں۔ اگر تو
میرے خیمہ میں اسی طرح لایا جاتا۔ تو مَیں تجھ پر وہی الزام
ثابت کر سکتا تھا۔ جو تو نے آج مجھ پر ثابت کئے ہیں۔ مجھے
معلوم نہ تھا۔ کہ مقتول تیرا بھائی ہے۔ ورنہ مَیں اُسے موت
کے گھاٹ نہ اُتارتا۔ کیونکہ چھوٹا ڈاکو بڑے قزاق کی عزت
کیا کرتا ہے۔ لیکن میں اس عدم واقفیت کو اپنا شفیع
نہیں بناؤنگا۔
جب ایک بھیڑیا مر جاتا ہے تو دوسرے بھیڑیے
اس کی تکا بوٹی کر لیتے ہیں۔ اب مَیں تیرے ہاتھوں میں گرفتار
ہوں۔ تیرا جی چاہے میرا سر قلم کر دے۔ یا میرے بدن کی
بوٹی بوٹی اُڑا دے۔ جنگ کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔ اور
مَیں تجھ سے اس کی شکایت نہیں کرتا۔ تیرے ساتھیوں کی
تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے تو میری جمعیت کو پریشان کر کے
مجھے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اس امر کا اطمینان
ہے۔ کہ اگر تو مجھے سو دفعہ بھی قتل کر سکے تو تیرا بھائی زندہ
نہ ہو سکیگا۔ اس لئے اس کھیل کو جو کئی گھنٹہ سے جاری ہے
ختم کر اور میری سزا کا حکم سُنا۔ مَیں موت سے ہم آغوش ہونے
کے لئے بالکل آمادہ ہوں۔"
قزاق کی اس تقریر کے بعد چند لمحہ عدالت پر سکون
طاری رہا۔ پھر راجکمار نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تمہاری سزا
یہ ہے کہ ۱۵۔ جنوری کے دن تم کو کوٹھڑی سے نکالا جائیگا
اور مقتل میں لیجا کر تمہارا سر قلم کر دیا جائیگا۔" یہ فقرہ ختم ہونے
پر راجکمار نے قدرے توقف کیا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا
مگر معاً اسے خیال آیا کہ روداد عدالت مہاراجہ صاحب کے
سامنے پیش ہوگی۔ جن کا نمائندہ عدالت میں موجود ہے۔
روداد میں کوئی ایسی بات درج نہ ہونی چاہئے۔ جس سے

بُرے انتقام آتی ہو۔ یا وحشیانہ بربریت پائی جاتی ہو۔ کیونکہ مہاراجہ ان باتوں سے سخت متنفر ہیں۔ یہ سوچکر راجکمار بیٹھ گیا۔

قزاق پھر کھلکھلایا۔ اُسکے خیال میں یہ سزا اتنی وحشتناک نہ تھی جتنی اُسے توقع تھی۔ اُس نے ساری عمر پہاڑوں میں بسر کی تھی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ ریاست کی حکمت عملی میں تبدیلی ہوچکی ہے۔ اور مجموعۂ آئین میں سے وحشیانہ قوانین خارج کر دیئے گئے ہیں۔ قزاق نے مضحکہ انگیز انداز سے کہا۔" میں وعدہ پر پہنچ جاؤنگا۔ بشرطیکہ کوئی اور ضروری کام پیش نہ آگیا۔"

محافظ سپاہی قزاق کو اُس کی کوٹھڑی میں لے گیا۔

راجکمار نے مہاراجہ کے سفیر سے مخاطب ہوکر کہا " دیکھا آپ نے، کس قدر گستاخ ہے "

سفیر نے کہا۔" ہاں حضور! وہ نہایت گستاخ ہے۔"

" میرے خیال میں میں نے نہایت رحمدلی کا سلوک کیا ہے۔"

" بیشک بحالت موجودہ اس کی سزا نہایت نرم ہے۔"

ادھم سنگھ ڈاکو کو کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ جس میں سے اُس نے حسرتناک نگاہ وادی پر ڈالی۔ جو کوٹھڑی کی آہنی سلاخوں والے روشندان کے سامنے درخشاں تھی وہ جانتا تھا کہ قلعہ سے نکلنا دشوار ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر بالفرض میں قلعہ سے نکل بھی گیا۔ تو پہاڑ کی بھول بھلیاں میں پھنس جاؤنگا۔ کیونکہ وہ ان دشوار گذار راستوں سے واقف نہ تھا۔ علاوہ بریں وادی کے مُنہ پر فوج کا شدید پہرہ تھا۔ اسکی اپنی فوج منتشر ہوچکی تھی۔ اس کے کئی جان نثار وفادار سپاہی قتل ہوچکے تھے یا گرفتار کر لئے گئے تھے۔ وہ زمین پر لیٹ گیا۔ اور فرار ہونے کی تدابیر پر غور کرنے لگا۔ کبھی وہ خیال کرتا۔" راجکمار نے اتنی رحمدلی سے کیوں کام لیا ہے۔ مجھے تو دردناک عذاب کی توقع تھی۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔" کبھی سوچتا۔" اب مقدمہ کا کھیل ختم ہوچکا ہے شاید اب مجھے بھوکوں ہلاک کرینگے۔" لیکن اس کے اس خیال کی تردید داروغہ نے پہلے سے بھی زیادہ خوشگوار کھانا لاکر دی

ادھم سنگھ نے داروغہ سے نہایت لجاجت آمیز لہجہ میں کہا۔" آپ کا نام کیا ہے؟"

داروغہ نے جواب دیا۔" میرا نام سرون سنگھ ہے۔"

کیا تم کو معلوم ہے مجھے ۱۵۔ جنوری کو قتل کیا جائیگا؟"

"سنا تو ایسا ہی ہے"

" کیا اُس وقت تک تم ہی مجھ پر داروغہ رہو گے؟"

" میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ راجکمار کی مرضی پر منحصر ہے۔ چاہے تو وہ مجھے آج ہی ہٹا دے۔ مگر مجھے زیادہ باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے اب مجھے واپس جانا چاہیئے۔"

" میں اُن لوگوں کو کافی معاوضہ دیا کرتا ہوں۔ جو وقت

پر میرے کام آئیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت مَیں بالکل بے حقیقت ہوں۔ ورنہ تمہارے نیک سلوک کی داد دیتا۔"

"اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مجھے مہاراجہ صاحب کی طرف سے کافی تنخواہ ملتی ہے۔"

"درست ہے لیکن ایک ڈاکو کا انعام تمہاری آنیوالی نسلوں کو بھی مستغنی کر دیتا۔"

سرون سنگھ کی آنکھیں انعام کا نام سُنکر چمک اُٹھیں ایک لمحہ بعد اس نے نہایت خوفزدہ ہو کر کہا۔ "اوہو! مجھے آئے کتنی دیر ہو گئی۔ کہیں اُن کو شک نہ پڑ جائے۔ ابھی میری نگرانی ہوتی ہے۔ چند روز میں نگرانی ہٹ جائیگی تو اِس معاملے پہ زیادہ تفصیل سے گفتگو کر سکینگے۔" یہ کہہ کر داروغہ جھٹ کوٹھڑی سے نکل گیا۔

قزاق جی میں ہنسا۔ کہ سرون سنگھ رشوت سے بالاتر نہیں ہے۔ جب نگرانی اُٹھ جائیگی تو پھر تذکرہ کریگا۔

آخرکار چند روز بعد داروغہ سے اودھم سنگھ نے کہا۔ "اگر میں ایک دفعہ قلعہ سے نکل جاؤں۔ تو پھر مَیں اپنا راستہ ڈھونڈ لونگا۔"

مجھے تو یقین نہیں آتا کہ آپ قلعہ سے نکل سکتے ہیں۔ بالفرض ایسا ہو بھی تو پہاڑوں میں سرگرداں پھرتے رہوگے اور راجکمار کی فوجوں کے چنگل میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ کیونکہ تم پہاڑوں کے راستوں سے واقف نہیں۔ بھلا تمہیں پہاڑی سرنگ کا پتہ ہے؟"

اودھم سنگھ نے اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا۔ "کونسی سرنگ؟"

"ان پہاڑوں کے درمیان کی سرنگ"

"اگر ہوتی تو مجھے معلوم نہ ہوتی؟"

"بس تم کو اتنا بھی معلوم نہیں۔ اُسے بنے صدیاں ہو چکی ہیں۔ اگر قلعہ غنیم کے ہاتھوں میں چلا جاتے تو قلعے کے تمام باشندے اس سرنگ کے راستے پہاڑیوں کے پار محفوظ مقام پہ پہنچ سکتے ہیں۔ اس کا راستہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اس کے مُنہ پر جھاڑیاں وغیرہ اُگائی گئی ہیں۔ تاکہ کسی کو اس سرنگ کا پتہ نہ لگ سکے۔ اگر مَیں تم کو اس کا پتہ دُوں تو مجھے کیا دو گے؟"

اودھم سنگھ نے حیرت سے سرون سنگھ کو دیکھا۔ اور ناقابل یقین لہجہ میں کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے۔ سب تم کو دے دُونگا۔"

"تمہارے پاس کتنی دولت ہے؟"

"اسقدر ہے، کہ تم ساری عمر مہاراجہ کی ملازمت کرو پھر بھی جمع نہ کر سکو گے۔"

"کیا تم مجھے اس کا پتہ دوگے۔ پیشتر اس کے کہ مَیں تم کو قلعہ سے باہر نکالوں اور سرنگ کا پتہ دوں؟"

ڈاکو نے کہا۔ "ہاں"

"کیا تم مجھے اس کا پتہ ابھی دو گے ؟"

"نہیں! کل تم کاغذ اور قلم دوات لاؤ۔ میں تم کو نقشہ بنا کر دکھا دونگا۔"

دوسرے دن داروغہ نقشہ بنوا کر لے گیا۔ تیسرے دن قزاق اودھم سنگھ نے پوچھا۔

"کیا تم کو خزانہ مل گیا ؟"

داروغہ نے جوابدیا "ہاں"

"کیا تم اب اپنا وعدہ پورا کر دو گے ؟ کیا تم مجھ کو اس قلعہ سے باہر نکال دو گے ؟"

"ہاں۔ میں تم کو قلعہ سے باہر نکال دونگا۔ بلکہ سرنگ کے منہ تک لے جاؤنگا۔ اس کے بعد تم کو اپنا رستہ آپ تلاش کرنا پڑیگا۔"

ڈاکو نے کہا "یقیناً جب میں اس بدبخت وادی سے نکل جاؤنگا۔ تو پھر سارے راجستھان کا مقابلہ کر سکوں گا۔ کیا تمہارے پاس رسّی ہے ؟"

داروغہ نے کہا "رسّی کی ضرورت نہ پڑیگی میں آدھی رات گئے۔ تمہارے پاس آؤنگا۔ اور چور راستے سے تم کو اس قلعہ سے باہر لے جاؤنگا۔ اور ہمارے فرار کی خبر صبح تک کسی کو معلوم نہ ہو گی۔"

چنانچہ آدھی رات گزرے داروغہ آیا۔ اور اودھم سنگھ کو عجیب و غریب پیچیدہ راستوں سے رہنمائی کرتا ہوا لیجانے لگا۔ گھنٹہ بھر میں وہ قلعہ سے باہر نکل گئے۔ باہر پہنچکر قزاق نے اطمینان کا سانس لیا۔

قزاق نے نہایت بے صبری سے پوچھا "وہ سرنگ کہاں ہے ؟"

"ہش!" داروغہ نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ "قلعہ سے تھوڑی دور ہے۔ مگر اس راستے میں گرگز پر سنتری کھڑے ہیں۔ ہم براہ راست سرنگ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے ہمیں اس پہاڑ کے اوپر سے ہو کر وہاں پہنچنا ہو گا۔"

قزاق نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کیا ہمیں ساری وادی کو عبور کر کے واپس اس سرنگ کے منہ پر آنا ہو گا ؟ اور چند گز فاصلہ کی خاطر اتنا چکّر کاٹنا پڑیگا ؟"

داروغہ نے تسلّی دینے والے لہجہ میں کہا "اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر تمہیں براہ راست جانا ہے تو اکیلے اس راستے سے چلے جاؤ۔ مگر میں تمہاری گرفتاری کا ذمہ دار نہ ہونگا۔"

"خیر میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں جہاں چاہو مجھے لیچلو۔"

وہ آہستہ آہستہ پہاڑی کی ترائی کی طرف چلے۔ اور ایک چھوٹی سی ندی کو عبور کرنے لگے۔

ایک دفعہ اودھم سنگھ ندی میں پھسل گیا۔ سرون سنگھ نے بمشکل اُسے سنبھالا۔ اب صبح نکل آئی تھی۔ مگر قلعہ سے ابھی کوئی خبر نہ سُنی گئی تھی۔ جب دن تھوڑا سا اور چڑھا

تو وہ رینگتے ہُوئے ایک غار میں گئے۔ وہاں سرون سنگھ نے اودھم سنگھ کو کھانا کھلایا۔ اور خود بھی کھایا۔

قزاق نے پوچھا "ہمیں سرنگ کے مُنہ تک پہنچنے میں کئی روز لگے۔ تو ہم کھانا کہاں سے کھائینگے؟"

"مَیں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔ جہاں جہاں ہم جائینگے۔ وہاں وہاں میں نے خفیہ طور پر اس کا بندوبست کر رکھا ہے۔ جب تم سو جایا کرو گے تو مَیں کھانا لے آیا کرونگا۔"

"لیکن اگر تم کو کسی نے پکڑ لیا۔ تو پھر مَیں کہاں جاؤنگا؟ کیا تم اب مجھے بتا دو گے کہ مَیں سرنگ کا مُنہ کس طرح تلاش کروں۔ مَیں تم کو خزانہ کا پتہ دے چکا ہوں۔ اس طرح تم سرنگ کا پتہ دے دو۔"

سرون سنگھ نے چند لمحہ غور کر کے کہا "ہاں میرے خیال میں یہ محفوظ راستہ ہے۔ اس ندی کے کنارے کنارے جاکر جہاں یہ ندی مشرق سے آنے والی ندی سے ملتی ہے۔ وہاں پہاڑیوں میں ایک آبشار گرتا ہے۔ تم آس پاس کی جھاڑیوں کو صاف کر ڈالو گے۔ تو سرنگ کا مُنہ برآمد ہو جائیگا۔ اس سرنگ میں جاتے جاتے جب تم دوسرے رُخ کے قریب پہنچو۔ تو دروازے کی چٹخنی اندر سے لگی ہوئی پاؤ گے۔ اُسے اُتار کر باہر نکل جانا۔"

اتنے میں قلعہ سے گھنٹوں کی آواز بلند ہوئی۔ شاید کوئی قیدی فرار ہو گیا ہے۔ ہر طرف سوار دوڑنے لگے اور دوپہر سے پہلے ہر جگہ اضطراب کا عالم طاری ہو گیا۔ جھاڑیوں اور جنگلوں میں سپاہی اکڑوں اور کبڑے ہو ہو کر مفرور کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ دو سپاہی تو ان کے اسقدر قریب پہنچ گئے۔ کہ اُن کی باتیں صاف سُنائی دینے لگیں۔

"کیا یہاں پاس ہی کوئی غار نہیں ہے؟ آؤ تو بھلا اس میں تلاش کریں۔"

"نہیں وہ اتنی جلدی یہاں کس طرح پہنچ سکتا ہے۔"

"کیوں۔ وہ آدھی رات گئے بھاگا ہوگا۔"

"آدھی رات گئے سرون سنگھ کو اس کوٹھڑی کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔ اس لئے وہ اُس وقت نہیں بھاگ سکا ہوگا۔"

اس جواب سے اُس کا ساتھی مطمئن ہو گیا۔ خیر گزری کہ دونوں واپس چلے گئے۔ اور مفرور گرفتاری سے بال بال بچ گئے۔ مگر قزاق کا رنگ زرد تھا۔ اور اس میں ہلنے کی طاقت نہ تھی۔ آخر اس کے ساتھی نے اُسے ڈھارس دلائی۔ اور وہ آگے روانہ ہوئے۔

آئندہ سفر میں دونوں مفرور کئی مرتبہ راجکمار کے فرستادہ سپاہیوں کے چنگل میں پھنستے پھنستے بچے۔ گرفتاری کے خوف۔ بھوک۔ پیاس اور امید و بیم کی کشمکش نے یہ اثر دکھایا۔ کہ لحیم شحیم قزاق سوکھ کر قاق ہو گیا۔ سردی کی شدت اور بارش نے رہے سہے اوسان بھی

کھودیتے۔ ہر آباد جگہ ان کے لئے خوف و بیم سے بھری
ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

آخر کار ایک شام کو وہ آبشار کے قریب پہنچ گئے۔ جس کی دھیمی دھیمی آواز ایک نغمہ سیال کا لطف دے رہی تھی۔ اور سورج کی رخصت ہونے والی شعاعیں آب مضطرب پر طرح طرح کے رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ طیور چہچہاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کو جا رہے تھے۔

رات انہوں نے غار میں گزاری اور صبح کو جب آفتاب جہاں تاب نے پہاڑوں کی اوٹ سے سر نکالا اور اپنی طلائی شعاعوں سے خاکدان دنیا کو مطلا کرنے کے بعد اس پر نقرئی روشنی سے ردائے نور پہنائی۔ تو قزاق آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔

"سرون سنگھ اٹھو! سورج نکل آیا۔ چلو سرنگ تک پہنچیں۔"

سرون سنگھ نے یاس انگیز لہجہ میں کہا۔ "میں تو خستہ تن ہو گیا ہوں تھکان کے باعث میری بوٹی بوٹی درد کرتی ہے۔ میں تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔"

"یہ ناامیدی کیوں ہے۔ اب تو ہم پہنچ ہی گئے ہیں۔"

"نہیں فاصلہ اس سے زیادہ ہے۔ جتنا تم خیال کرتے ہو۔ علاوہ بریں ہم قلعہ کے عین سامنے ہیں۔ کیا تم اب یہ چاہتے ہو کہ ہماری مصیبت کا خاتمہ ہونے لگا ہے۔ تو کسی نئی مصیبت کا آغاز ہو جائے۔ تمہیں یہ فراموش نہ کرنا چاہئے۔ کہ تمہارا سر مطلوب ہے۔ اور آج تاریخ کونسی ہے؟"

قزاق نے سرون سنگھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"کیا تاریخ ہے؟"

"آج ۱۵۔ جنوری ہے۔ اس روز تمہیں قتل کیا جانا تھا۔"

اودھم سنگھ کا سانس اندر کا اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔ خطرے نے اسے نہایت بزدل بنا دیا تھا۔ اب وہ کانپ رہا تھا۔ حالانکہ سزائے موت کا حکم اس نے ہنستے ہوئے سنا تھا۔ آخر اس نے دل کڑا کر کے پوچھا۔ "نہیں یہ کس طرح معلوم ہے کہ آج پندرہ تاریخ ہے۔"

سرون سنگھ خاموش رہا۔ اور چند لمحوں کے بعد بولا "میں تمہارے جیسا طاقتور نہیں طاقتور نہیں ہوں اگر سہ پہر تک مجھے یہاں آرام لینے دو، تو میں سرنگ تک پہنچنے کے لئے آخری کوشش کرنے کو تیار ہوں۔"

اودھم سنگھ نے کہا۔ "بہت بہتر"

دونوں وہاں لیٹ گئے۔ اور آبشار کی مدھم موسیقی نے انہیں اپنے خیالات میں غرق کر دیا۔ ناگاہ اودھم سنگھ نے سرون سنگھ سے پوچھا۔ "تم نے خزانہ کیا کیا؟"

سرون سنگھ اس ناگہانی سوال سے سٹ پٹایا۔ اور اُس
نے کہا۔" میں نے خزانہ دیکھا اور دیکھ کر وہیں چھوڑ آیا۔ بعد
یں کسی روز جاؤنگا۔ اور جاکر لے آؤنگا۔" ڈاکو یہ سُنکر خاموش
ہوگیا۔ مگر سرون سنگھ کے لئے یہی بات موت کا فتوے
تھی۔ کیونکہ اودھم سنگھ نے دل میں تہیہ کرلیا تھا۔ کہ جونہی
سرنگ کے دوسرے سرے پر پہنچونگا۔ سرون سنگھ کو
قتل کرکے خزانہ پر پھر قبضہ کرلونگا۔

دوپہر کے بعد وہ غار سے نکلے۔ اور دبکے دبکے
جھاڑیوں کی اوٹ لیتے ہوئے پہاڑ کی دوسری طرف
نیچے اترے۔ تین بجے وہ آبشار کے پاس پہنچے اور بمشکل
عبور کیا۔

اودھم سنگھ نے کہا۔" اہا ہا! یہ آخری منزل ہے۔ اب
سُرنگ تلاش کرنی چاہیئے۔"

آبشار کا پہلو انہیں قلعہ کی طرف سے چھپاتے ہوئے تھا
مگر سرون سنگھ نے اودھم سنگھ کو توجہ دلائی۔ کہ وادی کی طرف
سے ہم پر نگاہ پڑسکتی ہے۔

اودھم سنگھ نے بے باکانہ انداز سے کہا۔" اب کیا
پرواہ ہے؟ اب جسقدر جلد ہوسکے سرنگ کا مُنہ تلاش
کرنا چاہیئے۔"

" سرون سنگھ نے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے۔ اور
آخرکار ایک جگہ سے چند جھاڑیاں ہٹائیں اور گھاس
اُکھاڑ پھینکی۔ نیچے لکڑی کے تختے نظر پڑے۔ جن کے ہٹانے
سے ایک سوراخ رونما ہوا۔ جس میں ایک آدمی بآسانی
داخل ہوسکتا تھا۔

سرون سنگھ نے ایک طرف کھڑے ہوکر کہا۔" تم
آگے چلو۔"

اودھم سنگھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔" نہیں تم راستہ
جانتے ہو تم پہلے چلو۔ تم یہ خیال نہ کرو کہ میں تم کو صدمہ
پہنچانا چاہتا ہوں۔ دیکھو میں بالکل غیر مسلح ہوں۔"

" مگر میں تو ہرگز آگے نہ جاؤنگا۔ جب میں نے تم کو بتایا
تھا کہ خزانہ ہنوز پہاڑی میں ہے۔ تو تمہاری نگاہیں اچھی
نہ تھیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں ہے۔"

" اچھا یونہی سہی میں آگے چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر اودھم سنگھ
اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

تھوڑی دُور آگے جاکر سرنگ فراخ ہوگئی۔ وہاں
آدمی کھڑا ہوکر چل سکتا تھا۔

سرون سنگھ نے کہا۔" بس ٹھہرو۔ اب وہ دروازہ
آگیا ہے۔"

" ہاں تم نے ایک دروازہ کا ذکر کیا تھا۔ اس پر قفل
کیوں لگایا گیا ہے؟"

قفل نہیں چٹخنی لگی ہوئی ہے۔ جو بآسانی کھولی
جاسکتی ہے۔"

قزاق نے پھر اصرار سے پوچھا۔" دروازہ کیوں لگایا گیا ہے۔"

"یہ ہوا کی سیدھی رو کو روکنے کے لئے ہے۔ تاکہ ادھر کے رخ تختے نہ اڑ جائیں۔"

"ایلو! چٹخنی کھل گئی" قزاق نے چٹخنی اتارتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھل گیا۔ سرون سنگھ نے جھٹ قزاق کو دھکا دیکر اندر داخل کر دیا۔ اور دروازہ خودبخود بند ہو گیا۔ قزاق کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کیونکہ کمرہ روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اور ایک درجن کے قریب آدمی مشعلیں لئے کھڑے تھے۔ کمرہ کے وسط میں لکڑی کا ایک ٹکڑا سیاہ کپڑے میں منڈھا پڑا تھا۔ اور اس کے پاس جلاد برہنہ تلوار لیئے کھڑا تھا۔ اور راجکمار اپنے مصاحبوں کے حلقہ میں طلائی چوکی پر بیٹھا تھا۔

راجکمار نے طنزاً کہا۔ "تم عین وقت پر آگئے۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

پورن سنگھ ہنر

اقسام غم

طالب علم و ادب کا غم نہیں ہے غم میرا　　جو کہ رشک آمیز ہے
اور غم میرا نہیں غم زمزمہ پرداز کا　　جو کہ وحشت خیز ہے
غم نہیں وہ غم میرا جو دل میں درباری کے ہے　　جس میں ہے بوئے غرور
غم سپاہی کا نہیں وہ غم جو میرے دل میں ہے　　ہے ہوس اس میں ضرور
غم جو میرے دل میں ہے قانون داں کا غم نہیں　　جو کہ دانایانہ ہے
غم نہیں وہ غم مرا دل میں حسینہ کے جو ہے　　اور جو معشوقانہ ہے
غم مرا عاشق کے دل کا غم بھی تو ہرگز نہیں　　جس میں یہ سب وصف ہیں
(پھر یہ کیسا غم ہے جس کا راز کچھ کھلتا نہیں　　آہ خود حیراں ہوں میں!)

محروم

آخری ارمان

مارس لیبلانک کے افسانے جیوش لیمپ کا ترجمہ

پہلا باب

(۵)

اس شام کو ولسن اس شخص کی مانند سکون و راحت کے ساتھ بستر پر گیا جو اپنا فرض پورے طور پر انجام دے چکا ہو اور جسے سونے سے قبل کوئی کام باقی نہ رہ گیا ہو۔ اس لئے اس کو جلد نیند آگئی۔ اور وہ دلچسپ خواب دیکھنے لگا جس میں وہ لوپن کا خود ہی پوری کامیابی کے ساتھ تعاقب کر رہا تھا۔ اور اس کو گرفتار ہی کرنے والا تھا۔ یہ خیال اس پر اس تیزی کے ساتھ قائم ہوا کہ وہ بیدار ہو گیا۔

کوئی شخص اس کا بستر چھو رہا تھا۔ اس نے اپنا طپنچہ سنبھالا۔

"لوپن، دوسری حرکت ہوئی اور میں نے فیر کیا!"

"ہوش میں آؤ، بڈھے خرانٹ ہوش میں۔"

"آہا! مسٹر شیر آپ ہیں؟ کیا کوئی ضرورت ہے؟"

"مجھے ذرا تمہاری نظروں کا امتحان درکار ہے۔ اٹھو۔۔۔۔"

وہ اس کو کھڑکی کے پاس لے گیا۔

"اس طرف دیکھو۔۔۔۔ کٹہرے سے اور آگے۔۔۔۔"

"پارک میں؟"

"ہاں، تمہیں کوئی چیز نظر آتی ہے؟"

"نہیں، کچھ بھی نہیں۔"

"دوبارہ کوشش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم کوئی چیز دیکھ رہے ہو۔"

"ہاں، میں دیکھتا ہوں، ایک سایہ۔۔۔ نہیں! دو"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ کٹہرے کے مقابل۔ دیکھو، وہ حرکت کر رہے ہیں۔ ہم کو ذرا بھی وقت ضائع نہ کرنا چاہئے۔"

ٹٹول کر رسی کو پکڑے ہوئے دونوں زینے سے اترے اور ایک کمرہ میں جو باغ کی طرف کھلتا تھا۔ داخل ہوتے شیشوں سے اب بھی ان کو وہ دونوں سائے اسی مقام پر

نظر آرہے تھے۔

"یہ عجیب معاملہ ہے" شیر نے کہا۔ "مجھے مکان میں شور وغل سا معلوم ہوتا ہے"

"مکان میں؟ غیر ممکن؟ ہر شخص خواب میں ہے۔"

"سنئے اگرچہ . . . . . . "

اسی اثنا میں ایک ہلکی سیٹی کٹہرے کے قریب سنائی دی۔ اور انہوں نے ایک مدھم روشنی مکان سے آتی ہوئی دیکھی۔

"ڈی امبلی ویل نے ضرور اپنے کمرہ میں روشنی کی ہے" شیر نے کہا۔ "ہم لوگوں کے اوپر انہیں کا تو کمرہ ہے۔"

"تو کیا شیر واقعی یہ انہیں کی آواز تھی" ولسن نے کہا۔

"شاید وہ مجھے کی نگرانی کر رہے ہیں" پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے دوسری سیٹی بجی۔

"شیر نے پریشان کن لہجہ میں کہا۔ "میں نہیں سمجھ سکتا میں نہیں سمجھ سکتا"

ولسن بولا۔ "اور نہ میں ہی سمجھ سکا۔"

شیر نے کنجی گھمائی۔ دروازہ کی چٹخنی ہٹائی اور آہستہ سے اس کو کھول دیا۔ اتنے میں تیسری سیٹی بجی۔ اس مرتبہ کچھ تیز مگر دوسری آواز اور ان کے سر کے اوپر کی آواز ذرا بلند اور تیز ہوگئی۔

شیر نے آہستہ سے کہا۔ "یہ تو ایسی سنائی دیتی ہے گویا خاص کمرہ کے برآمدہ میں ہے"

اس نے اپنا سر دروازہ کے شیشوں سے نکالا لیکن فوراً ہی ایک گہرے سکوت کے ساتھ اندر کھینچ لیا۔ ولسن نے بھی بعد ازاں باہر کی طرف دیکھا۔ ان کے قریب ایک سیڑھی برآمدہ کے ستون سے لگی کھڑی تھی۔

شیر نے کہا۔ "بخدا یہاں کمرۂ خاص میں ضرور کوئی ہے بس بس اسی کی آواز تھی۔ جلدی کرو۔ ہم کو پہلے سیڑھی علیحدہ کرنا چاہئے۔"

لیکن اسی اثنا میں ایک شکل اوپر سے اتری۔ سیڑھی ہٹا لی گئی۔ اور وہ شخص جو اسے لیجا رہا تھا۔ تیزی سے کٹہرے کی طرف لپکا۔ جہاں اس کے معاون انتظار کر رہے تھے۔ شیر اور ولسن باہر جھپٹے۔ یہ اس شخص کے پاس ٹھیک اس وقت جب وہ سیڑھی جنگلے کے مقابل رکھ رہا تھا پہنچ گئے۔

دوسری جانب سے دو فائر ہوئے۔

"زخمی ہوگیا۔ شیر نے چلا کر کہا۔

"نہیں" ولسن نے جواب دیا۔

اس نے اس شخص کو مضبوط پکڑ لیا اور اسکے گرانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ گھوما۔ اور اپنے مقابل کو ایک ہاتھ سے مضبوط پکڑ کر دوسرے سے پورا چاقو اس کے سینہ میں بھونک دیا ولسن نے آہ کی۔ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔

"لعنت" شیر نے چیخ کر کہا۔ اگر انہوں نے اسے قتل

کیا ہے تو میں اُن کے ٹکڑے اُڑا دونگا۔"

اُس نے ولسن کو گھاس پر لٹا دیا۔ اور سیڑھی کی طرف دوڑا۔ لیکن وہ شخص وہاں سے فرار ہو کر اپنے مددگاروں کے ساتھ جھاڑیوں میں ہو کر بھاگا جا رہا تھا۔

" ولسن، ولسن، یہ زخم کاری تو نہیں ہے۔ خدارا کہہ بھی دو کہ معمولی خراش ہے۔"

مکان کا دروازہ یکبارگی کھُلا۔ اور سب سے آگے ایم۔ ڈی اسپلی ویل ملازموں کے ساتھ جو شمعیں لئے ہوئے تھے دکھائی پڑا۔

" یہ کیا معاملہ ہے" بیرن نے چلّا کر پوچھا" کیا ولسن صاحب زخمی ہو گئے؟"

" نہیں! صرف ایک ہلکا زخم" شیر نے اپنے دل کو تسکین دیتے ہوئے جواب دیا۔ ولسن کی کثرت سے خون جاری تھا۔ اور اس کے چہرے پر موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ بیس منٹ بعد ڈاکٹر نے بتلایا۔ کہ صرف چوتھائی انچ چاقو کی نوک سینہ میں گھُس گئی ہے۔

" چوتھائی انچ! ولسن ہمیشہ سے ایک خوش نصیب ہستی ہے" شیر نے واقعات حاضرہ پر غور کرتے ہوئے رقیبانہ انداز سے کہا۔

" خوش نصیب اور قسمت والا۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

" بیشک اُس کے مضبوط قویٰ اُسے بہت جلد صحتیاب بنا دیں گے۔"

" صرف چھ ہفتہ بستر علالت پر رہنے کے بعد دو ہفتہ کے اندر اندر کامل صحت ہو جائیگی۔"

" زیادہ عرصہ نہیں"

" بیشک۔ اب اگر کوئی پیچیدگی آپڑے تو اور بات ہے"

" مگر سوال تو یہ ہے کہ پیچیدگی آتے ہی کیوں"

پورے اطمینان کے بعد شیر ایم۔ ڈی اسپلی ویل کے پاس کمرۂ خاص میں آیا۔ اس مرتبہ خفیہ آنے والے نے سابقہ متانت سے کام نہیں لیا تھا۔ اُس نے بلا تکلف جواہرات سے مرصع ہلاس کی ڈبیا۔ بڑے بڑے موتیوں کے ہار اور عام چیزوں کو جو ایک باعزت نقب زن کی جیب میں آسکتی تھیں۔ چُرا لیا تھا۔ کھڑکی ابتک کھُلی تھی۔ جس کا ایک شیشہ نہایت صفائی سے کاٹا گیا تھا۔ دن کی مختصر تفتیش سے یہ پتہ چلا کہ سیڑھی زیر تعمیر مکان سے آئی۔ اور چور بھی ضرور اسی راستہ سے آئے۔

ایم۔ ڈی اسپلی ویل نے کسی قدر تُرش لہجہ میں کہا" مختصر یہ ہے کہ جیوش لیمپ کی چوری کی بجنسہٖ نقل ہے۔"

" ہاں، اگر پہلی واردات میں ہم پولیس کے ہم خیال بن جائیں۔"

" ہائیں! کیا آپ اب بھی اس کو ماننے کے لئے تیار

نہیں ہیں؟ کیا اس دوسری چوری نے آپ کے پہلے خیال کی تردید نہیں کی؟"

"اس کے برخلاف یہ میرے خیال کو اور زیادہ تقویت دیتی ہے۔"

یہ قابل قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کے پاس کافی ثبوت موجود ہے۔ کہ گزشتہ شب کی چوری کسی بیرونی شخص نے کی ہے لیکن بایں ہمہ آپ کا یہ خیال ہے۔ کہ جیوش لیمپ کی چوری ہمارے آدمیوں میں سے کسی نے کی ہے؟"

"مکان ہی کے کسی رہنے والے نے؟"

"آخر آپ کس طرح یقین دلاتے ہیں؟"

"مَیں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مانشیور، مَیں نے دو باتیں قائم کی ہیں۔ جو ظاہرا ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ اب مَیں ان دونوں پر علیحدہ علیحدہ غور کر کے صرف اُس درمیانی کڑی کو دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جس سے دونوں کا سلسلہ مِل جاتے۔"

اُس کا ثبوت مدلل اور اس کی تحقیقات ایسی زبردست معلوم ہوتی تھی۔ کہ بیرن لاجواب ہو گیا۔

"اچھا۔ اب ہمیں کمشنر پولیس کو اطلاع کرنے دیجئے"

"کبھی نہیں! انگریز سراغرساں نے چلا کر کہا۔ ہرگز نہیں، خواہ کچھ بھی ہو! پولیس صرف اس لئے ہے کہ جب ضرورت ہو تو ہم اُسے طلب کریں۔"

"پھر یہ فیس۔۔۔؟"

"فیسوں کی کچھ پرواہ نہ کیجئے۔"

"آپ کے دوست کا معاملہ؟"

"میرا دوست صرف زخمی ہو گیا ہے۔۔۔۔ ڈاکٹر سے کہتے خاموش رہے۔۔۔۔ پولیس کے متعلق تمام ذمہ داریاں مَیں اپنے سر لے لونگا۔"

(۶)

دو دن بلا کسی واردات کے گزر گئے۔ جس میں شیر نے نہایت انہماک۔ ہوشیاری اور تن دہی سے معاملات کی تحقیق کی۔ جو اس دن کے دلیرانہ حملہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ اور جو اُس کی آنکھوں کے سامنے واقع ہوا۔ اور یہ اس کے روکنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اُس نے باغ اور مکان کی تلاش بہت محنت سے کی۔ نوکروں سے پتہ لگایا۔ باورچیخانہ اور اصطبل کی بہت دیر تک دیکھ بھال کی۔ تاہم اسکو رتی بھر پتہ نہ چلا۔ پھر بھی اُس نے ہمت نہ ہاری۔

"جس کو مَیں تلاش کر رہا ہوں۔ ضرور اُسکا پتہ لگاؤنگا۔" اُس نے خیال کیا۔ "اور اُس کو مَیں یہیں پاؤنگا۔ یہ اس قسم کا سوال نہیں ہے۔ جیسا کہ سنہری بال والی خاتون کے قصّہ میں تھا خفیہ راستوں سے سفر یا پُراسرار طریق پر کسی نامعلوم جگہ پر پہنچنا۔۔۔۔ بلکہ اس مرتبہ مَیں خود میدانِ جنگ میں ہوں۔ دشمن پوشیدہ اور نظر فریب تو پن نہیں ہے۔ بلکہ

گوشت و خون کا ایک مجسمہ ہے۔ جو اس مکان کی چار دیواری کے اندر گھومتا ہے۔ مجھ کو ذرا سا پتہ چل جائے۔ بس پھر میں سمجھ لونگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

وہ ذرا سا واقعہ جس سے وہ اہم نتائج نکالکر اپنی زبردست ذہانت سے جیوش لیمپ کی پُراسرار چوری کو سراغرسانی کے نقطہ نظر سے کامیاب بنانے کا خواہشمند تھا۔ ۔ ۔ ۔ ایک ایسا واقعہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ جس کو وہ محض سوئے اتفاق سے دریافت کرنا چاہتا تھا۔

تیسرے دن کمرۂ خاص کے اوپر والے کمرہ میں جو بچوں کے مکتب کا کام دیتا تھا۔ داخل ہوتے ہی وہ دونوں میں سے چھوٹی بہن ہن ریٹا کے پاس آیا۔ وہ اپنی مقراض دیکھ رہی تھی۔

"آپ جانتے ہیں" اُس نے شیر سے کہا۔ "میں بھی اُس جیسا کاغذ بنا تی ہوں۔ جو آپ کے ہاتھ میں گزشتہ شام کو تھا۔"

"گزشتہ شام کو؟"

"ہاں، کھانے کے بعد آپ کے پاس ایک پھٹا ہُوا کاغذ تھا نا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو خیال آیا۔ وہی ایک تار ۔ ۔ ۔ ہاں میں بھی ویسا بنا لیتی ہوں۔"

وہ باہر چلی گئی۔ ہر سُننے والا شخص ان الفاظ کو محض ایک بچی کی بھولی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں خیال کر سکتا تھا۔

اور شیر نے بھی انہیں معمولی طور پر سُنا۔ مگر اپنی تفتیش کو جاری رکھا۔ لیکن دفعتاً وہ بچی کے پیچھے دوڑا۔ جس کے آخری لفظ نے اُس پر فوری اثر کیا تھا۔ اُس نے اُسے زینہ کے سرے پر پکڑا۔ اور کہا۔ "تو کیا تم اخبارات کے حروف بھی جوڑا کرتی ہو۔"

ہن ریٹا نے نہایت فخریہ کہا۔ "ہاں میں حروف کاٹ ڈالتی ہوں اور پھر لگا لیتی ہوں۔"

"بھلا تم کو یہ اچھا کھیل کس نے سکھایا ہے؟"

"میڈ موازل نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری اُستانی نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اُنہیں یہ عمل کرتے دیکھا ہے۔ وہ اخبارات سے الفاظ علیحدہ کر لیتی ہیں اور پھر اُن کو ملا کر درست کر لیتی ہیں۔"

"پھر اُن کو وہ کیا کرتی ہیں؟"

"تار اور خطوط بنا کر باہر بھیجا کرتی ہیں۔"

نالملاک شیر غیر معمولی طور پر متوحش مکتب خانہ میں ان معلومات پر پتہ چلانے کے لئے واپس آیا۔ انگیٹھی کے اُوپر اخبارات کا ایک بنڈل رکھا تھا۔ اس نے ان کو کھولا۔ اور دیکھا کہ در اصل وہاں سطریں کی سطریں غائب تھیں۔ اور نہایت صفائی کے ساتھ کاٹی گئی تھیں۔ لیکن اُس نے صرف شروع اور اخیر کے الفاظ پڑھے اور یہ معلوم کر کے کہ درمیان کے الفاظ مقراض سے بلا وجہ کاٹے گئے ہیں۔ اس کا اندازہ کر لیا کہ یہ ہن ریٹا نے کاٹے ہیں۔ بہت ممکن تھا

کہ ڈھیر میں کوئی کاغذ ایسا بھی ہو جسے میڈ مو انل نے کاٹا ہو۔ مگر وہ صحیح پتہ کیسے چلا سکتا تھا۔

شیر نے میز پر رکھی ہوئی کتب درسیات و نیز الماری کے اندر کی دیگر کتابوں کی ورق گردانی کی۔ اور ایکبارگی جوشِ مسرت میں چیخ اُٹھا۔ الماری کے ایک گوشہ میں پرانی مشق کی کاپیوں کے نیچے اس نے بچوں کی ایک سادی کتاب پائی۔ جس میں حروف تہجی کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اسکے درمیان کے ایک ورق میں اس کو ایک خالی جگہ نظر پڑی۔ اُس نے اس ورق کا مقابلہ کیا۔ اس میں ہفتہ کے دنوں کے نام تھے۔ یکشنبہ دوشنبہ۔ سہ شنبہ وغیرہ لفظ شنبہ غائب تھا۔ اور جیوش لیمپ کی چوری بھی شنبہ ہی کی شب کو ہوئی تھی۔

شیر کے دل میں انکشاف راز کا احساس ہوا۔ وہ احساس جو ہمیشہ اس کے دل میں ایسے حل طلب معمہ کے دقت پیدا ہوا کرتا تھا اُس حقیقت کا انکشاف۔ اُس یقین کا مادہ جس سے کبھی اُس کو دھوکا نہیں ہوا۔ اشتیاق اور اطمینان کے ساتھ وہ بہت سرعت سے اوراق اُلٹنے لگا۔ چند ورق کے بعد اُس کو ایک اور حیرت خیز بات نظر آئی۔

یہ ایک صفحہ تھا جو جلی حروف تہجی سے لکھا تھا اور جس کے برابر تصویروں کی ایک قطار تھی۔

نو حروف اور تین کی تعداد میں تصویریں نہایت ہوشیاری سے غائب کی گئی تھیں۔ شیر نے اسکو اپنی نوٹ بک میں سلسلہ وار یوں لکھا۔

ج۔ب۔ا۔ د۔ و۔ ۶۔ ی۔ ۲۳۷۔ ا۔ک

"بخدا!" اُس نے کہا۔ "اس سے زیادہ پہلی نظر میں اور کچھ نہیں معلوم کیا جا سکتا۔ کیا ان حروف کو کسی اور طریقہ سے لکھ کر دو فقرے یا با معنی الفاظ بنا لینا ممکن نہیں؟"

شیر نے بے کار اس کی کوشش کی۔

صرف ایک نتیجہ اس کو صحیح معلوم ہوا۔ جو اُس نے اخیر میں اپنی پنسل سے لکھا۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اُس کا تعلق اصل واقعات سے تھا۔ اور جن کو معمولی انشاء پردازی پر سمجھا جا سکتا تھا۔

یہ معلوم کرتے ہوئے کہ انہیں میں صرف ایک ہی بار ایک حرف تہجی لکھا ہے۔ اس کو یہ یقین ہو گیا کہ جملے ناکمل حروف سے بنائے جاتے ہونگے۔ اور یہ الفاظ دوسرے اوراق کے حروف لیکر مکمل کئے جاتے ہونگے۔ ان شرائط کو اور نیز غلطی کے امکان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حسب ذیل الفاظ بنے۔

ج۔و۔ا۔ب۔ د۔ ۶۔ ی۔ ۲۳۷۔ ا۔ک۔ پہلا لفظ بالکل صاف تھا۔ "یعنی جواب" اور حرف "ج" چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ یہ حرف ایکبار استعمال کرنیکے بعد دوسرا کوئی نہ تھا۔

آخری ناکمل لفظ کے لئے یہ ممکن تھا کہ اُسے کاتب نے مکتوب الیہ کو نمبر ۲۳۷ کے ساتھ پتہ میں لکھا ہو۔ اسکو شنبہ کا دن مقرر کرنے کے لئے نصیحت کی گئی تھی۔ اور ا۔ک ۲۳۷

کے پتہ پر جواب بھیجنے کو لکھا گیا تھا۔ یا تو ۲۳۷ ڈاکخانہ کا سرکاری پتہ تھا۔ یا کسی خاص اشارہ کے شروع کے حروف ہونگے۔ شیر نے البم کے اوراق اُلٹے پلٹے لیکن اور کسی صفحہ کا کوئی حرف نہیں لکھا تھا۔ اس لئے وہ آئندہ نتائج کے انتظار میں انہیں معلومات پر قانع رہا۔

"کیا یہ عمدہ کھیل نہیں؟"

ہن ریٹا نے واپس آکر پوچھا۔

شیر لاک نے جواب دیا۔

"ہاں، بہت خوب! ہاں کیا تمہارے پاس اور کاغذات نہیں ہیں؟ اگر کچھ الفاظ لکھے ہوتے ہوں تو لاؤ۔ میں بھی چپکاؤں؟"

"کاغذات؟ ... نہیں .... بھلا میڈموازل اس کو کب پسند کرینگی۔"

"میڈموازل؟"

"ہاں میڈموازل نے مجھ کو بہت بُرا بھلا کہا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں آپ سے واقعات بتلا دیا کرتی ہوں اور وہ کہتی ہیں کہ مجھے جن چیزوں سے دلچسپی ہو انہیں دوسرے لوگوں سے نہ بتلایا کروں"

"تم نے اچھا کیا۔ جو مجھے بتلا دیا۔"

[illegible] خوش نظر آتی تھی اس نے

ایک کرچ کے بٹوہ سے جو اُس کے فراک میں آلپین سے لگا ہوا تھا۔ کسی چیز کے چند ٹکڑے، تین بٹن، دو شکر کے ٹکڑے اور اخیر میں ایک مربع کاغذ کا ٹکڑا نکلا۔ جس کو اُس نے شیر کو دیا۔

"لیجئے، میں آپ کو اس طرح کے بہت سے دونگی۔"

یہ ایک گاڑی کا نمبر تھا۔ نمبر ۸۲۷۹

"تم نے اسے کہاں پایا؟"

"یہ اُستانی جی کی جیب سے گر پڑا تھا۔"

"کب؟"

"یکشنبہ کے دن، جب وہ تانبے سے کچھ ٹکڑے جمع کر رہی تھیں۔"

"شاباش! اب میں تم کو بتلاؤنگا کہ تم کس طرح ملامت سے محفوظ رہ سکتی ہو۔ میڈموازل سے نہ بتلانا کہ تم مجھ سے ملی تھیں۔"

شیر سیدھا ایم۔ ڈی امبلی ویل کی تلاش میں نکلا۔ اور اس سے میڈموازل کے حالات دریافت کئے۔

بیرن چونکتا ہوا!

"الائس ڈیمن! ..... کیا آپ کا اُس کی طرف خیال ہے؟ ..... آہ! غیر ممکن....."

"اُسے کتنے عرصہ سے آپ کی ملازمت کا فخر حاصل ہے؟"

"صرف بارہ مہینے سے لیکن میں اس سے زیادہ [illegible]

یا قابل اعتبار اور کسی شخص کو نہیں سمجھتا۔"

"یہ کیا بات ہے۔ کہ اس وقت تک وہ میری نظروں سے نہیں گذری؟"

"وہ دو دن کے لئے باہر گئی ہوئی تھی۔"

"اور اس وقت؟"

"اپنی واپسی پر فوراً ہی اُس نے آپ کے دوست کی تیمار داری شروع کر دی ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی تیماردار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ رحمدل ۔ ۔ ۔ اور پاکباز ہے۔ مسٹر ولسن اُس سے بہت خوش معلوم ہوتے ہیں۔"

"اوہ"، شیر نے کہا۔ جو اپنے دوست کی حالت سے قطعی لاپرواہ نظر آتا تھا۔

اُس نے ایک لمحہ غور کے بعد دریافت کیا۔

"اور کیا وہ اتوار کی صبح کو باہر گئی تھی؟"

"چوری کے دوسرے دن؟"

"ہاں"

بیرن نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ اور اُس سے دریافت کیا۔ اُس نے جواب دیا۔ "میڈموازل حسب معمول گیارہ بجے کے قریب مجمع میں بچّوں کو لے گئی تھی۔"

"لیکن اس سے قبل؟"

"قبل؟ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یا شاید ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں چوری کے واقعہ سے ایسی پریشان تھی: ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاہم مجھے خیال آتا ہے کہ اُس نے پہلے شام ہی کو اتوار کی صبح باہر جانے کی اجازت لی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک چچازاد بھائی سے ملنے کے لئے جو شاید پیرس سے گزر رہا تھا۔ لیکن یقیناً آپ کو اُس پر شُبہہ نہ کرنا چاہیے؟"

"قطعی نہیں، لیکن میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ ولسن کے کمرہ میں گیا۔ ایک عورت ہسپتال کی نرسوں کی طرح لابنا بھورے رنگ کا ریشمی گون پہنے مریض پر جھکی ہوئی اس کو دوا پلا رہی تھی۔ جب وہ اس طرف گھومی تو شیر نے اس لڑکی کو پہچانا۔ اور یہ وہی تھی جس نے گیر ڈو نارڈ کے باہر اسٹیشن پر گفتگو کی تھی۔

(۷)

اُن میں ذرا بھی گفتگو نہیں ہوئی۔ الائس ڈیمن بلا کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے سنجیدہ او سحر بار آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ انگریز جاسوس نے کچھ کہنا چاہا۔ ایک دو لفظ کہنے کی کوشش کی۔ اور خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے اپنا کام شروع کیا۔ شیر کی متحیر نگاہوں کے سامنے اُس نے حرکت کی۔ بوتلوں کو اُٹھایا۔ پٹیوں کو باندھا۔ کھولا۔ اور پھر اُسے دیکھ کر مسکرائی۔ شیر اُنہیں قدموں واپس ہوا۔ زینہ سے نیچے اُترا۔ ایم ڈی امبلی ویل کے موٹر کے پاس احاطہ میں آیا۔ اُس میں بیٹھا۔ اور ڈرائیور سے احاطہ لیوٹیس چلنے کے لئے کہا۔ جہاں کا پتہ گاڑی کے ٹکٹ پر جن کو ہن ریٹا نے دیا تھا۔ ڈو پر بیٹھ

گاڑیبان جو یکشنبہ کی صبح کو نمبر ۹، ۲۴ کو گیا تھا۔ موجود نہیں تھا۔ شیر نے موٹر واپس کر دیا۔ اور خود اس کا منتظر رہا۔ یہاں تک کہ وہ گھوڑا بدلنے آیا۔ ڈو پریٹ ڈرائیور نے کہا' ہاں وہ ایک خاتون کو پارک مانشور کے قریب سے لے گیا تھا۔ ایک نوجوان سیاہ پوش خاتون جس کے منہ پر لمبا نقاب تھا۔ اور وہ بہت پریشان معلوم ہوتی تھی۔

"کیا وہ ایک پارسل لئے تھی؟"

"ہاں، ایک بڑا سا پارسل"

"اور تم اُسے کہاں لے گئے تھے؟"

"پہلے سینٹ فرڈیننڈ کے کنارے' ایونو ڈیز ٹرنس کو وہ اس سینٹ کے قریب ٹھیری، اور پھر ہم لوگ پارک مانشو کو واپس آئے۔"

"کیا تم پھر ایونو ڈیز ٹرنس میں اُس مکان کو پہچان لوگے؟"

"غالباً! کیا میں آپ کو وہاں لیچلوں؟"

"اس وقت! پہلے ۳۶ قوائے ڈیز آرفیورس چلو۔"

پولیس کے صدر مقام پر حسن اتفاق سے چیف انسپکٹر گینمارڈ سے اُس کی ملاقات ہوگئی۔

"کیا آپ بیکار ہیں۔ مسٹر گینمارڈ؟"

"اگر یہ سوال لوپن کے متعلق ہے تو ہوں"

"یہ لوپن ہی کے متعلق ہے"

"تو بندہ باز آیا"

"کیا آپ نے علیحدگی اختیار کرلی ۔ ۔ ۔ ؟"

"میں نے فوق الفطرت ہستی سے دست کشی کرلی ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس ناہموار مقابلے سے پریشان ہوگیا۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ شرم وندامت کے ساتھ ملا۔"

"یہ بزدلی اور لغویت ہے۔"

کچھ بھی ہو! یہ آپ کی مرضی ۔ ۔ ۔ میں اس کی پروا نہیں کرتا! لوپن ہم لوگوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس لئے بجز علیحدگی اختیار کرلینے کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔"

"میں اس کے ماننے کو تیار نہیں۔"

"ہم لوگوں کی طرح وہ آپکو بھی اپنی عظمت کا قائل کر دیگا"

"خوب! تو پھر یہ ایک ایسا نظارہ ہوگا جو آپ کے خوش کرنے کو کافی ہے۔"

"یہ بالکل صحیح ہے۔" گینمارڈ نے معصومانہ طرز سے کہا "اور اگر آپ دوبارہ کوشش کے خواہشمند ہیں۔ تو بسم اللہ آگے قدم بڑھائیے!"

گینمارڈ اور شیر دونوں گاڑی میں بیٹھے۔ انہوں نے مکان سے کچھ پہلے۔ راستہ کے ایک طرف ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے گاڑی روکنے کو کہا۔ وہ اُس کے باہر لورل اور اپینڈلی درختوں کے درمیان بیٹھ گئے۔

روشنی گھٹنی شروع ہوگئی تھی۔

"نوکرا" شیر نے کہا۔ "قلم دوات"

اُس نے ایک رقعہ لکھا۔ اور دوبارہ خادم کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ "اس کو سامنے والے مکان میں دربان کے پاس لے جاؤ۔ وہ شخص جو ٹوپی لگائے دروازہ میں بیٹھا پائپ پی رہا ہے۔"

دربان دوڑتا ہوا آیا۔ اور کیمنارڈ کے بتلانے کے بعد کہ وہ چیف انسپکٹر ہے شیر نے دریافت کیا "کیا یکشنبہ کی صبح کو ایک سیاہ پوش نوجوان خاتون اس مکان پر آئی تھی؟"

"سیاہ پوش؟ ہاں نو بجے کے قریب، یہ بھی اُن میں سے ایک ہے جو دوسری منزل پر جایا کرتے ہیں۔"

"کیا تم اُسے زیادہ تر دیکھتے ہو؟"

"نہیں، یہ بات تو نہیں۔ مگر اس سے قبل وہ اکثر آیا کرتی تھی۔ یعنے گزشتہ پندرہ دن سے روزانہ۔"

"اور یکشنبہ کے بعد؟"

"صرف ایک بار۔ اگر آج کی آمد شمار نہ کی جائے۔"

"کیا کہا! کیا وہ آج بھی آئی تھی؟"

"وہ اس وقت بھی وہاں موجود ہے۔"

"سچ! وہ اس وقت بھی وہاں موجود ہے؟"

"جی ہاں، اُسے آئے دس منٹ ہوئے حسب معمول کوچوان اُس کا انتظار سینٹ فرڈینینڈ پر کر رہا ہے میں اُس سے دروازہ میں ملا تھا۔"

"اور دوسری منزل کا کرایہ دار کون ہے؟"

"وہاں دو ہیں۔ ایک خیاط میڈموازل لینجیز اور دوسرا ایک شریف آدمی جس نے تقریباً ایک ماہ سے برلین کے نام سے دو عمدہ کمرے کرایہ پر لئے ہیں۔"

"یہ تم نے کیا کہا۔ کہ برلین کے نام سے؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ فرضی نام ہے۔ میری بیوی اُس کے کپڑے درست کرتی ہے۔ مگر جناب، تمام پوشاک میں اُس کو دو کپڑے بھی ایسے نہیں ملے۔ جن پر اس کے نام کا پہلا حرف درج ہو۔"

"اُس کا طرزِ معاشرت کیا ہے؟"

"اے جناب، وہ تو تقریباً ہمیشہ باہر رہتا ہے۔ بعض اوقات وہ تین تین دن تک برابر مکان پر واپس نہیں آتا۔"

"شنبہ کی شب؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹھیریے میں خیال کر لوں ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں وہ شنبہ کی شب کو یہاں آیا اور پھر ابھی تک نہیں نکلا۔"

"وہ کس قماش کا آدمی ہے؟"

"واللہ، یہ میں کچھ نہیں بتلا سکتا۔ وہ ایسا بھروپیا ہے۔ کہ کبھی لانبے قد والا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی ٹھگنا۔ کبھی تن و توش والا۔ کبھی دُبلا پتلا ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی سیاہ رو اور کبھی گورا چٹا۔ میں اُس کو پہچاننے میں ہمیشہ دھوکا کھاتا ہوں۔"

اُس کا برابر کا مقابلہ نہ ہوگا۔"

"پھر میں اُس کے کمرہ میں نہیں گھس سکتا۔ مجھے اس کا مجاز نہیں ہے۔ اور خاصکر رات کے وقت۔

شیر نے اپنے شانہ کو حرکت دی۔

"اگر ایک مرتبہ آپ لوپن کو گرفتار کر لینگے تو پھر آپکو کوئی شخص اس زیادتی کا جو آپ اُس کی گرفتاری میں روا رکھینگے الزام نہ دیگا۔ خیر آؤ...... ذرا گھنٹی تو بجا کر دیکھیں کیا واقع ہوتا ہے۔"

وہ زینہ پر چڑھے۔ فرش کی بائیں جانب دو دروازے تھے گینمارڈ نے گھنٹی بجائی۔

کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے دوبارہ بجائی۔ کوئی نہیں اُٹھا۔

"ہم کو اندر چلنا چاہیئے۔" شیر نے کہا۔

"ہاں قدم بڑھائیے۔"

ہایں ہمہ وہ کشش و پنج میں بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ اُن لوگوں کی طرح جو قطعی فیصلہ کرنے کے قبل پس و پیش کرتے ہیں۔ وہ بھی ہچکچا رہے تھے۔ کہ یکایک یہ اُن کے ذہن نشین ہوگیا۔ کہ آرسین لوپن کا یہاں ہونا غیر ممکن ہے۔ ان کے اتنے قریب۔ ایسے کمزور پردہ کے پس پشت، جن کو وہ ایک ہی گھونسے کی ضرب میں توڑ سکتے تھے۔ یہ دونوں اُس سے اچھی طرح واقف تھے۔ کہ وہ ایسا بیوقوف جن نہیں کہ ایسی آسانی سے اپنے کو حوالہ کردے۔

نہیں، نہیں۔ ہزار بار نہیں۔ وہ وہاں نہیں ہے وہ ضرور پاس کے مکانوں سے نکل گیا ہے۔ چھت سے یا کسی دوسرے بیرونی راستہ سے جس کو اس نے وقت ضرورت کے لئے تیار کر رکھا ہوگا۔ اور ایک مرتبہ پھر اُنہوں نے خیال کیا کہ وہ صرف آرسین لوپن ہی تھا جس کو وہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ وہ مارے خوف کے کانپ اُٹھے۔

ایک نامعلوم آواز نے دروازہ کی دوسری جانب سے آکر خاموشی کو توڑا۔ ان کو خیال نہیں بلکہ یقین کامل ہوگیا۔ کہ اس چوبی دیوار کے پس پشت ضرور کوئی موجود ہے۔ جو ان کی گفتگو سُن رہا ہے۔ اور آمد کا حال معلوم کر چکا ہے۔

اُن کو کیا کرنا چاہیئے تھا؟ یہ ایک عجیب موقعہ تھا پولیس کے نہایت تجربہ کار و سخت دل افسر ہونیکے باوجود بھی ان پر کچھ ایسی وحشت طاری ہوئی۔ کہ وہ خود اپنے دل کی حرکت کو کانوں سے سُن رہے تھے۔

گینمارڈ نے نیم باز نظروں سے شیر کی رائے دریافت کی۔ اور پھر دروازہ پر سختی سے دستک دی۔

اب پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ وہ چاپ جسکو اب اور زیادہ چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

(باقی آئندہ)

شمیم بلھوری۔ سلیم ندوروی

قیمت سالانہ چھ روپے — رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴ — قیمت ششماہی [illegible] فی پرچہ ۱۰ ر

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹر: محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۵ — اشاعت ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء — نمبر ۳

دریا بہ حباب اندر

صفحۂ ادارت

اس اشاعت کا صفحۂ جمیل تاجدارِ سندھ کے تازہ نتیجۂ فکر سے مزین ہے۔ تاکہ شائقین ادب اُردو اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ ایک والیِ ملک اور خصوصاً ملک سندھ کا فرماں روا اُردو زبان کی شاعری پر کیسا عبور اور اس کا کیسا صحیح ذوق رکھتا ہے۔ کلام الملک ملک الکلام کی یہ زندہ تفسیر امید ہے کہ حضورِ موصوف کی کرم گستری کی پہلی قسط ہوگی۔ اور ہزارداستان کے صفحات اکثر اوقات ان کے دامان تخیل کی خوشہ چینی میں کامیاب ہوں گے۔

ہم کسی دوسری فرصت میں ملک سندھ کی مجمل تاریخ اور اس کے عالی ہمت تاجدار کے سوانح حیات اور اکتسابات علم و فن پر ایک مفصل نظر ڈالیں گے۔ تنگی وقت اور عدم گنجائش اس وقت اس دلچسپ اور نتیجہ خیز تحریر کی متحمل نہیں ہو سکتی

جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری جو میرے ساتھ ہزارداستان کی ادارت کے ذمہ دار تھے۔ افسوس ہے کہ چند ناگزیر حالات کی وجہ سے اس فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں مگر امید ہے کہ وہ اس انقطاع تعلق کے باوجود ہزارداستان کو اپنے رشحات قلم سے ہمیشہ مستفیض فرماتے رہیں گے۔ آیندہ سے مضمون نگار حضرات اپنے مضامین میرے نام ارسال فرمائیں۔ تاکہ ان کی اشاعت میں تعویق نہ ہو۔

محمد اسمٰعیل نعیم

اشعار میں بھی بلا کا دیدہ زیب ستم کا سامعہ فریب تھا۔
دیکھئے تو ظلِ اللہ کے پیوستہ لبوں میں حرکت سی ہوئی۔ گوہر نصیب دانتوں کی لڑیاں سفید بجلیوں کی طرح تڑپ کر ہونٹوں کی شفقی رنگت میں محلول ہوگئیں، اور بیساختہ کچھ سوالیہ الفاظ سُنائی دیتے۔
یہ انمول موتی زنانِ عالم کا سرتاج، حسینانِ جہان کا گوشوارہ اس عالمِ ترکیب کی فانی صدف میں کب ضیا پاش ہُوا۔ اور کفرستانِ ہند کے کس مشرک کے رشتۂ زندگی میں نامنصفی سے بیدھ کر پرو دیا گیا۔
کبیشر نے نہایت ادب سے جواب میں عرض کیا۔
کہ جہاں پناہ وہ اب بھی موجود ہیں۔ اور ابھی تک کنواری ہیں میں خود لالہ پر وصف و تحسین کے شاداب و قرمزی گلابی کلیاں نچھاور کرتا ہوں۔ جو پربت سنگھ کی اکلوتی لڑکی ہے اگر وہ تمہارے خیالی کشیدہ پیکر کی طرح واقعی دلفریب ہے۔ تو میری دُلہن بن کر رہیگی۔ بصورت دیگر تمہارا سر تمہاری کذب سرائی کا خونبہا ہو جائیگا۔"
ممدوح یہ کہہ کر محیطِ خیالات کے زوردار جزر و مد میں محوِ سیر ہو گئے۔ اور اشارۂ ابرو سے حکم دیدیا کہ سفینۂ مخصوص سفید محل کی مرمریں فرودگاہ پر واپس کھے کر لگا دیا جائے۔
دوسری صبح کو مشیرِ خصوصی رکنِ مجلس مہابرہمن صاحب طلب کئے گئے۔ اور ان سے پربت سنگھ کی اکلوتی کنیا کے واسطے استفسار کیا گیا۔ انہوں نے بھی جواباً وہ گہر ریزیاں کیں اور سنجیدہ نثر ہیں جمالِ لالہ کے حسنِ ظاہر خاصہ باطن کی ویسی ہی جادو بھری مورت سامنے کر دی جیسی موبہ مو تصویر ہندی کبیشر نے گزشتہ شب کو اپنی ترنم ریز مدحیہ نظم میں روپہلی جھیل کی ان طلائی موجوں پر روبرو کی تھی، جو پورے چاند کے کشش انداز پرتو سے موجۂ نورِ سیال بنی ہوئی تھیں۔ اتنی ہی تصدیق کسی کے جمال پرست دل کے لئے تازیانۂ شوق ہوگیا۔ اور مہابرہمن کو فی الفور حکم دے دیا گیا۔ "پربت سنگھ کو فوراً مطلع کر دیا جائے۔ کہ خود سر پر آرا بہ نفسِ نفیس لالہ کو عروسِ خاص بنانے کا فیاضانہ قصد فرماتے ہیں۔"
کچھ سی جذبۂ بے اختیاری قابو بخش اور لہجۂ پیام سنجیدہ نہ تھا۔ اکثر راجپوتوں نے اپنی لڑکیاں حرم شاہی اور خلوت گاہِ امراء دربار میں بہ طیبِ خاطر دیدی تھیں۔ مگر اکیلا پربت سنگھ راجپوتوں کا وہ راجپوت تھا جو سب سے بڑھ کر اپنے بے داغ حسب و نسب پر فخر و ناز کیا کرتا تھا۔ حتےٰ کہ وہ اس خیال سے بھی متنفر تھا کہ اس کی لڑکی کسی نیچ قوم مسلمان سے مربوط ہو کر اپنی موتی جیسی ابرو۔ کندن جیسی ذات کھو دے۔ چاہے اُس کے صلہ میں وہ لڑکی کسی زبردست راجدھانی کی رانی ہی کیوں نہ بن جائے بہرحال اس نے پیشوائے مذہب کے مشورے سے جعلی

رضامندی ظاہر کر دی۔ اور خود قلعہ آہور میں بند ہو کر بیٹھ رہا اور اسی دوران میں اپنے معافی داروں اور رشتہ ناتے والوں کو مجتمع کر لیا کہ اس وہمی ننگ و ذلت اور خیالی رسوائی و بے عزتی سے سب مل جل کر باپ بیٹی کو بچالیں۔

احمد شاہ نے بھی ان تیاریوں کی بھنک پا کر اپنی فوج در موج سے دس ہزار جوان چن لئے جو حسب موقعہ قلعہ آہور و سوفائی کر دیں۔ یا راجپوت دُلہن کے ڈولے کے ساتھ محافظ و باراتی بن جائیں۔ کجکلاہ ثریا جاہ بہ نفسِ نفیس فیل خاص پر نقرئی ہودے میں بیٹھ کر سرکردہ لشکر کی حیثیت سے پیش پیش روانہ ہوئے، جن کی پشت پر دوسرا ہاتھی شاہانہ انداز سے دُلہن بنا ہوا اس لئے رواں تھا کہ راجپوت عروس کے مسرت افزا خیر مقدم کے وقت کام میں لایا جائے۔

اسی شان سے جنگجو بادشاہ نے قلعہ آہور کی سنگین دیواروں کے قریب پہنچکر داخلہ کا مطالبہ کیا۔ جس کا جواب ایک پوری قوت سے رہا کئے ہوئے برجستہ سہ پہلوی ناوک سے دیا گیا۔ جو تاج "تاج بخش" کے اوپر والی کارچوبی جھول میں ترازو ہو گیا۔ تیر سے بندھا ہوا مسودہ اپنے شکن آلود دامن میں ذیل کا مہذب ترین جوابی پیام رکھتا تھا۔

"جس دھنش دھاری (کمان والے) نے تیرے سر والی جھل (جھول) کو اپنے تیر کا سچا نشانہ بنا لیا، وہی سورما بہت آسانی سے یہی تیر اس باندر سروپ (صورت) ظالم کے مغزِ سر میں بھی گاڑ سکتا تھا۔ جو پربت سنگھ کی لڑکی سے دیوانہ پن کے ساتھ اپنا بیاہ رچایا چاہتا ہے ابھی بھور بیلے (سویرا ہے) جاگ! اور کٹھن گھڑی پڑنے سے پہلے لوٹ جا۔"

اور اسی دوران میں بادشاہ کا بھیجا ہوا اسوت (پیرہن عروسی) جو راجپوتوں کے حسب رواج تھا، بقچہ پیرہن کثیف کی طرح قلعہ کی دیواروں سے لڑھکا دیا گیا۔ اور شاہی فیل کے پاؤں پاس گر کر گرد و غبار میں اٹ گیا (جو غالباً اہانت عروس کے لئے بھی کافی رکیک حرکت تھی) اس طرح سے مقتل نواز، اعلان جنگ کی تکمیل کر دی گئی۔ مسلم صفوف اس خیال سے کہ مبادا چشم زخم، حدِ ذلت تک نہ پہنچ جائے۔ خودداری سے زیادہ احتیاطی پیش بینی کی بدولت ناوکوں کی زد سے دور ہٹ آئے کہ شاید راجپوتوں کی طرف سے تیروں کی اچانک بارش واقعی پیامِ افتتاحِ جنگ لیکر نہ آپڑے۔

ایکے احمد شاہ کا بے لوث صلح پسند رویہ غازیانہ حملہ میں تبدیل ہو گیا۔ اس طرف آہور کے زبردست مورچوں میں تین ہزار قوی تن راجپوت مسلح موجود تھے۔ شاہ مقابل کے قیمتی عروسی ہدایا اور بیش بہا خسروی تحائف دیواروں کی مضبوطی، حصار کی پختگی عمدہ سلاخ کی خبرداری، اور ان

تیاریوں میں صرف کردیتے گئے تھے۔ جو روپیہ کے ذریعہ خریدی جاسکتی ہیں۔

جب مسلم محاصرین بڑھنا چاہتے تھے تو انکو تیروں کی بے پناہ بوچھاڑ اور ان پتھروں کی سرگردان بارش سے مجبوراً پیچھے ہٹ آنا پڑتا تھا۔ جو قلعہ کے بلند برجوں سے آلہائے حفاظت سمجھ کر پہاڑ کے دامنوں سے چن کر ایک کثیر تعداد میں محفوظ کر لئے گئے تھے۔ بعض وقت عیار محصورین جناب محاصرین کو دیواروں میں ریشمی رسیاں بھی نصب کرنے کا موقع دیدیا کرتے تھے۔ مگر قبل اس کے کہ کوئی متنفس حریف کافی بلندی تک چڑھنے پاتے۔ وہ لوگ لانبے نکیلے بانسوں سے، ان سربکف جان نثاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے تھے۔ جو پھندے دار ڈانڈوں پر فرط سعی و صدمۂ ضرب سے لہرا لہرا کر ڈگمگا ڈگمگا کر روئے زمین کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ رسائی قلعہ کے لئے اس قسم کی تمام کوششیں بے ثمر ثابت ہوتیں اب محاصرین نے دیواروں پر حملہ موقوف رکھا۔ اور مختلف قسم کی جنگی تدابیر سوچنے میں مصروف ہو گئے۔

فتح قلعہ اب محض معمہ موقعہ و سوال وقت بن کر رہ گیا تھا۔ ادھر دو تین مہینوں کے بعد آب و آذوقہ محفوظ میں نمایاں و روح فرسا کمی شروع ہو گئی اور ستم یہ کہ بیرون قلعہ سے رہائی کی آخری امید بھی مٹ چکی تھی بلاشبہ اگر پربت سنگھ شاہ مقابل سے اپنی جگر گوشہ کا پیوند ہونا منظور کر لیتا تو جزیہ کی آسان و ترحم آمیز شرائط اس کے واسطے دامن کشادہ چشم براہ تھیں لیکن بصورت موجودہ قطعی انکاری ہو چکا تھا اور اس مسیحانفس نازنین کی رضامندی کے بغیر مصیبت نصیب محصورین کے واسطے جزیہ کی تمام راہیں دامن بدست قفل بدہن ہو چکی تھیں۔

راجپوت اطاعت کے مقابلے میں مرمٹنے کو تیار ہو گئے۔ مگر ان کے بعد ان کی بیویاں ان کی لڑکیاں فتح نصیب مسلمانوں کی منکوحہ بیویاں یا مدخولہ لونڈیاں بن جائینگی اس ننگ و رسوائی سے بچنے کی صورت صرف یہ تھی کہ خوفناک جوہر کے غیر فطری قانون پر عمل کیا جائے یعنی پہلے تمام معصوم عورتیں، بے گناہ ہستیاں بے خطا مرد بے بس بچے نادان بچے، جھنڈوے بچے، مذہبی قربانی کی تحت میں جہالت پرستیوں کی مغرور و آدم خور دیوی پر ایک طرف سے بھینٹ چڑھا دیئے جائیں۔ اور پھر تمام مرد موت کے لئے تیار میں اپنے پاؤں سے الجھ کر دشمنوں کی بے پناہ جماعت پر مایوسانہ حملے کریں۔ اور برباد ہو جائیں

عورتوں نے بلا تامل اس خوفناک سازی کا دینا اپنا فرض ادا کر دینے کے لئے پوری تیاری ظاہر کر دی کیا عجب ہے کہ انہیں اپنے اندرونی جذبات کے اظہار کی ہمت نہ پڑی ہو، اور کیسے پڑتی کہتیں بھی تو جان الگ

نہ بچی، نشانۂ طعن وہدفِ ملامت اننگ بنائی جائیں بعضوں نے سلاحِ جنگی و پیراہن رزمی سے آراستہ ہوکر باپ بھائیوں اور شوہروں کے سینہ بہ سینہ جنگ کرنے کی اجازت حاصل کرلی۔ پربت سنگھ کی بیوی نے جس کے بشرہ پر خوف و پشیمانی کی چھاؤں بھی نہ تھی۔ اپنے شوہر سے کہدیا۔ کہ ہم سب عورتیں دہکتی ہوئی چِتا کے اندر باہم جل کر برباد ہوجائینگی۔ تاکہ بیکنٹھ میں اپنے پیاروں سے جلدی مل جائیں مگر مسلمانوں کی لونڈیاں بننا گوارا نہ کرینگے (کاش نادان بچوں سے۔ بے زبان بچّوں سے ایک ہی بار سہی ان کی مرضی بھی جھوٹے منہ پوچھ لی جاتی) رات کے وقت ایک بہت بڑی چِتا آراستہ کی گئی۔ جس میں سب سے پہلے قلعہ کے محفوظ جواہر و بیش بہا سامان پھینک دیئے گئے جس کے بعد کمسن و مسن ظالمہ و قاتلہ عورتیں اپنے معصوم بچّوں کو، تصویر یاس بچّوں کو گودیوں میں لئے ہوئے سر بفلک شعلوں کے اندر جھاجھم کودنے لگیں یا ادلی ہوئی تلواروں پر گلوں کے بل گرنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک راجپوتنی بھی باقی نہ رہ گئی۔

اب صبح کو مردوں کی باری تھی کہ مرشٹیں اور شمشیر دشمن ان کے لئے آسان تر موت تھی۔ اعتقادی قانون کا ہر حرف مذہبی پابندیوں کے ساتھ ادا ہونا چاہیئے تھا۔ اور ہوا یعنی انھوں نے پوتر تلسی کی ٹہنیاں اپنے خود نما صافوں میں لگالیں۔ "سالگ رام" پتھر اپنے گلے میں باندھ لئے۔ اور سروں پر کامدار کلسہیا رکھ لی۔ گویا سندر اپسارس (بیکنٹھ کی پریزادوں سے) گٹھ بندھن ہونے والی تھی۔ اب دو ہزار پانچسو قوی تن در قلعہ کے اس طرف کیسریا (زعفرانی) کپڑے پہنے ہوئے اکٹھے ہوئے۔ اور ہر ایک دوسرے سے جوش کے ساتھ گلے مل مل کر رخصت ہونے لگا۔ گویا انہیں پھر کبھی ملنے کی امید نہ تھی۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ اور ساری فوج نے پربت سنگھ و کنور رام سنگھ (وارث و فرزند) کی سرکردگی میں اپنی صفیں درست کر کے محاصرین پر دھاوا بول دیا۔ خاصکر قلب لشکر کی طرف بھرپور زور کر رہے تھے۔ علم محمدی کا دہانی پھریرا، بادشاہ کے ریشمی خیمہ پر لہریں لے رہا تھا۔ اور جس کے ہر غرّاٹے سے "نصر من اللہ و فتح قریب" کی زلزلہ انداز آواز نکل رہی تھی۔ حملہ آوروں کا دلی منشا یہ تھا کہ ان کے قبیلہ کا ہر فرد مصیبت موت میں دوسرے کے قدم بہ قدم رہے۔ خود پربت سنگھ و رام سنگھ اپنے کمترین پیادوں کی طرح ننگے پاؤں تھے۔ صرف فرق یہ تھا کہ باپ کے سر پہ کامدار چھتر، راج پاٹ کا نشان لگا ہوا تھا۔ اور راجپوتی جھنڈا ابھی اُڑ رہا تھا جس پر چاند سورج سے شاہزادوں کا اُترنا سلسلہ ستارے والی گنگا جمنی خیالی تصویروں میں دکھایا گیا تھا۔ جو ساتھ ہی ساتھ دشمن کے مستقل ترین حملوں کو اپنی جانب مائل کر لینے کے لئے

بھی ایک مہلک امتیازی نشان تھا۔ مگر بہر حال مرنا سبھی کو تھا صرف یہ سوال درمیان تھا۔ کہ سورگ جانے میں کون پیش قدمی کرتا ہے۔

بے خبر مسلم صفوف کے آگے پشتہ خاکی کا ایک نرم پردہ تھا۔ جو ذرا دانی تکلیف کے بغیر پہلے ہی حملہ کے نذر ہو گیا مدافعین حیران ہو گئے۔ اور راجپوت دشمنوں کے روبرو پہنچکر نہایت گھماگھمی سے خیمہ شاہی کی طرف ٹوٹ پڑے

چشم زدن میں احمد شاہ نے خیمہ سے نکل کر فیل خاص کے نقرئی ہودے میں جلوہ گری کی۔ جو دشمنوں کے اچانک حملے سے منتشر مسلم افراد کے واسطے رشتہ شیرازہ یا نقطۂ الصمد بن گیا۔

پھر بھی اس میں بہت دیر ہو گئی کہ محاصرین کے تقسیم شدہ حصص قلعہ کے گرداگرد سے سمٹ کر عین کارزار میں یکجا ہو سکیں۔ اس دوران میں اسد جگر بادشاہ قلب لشکر میں جرأت و استقلال سے کھڑے ہوئے اپنے جرأت فروش نعروں اور ہمت بخش اشاروں سے فوج کا دل بڑھا رہے تھے۔ اور گاہے بہ گاہے کمان کیانی دست حق پرست سے زہ کر کے بڑھتے ہوئے راجپوتوں کی جانب ناوک موت و تیر بے خطا رہا کر دیتے تھے۔ مگر کمی جماعت کی بدولت، موت و اسیری کے خدشہ سے خود بھی خالی نہ تھے جب دستہ محافظین کے ہر فرد نے فیل خاص کے آگے سینہ سپر ہو کر پیمان بزرگی کے ساتھ حق نمکخواری ادا کر دیا۔ تو اسی وقت اس کھیت میں دوسرے تازہ وارد تن نے ان کی جگہ لے لی۔

راجپوت ابتک بڑھے آ رہے تھے۔ اگرچہ ان کی پیش روی ہر بار ایک ایک انچ سے زائد نہ تھی۔ آخر کار وہ لوگ شاہی فیل کے سامنے پہنچ گئے۔ جس کا ہودہ انہیں کے رہا کردہ نیزہ و تفنگ کے بے ترتیب گچھوں سے رشک چمن ہو رہا تھا۔

اس موقع پر نوجوان رام سنگھ کی وحشیانہ جرأت نے راجپوتوں کی سرائے تصویر کے مرہوم خدوخال پر پوری اور آخری رنگ آمیزی کر دی ناکردہ کار نے شاہی فیل کے زیر شکم پہنچتے ہی نقرئی ہودے کی داہنی ریشمی رسیاں تلوار سے کاٹ دیں۔ ہودا دوسری جانب تیزی سے سرک گیا۔ اور گو ہر خاتم فیل نگین خاک بن گیا اسی حالت بے بسی میں شعار جرأت و تقاضائے جوانمردی کے خلاف خود رام سنگھ اور دوسرے بڑھے ہوئے راجپوتوں نے غزال فریب کجکلاہ پر چیتوں کی طرح حملہ کر دیا۔ مگر کچھ بھی نہ بنا سکے۔ ممدوح اپنی دو رخی ہلالی جلالی تلوار کھینچے ہوئے برق کی طرح تڑپ کر اٹھے۔ اور بیشل پھکیت تلواریوں کی طرح چھوٹ کے ہاتھ چلا کر اس وقت تک یکساں مدافعت کرتے رہے۔ جبتک کہ اور غلامان محافظ

کی کافی تعداد نہیں پہنچ گئی۔

اسی دوران میں محیط جنگ کا طوفانی جزر و مد بھی عارضی طور پر سکون پذیر ہو کر اپنا رُخ بدلتا گیا۔ اور حلقہ چھپا کے گوشہ گوشہ سے تازہ دم دستے جمع ہوتے گئے خیمہ شاہی کے قلب میں (جہاں تک راجپوت اپنے پہلے حملہ میں پہنچ گئے تھے) اب مسلمان سپاہی سینہ بہ سینہ دست بدست پہلو بہ پہلو مجتمع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کی ہلالی بدر خیمہ کے گرد نصف ہالہ بن گئی۔

اب راجپوت بھی ایک ہی حلقہ میں ہو کر مقتولین کی دیواروں کی آڑ پکڑ کر اسد شکار دشمنوں سے اپنی حفاظت کرنے لگے۔ اب ان میں ایک قدم بڑھنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ ان کی محدود تعداد لمحہ بہ لمحہ کم و کمتر اور گردش حلقہ حملہ بہ حملہ تنگ و تنگتر ہوتی جا رہی تھی۔ تلواریں ٹوٹ چکی تھیں۔ خنجروں میں دندانے پڑ گئے تھے۔ ترکش خالی ہو چکے تھے۔ بھالوں کی باڑھیں مر چکی تھیں۔ اور مسلسل کارزار سے دست و بازو شل ہوتے جا رہے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے فرض حملہ دشمنوں یا حقداروں کے سپرد کر کے محض مدافعت پر قناعت کر لی تھی۔ کچھ بھی سہی ابتک راجپوتوں کا ایک دستہ مایوسانہ جرأت سے مسلمانوں کی فولادی صفوف میں گھس جاتا تھا۔ اور بقدر حوصلہ کشت و خون کے بعد اسی گھیرے میں اپنے وضع کردہ حریص موت کے گھاٹ اُتر کر شمشیر دشمن کی باڑھ میں جلا دیے جاتا تھا۔ پربت سنگھ کا چھتر و جھنڈا شور کارزار میں ابتک گرد آلود عنوان سے بلند تھا۔ گو بے چین مسلمان اس کے گرا دینے یا چھین لینے کے لئے بہت سے روح فرسا مستقل حملے کر چکے تھے جس وقت پربت سنگھ اس خوفناک گھمسان میں اپنے سورما بزرگوں کا نام زندہ کر کے جانباز سپاہیوں کے جھرمٹ میں قالب بے جاں ہو کر فرش زمین ہو گیا۔ فوراً کنور رام سنگھ نے چھتر کے زیر سایہ جگہ لے کر مایوس راجپوتوں میں نیا جوش پیدا کر دیا۔ اب اس نے ایک خان سے (جو معرکہ میں بد بر آیا تھا) بڑھ کر تلوار چھین لی۔ اور اس نئے آلہ قتل سے تین دشمنوں کا کام تمام کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ خود اور اس کا وہ طلائی جھنڈا جس میں چاند و سورج کے غرور آمیز خاکے بنے ہوئے تھے۔ سرنگوں کر دیا گیا۔

خوفناک جنگ ختم ہو گئی۔ جانبین کے پانچہزار مقتولین پر گرد و غبار کی نرم و گداز چادر پڑ گئی۔ اب مسلمانوں کے طوفان نواز "اللہ اکبر" زلزلہ انداز "اللہ اکبر" کے جواب راجپوتوں کے "ہر ہر مہادیو" والے نعروں سے نہیں دبتے جاتے تھے۔ قلعہ آہور کی تمام تر ثروت گنج شہیداں میں برباد ہو چکی تھی۔ مگر مرتے مرتے بھی اُنھوں نے برابر یا زیادہ کی تعداد میں مسلمانوں کو اپنا ہم سفر بہشتیں بنا لیا تھا (دوسرے معنوں میں ایک جنگ ابھی اور باقی تھی۔

وہ زندوں کی لڑائی تھی جو ختم ہو گئی۔ اور مُردوں کی زرگسی جنگ دیکھنے کبتک ہوتی رہے)

احمد شاہ نجیب محفوظ قلعہ میں اپنی بیش قیمت گراں فتوح راجپوت دُلہن کو ساتھ لے جانے کے خیال سے داخل ہوتے۔ تو انہیں قدم رکھتے ہی شہر خموشاں یا گورغریباں نظر آیا جس کے اندر باہر کی تمام ہوا بوے سوختگاں سے بسی ہوئی تھی۔

اس جگہ اور دیگر موقعوں پر بھی راجپوتوں نے عملاً دکھا دیا۔ کہ وہ ننگ غلامی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کی بہادرانہ موت نے جس میں مرد و زن سبھی شامل تھے آنے والی نسلوں میں وہ ناقابل تسخیر روحانیت پیدا کر دی جو ان کی آزادی کو زبردست مغلوں کے پنجہ سے ہمیشہ بچاتی رہی۔

(۲)

ذکی الحس احمد شاہ، نازک مزاج احمد شاہ، الم نصیب احمد شاہ! نتائج محبت سے متاثر ہو کر ایک عرصہ تک پیکر حرماں و مجسمہ یاس بنے رہے۔ ہاں اس وقت ان کی پژمردہ امیدوں میں نئے سر سے جان آگئی مرجھائی ہوئی کلیاں کھل اُٹھیں۔ جب اُنھوں نے ایک معتبر جاسوس سے یہ مسرت اثر خبر پائی۔ کہ دلفریب لالہ آبو روالی چتا میں جل کر خاک نہیں ہوئی بلکہ وہ پری جمال محاصرہ کے پہلے ہی پوشیدہ طور پر قلعہ سے باہر بھیجکر ایک راجپوت سردار کے سپرد کر دی گئی تھی۔ جس کی عزت و وفا خودداری و حیا پر پربت سنگھ کو پورا بھروسہ تھا۔

نفتہ جگر تاج نصیب شاہ نے یہ سنکر تسخیر دوشیزہ کے لئے نئی تیاریوں کا حکم دیدیا۔ جسے وہ عروس خاص بنانے کا مستحکم ارادہ مصمم قصد کر چکے تھے۔ "محافظ عروس" نے چاہا کہ شاہی طاقتوں کے سامنے بھی امانت نواز دوشیزہ کی مدافعت حتی المقدور کی جاتے۔ مگر خود لالہ نے اب اور زیادہ قتل و خون کا سبب بننا پسند نہ کیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ "جب بادشاہ مجھے بیاہنے پر تلے ہی بیٹھے ہیں تو انہیں کامیاب ہو جانے دو۔ اور رحم کرے وہ اس کامیابی پر کبھی نہ پچھتائیں۔

دوشیزہ نے محض وعدہ ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ ایک نہایت بیش قیمت زردوز شہانا جوڑا جس میں آبدار جواہر بکثرت ٹکے ہوئے تھے۔ احمد شاہ کی خدمت میں یوم عروسی کو زیب تن کرنے کے لئے بھیجدیا۔ راجپوتوں نے اس آزادانہ حرکت پر کمینہ فطرت کنّیا کو بہت لعنتیں ملامتیں کیں۔ کہ افسوس! تو برباد کن خاندان سے پیوند ہونے کے لئے اسقدر بے چین ہے۔ اور دُلہن بھی اس ظالم کی بننا چاہتی ہے جس کے ہاتھ تیرے پدر و برادر کے ناحق خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

یہ تقریب خانہ آبادی محل شاہی کے مرمریں سائبان میں برپا ہونے والی تھی۔ جو روپہلی جھیل کے عین لب ساحل واقع تھا۔ سیاسی اصول اور ذاتی وجوہ کو مدنظر رکھتے ہوئے شان رسم نہایت بلند ہو جاتی تھی۔ اس لئے کہ آئندہ یہی دعوت عمل امن وسکون کی حقیقی دعوت بن جائیگی۔

• سر بیآرا کو محض اپنی خواہشات کی تکمیل منظور نہ تھی۔ بلکہ اسی تحت میں یہ امید افزا راز بھی مضمر تھا کہ ہندو مسلم کی روحانی یکجہتی کے بعد میرے زیر نگیں قلمرو میں متحدہ حکومت کی فرمانروائی بھی داخل ہو جائیگی۔ تکمیل مقصد مذکور کے لئے اُن تمام راجپوتوں کے نام پروانہ جان بخشی جاری وعطا ہوگیا جو کبھی بھی حکومت کے خلاف باغیانہ سازشوں میں شریک رہ چکے تھے۔ شادی حتےالوسع ہندو مراسم کے ماتحت منعقد ہوئی۔ اور ہزاروں برہمن اس پاک موقع پر شکم سیری کے ساتھ کھلا دئے گئے۔

"دیکھئے! آخر احمد شاہ اپنی خواہشات کی معراج قریب بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔ آج شادی کا دن ہے وہ اور لالہ پہلو بہ پہلو چاند وسورج کی شان سے مسند آرا ہیں۔ گلو میں گل وجواہر کے ہار پڑے ہوتے ہیں۔ جادو نگاہ دلہن ریشمی محرم اور مخملیں پیرہن میں ملبوس ہے۔ جس پر آب رواں کا ایک باریک دوپٹہ حباب حسن کا نظر نواز حسین حجاب بنا ہوا ڈاٹر چھاپا ہوا ہے۔ جس پر سرخ رنگ کے پھول پڑتے، انگاروں کی طرح دہک رہے ہیں۔ وہی دوپٹہ پتلی لچیلی کمر کا حلقہ بننے کے بعد سرتک بندھا ہوا ہے۔ جو سہ پہلوی تاج نما کلاہ سے ڈھکا ہوا ہے۔ پیرہن زیب دولہا بھی لالہ کے آج ہی صبح بھیجے ہوئے نفیس تریں زردوزی پوشاک میں ملبوس ہے۔ جس میں جا بجا شعلہ مزاج لعل دہک رہے ہیں راسخ الاعتقاد مسلم افراد کے خلاف مرضی احمد شاہ نے نہایت مختصر طرز عقد اختیار کر لیا یعنی ایک ہاتھ میں تلسی کی پاک ٹہنی، دوسرے میں لالہ کا ہاتھ تھام لیا۔ وہیں دونوں ہمیشہ کے لئے میاں بیوی ہوگئے۔

ختم رسم کے بعد لالہ نزاکت و متانت سے اٹھتی ہے۔ شوہر کا ہاتھ تھام کر اس مرتفع شہ نشین تک لاتی ہے جو روپہلی جھیل کے عین بالائے سر ہے۔ اور کہنے لگتی ہے۔ "میرے مالک ذرا دیر کے لئے دھوپ میں کھڑے ہو کر اپنی وفادار رعایا کو اپنا جمال جہاں سوز دکھا کر مسرور فرما دیجئے

اور واقعی حسب مست مسرت، بیدار بخت خفتہ نصیب احمد شاہ نے دیکھا۔ کہ حد نظر تک ہزارہا خوش پوش … تعطیلی لباس پہنے ہوئے دید شاہی پر نعرہ ہائے … کر رہی ہے۔ تو فانی دل غرور مسرت سے پھول … میں تنگ ہوگیا۔ واقعی اس وقت ساری … تمام گھاٹیاں اسی کی رعیت سے بھری … نگاہ جاتی ہے کوئی سبزہ زار کوئی میدان کوئی وادی …

ایسی نظر نہیں آتی جو اپنے احاطہ سلطنت کی وسیع حدود سے باہر ہو۔

سب سے بڑھکر وہ اپنی دلفریب عروس کی تسخیر پر نازاں تھا۔ جو بازوؤں کا تمام زور صرف کر کے ایک نہایت جنگجو قوم کے سخت پنجے سے ہزاروں بے گناہ [illegible] کر کے حاصل کی گئی تھی۔

مگر جب دوشیزہ نے آنکھیں ملائیں تو ان میں ایک عجیب الاثر جذبہ جھلک رہا تھا۔ جو یقیناً "حجاب عروسانہ" سے امتیازی شان رکھتا تھا۔ "میرے مالک! اس مسرت بیز گھڑی کے مزے جبتک یہ باقی ہے اٹھا لیجئے مگر یاد رکھئے کہ جس وقت انسان اپنی انتہائی فارغ البالی پر ہوتے ہیں۔ اسی وقت دیوتاؤں کی منتقم نگاہیں انکے شباب مسرت کو لگ جاتی ہیں۔ جو ابھی ابھی صحت و جوانی و محبت کے کمال پر ہیں۔ ایک دن۔ نہیں۔ ایک منٹ میں کچھ بھی نہیں رہ جاتے۔"

سرشارِ محبت نے جواب میں اک شیریں تبسم پر اکتفا [illegible] دولہا! اپنی سحر طراز دلہن کی جادو بھری ہستی میں [illegible] تھا کہ نالہ کا ہر کام ہر لفظ اس کی آنکھوں میں عروس [illegible] و دلکشی بڑھاتا ہی جاتا تھا۔

[illegible] والے مصاحبین اور جھیل والے حاضرین [illegible] سے دیکھا کہ شاہی پوشاک کے لعل جن پر آنکھیں نہیں ٹھیرتیں شعلوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ یکایک آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔ اور وہ لوگ کمال یاس [illegible] سے کیا دیکھتے ہیں۔ کہ دولہا کے داہنے بازو [illegible] آگ کا ایک اصلی شعلہ ہوا میں لپکے لے رہا ہے۔ وہ مشکل سے اپنی آنکھوں پر اعتبار کر سکے۔ مگر واقعیت کی شان مسلّم تھی۔

ہندی آفتاب کی بے پناہ شورش نے ان خبر عروس اجزائے سمیت پر اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ جو بے رنگ و بو روغن کی شکل میں آتش بدامن لالہ نے اپنے دولہا کے شاہانہ جوڑے میں اپنے ہاتھوں سے جی کھول کر مل رکھا تھا۔

احمد شاہ معرکۂ رزم میں شیر صولت بہادر ضرور تھے۔ مگر اس وقت اپنی ہی محبوب دلہن والی تجویز کردہ موت کے صدمات ان کو معمولی انسانوں کی سطح پر کھینچکر لے آئے تھے انہوں نے درد سے بے چین ہو کر جگر خراش چیخیں ماریں اور وحشیانہ طور پر دوڑنے لگے کہ جلتے ہوئے گوشت سے شعلہ جوالہ پیرہن عروسی کو پھاڑ کر پھینکدیں مگر اس دوا دوش کا سہارا [illegible] سارے جسم پر دوڑ [illegible] نفیس مزاج بادشاہ اپنے [illegible] سیاہ کوئلوں کا ایک عبرت انگیز ڈھیر [illegible]

اسی دوران میں داغ پرست لالہ [illegible]

چکی تھی۔ اور اپنے دولہا کی مشکلات مرگ، رنج و خوشی، اطمینان و بے چینی سے دیکھ کر دل ہی دل میں مطمئن ہوگئی تھی کہ آج پدر و برادر کے خون کا بدلہ اور بربادیٔ نسل کا انتقام پورا ہوگیا۔ اب کیا تھا وہ مسکرائی اور روپہلی جھیل کی گہرائیوں میں سر کے بل جھم سے کود گئی۔

(مفہوم ماخذ) **طالب الہ آبادی**

سودائے خام

ساقی ہو دلنواز　　نغمہ ہو جانگداز　　ساقی کا روٹھنا　　ساغر کا ٹوٹنا
مطرب ہے بے نیاز　　چشمے بجائیں ساز　　چھلکوں کا چھوٹنا　　قسمت کا پھوٹنا

منظر ہو فتنہ خیز　　بلبل ترانہ ریز　　آفت کی وہ گھڑی　　محشر سے بھی کڑی
پھولوں میں بوئے تیز　　ہر شاخ عطر بیز　　حسرت سی چھا گئی　　افسردہ ہر کوئی

غم کا نہ ہو نشاں　　نہرِ خوشی رواں　　پھر گونجے قہقہے　　بلبل سے چہچہے
جوبن پہ گلستاں　　فردوس کا سماں　　ساغر نہیں ملے　　چلّو ہی بھر لئے

ہر غنچہ پر حجاب　　ہر چہرے پر نقاب　　بوندیں پڑیں اِدھر　　محشر بپا اُدھر
ہر ڈالی پر شباب　　ہر پھول لاجواب　　ساقی ہو اِک نظر　　بدلے میں دِل جگر

نرگس فسوں طراز　　سوسن زباں دراز　　بادل کی گڑگڑاہٹ　　بجلی کی کڑکڑاہٹ
گلچیں سے بے نیاز　　ہوں محوِ رقص ناز　　رندوں کی تلملاہٹ　　کچھ خوف کی ملاوٹ

بوتل کی قاہ قاہ　　رندوں کی واہ واہ　　عنقا ہُوا سکوں　　سر کو چڑھا جنوں
محشر ہو اِک بپا　　ہر لب پہ یہ صدا　　ہر لب پہ ہائے کیوں　　مَیں تشنہ لب مروں

ساقیِ خوبرو　　صدقۂ حسن تو　　فرقت کا ہو نہ ڈر　　غم کا نہ ہو گزر
بھر بھر کے دے سبو　　بر آئے آرزو　　دنیا سے بے خبر　　ہو عمر یوں بسر

محمودالا گوہر

"یوم یکشف عن ساق"

ایک دن ہر ساز سرتاپا صدا ہو جائیگا
ایک دن ہر رازِ راز بر ملا ہو جائیگا

ایک دن ہر جزو و کُل کا امتیاز اٹھ جائیگا
ایک دن ہر قطرہ دریا میں فنا ہو جائیگا

ایک دن ہر خار و گل کا امتیاز اٹھ جائیگا
ایک دن ہر ذرہ مہرِ جلوہ زا ہو جائیگا

ایک دن ہر رنج راحت آشنا بن جائیگا
ایک دن ہر دکھ ہم آغوشِ دوا ہو جائیگا

ایک دن ہر قہر لطفِ جانفزا بن جائیگا
ایک دن ہر زہر تریاقِ شفا ہو جائیگا

ایک دن ہر کفر و دیں کی کشمکش مٹ جائیگی
ایک دن ہر شبہ و شک کا فیصلہ ہو جائیگا

ایک دن ہر این و آں کی چپقلش مٹ جائیگی
ایک دن ہر پیش و پس کا خاتمہ ہو جائیگا

ایک دن ہر ساز سے اس کی صدائیں آئینگی
ایک دن نغمات کا طوفاں بپا ہو جائیگا

ایک دن ہر سمت آنکھیں اس کو پیدا پائینگی
ایک دن عالم کا عالم ہی نیا ہو جائیگا

ایک دن ہر باب الطاف و کرم کھل جائیگا
ایک دن ہر دل ہٹ کر راستا ہو جائیگا

ایک دن ہر لن ترانی کا بھرم کھل جائیگا
ایک دن ہر پردہ اٹھ کر سامنا ہو جائیگا

ایک دن ہر گفتگو کی ہمتیں بڑھ جائینگی
ایک دن ہر مطلب بیجا بجا ہو جائیگا

ایک دن ہر آرزو کی ہمتیں بڑھ جائینگی
ایک دن ہر امر ناجائز روا ہو جائیگا

ایک دن ہر رنجِ الفت کا صلا مل جائیگا
ایک دن ہر وعدۂ الفت وفا ہو جائیگا

ایک دن ہر شوق منہ مانگی مرادیں پائیگا
ایک دن ہر حسرتِ دل کا بھلا ہو جائیگا

ایک دن ہر دوریِ فانی کے غم مٹ جائینگے
ایک دن ہر صدمۂ باقی فنا ہو جائیگا

ایک دن ہر بُعدِ جسمانی کے غم مٹ جائینگے
ایک دن ہر قربِ روحانی عطا ہو جائیگا

ایک دن تقدیر بالکل راہ پر آجائے گی
ایک دن بختِ سیہ بختِ رسا ہو جائیگا

ماحصل یہ ہے کہ ہر امید بر آجائیگی
مختصر یہ ہے کہ ہر شغلِ خدا ہو جائیگا

بس اب اے آزاد تصریحِ مزید اچھی نہیں
جا اور اطمینان رکھ۔ جو کہدیا ہو جائیگا

آزاد انصاری

ایک پاگل کا قلمی نوشتہ

ہاں۔ دیوانہ! آج سے کچھ سال پیشتر یہ لفظ مجھے کس طرح پریشان کر دیتا تھا کس طرح اس لفظ سے مجھ پر وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور کس طرح میرا خون ایک سنسناہٹ کے ساتھ رگوں میں دوڑنے لگتا تھا۔ حتیٰ کہ سرد پسینے کے بڑے بڑے قطرے میری جبین پر نمودار ہو جاتے۔ اور ڈر کی وجہ سے میرے گھٹنے آپس میں ٹکرانے لگتے۔

اب میں اسے پسند کرتا ہوں بہت پسند کرتا ہوں۔ یہ ایک پسندیدہ نام ہے۔ کوئی بادشاہ مجھے ایسا دکھا دو جس کے تیور دیوانے کی خوفناک چمکیلی آنکھوں سے زیادہ دہشت پیدا کر سکتے ہوں۔ جس کی دار و رسن ایک دیوانے کی گرفت سے زیادہ مضبوط ہو۔ دیوانگی! دیوانگی نہایت شاندار چیز ہے۔ آہو! ایک وحشی شیر ببر کی طرح سلاخوں میں دکھائی دینا، رات کے سکوت کو اپنی بھاری زنجیروں کی جھنجھناہٹ میں موسیقی کے دلگداز نغموں سے زیادہ حظ حاصل کرنا اور پھر اس خوشی سے بیخود ہو کر گھاس پر لوٹنا گھاس اوڑھنا گھاس بچھانا کیا عمدہ فرحت ہے۔ یہ پاگل خانے کی جگہ یہ ایک نادر جگہ ہے۔

میرے دل میں ان دنوں کی یاد باقی ہے جب میں دیوانگی سے خوف کھاتا تھا۔ جب میں سوتے سے چونک چونک اٹھتا تھا۔ اور گھٹنوں کے بل ہو کر دعا مانگتا کہ اے رب العالمین مجھے اس موروثی لعنت سے نجات دے۔

جب میں خوش و خرم محفلوں سے دُور بھاگتا تھا تاکہ کسی سکوت جگہ میں چھپ جاؤں۔ جب میں پہروں اس خوفناک بیماری کو ترقی کرتے دیکھتا ایک دن میرے دماغ پر مسلّط ہو کر اسے ضائع کر دینے والی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جنون میرے خون میں پنہاں ہے۔ اور یہ مجھے باپ کی طرف سے وراثت میں ملا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس کا جوہر میری ہڈیوں میں موجود ہے۔ میں جانتا تھا کہ جو ہوتا رہا ہے وہ ہو رہا ہے اور ہوتا رہیگا۔

جب کسی بھری محفل سے آنکھ بچا کر کسی گوشے میں چھپنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ میں لوگوں کو اپنی طرف انگشت نمائی اور سرگوشی کرتے دیکھتا تو جان لیتا تھا کہ وہ آپس میں میرے آنے والے جنون کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ اور میں چپکے سے ٹلجاتا تھا۔ تاکہ تنہائی میں اپنی بدقسمتی پر روؤں۔ چلاؤں۔

"میرا برسوں یہی چلن رہا۔ وہ سال بہت ہی طویل

تھے۔ یہاں بھی اکثر راتیں طویل ہوتی ہیں۔ مگر ان بے چین راتوں اور ان دہشتناک خوابوں سے ان کو کوئی نسبت نہیں میرا خون ان کی یاد آتے ہی منجمد ہونے لگتا ہے۔ بڑی بڑی ڈراؤنی شکلیں اپنی بدقطع اور قبیح صورتوں کو لئے ہوئے کونے کونے سے نمودار ہونے لگتیں۔ بڑھتے بڑھتے میرے بستر پر چھا جاتیں اور مجھے جنون پر اکساتیں۔ میرے کانوں میں نہایت دھیمی آوازیں کہتیں کہ ہمارے گھر کا فرش جس پر میرا باپ فوت ہوا تھا اس خون سے رنگا ہوا ہے۔ جو اس نے جنون کے جوش میں بہایا تھا۔ میں اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتا مگر وہ چیخ چیخ کر کمرہ کو سر پر اٹھا لیتیں۔ وہ مجھے بتاتیں کہ میرا دادا کتنی برس تک ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں لئے رہا تا کہ وہ ناخنوں سے خود اپنے ٹکڑے نہ کر ڈالے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہاں یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔

آخر کار جنون ترقی کرتے کرتے مجھ پر قابض ہو گیا۔ اور میں حیران ہوتا تھا کہ میں اس سے کیوں خوف کھایا کرتا تھا۔ اب میں دنیا والوں میں آ جا سکتا تھا اور ان میں سے بہترین لوگوں کے ساتھ ہنس کھیل سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں دیوانہ ہوں مگر ان کو اس بات کا بالکل شبہ نہ تھا۔ میں اس عمدہ کھیل کا خیال آتے ہی جو میں ان کے ساتھ کھیل رہا تھا کس طرح خوشی میں اپنے آپ سے بغلگیر ہوا کرتا تھا کیونکہ وہ کچھ عرصہ پیشتر مجھ پر انگشت نمائی کرتے ہوتے ہنس دیا کرتے تھے جب میں پاگل نہ تھا۔ تو وہ صرف ڈرتے ہی تھے۔ کہ کہیں میں سچ مچ دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

جب میں تنہا ہوتا تھا تو میں کس طرح خوشی سے ہنسا کرتا تھا۔ اور خیال کیا کرتا تھا کہ کس خوبی سے میں نے اپنے راز کو پوشیدہ رکھا ہے میرے دوست کس تعجیل کے ساتھ مجھ سے کنارہ کش ہو جاتے۔ اگر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے۔

اور جب میں اکیلا کسی خوش رو زندہ دل نوجوان کے ساتھ بیٹھ کر ماحضر تناول کیا کرتا تو خیال کرتا کہ اگر اس نوجوان کو معلوم ہو جائے کہ اس کا عزیز دوست جو اس کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا چاقو تیز کر رہا ہے اپنی تمام قوت سے دیوانہ ہے۔ اور اس کے دل میں یہ خیال ادھورے طور سے جاگزین ہو گیا ہے۔ کہ چاقو کو اس کے دل میں اتار دے تو وہ کس قدر زرد پڑ جاتا اور کس قدر جلدی بھاگ جاتا میں یہ خیال آتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑنے سے بمشکل رک سکتا تھا۔ آہ وہ کیسی پسندیدہ زندگی تھی۔

میں امیر ہو گیا۔ مجھے بیشمار دولت مل گئی اور میں خوشی سے عیش و عشرت میں ڈوب گیا۔ میری خوشی اس خیال سے اور بھی بڑھ گئی کہ میں ایک اہم راز کو چھپائے ہوئے ہوں۔ ہزار گنا زیادہ ہو گئی تھی۔ مجھے ایک بڑی جائداد مل گئی تھی۔ قانون۔ آہنی قانون عقاب کا سا تیز نظر قانون

دھوکے میں آگیا۔ اور ہزاروں روپے بغیر کسی جھگڑے کے مجھے مل گئے۔ کہاں تھی صحیح العقل تیز فہم لوگوں کی عاملہ فہمی کہاں تھی چالاک وکیلوں کی چالاکی جو نقائص نکالنے میں بڑے مشاق ہوتے ہیں۔ ایک سفن دیوانے کی عیاری نے سب کو فریب دے دیا۔

جب میں دولتمند تھا تو لوگ کس طرح میری خوشامد کیا کرتے تھے میں اس دولت کو بجا اور بیجا طور پر صرف کیا کرتا تھا۔ میری کس طرح تعریف ہوا کرتی تھی۔ کس طرح وہ تینوں مغرور اور متکبر بھائی میرے سامنے عاجز ہو گئے۔ عزت! توقیر!! رفاقت!!! دوستی کس طرح وہ بوڑھا آدمی میری پرستش کرنے لگا۔ اس کی ایک لڑکی۔ اور ان نوجوانوں کی ایک بہن تھی۔ اور وہ پانچوں مفلس تھے۔ میں امیر تھا اور جب میں نے اس لڑکی سے شادی کی میں نے انکے چہروں پر ایک فاتحانہ تبسم کھیلتا ہوا دیکھا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے منصوبوں اور تدابیر کو پروان چڑھتے دیکھا تھا لیکن مسکرانا مجھے چاہیے تھا۔ مسکرانا اور قہقہہ لگا کر ہنسنا، بالوں کو نوچنا۔ فرش پر لوٹنا اور خوشی سے چیخیں مارنا یہ سب کچھ میرا حق تھا وہ کیا جانتے تھے کہ انہوں نے اپنی بہن ایک دیوانے کو بیاہ دی تھی۔

ٹھہرو! اگر وہ جانتے تو کیا وہ اسے بچا لیتے؟ کیا ایک بہن کی خوشی اس کے خاوند کی دولت کے مقابلہ میں بہت ہلکی تھی۔

ایک چالاکی کے باوجود مجھے دھوکا ہوا۔ گو دیوانے بہت تیز فہم ہوتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی وہ بھٹک جاتے ہیں اگر میں پاگل نہ ہوتا تو مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ لڑکی ایک قابل رشک امیر بیوی بننے کے بجائے اپنے تئیں ایک قبر میں ایک سفید کفنی میں ملبوس ہونا زیادہ پسند کرتی ہے۔ مجھے جاننا چاہیے تھا کہ اس کا دل اس سیاہ آنکھوں والے لڑکے کے ساتھ ہے۔ جس کا نام میں نے اسے خواب میں لیتے ہوئے سنا تھا۔ مجھے جاننا چاہیے تھا۔ کہ وہ سفید ریش ضعیف باپ کی مفلسی پر بھینٹ چڑھا دی گئی ہے۔

مجھے اب شکلیں یاد نہیں پڑتیں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکی قبول صورت تھی۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ وہ حسین تھی۔ کیونکہ چاندنی راتوں میں جب میں خواب میں چونک اٹھتا ہوں۔ اور میرے اردگرد سکوت ہوتا ہے۔ تو ایک لاغر اور افسردہ شکل اپنی کبھی نہ بند ہونے والی آنکھوں سے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی ہے اسکے لمبے لمبے بال اس کے شانوں اور کمر پر پڑے ہوتے ہیں جن کو کوئی دنیاوی ہوا متحرک نہیں کر سکتی۔ میں اسے اپنی کوٹھڑی کے ایک کونے میں بے حس و حرکت کھڑی دیکھا کرتا ہوں اوہ۔ خون میرے دل میں منجمد ہونے لگتا ہے۔ وہ شکل اس کی ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں بادل کی طرح

چمکتی ہیں۔ وہ شکل کبھی متحرک نہیں ہوتی۔ اور کبھی دوسری شکلوں کی طرح جو کبھی کبھی اس کی قائم مقام ہو جایا کرتی ہیں۔ مجھے گھورا نہیں کرتی۔ اور نہ مجھ پر ہنسا کرتی ہے لیکن وہ ان آسیبوں سے بھی وحشتناک ہے۔ جو مجھے کئی سال تک ورغلایا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ تازہ تازہ قبر سے آتی ہے۔ اور اس کی شکل کس قدر خوفناک ہوتی ہے۔ ایک سال کی مدت تک میں اس چہرہ کو روز بروز زردی مائل ہوتے دیکھا کیا اور ایک سال تک میں ان آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھا کیا۔ مگر اس کا سبب؟ اس کا سبب مجھے معلوم نہ تھا لیکن مجھے پتہ چل گیا۔ اور وہ زیادہ عرصہ مجھ سے اس کی وجہ نہ چھپا سکی۔ اس نے مجھے کبھی پسند نہ کیا تھا۔ اور میں بھی ایسا ہی خیال کرتا تھا۔ وہ میری دولت سے متنفر تھی اور اس شان و شوکت سے بالکل بے پروا۔ یہ میں نے کبھی خیال نہ کیا تھا۔ مگر وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔ اس بات کی مجھے کبھی امید نہ تھی۔

عجیب و غریب خیالات مجھے آنے لگے۔ اور کوئی مخفی طاقت مجھ پر قابو پانے لگی۔ عجیب عجیب خیالات میرے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ مجھے اس سے نفرت نہ تھی۔ گو میں اس لڑکے سے نفرت کرتا تھا جس کے واسطے وہ ابھی تک روتی تھی۔ لیکن مجھے اس پر رحم آتا تھا۔ ہاں! ہاں!! مجھے اس کی اس اندوہناک زندگی پر رحم آتا تھا جس کا سبب اس کے بھائیوں اور باپ کی خودغرضی اور کمینہ پن تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی زندگی زیادہ عرصہ نہیں مگر اس خیال نے کہ وہ اپنی موت سے پہلے کسی بدبخت بچے کی ماں نہ بن جائے دیوانگی کی تمام قوتوں کو میرے اندر از سر نو زندہ کر دیا تھا میرے جنون کا فیصلہ اٹل تھا۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اسے قتل کر دوں۔

کئی ہفتوں تک میں زہر کا خیال کرتا رہا۔ اور پھر ڈبو دینے کا اور پھر جلانے کا آیا۔ عالیشان مکان کا تمام شعلوں سے گھرا ہوا ہونا اور میری بیوی۔ دیوانے کی بیوی کا اس کے درمیان جلنا کیا ہی عجیب اور خوشنما منظر تھا۔ ذرا اس بڑے انعامی مذاق کا خیال تو کرو۔ یہ کام اگر کسی صحیح العقل آدمی کو دیا جاتا تو اس سے کبھی نہ ہو سکتا۔ ہاں یہ ایک اہم کام دیوانہ ہی انجام دے سکتا ہے۔

میں اکثر اس کا خیال کرتا رہا۔ مگر پھر اسے بھی چھوڑ دیا مجھے ایک استرے کو تیز کر کے اس کی دھار کو دیکھتے ہوئے اس خیال سے کہ اس باریک اور چمکدار دھار سے ایک ہی وار میں کیسا کاری زخم لگ سکتا ہے کیسی خوشی ہوا کرتی تھی

آخر کار وہ تمام شکلیں اور آسیب جو اکثر میرے ساتھ رہا کرتے تھے مجھ سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ مجھے اکسانے لگے کہ اب وقت آگیا ہے۔ انہوں نے کھلا ہوا استرہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا

بستر پر سے آہستہ آہستہ اُٹھا اور اپنی سوئی ہُوئی بیوی پر جُھک گیا۔ اس کا چہرہ اس کے ہاتھوں میں چھپا ہُوا تھا۔ مَیں نے آہستہ سے ان کو علیحدہ کیا۔ ہاتھ اس کی چھاتی پر گر پڑے۔ وہ رو تی رہی ہوئی۔ کیونکہ آنسو ابھی اس کے گالوں پر خشک نہیں ہوئے تھے اس کا چہرہ پرسکون تھا۔ اور جب مَیں اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک ہلکا سا تسلّی بخش تبسّم اس کے زرد چہرے کو زیب دے رہا تھا۔ یہ غالباً ایک جلدی سے گزر جانے والا خواب تھا۔ مَیں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ چونک پڑی۔ مَیں پھر آگے جھکا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور جاگ پڑی میرے ایک دفعہ کے ہاتھ ہلانے سے وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی۔ مگر مَیں دہل گیا۔ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اسکی نگاہیں میری آنکھوں پر جم گئیں۔ مَیں اس کا سبب نہیں جانتا تھا مگر مَیں ڈر گیا اور جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بستر سے اُٹھی۔ مگر ابھی تک اس کی نگاہ نہایت ثابت قدمی سے مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ مَیں کانپ گیا۔ استرا میرے ہاتھ میں تھا۔ مگر مَیں ہل نہیں سکتا تھا۔ وہ دروازے کی طرف جانے لگی۔ جب وہ اس کے نزدیک پہنچ گئی اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور اپنی نگاہ بھی ہٹا لی۔ بس سحر ٹوٹ گیا۔ مَیں آگے کو لپکا۔ اور اس کے بازو کو زور سے پکڑ لیا۔ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ بیہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔ اب مَیں اُسے بغیر کسی مزاحمت کے قتل کر سکتا تھا۔ مگر تمام گھر میں خبر ہو چکی تھی۔ اور مَیں نے نوکروں کے پاؤں کی چاپ سیڑھیوں پر سُنی۔ مَیں نے اُسترے کو اس کی اصلی جگہ بند کر دیا۔ اور دروازے کو کھول کر اونچی آواز سے مدد طلب کی۔

لوگ آئے اور اُسے اُٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ وہ گھنٹوں بالکل مردہ پڑی رہی۔ اور جب سانس واپس آنے لگا اس کے ہوش و حواس رخصت ہو چکے تھے۔ اور وہ غضبناک کلمات میں ہذیان بک رہی تھی۔

ڈاکٹر بلائے گئے۔ جو اپنی امارت کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی گاڑیوں میں عمدہ عمدہ گھوڑوں اور اچھے اچھے لباس پہن کر آئے۔ وہ اس کا علاج ہفتوں کرتے رہے۔ اُنھوں نے ایک میٹنگ کی اور دوسرے کمرے میں آہستہ آہستہ آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ ایک نے جو ان سب میں سے زیادہ چالاک تھا۔ اور زیادہ مشہور تھا۔ مجھے علیحدہ طلب کر کے کہا۔ کہ بری سے بُری خبر سننے کو تیار ہو جاؤ۔ اور پھر مجھے ایک دیوانے کو بتلایا کہ میری بیوی دیوانی ہو گئی ہے۔ وہ ایک کھلی کھڑکی کے سامنے میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اور اس کی آنکھیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اس کا ہاتھ میرے بازو پر پڑا تھا۔ ایک کوشش سے مَیں اُسے اُٹھا کر نیچے بازار میں گرا سکتا تھا۔ اور یہ ایک بیمثال مذاق ہوتا۔ مگر اس سے میرے راز کے افشا ہو جانے کا ڈر

تھا۔ اس لئے میں نے اُسے جانے دیا۔ کچھ دن بعد اُنہوں نے مجھے کہا۔ اس کو پابندی میں رکھنا چاہیئے۔ اور اس کیلئے ایک محافظ ملازم رکھنی چاہیئے۔ میں ! میں کھلے کھیتوں میں نکل گیا۔ جہاں مجھے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور اتنا ہنسا کہ ہوا میں میری ایک وحشیانہ گونج پیدا ہو گئی۔

دوسرے دن وہ مر گئی۔ اس کا ضعیف باپ اسے قبر تک پہنچانے گیا۔ اور مغرور بھائیوں نے اس کی بے جان لاش پر ریاکاری کے آنسو بہائے۔ جنہوں نے اسکی زندگی میں اس کی تکالیف کو نہایت ٹھنڈے دل سے برداشت کیا تھا۔ یہ سارا کھیل میرے واسطے خوشی کا سامان تھا اور میں اپنے سفید رومال کے نیچے جو میں نے اپنے منہ پر رکھا ہوا تھا آتی دفعہ اس قدر ہنسا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے

اگرچہ میں اپنی تدابیر میں کامیاب ہوا۔ اور اُسے مار ڈالا۔ مگر میں بیچین اور بیقرار سا رہا کرتا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب زیادہ دیر تک میرا راز پوشیدہ نہیں رہ سکتا میں اس وحشیانہ خوشی کو نہیں روک سکتا تھا۔ جو میرے اندر جوش مارا کرتی تھی۔ اور میں تنہائی میں ہنسنے اور تالیاں بجانے لگتا تھا۔

جب میں باہر نکلتا اور لوگوں کو کاروبار میں مصروف ان کو تتربتر جاتے دیکھتا موسیقی کے نغمے سنتا۔ ان کے رقص پر نظر دوڑاتا تو میں اتنی خوشی محسوس کرتا تھا کہ بمشکل ان میں کود پڑنے اور ہر ایک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے روک سکتا تھا۔ میں دانت پیس کر زمین پر پاؤں مار کر رہ جاتا۔ اور اپنے ناخن اپنی ہتھیلیوں میں گاڑ دیتا۔ یہاں تک کہ گوشت میں سے خون جاری ہو جاتا۔ مگر میں اس جوش کو تھامے رکھتا اور ابھی تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں پاگل ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ یہ آخری بات ہے جو مجھے یاد پڑتی ہے۔ کیونکہ اب واقعات کو میں توہمات سے ملا دیتا ہوں اور چونکہ مجھے فرصت نہیں۔ اس لئے ان کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ان کے دہشت کھائے ہوئے چہرے مجھے ابھی تک دکھائی دیتے ہیں۔ اور میں اس سہولیت کو محسوس کرتا ہوں۔ جس سے میں نے انکو اٹھا کر دے مارا تھا اور ان کے سفید چہروں پر مکوں کی بارش کر دی تھی۔ اور پھر ہوا کی طرح وہاں سے بھاگا تھا۔ اور ان کو چیخنا چلانا پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

جب میں اس ہنگامے کا خیال کرتا ہوں مجھ میں ایک دیو کی سی قوت آجاتی ہے۔ اور رگوں میں ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔

دیکھو میں اس لوہے کی سلاخ کو اپنی غضبناک قوت سے کس طرح دوہرا کر دیتا ہوں۔ میں اس کو ایک نرم شاخ کی طرح توڑ کر علیحدہ کر دیتا۔ مگر چونکہ یہاں بہت سی لمبی لمبی تاریک گلیاں ہیں۔ اور میں نہیں خیال کرتا کہ میں ان میں

اپنا راستہ پا لونگا اور اگر راستہ مل بھی جائے تو میں جانتا ہوں کہ نیچے لوہے کے مضبوط دروازے ہیں۔ جو ہر وقت بند اور مقفل رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں کسقدر چالاک دیوانہ تھا اور وہ مجھے اس جگہ نمائش کے طور پر رکھنے پر نازاں ہیں۔

مجھے سوچنے دو۔ ہاں ہاں!! مجھے یاد آگیا۔ ٹھیک! میں باہر گیا ہوا تھا۔ جب میں گھر پہنچا۔ رات کافی آ چکی تھی۔ اور میں نے وہاں ان تین بھائیوں میں سے سب سے زیادہ مغرور بھائی کو وہاں پایا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے ایک ضروری کام ہے۔ میں اسے خوب یاد رکھتا ہوں۔ میں اس شخص سے ایک مجنون کی تمام قوت سے نفرت کرتا تھا کئی دفعہ میں نے چاہا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں مگر میرا راز مانع تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اوپر ہے۔ میں جلدی سے اوپر بھاگا۔ اسے مجھے چند الفاظ کہنے تھے۔ اس نے نوکروں کو بتایا تھا میں نے ان کو چلے جانے کا حکم دیا۔

کافی وقت گزر چکا تھا اور میں پہلی دفعہ اس کے ساتھ تنہا تھا۔

اول اول میں احتیاطاً اپنی آنکھوں کو اس سے دور رکھتا تھا کیونکہ مجھے اس بات کا علم تھا جس کا اسے گمان تک بھی نہ تھا۔ اور اس علم سے میں بہت خوش ہوتا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری آنکھوں سے دیوانگی کی چمک آگ کی طرح عیاں تھی۔

کچھ منٹوں تک خاموشی طاری رہی۔ آخر اس نے کہا کہ تمہاری حال کی اوباشی جسکے تم میری بہن کی وفات کے بعد مرتکب ہوتے ہو۔ میری مردہ بہن کی یاد کے لئے ہتک ہے اور ساتھ ہی چند واقعات جن کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ کہ آیا اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ تم نے میری مردہ بہن سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا اس کا گمان ٹھیک ہے۔ کہ میں اپنی باتوں اور حرکات سے اپنی مردہ بیوی اور اس کے خاندان کی توہین کرنا چاہتا تھا۔

یہ اس کی فوجی پوشاک کی وجہ سے تھا کہ وہ مجھ سے ان باتوں کا جواب طلب کرنے کی جرات کر سکا۔ یہ آدمی فوج میں ایک معمولی افسر تھا۔ اور یہ عہدہ اسے میری دولت اور اس کی مردہ بہن کی بدولت دستیاب ہوا تھا۔

یہ وہ آدمی تھا جو ان تدبیروں اور منصوبوں کا بانی مبانی تھا۔ جو میری دولت کو میری بیوی کے ذریعے سے ان تک پہنچا دیتیں۔ یہی وہ شخص تھا۔ جو اپنی بہن کو میرے ساتھ شادی پر مجبور کرنے پر سب سے زیادہ کوشاں تھا۔ اور جو اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ اس کی بہن کسی اور کے دام محبت میں گرفتار ہے اس وقت وہ اپنی فوجی پوشاک کے بھروسے پر گفتگو کر رہا تھا۔ جو اس کی رذالت کی وجہ سے اور اس کے اخلاق کی قیمت سے اسے حاصل ہوئی تھی۔ میں نے اپنی نظر اس پر ڈالی۔ میں مجبور تھا۔ مگر میں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔

میں نے وہ فوری تعیّر دیکھا جو اس پر میری نظر سے واقع ہوا تھا۔ وہ ایک دلیر شخص تھا۔ مگر اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور اس نے کرسی پیچھے کر لی۔ میں نے اپنی کرسی کو کھینچ کر اس کے نزدیک کر لیا۔ میں ہنسا۔ میں اس وقت بہت خوش تھا میں نے اسے کانپتے اور جنون کو اپنے اندر بڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھ سے خوف کھانے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ تم اپنی بہن کو بہت چاہتے تھے جب وہ زندہ تھی بہت

وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور میں نے اسے کرسی کی پشت کو مضبوط پکڑتے ہوئے دیکھا۔ مگر وہ بولا نہیں میں نے کہا "بدمعاش کتے" آخر تم میرے ہاتھ آ گئے مجھے تمہاری تمام جھوٹی تدابیر کا پتہ چل گیا۔ تم نے اسے میرے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن اس کا دل کسی اور طرف تھا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں میں سب کچھ جانتا ہوں"

وہ یکایک کرسی پر سے کود پڑا اور کرسی کو دونوں ہاتھوں سے اُوپر اُٹھا مجھے پرے ہٹنے کو کہا۔ کیونکہ میں جوں جوں بولتا جاتا تھا احتیاطاً اس کے قریب ہوتا جاتا تھا۔ میں بولنے کی بجائے چیخ رہا تھا۔ کیونکہ فتنہ انگیز جذبات میرے خون کے اندر جوش زن تھے۔ اور پرانے آسیب سرگوشیاں کرتے ہوئے مجھے مذاق کر رہے تھے۔ اور اس کے ناپاک دل کو سینہ چیر کر باہر نکال دینے پر برانگیختہ کر رہے تھے۔

"تجھ پر لعنت ہو" میں نے کھڑے ہو کر اس پر حملہ آور ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے قتل کر دیا۔ میں دیوانہ ہوں تجھے بھی مار ڈالونگا۔ خون! خون!! میں اسے ضرور بہاؤنگا۔" اس نے کرسی مجھ پر دے ماری۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر اس پر لپکا۔ اس کو دبوچ لیا۔ ہم دونوں فرش پر گر پڑے۔

یہ بہت عمدہ کشمکش تھی۔ کیونکہ وہ ایک لانبے قد کا طاقتور جوان تھا۔ اور اپنی زندگی کے لئے جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اور میں! میں ایک طاقتور دیوانہ جو اسکے خون کا پیاسا تھا۔ میں جانتا تھا۔ کہ کوئی طاقت مجھ سے مقابلہ نہیں کر سکتی اور میں درست کہتا تھا۔ میں درست کہتا تھا گو میں پاگل تھا۔ اس کی کوششیں کمزور ہوتی گئیں۔ میں نے اس کے سینہ پر گھٹنے رکھ کر گردن کو اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔ اور زور سے دبایا۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اور اس کی زبان منہ سے نکلی ہوئی دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ وہ مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔ میں نے اور مضبوطی سے دبایا۔

یکایک دروازہ ایک عظیم شور کے ساتھ کھل گیا اور لوگوں کا ہجوم دوسرے کو پکارتا ہوا اندر لپکا۔ دیوانے کو پکڑ لو، پکڑ لو۔ میرا راز طشت از بام ہو چکا تھا۔ اب میں نے اپنی تمام کوششیں اپنے آپ کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے

ہیں لگادیں۔ اس سے پیشتر کہ کوئی مجھے ہاتھ لگاتے میں کھڑا ہو چکا تھا۔ پھر حملہ آوروں پر جھک پڑنا ایک لمحہ کا کام تھا۔ میں اپنے طاقتور ہاتھوں سے راستہ صاف کرنے لگا۔ گویا میرے ہاتھ میں کلہاڑی ہو۔ میں نے انہیں اپنے سامنے سے ہٹادیا اور دروازہ تک پہنچ گیا۔ کٹہرے پر سے نیچے کود پڑا۔ چشم زدن میں میں سڑک پر تھا۔

میں ناک کی سیدھ میں تیز دوڑا۔ مجھے روکنے کی کسی نے جرأت نہ کی۔ میں نے لوگوں کے پاؤں کی آواز اپنے پیچھے سنی۔ اس لئے میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ آواز رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ کیونکہ فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ اور آخرکار بالکل بند ہو گئی۔ مگر میں بھاگتا رہا۔ ندیاں۔ دلدلیں۔ دیواریں۔ احاطے۔ جھاڑیاں پھاندتا اور طے کرتا گیا۔ میں وحشیانہ شور مچاتا بھاگا جا رہا تھا۔ وہ عجیب و غریب شکلیں جو مجھ پر چھائی ہوئی تھیں۔ میرے شور کو بڑھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہانتک کہ ہوا میری چیخوں سے معمور ہو گئی۔

میں بھوتوں اور شیطانوں کے بازوؤں پر جا رہا تھا۔ جو ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اور مجھے چکر دیتے ہوئے لیجا رہے تھے۔ حتیٰ کہ میرا سر چکرانے لگا۔ آخرکار انہوں نے بڑے زور سے مجھے زمین پر دے مارا۔ میں نے اپنے تئیں زمین پر گرتے ہوئے محسوس کیا۔ اور بس پھر اندھیرا ——

جب مجھے ہوش آیا تو میں یہاں اس پسندیدہ کمرے میں تھا جہاں سورج کی روشنی شاذ و نادر ہی آتی ہے۔ یہاں چاند کی شعاعیں کبھی کبھی بھولے بھٹکے آجاتی ہیں۔ جن سے میں کمرے کے تاریک کونے دیکھ سکتا ہوں۔ اور ساتھ ہی وہ سفید شکل جو کونے میں بے حرکت کھڑی رہتی ہے۔

جب میں لیٹا ہوا ہوتا ہوں تو کبھی کبھی عجیب چیخ پکار سنتا ہوں۔ جو اس عظیم الشان محل کے دوسرے حصوں سے آتی ہوگی۔ نہ تو وہ اس خاموش مورت سے آتی ہے اور نہ ہی ان سے کوئی تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ شام کی تاریکی سے لیکر صبح کی پہلی شعاع تک وہ ساکت کھڑی میری زنجیروں کی موسیقی سنا کرتی ہے میرا رقص دیکھا کرتی ہے۔ جو میں گھاس پر کیا کرتا ہوں لیکن آوازیں! یہ میں نہیں جانتا۔

(ترجمہ) **فیاض الدین احمد**

دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا
دل مجھے اس گلی میں لے جاکر — اور بھی خاک میں ملا لایا
اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر — پھر ملیں گے اگر خدا لایا (میر)

جوشِ بہار

مستوں پہ انگلیاں نہ اُٹھاؤ بہار میں — دیکھو تو ہوش ہے بھی کسی ہوشیار میں
اب وہ سکونِ یاس نہ وہ اضطرابِ شوق — سینے میں دل ہے یا کوئی لاشہ مزار میں
کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ — پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں
وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی — دونوں جہاں ہیں آج میرے اختیار میں
اب خاک اُڑائیے نہ ہمارے مزار کی — اب خاک بھی نہیں ہے ہمارے مزار میں
جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ — جاؤ کہ تم نہیں ہو میرے اختیار میں
یوں وادیِ حیات اسی طرح سست گام — جیسے ہو پا شکستہ کوئی خارزار میں
تنہائیِ فراق میں امید بارہا — گم ہو گئی سکوت کے ہنگامہ زار میں
اللہ! بات کیا ہے کہ دیوانگی مری — دیوانگی نہیں نگہِ ہوشیار میں

وہ عندلیبِ گلشنِ معنی ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

ابوالاثر حفیظ

محشرِ سوز و ساز

آج تو ہر طرف بپا محشرِ سوز و ساز ہو — مطربِ خوشنوائے عشق عمر تری دراز ہو
دل میں خیالِ دوست ہو مستیِ سوز و ساز ہو — اس سے بھی اور بڑھ کے کیا شیخ مری نماز ہو
شوقِ نظارہ میں ترے دل ہے جہانِ اضطراب — شعلۂ طور بن کے آج بزم میں جلوہ ساز ہو
آتشِ اشتیاق سے پھونک دے عقل و ہوش سب — پیروِ مسلکِ ہوس عشق سے سرفراز ہو
دل سے خودی تو مٹ گئی توڑ دے یہ طلسم بھی — کہہ دے انا الحبیب اور پردہ کشائے راز ہو
دل سے مٹا دے امتیاز آج تو حسن و عشق کا — اتنا نیاز مند بن ان سے بھی بے نیاز ہو
شارق مدعا طلب تابہ کجا یہ غفلتیں — دیدۂ دل کو کر دے وا پردہ درِ مجاز ہو

شارق

مارِ آستین

خفیہ پولیس کے مشہور و معروف انسپکٹر شاہد حسین صاحب نے یوں تو اپنے دوران ملازمت میں بہت سے سنگین جرائم کی (جو راز سربستہ کی صورت میں تھے) اپنی اعلیٰ قابلیت سے دُنیا کے سامنے حقیقت ظاہر کی۔ مگر یہ واقعہ ایک خاص واقعہ ہے۔ جس کو اُن کی نوٹ بک کی تحریر کے مطابق لفظ بہ لفظ نقل کر کے ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اور اگر قدردانان 'ہزار داستان' نے اس کو پسند کیا۔ تو اور بھی دو چار واقعات وقتاً فوقتاً ہدیۂ ناظرین ہونگے۔

(۱)

برقعہ پوش دوشیزہ نے پُوری سنجیدگی کے ساتھ میرے روبرو یہ حکایت بیان کرنا شروع کی۔ جس کو مَیں بعینہٖ اسی کے الفاظ میں درج کرتا ہوں۔

آج صبح مختصر رسمی گفتگو کے بعد اُس نے کہنا شروع کیا "میرے چچا نواب ممتاز علی صاحب اپنی کوٹھی واقعہ ترکمان دروازہ۔ کمرہ آرامگاہ میں مردہ پائے گئے۔ اور نقدی کی تجوری جس میں اُن کی اور میرے ترکہ کی کثیر دولت معہ کاغذات کے بند تھی۔ بالکل کھلی خالی پڑی ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ نقب زن بدمعاشوں نے اُنہیں قتل کر دیا"۔

مَیں نے کہا۔ اچھا تو آپ یہ چاہتی ہیں کہ مَیں پولیس کو مدد دیکر قاتلوں کو گرفتار کراؤں اور گمشدہ رقم و کاغذات کا پتہ چلاؤں۔ کیا پولیس بالکل مجبور و قاصر ہے"۔

"نہیں۔ یہ بات تو نہیں۔ بلکہ افسر تفتیش کنندہ سردار سنجیت سنگھ کا زیادہ زور اس طرف ہے۔ کہ کسی شخص کو قاتل قرار دیکر گرفتار کر لیا جائے۔ نہ یہ کہ میری گمشدہ دولت یا کاغذات کا پتہ لگایا جائے۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ اس کے بعد اُس کا حال خود بخود معلوم ہو جائیگا۔ مگر مَیں اس کے خلاف ہوں اور اس وجہ سے آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں کہ آپ ایک علیحدہ تفتیش شروع کریں۔ جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ میرے قیمتی کاغذات اور گمشدہ دولت کا پتہ لگایا جائے"۔

"اچھا۔ تو کیا مَیں یہ سمجھوں کہ آپ کو قاتل یا قاتلوں کو سزا دلانے میں زیادہ دلچسپی نہیں"۔ مَیں نے پوچھا

"نہیں جناب" دوشیزہ نے بلا تامل جواب دیا "قتل کی سزا ملزم کو ضرور ملنی چاہیئے۔ . . . . مگر اس سے سوائے اس کے کہ میرے جذبۂ انتقام کی آگ فرو ہو جائے اور کیا نتیجہ

نکل سکتا ہے۔ ۔ میرے اطمینان کی چیزیں تو وہ کاغذات ہیں اگر چچا مرحوم زندہ ہوتے تو شاید میں انہیں کو ملزم قرار دیتی۔ کیونکہ اکثر مرتبہ انہوں نے میرے سامنے ان کاغذات کو تلف کر دینے کی دھمکی دی تھی"

"تو پھر ذرا معاملہ بہت صاف صاف بیان فرمائیے۔"

"میں خود عرض کرتی ہوں۔ چھ برس ہوتے۔ کہ میرے چچا کو میرا ولی مقرر کیا گیا۔ مگر اُن کا مزاج نہایت مراقی تھا یا کم از کم لوگوں نے انہیں پاگل اور مجنون سمجھ رکھا تھا۔ ان کی وفات نے گویا مجھے آزاد اور خود مختار کر دیا ہے۔ اور عنقریب میری شادی مسٹر نسیم بی۔ اے۔ بار ایٹ لا سے ہو جائیگی چھ مہینے کا عرصہ ہوا۔ ۔ ۔ ۔ کہ میری اٹھارھویں سالگرہ سے قبل چچا جان مسٹر موصوف سے یک بیک ناراض ہوگئے اور مجھے کہنے لگے کہ اگر تم نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے شادی منظور کی تو میں تمہارے ترکہ کے تمام کاغذات جلا دونگا اور تمہیں ایک حبہ نہ دونگا۔ چنانچہ اس دھمکی کو زیادہ باثر بنانے کے لئے انہوں نے بینک سے جملہ رقم کاغذات سمیت نکالکر اپنے قبضہ میں کرلی۔"

"آخر اس ناراضگی کی وجہ"

"میں خود آجتک نہ سمجھ سکی۔ مگر قیاساً عرض کرتی ہوں کہ میرے چچا صاحب نہایت ہی بد اخلاق اور خود غرض آدمی تھے۔ وہ عرصہ تک لکھنؤ میں رہے۔ اور اُن کی بد اخلاقی کا یہ اثر ہوا کہ وہاں کے طبقۂ امرا نے انہیں دیوانہ سمجھ کر ان سے قطع تعلق کر لیا۔ ان کا طرزِ عمل میرے ساتھ بھی نہایت وحشیانہ اور ناقابلِ برداشت تھا۔ مسٹر ۔ ۔ ۔ ۔ بی۔ اے ۔ ۔ ۔ ۔ میرے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔ ۔ ۔ اور میں بچپن ہی سے اُن سے منسوب ہوں۔ اب ماشاءاللہ وہ خود سمجھدار ہیں ... انہوں نے میری غیبت میں انہیں اس وحشیانہ طرزِ عمل سے باز رکھنے کی التجا کی۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ چچا جان سخت ناراض ہوئے۔ اور کہنے لگے۔ اس لونڈے نے میری سخت توہین کی۔ اور یہانتک بگڑے کہ پاگلوں کو مات کر دیا۔ میرا اور مسٹر ۔ ۔ ۔ بی۔ اے کا خیال ہے۔ کہ سب غصہ محض ظاہری تھا۔ اُن کا مقصد تو صرف اس شادی میں رکاوٹ ڈالنا تھا۔"

"کیا آپ کے چچا آپ ہی کے ترکہ سے زندگی بسر کرتے تھے؟"

"اس کا کوئی ثبوت تو میرے پاس نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ہاں انہیں اپنے ذاتی کاروبار میں ناقابلِ برداشت خسارہ ہو چکا تھا۔"

"تو آپ نے معاملات کو صاف کرنے کے لئے قانونی چارہ جوئی کیوں نہ کی۔"

"میں یہی ارادہ کر رہی تھی۔ کہ کل مسٹر بی۔ اے نے میری طرف سے عدالتی چارہ جوئی کے لئے پیروی کرنے کا

وعدہ کر لیا۔ مگر معاملہ بیحد نازک تھا۔ میرے چچا صاحب نے فرمایا۔ کہ اس معاملہ میں قانون بالکل بیکار۔ ناصر سے ضمانتی کاغذات سب صندوق میں بند میرے قبضہ میں ہیں۔ جب چاہو لے دوں۔ مسٹر ۔۔۔ بی۔ اے نے کہا۔ کہ جج خود حکم دیگا کہ تجوری کھلوائی جائے ۔۔ یہ سنکر چچا صاحب جامہ سے باہر ہو گئے۔ اور چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ اچھا تو میں دیکھ لونگا ۔۔ اب جبتک یہ نہ کر لوگے اس وقت تک میں کچھ نہ دونگا۔ تجوری خود کھلوانے والے کی زندگی کا خاتمہ کر دیگی۔ میری تجوری ایسی ویسی نہیں۔ اُنہوں نے ان الفاظ کو سینکڑوں مرتبہ دوہرایا۔ مسٹر موصوف اُسی وقت چلے گئے۔ اب میں نے انہیں ترکمان دروازہ میں ٹیلیفون کے ذریعہ سے اطلاع دیدی ہے کہ میں کس وقت واپس ہونگی۔"

"ہاں۔ تو آپ کو اس کے متعلق کوئی علم نہیں کہ نواب صاحب کے بار بار ان الفاظ کو دُہرانے کا کیا مطلب تھا۔ کہ میری تجوری ایسی ویسی نہیں۔"

"بالکل نہیں ۔۔۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ایک ہفتہ قبل ایک شخص اُن کے کمرہ میں کام پر بلایا گیا تھا۔ اور اُس نے بند کمرہ میں یقیناً اس تجوری کی مرمت کی۔ اب خدا معلوم اُس نے اُس میں کوئی خاص مشین لگا دی یا کیا کیا۔ میں کہہ نہیں سکتی اتنی بات میں نے آج صبح پولیس کے سامنے بھی ظاہر کر دی۔ مگر انہیں بھی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "یہ معاملہ عجیب ہے۔" کیا کسی ڈاکٹر نے نعش کا معائنہ کیا؟ اُس نے کچھ اپنی رائے ظاہر کی؟"

"صرف اتنی کہ موت واقع ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ مگر وہ موت کا سبب نہیں بتلا سکا۔ کیونکہ نہ تو بدن پر کوئی ضرب کا نشان ہے، نہ اور کوئی سمیت کے علامات۔ یہ صرف پولیس ہی کا خیال ہے کہ چچا جان کو قتل کیا گیا۔"

"یہ بات ہے۔ اچھا تو میں آپ کی طرف سے اسکی تحقیقات اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔ اور سردار رنجیت سنگھ جو راستہ اختیار کر رہے ہیں میں بالکل اس کے خلاف چلونگا۔ میرا خیال ہے کہ یہ آپ کے ولی ہی کی عنایت تھی۔ جو آپ اس وقت تک شادی نہ کر سکیں۔"

"ہاں مسٹر ۔۔۔ بی۔ اے کا خیال تھا کہ کہیں دیوانگی میں چچا جان اُن کاغذات کو تلف نہ کر دیں۔ اس لئے میری اور اُن کی متفقہ رائے ہوئی۔ کہ خاموشی کے ساتھ واقعات کی رفتار کا مشاہدہ کیا جائے۔ میں نے جناب سے تمام ضروری حال بیان کر دیا۔ اب آپ ہماری امداد کیجئے۔"

"بسر و چشم میں حاضر ہوں۔ اور اسی وقت آپ کے ہمراہ چلنے کو تیار ہوں۔"

(۲)

جب ہم لوگ ترکمان دروازہ پہنچے تو مکان میں داخل

ہوتے ہی ہماری پہلی ملاقات ایک سرو قد نوجوان سے ہوئی۔ جس کے چہرہ سے استقلال عیاں تھا۔ اور جس کا بایاں ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے رومال سے لٹکا ہوا تھا۔ نوجوان خاتون نے میرا تعارف کرایا۔ اور کہا۔ "آپ ہی مسٹر ... بی۔ اے ہیں۔" اور یکایک نوجوان سے محبت بھرے لہجہ میں پوچھنے لگی۔ کہ ہاتھ میں کیا ہوا۔

"کچھ نہیں"! نوجوان کہنے لگا۔ "صرف ذرا سی چوٹ آگئی ہے۔ یہ باتیں بعد میں ہوتی رہینگی۔"

نوجوان خاتون نے مجھ سے معافی چاہی۔ اور مجھے مرحوم کے کمرہ میں پہنچا کر واپس چلی گئی۔ یہاں مقامی پولیس کے انسپکٹر صاحب بھی موجود تھے۔

"جناب شاہد حسین صاحب" انسپکٹر صاحب کہنے لگے "یہ معاملہ بہت ہی عجیب ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب بھی یہاں موجود تھے۔ وہ کوئی رائے نہ دے سکے۔ آئیے آپ بھی ذرا نعش کو دیکھ لیجئے۔"

"ضرور۔ ضرور" میں نے جوابدیا۔

نعش کھڑکی کے نیچے بچھے ہوئے پلنگ پر پڑی تھی۔ انسپکٹر صاحب نے منہ سے کپڑا اٹھایا۔ تو معلوم ہوا کہ چہرہ بہت ہی بدنما ہو گیا تھا۔ اور ہونٹ اسقدر سمٹ گئے تھے کہ سارے دانت کھلے ہوئے تھے۔ ظاہرا معلوم ہوتا تھا کہ جان سخت اذیت کے ساتھ نکلی ہے۔ "زہر" میں نے یکدم زور سے کہا۔

"یہ تو اول ڈاکٹر صاحب نے بھی کہا" انسپکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "مگر چند نشانات کی وجہ سے تبدیل کرنی پڑی۔ اگر زہر خورانی کا شک ہوتا تو یقیناً بدن پر نیلاپن، خون کی سیاہی اور علامات تشنج وغیرہ کچھ تو معلوم ہوتے۔ میری سمجھ میں تو یہ ایک عجیب پُراسرار موت ہے"

"تو کیا لاش کا بخوبی معائنہ کیا جا چکا"

"بیشک نہایت غور و خوض کے ساتھ۔ سوائے بائیں ہاتھ پر ایک خراش کے سارے بدن پر کوئی نشان نہیں۔ ... پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ لیجئے۔ اب بتلائیے کیا کیا جائے۔"

میں نے بھی اس بائیں ہاتھ کو اٹھا کر آستین سرکائی۔ کلائی پر دو ذرا سے خون کے نشانات پیسہ برابر حلقہ کے اندر دکھائی دئے۔ میں نے خوردبین کا شیشہ لگا کر اُس کو بغور دیکھا۔ اور یکدم تجوری کی طرف مڑا جو دیوار میں بالکل قریب کھلی پڑی تھی۔ "آپ نے اس تجوری میں بھی کوئی خاص بات معلوم کی" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں" انسپکٹر صاحب نے کہا۔ "وہ باتیں میں نے بھی سنیں۔ جو مرحوم نے تجوری کی بابت کہی تھیں۔ مگر میرے خیال میں یہ بھی ایک معمولی تجوری ہے۔ بس اس میں پشت کی طرف دو سوراخ ضرور ہیں۔ ان کو حال ہی میں لوہا کٹوا کر بنوایا گیا ہے مگر یہ کیوں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔"

تجوری بڑی اور تین حصوں میں منقسم تھی۔ سب سے نیچے کے حصہ میں بہت سے چھوٹے خانے تھے۔ اور ان سب پر جالی لگی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے دو سوراخ نظر آرہے تھے۔ جب میں بالکل نزدیک ہوگیا۔ تو میں نے ایک عجیب بدبو محسوس کی۔ دو ایک مرتبہ سونگھ کر میں نے فوراً اپنی موٹی چھڑی اٹھائی۔

"آپ نے خیال کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی کچھوے کو بند کیا گیا ہو۔" انسپکٹر صاحب نے کہا۔

میں نے فوراً اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تجوری سے کچھ فاصلہ پر کھڑے ہوکر اسی چھڑی سے میں نے اس جالی کو ہٹایا۔ مگر اس میں سے کوئی بھی شے مردہ یا زندہ برآمد نہیں ہوئی۔ میں نے گھبراہٹ میں پھر ایک بار اس کلائی کے زخم کو بغور دیکھنا شروع کر دیا۔

"انسپکٹر صاحب کچھوا کمبخت یہاں کیا کرنے آئے گا" میں نے کہا۔ "بس یوں سمجھئے۔ کہ یہ سوراخ کسی موذی سانپ کو ہوا پہنچانے کے لئے کئے گئے ہیں۔"

"واللہ مجھے اس کا خیال تک نہ ہوا تھا۔"

میں مسکرایا اور کمرہ کے ہر گوشہ کو دیکھنے لگا۔ پلنگ کے نیچے۔ کرسیوں پر، میز۔ میز پوش۔ فرش۔ دری۔ ہر چیز کو دیکھ ڈالا۔ آخرکار میں پلنگ کے بچھونے کے قریب پہنچا۔ اور دو تین منٹ تک اسے غور سے دیکھتا رہا۔

"آپ نے اسے تو اس وقت تک نہیں چھوا۔ میں نے خیال کیا۔

"نہیں" انسپکٹر صاحب نے جواب دیا "میں نے اس کو ضروری نہیں سمجھا جس جگہ سے ہم نے نعش اٹھائی ہے وہ یہ ہے" گوشہ میں ایک سنگ مرمری مربع کی طرف اشارہ کرکے بتلایا۔

میں نے اسے بھی دیکھا۔ وہاں ایک برتن رکھا ہوا تھا۔

"خون"

"بیشک" انسپکٹر صاحب بولے۔ "ڈاکٹر صاحب نے بھی اس کا امتحان لیا۔ اور لیجئے۔ یہ بھی استرا دکھلا کر۔" یہ بہت پرانا ہے۔ اور بری طرح استعمال کیا گیا ہے۔ مگر تیز کافی ہے۔"

میں نے استرے کا بھی خوردبین سے معائنہ کرکے جیب میں رکھ لیا۔ دھار پر آرے کی طرح دندانے پڑے تھے۔ اور دو ایک خون کے نشانات بھی تھے میں اس عرصہ میں اس برتن پر پڑے ہوئے خون کو دیکھ رہا تھا۔

"انسپکٹر صاحب آپ کتنے تھے عجیب راز سربستہ ہے" میں نے کہا۔ "واقعی یہ ٹھیک ہے۔ بھلا اس خون کی اس جگہ کیا ضرورت تھی۔"

"سوائے اس کے کہ چوروں نے تجوری کھولنے کی کوشش کی اور کسی کا ہاتھ کٹ گیا۔"

"واللہ۔ کیا بات نکالی ہے۔ اجی حضرت چور ایسے

بیوقوف نہیں کہ اُسترا لیکر چوری کرنے چلیں۔ خیر آپ کو اس کی بھی کوئی علامت نظر آئی۔ کہ کوئی شخص باہر سے زبردستی اندر داخل ہوا ہو۔"

"جی کوئی نہیں"

"یہ تجوری پر کسی قسم کے آلہ کا نشان ہے"

"کوئی نہیں۔ غالباً وہ کنجی ہی سے کھولی گئی ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ اب آپ نے کیا نتیجہ نکالا؟"

"یہی۔ جو آپ خیال کرتے ہیں۔ چور یا چوروں کے پاس اس کی دوسری کنجی موجود تھی۔ میں نے یہاں کی دو ضعیف خادماؤں سے دریافت کیا۔ مگر انہیں اس کی بابت کوئی علم نہیں۔"

"بس ہماری تحقیقات کا یہیں پر خاتمہ ہونا ہے۔"

"ہاں بسر دست تو اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا۔ میں دو ایک سوالات نوجوان خاتون سے کیا چاہتا ہوں۔ براہ عنایت میری عدم موجودگی میں کسی کو کمرہ میں نہ آنے دیجئے گا۔ اور نہ بستر کے قریب جائیے گا۔ اور نہ اُسے ہاتھ لگائیے گا۔

(۳)

میں کمرے سے باہر نکلا۔ گھر کی ضعیفہ سامنے سے آتی دکھائی دی۔ پوچھا کہ خاتون کس کمرہ میں ہیں۔ اُس نے مجھے کمرہ بتلایا۔ میں جھپٹ کر وہاں پہنچا۔ اور خاتون سے سوال کیا۔

"کبھی آپ کو اس کا بھی شک ہوا۔ کہ تجوری میں کوئی زندہ شے بند کی جاتی تھی۔"

"نہیں تو" اُس نے عجیب حیرت سے جواب دیا۔

"اور اگر خادموں سے بھی میں یہی سوال کروں؟"

"بیشک! ضرور دریافت کیجئے۔" اور خاتون نے ملازموں کو آواز دی

سب سے قبل وہی ضعیفہ سامنے آئی۔ میں نے اُسی سوال کا اعادہ کیا۔

"جی ہاں' جناب" وہ کہنے لگی۔" نواب صاحب بعض اوقات گوندھے ہوئے آٹے کی ایک ٹکیہ سے جایا کرتے تھے۔ مگر میں بیچاری یہ سوال کیسے کر سکتی تھی کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے۔"

"علی ہذالقیاس" دوسری خادمہ کہنے لگی۔

"بس کافی ہے" میں نے کہا۔ "اب تم لوگ جاؤ۔"

بعد ازاں میں نے خاتون سے مخاطب ہو کر کہا۔

"انسپکٹر صاحب ابھی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ نہ تو کسی کے زبردستی اندر آنے کی کوئی علامت ہے۔ نہ بدن پر کسی ضرب کا نشان۔ میں نے خود اطمینان کر لیا ہے کہ تجوری کو زبردستی نہیں بلکہ کنجی سے کھولا گیا ہے۔ اب ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے خود تجوری کھولی۔ اور کاغذات نکالے۔ کہ اتنے میں گھر کا کوئی شخص یا ملاقاتی۔ میں نے

مسٹر . . . بی۔اے کی طرف نگاہ کی ... آگیا جس کے پاس تجوری کی دوسری چابی تھی۔میں نے اس کی بابت انسپکٹر سے سوال نہیں کیا۔"

میں رُک گیا اور مسٹر . . . بی۔اے پر غور سے نگاہ ڈالتا رہا کہ وہ کوئی جواب دیں۔

"بیشک میں گھر میں تو ضرور موجود تھا۔" نوجوان نے گھبرا کر کہا۔"مگر کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ میں ہی ۔ ۔ ۔" وہ کچھ آگے نہ کہہ سکا۔میں نے انگلی کے اشارہ سے کہا۔"کمرہ میں چلئے"

"کہتے جائیے۔" میں نے کہا۔"قاتل ہوں، کیوں صاحب آپ یہی کہنے والے تھے۔ ۔ ۔ یا" میں ہی نے تجوری کھولی۔" بہرحال آپ سمجھتے ہیں کہ" میں نے کہا۔"آپ کی انگلی میں ضرب ہے۔کیا میں یہ خیال نہیں کرسکتا کہ یہ کوئی ناگہانی چوٹ آئی۔"

مسٹر نسیم بی۔اے خاموش تھے کہ نوجوان خاتون نے جواب دیا۔

"بہت ممکن ہے کہ وہ کسی وجہ سے کھلی گئی ہو۔"

مجھے اس پر ہنسی آگئی۔

"میں مسٹر نسیم کو اس جرأت پر مبارکباد دیتا ہوں۔میرے ایک ملاقاتی نے صرف کہنی میں درد ہونے کی وجہ سے پورا ہاتھ تلوار سے خود کاٹ ڈالا تھا۔یہ ایک گاؤں کا واقعہ ہے جہاں قریب میں کوئی ڈاکٹر صاحب نہیں رہتے۔اس موقع پر تلوار نہ تھی اُسترہ سہی۔بہرحال بات وہی ہوئی۔وہاں ہاتھ کاٹا گیا تھا۔یہاں صرف انگلی پر جراحی کی گئی۔نسیم صاحب اجازت دیجئے کہ میں پھر ایک بار آپ کو آپ کی مردانگی پر مبارکباد دوں۔"

"آخر آپ نے کیا رائے قائم کی؟" نوجوان موصوف نے زرد ہو کر کہا۔

"یہ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔" میں نے عرض کیا۔" جناب میں نے خوب سمجھ لیا ہے۔اچھا آئیے مرحوم کے کمرہ میں چلئے خاتون صاحبہ آپ یہیں ہماری واپسی کا انتظار کریں۔"

(۴)

حوروش متوحش تھی۔اور ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ ہم لوگ جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گئے۔انسپکٹر صاحب جا چکے تھے۔ایک پولیس کا سپاہی دروازہ کی حفاظت کر رہا تھا۔اس نے بلا کسی مزاحمت کے ہم لوگوں کو کمرہ میں داخل ہو جانے دیا لیکن خود بدستور محافظت پر مامور رہا۔میں نے بستر پر ایک نظر ڈالی۔

"فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ اور ہاتھ دھونے کے طشت کی طرف بڑھا۔اور خون کے دھبے پر خوردبین رکھ کر مسٹر نسیم بی۔اے سے مخاطب ہوا۔غور کیجئے اور فرمائیے آپ نے کیا دیکھا۔"

ایک نظر کافی تھی۔

"میں ہر ایک بات نہایت وضاحت سے بیان کرسکتا

ہوں" نوجوان نے کہا۔ "نواب ممتاز علی صاحب مرحوم کے قتل میں میرا ذرا بھی ہاتھ نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا وہ صرف خاتون موصوف کی اعانت میں تھا۔"

"اس پر مجھے کامل یقین ہے۔" میں نے جواب دیا "یہ عجیب طرز کی مشابہت ہے۔ کہ مسٹر نسیم کی حال ہی میں ایک انگلی ضائع گئی ہے۔ اور قاتل کی بھی۔ جو اس نے اسی کمرہ میں اس استرے سے قطع کی ہے۔ جو آپکے صاحب موصوف کے قبضہ میں ہے۔

مگر۔۔۔۔ دیکھئے۔۔۔۔ وہ دیکھئے۔۔۔۔ نواب صاحب مرحوم کا قاتل آرام کی نیند سو رہا ہے۔ مسٹر نسیم کیا آپ از راہ مہربانی بتلا سکینگے کہ وہ کس قسم کا سانپ ہے؟"

"افسوس کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتلا سکتا۔" نوجوان نے کہا۔ "کیونکہ جس وقت اُس نے مجھے ڈسا تھا میں نے صرف اُس کی ایک جھلکی دیکھی تھی۔ علاوہ بریں جونہی میری نظر بینک کے نوٹوں اور ضروری کاغذات کے بنڈلوں پر پڑی میں نے فوراً انہیں نکال لیا۔ اور احتیاطاً ایک پٹی کلائی پر کسکر باندھ لی۔ تاہم یقینی طور پر اطمینان کی غرض سے جسقدر جلد مجھ سے ممکن ہو سکا میں نے اپنی انگلی قطع کر دی۔ جہانتک خیال ہے۔ سانپ گہرے سُرخ رنگ کا تھا۔ اور اُس کی پشت پر زردی مائل حلقے پڑے تھے۔"

"کیا کہا! گہرے سُرخ رنگ کا؟" میں نے گھبرا کر دریافت کیا۔ "یہ تو نہایت زہریلا پہاڑی سانپ ہے جس کے بارے میں سُنا گیا ہے۔ کہ بڑی احتیاط سے بھوٹان سے لایا جاتا ہے یہ بھی سُنا گیا ہے۔ کہ لوگ اس کو "سُرخ موت" کے نام سے پکارتے ہیں۔۔۔۔ اگر بدبختی سے یہ سانپ کسی شخص کو ڈس لیتا ہے۔ تو وہ آن واحد میں لقمۂ نہنگ اجل ہو جاتا ہے۔ اور غالباً بدقسمتی سے یہی حشر نواب صاحب مرحوم کا ہوا میرا خیال ہے کہ آپ تجوری بند کرنا بھول گئے تھے!"

نوجوان نے جواب دیا۔

"جی ہاں! جناب کا خیال بالکل صحیح ہے۔" میں آپ سے کل واقعہ بیان کر دوں گا۔ لیجئے۔ سُنئے۔ ہفتہ عشرہ سے میں اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس تجوری کی کنجی مل جائے تو میں خاتون مذکور کے کل ضروری کاغذات اور نوٹ بک وغیرہ نکالکر کسی محفوظ مقام پر پوشیدہ کر دوں۔ کل آپس میں سخت فساد برپا ہوا۔ نواب صاحب مرحوم جوش میں آکر کمرے سے باہر نکل گئے کنجی کا اُنہوں نے کچھ خیال نہیں کیا۔ وہ میز پر رکھی رہ گئی۔ موقعہ کو غنیمت سمجھ کر میں نے کنجی اُٹھالی۔ اور چلتا بنا۔ لیکن نواب صاحب مرحوم کو قریب دیکھ کر جلدی ہی واپس آگیا مجھے یقین کامل ہے کہ کسی شخص نے مجھے اُوپر جاتے یا کمرہ سے باہر آتے نہیں دیکھا۔ میں اس قدر عجلت اور گھبراہٹ میں تھا کہ تجوری بند کرنے کا خیال قطعی نہیں رہا۔" تجوری کو کھلا پاکر غالباً سانپ باہر نکل آیا اور گرم مقام کی تلاش میں بستر پر جا پہنچا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کُرسی بستر کے قریب پڑی ہے۔ اس لئے اُس کو بستر پر جانے ہیں کوئی دقت نہ تھی۔ نواب صاحب مرحوم اندر تشریف لائے۔ اور بلا تیوری کی طرف دیکھتے ہوئے پوشاک اُتارنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ بستر پر بیٹھ گئے۔ اور غالباً سانپ ہی پر بیٹھے اور اُس نے بائیں کلائی کے کچھ ہی اُوپر ڈس لیا۔ اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے اس دارِ محن سے رخصت ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ بہت بہتر ہو گا اگر سانپ کو جہاں وہ اس وقت پڑا ہے مار ڈالا جائے۔"

مسٹر نسیم نے قریب ہی پڑی ہوئی لوہے کی چھڑی اُٹھالی اور میں نے اپنا ڈنڈا سنبھالا۔ ہم دونوں نے سانپ پر کئی ضربیں لگائیں۔ اولاً کچھ دیر تک تو وہ بل کھاتا رہا بعد ازاں بالکل ساکت ہو گیا۔ میں نے شال ہٹایا تو ایک تین فٹ لمبا چمکدار گہرے سُرخ رنگ کا سانپ نظر پڑا جس کی پشت پر زردی مائل حلقے نمودار تھے۔ اب وہ بالکل مردہ تھا۔

میں نے کہا۔ "مسٹر نسیم آپ کو اختیار ہے جس قدر آپ مناسب سمجھیں پولیس سے اپنی سرگزشت بیان فرمائیے۔ لیکن میں اپنی ذاتی رائے اپنے ہی تک محدود رکھوں گا۔ ہاں یہ تو فرمائیے۔ وہ کاغذات اور نوٹوں کا بنڈل کہاں ہے جو آپ یہاں سے لے گئے؟"

"دیوان خاص کے گول میز کی دراز میں۔" نوجوان موصوف نے جواب دیا۔ "میرا قصد تھا کہ میں اُن کو بینک میں جمع کر دوں لیکن جب خاتون مذکور نے نواب صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر ٹیلیفون کے ذریعہ سے مجھے دی۔ تو میں نے اُن کو واپس لانا بہتر سمجھا۔" اب ہم لوگ اُس کمرہ کی طرف رجوع ہوئے جس میں دوشیزہ خاتون نہایت بے چینی سے ہم لوگوں کی منتظر تھی۔ آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ دوشیزہ خاتون نوجوان کے بیان کردہ قصّہ کو سُنکر کس درجہ متعجب ہوئی ہو گی اور خاصکر یہ معلوم کر کے کہ اُس کا پیارا اُس کے جان و مال کا مالک، اس بلائے ناگہانی سے کیسا بال بال بچ گیا ورنہ اُس کا بھی وہی حشر ہوتا جو نواب صاحب مرحوم کا ہوا۔ اُس نے خدائے وحدہٗ لاشریک کا سچے دل اور نہایت خلوص سے لاکھ لاکھ شکریہ ادا کیا۔

معاملہ کی تفتیش میں اس نوجوان کے تعلق کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹری معائنہ کی مدد سے افسرانِ انصاف نے نہایت آسانی سے حقیقت معلوم کر لی۔ کہ نواب ممتاز علی صاحب مرحوم کی وفات ایک زہریلے سانپ کے ڈسنے سے ظہور پذیر ہوئی جسکو مرحوم نے کسی بھوٹانی دوست سے حاصل کیا تھا۔

نواب صاحب مرحوم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد دوشیزہ کی شادی اُس کے خالہ زاد بھائی اور منگیتر مسٹر نسیم بی۔ اے بار ایٹ لا۔ کے ساتھ نہایت تزک و احتشام سے ہو گئی۔ اور یہ دونوں نہایت خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

سلیم

پریشان محبت

اے بیخودیٔ الفت! یہ جوشِ جنوں کب تک
آوارہ پھروں آخر با حالِ زبوں کب تک

رکھے گی مجھے فطرت مائلِ بجنوں کب تک
اے دورِ فلک! ہوگی تجدیدِ سکوں کب تک

کاشانۂ دل میرا ویرانۂ وحشت ہے
دنیائے محبت میں برباد رہوں کب تک

خاموش ہے اب آخر میرا دلِ فریادی
وہ اپنی کہے سب تک میں اس کی سنوں کب تک

تقدیر نہیں بنتی، تدبیر نہیں چلتی
تقدیر بنانے کی تدبیر کروں کب تک

کیوں سرد نہیں ہوتی یہ آگ محبت کی
سوزِ غمِ فرقت میں اللہ! جلوں کب تک

ملتی ہی نہیں مجھ کو کچھ دادِ جبیں سائی
سنگِ درِ جاناں پر سجدہ میں رہوں کب تک

سنتا ہی نہیں کوئی رودادِ شبِ فرقت
فریاد کروں کس سے، فریاد کروں کب تک

افسردۂ فرقت ہوں، ناکامِ محبت ہوں
جینے کا نہیں حاصل آخر میں جیوں کب تک

مایوسِ مسرت ہوں، مانوسِ اذیت ہوں
فریادِ خدا اے دل! ناشاد رہوں کب تک

بیہوشی و ہشیاری، اللہ یہ نیرنگی!
حیران ہوں میں ہوگی تکمیلِ جنوں کب تک

دل سیر ہے جینے سے، اب موت کی خواہش ہے
جینے کی تمنا میں اے راز مروں کب تک

راز چاندپوری

جو شخص تیری مبتسم آنکھوں کو دیکھ کر اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔ اس کی حالت بعینہ اس شخص سے مشابہ ہوتی ہے جو موسم گرما میں مطلع کو ابر آلود نہ پا کر اپنی مختصر سی کشتی بحرِ ناپیدا کنار میں ڈال دیتا ہے۔ (ٹامس مور)

کوئی بتائے وہ حسینہ کہاں ہے۔ جس کا دل خلوص کے ساتھ محبت کر سکتا ہو۔ تاکہ میں دنیا کو ترک کر کے اس کے قدموں پر سر رکھ دوں :-
اور اس حالت میں صرف ایک بار سانس لوں۔ (ٹامس مور)

پورن سنگھ ہنر

پریم ساگر

اُس کی فطرت عجیب تھی! میرے عظیم الشان محلات میں اس کی روح بیقرار رہتی تھی۔ میری شان و شوکت اُس کی نظروں میں نہ جچتی تھی۔ میرے لاتعداد خزانوں کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور میرے عیش و عشرت کی رنگینیوں میں اُس کے لئے کوئی دلکشی نہ تھی۔ آہ میں پاپی اُس کا باپ بننے کے قابل نہ تھا! اے میرے چاند، اے میرے چاند، اے میرے سورج، تو کہاں چھپ گیا؟ میری زندگی کی طویل رات تجھ بن کیسے گذریگی؟"

شام کا گلابی دھندلکا آسمان کی نیلگوں وسعتوں، پہاڑوں کی گلپوش چوٹیوں اور دریا کی پرسکون سطح پر رنگ افشانی کرتا ہوا پھیل رہا تھا۔ کہ یہ الفاظ ایک دھیمی سی گونج پیدا کر کے فضا کی اداس خاموشی میں جذب ہو گئے۔

آج سے کئی سو سال قبل شمالی ہند میں پرتاب گڑھ نام کا ایک شہر آباد تھا۔ اُس کے درمیان ایک دریا تھا جو موسموں کے تغیر و تبدل سے بے نیاز ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ اُس کا پانی صاف اور شیریں تھا۔ اور اُس کے دونوں کناروں پر سدابہار درخت اپنی پھولوں بھری شاخیں جھکائے رہتے تھے کہیں کہیں سرسبز ٹیلے بھی تھے۔ جن کا پانی آب حیات اور ہوا بادِ فردوس تھی۔ شہر کیا تھا۔ گویا جنّت آسمان سے اُتر کر زمین پر آگئی تھی۔ بڑے بڑے باغات تھے۔ جہاں سنگِ مرمر کے حوضوں میں چاندی کے فوّاروں سے عطر کے قطرے اُچھلتے تھے۔ طاؤس اپنے زرّیں پر پھیلا کر ناچتے تھے۔ خوشرنگ پرندے والہانہ انداز میں مسرت کے زمزمے گاتے تھے۔ خوبصورت پھول خمارِ حسن سے جھومتے تھے وہ حُسن کی لطافتوں اور محبت کی زمزمہ سنجیوں کا ایک دلفریب مجموعہ تھا۔

جب جنّت کا نام لیا جاتا ہے تو اعراف اور جہنّم بھی ایک ساتھ دماغ میں پھر جاتے ہیں۔ اس جنّت کا یہ امتیاز تھا کہ وہاں کوئی اعراف نہ تھا۔ ہاں ایک خوفناک اور مہیب جہنم ضرور تھا۔ دریا کے دونوں کنارے عشرت کی فراوانیوں سے معمور تھے۔ مگر چند میل کے فاصلے پر عجیب بستیاں آباد تھیں۔ بے ترتیب جھونپڑیاں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ جو دھوئیں کی سیاہی سے بھیانک سی معلوم ہوتی تھیں۔ جھونپڑیوں کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کے رہنے والے میل کچیل کو بہت پسند کرتے ہیں۔

جھونپڑیوں پر منوں مٹی، غلیظ کپڑے، میلے کچیلے برتن، گدلا پانی یہانتک کہ ان لوگوں کے بدن بھی انسانی گوشت پوست کے نہیں بلکہ میل ہی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ مٹی کھودتے اور پتھر توڑتے تھے۔ اور ان میں زیادہ شریف النسب زمین جوتتے تھے۔ ان کو چوبیس گھنٹوں میں بیس گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اور جب وہ سوتے بھی تھے۔ تو خواب میں اپنے افسر کے چابک کی ضرب سے چلا کر چونک پڑتے تھے۔ اُن کی عورتیں اپنے بچوں کو پیٹھ پر باندھ کر دن بھر کام کرتی تھیں۔ اور رات کو وہ بھی ایک ایسی ہی بے آرام نیند سویا کرتی تھیں۔ یہ تھی اُن کی زندگی۔ مگر وہ اسی حال میں مست تھے۔ امیر ہونا اور بات ہے۔ اور خوش ہونا اور بات۔ غریبی انسان کی زندگی کو تباہ نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ چاہے کتنے ہی بُرے حالوں بسر کرتے تھے لیکن اُن کے دلوں میں بھی مسرت موجزن تھی۔ وہ بھی بعض بعض باتوں سے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ صبح کے وقت جب یہ سب لوگ قطار در قطار عبادتگاہ کی طرف جاتے تو اُن کے دل بھی کئی معصوم آرزوؤں سے معمور ہوتے تھے۔ راجہ بکرم اپنے سنگھاسن پر شاہانہ تمکنت سے بیٹھا ہوتا۔ اور یہ لوگ اُس کے سامنے سجدے میں جھک جاتے۔ جب سجدہ ختم ہو جاتا تو وہ اپنے گھروں کو لوٹتے اور تمام راستہ اسی دلچسپ بحث میں طے ہو جاتا۔ کہ راجہ نے کس کی جانب دیکھا۔ ہر شخص راجہ کی نگاہ غلط انداز کو اپنی ہی جانب منسوب کرتا۔ وہ پھر کام کاج میں منہمک ہو جاتے اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ صرف اسی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور یہی پرمیشور کی مرضی ہے۔

(۲)

پرتاپ گڑھ راجہ بکرم کی وسیع سلطنت کا دارالخلافہ تھا اُس کی سطوت و جبروت کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی تھی سلطنتیں اس کے نام سے کانپ اٹھتی تھیں اور راجاؤں کے دل اس کے خیال سے دہل جاتے تھے اردگرد کی تمام راجدھانیاں اُس کی باجگذار تھیں اور ہر سال اُس کے خزانے خراج کے تحائف سے معمور ہو جاتے تھے۔ راجہ نہیں سمجھتا تھا کہ ان خزانوں کو کیا کرے۔ بالآخر وہ بازو جو کبھی تیر اندازی اور شمشیر زنی میں شہرۂ آفاق تھے۔ ساغر و مینا اٹھانے میں مصروف ہو گئے وہ دل جو کبھی میدان کارزار میں جنگی باجوں کی گونج پر ناچتا تھا۔ ساز طرب کی نرم اور ہلکی آوازوں میں فنا ہونے لگا۔ وہ آنکھیں جو کبھی جنگ کے خوفناک مناظر دیکھنے کی مشتاق تھیں۔ گلہائے عارضی کی پتیوں پر پھسلنے لگیں۔ اب وہ عیاش تھا۔ بادہ نوش تھا وہ شیطنت کا مجسمہ تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد نفس پرستی تھا۔ نیکی اور بدی اُس کے فرہنگ اخلاق میں یکسر مہمل الفاظ تھے۔

یوراج پریم ساگر کی سولہویں سالگرہ تھی تمام شہر خوشی

کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ زرق برق پوشاکیں حسن و جمال کے بہترین نمونے اور کوچہ و بازار کی آرائش قوس قزح کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ لوگ اس طرح جوق در جوق آ رہے تھے گویا سیلاب مسرت امڈا چلا آتا ہے۔ جس طرح سمندر کی موجیں اُٹھ اُٹھ کر ایک دوسرے میں جذب ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک ہجوم دوسرے ہجوم میں مدغم ہو رہا تھا۔ وسیع میدان میں کئی شامیانے ایستادہ تھے۔ عین وسط میں ایک زرنگار شامیانے کے نیچے بلند اور جواہر نگار تخت پر مہاراجہ بکرم اور یوراج پریم ساگر جلوہ افروز تھے۔ پریم ساگر فی الحقیقت محبت کا سمندر تھا۔ اُس کا چہرہ خندۂ صبح کی طرح پاکیزہ اور روشن تھا۔ جہاں دو ستارے محبت کا نور برسا رہے تھے اُس کا سڈول اور طاقتور جسم اس کی پاکبازی کا ثبوت تھا۔ اس شورِ محشر کے ہنگاموں میں اُس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ہجوم کی ایک نہ دوسری لہر کو دھکیل رہی تھی۔ اور افسروں کے تازیانے اس طوفان کے آگے تنکوں کی طرح بہے جاتے تھے۔ تازیانوں پہ تازیانے برستے تھے مگر مشتاقانِ دیدار کی روک تھام نہیں ہو سکتی تھی۔ کتنے ہی زخمی ہوئے کئی ایک کو چوٹیں آئیں اور کئی ایسے کچلے گئے کہ وہیں جاں بحق ہو گئے۔

"کیا یہ سب شور و شغب میرے لئے ہے۔ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر کیا یہ مجھی کو دیکھنے آتے ہیں۔ میرا سر اس تاج کے بوجھ سے کس قدر مصیبت میں ہے۔ یہ بھاری بھرکم زیورات یہ زرق برق پوشاک۔ آہ! میری رُوح کس قدر دبی جاتی ہے۔ کیا کبھی انہیں تماشائیوں کی طرح ایک انسان ہوں تو پھر مجھ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے کیوں اتنی جانیں تلف ہو رہی ہیں۔ میں گرفتار ہوں۔ میری رُوح گرفتار ہے میں ان زنجیروں کو توڑ ڈالونگا" یہ تھے وہ جذبات و خیالات جو یوراج کے سینہ و دماغ میں متلاطم تھے۔

شور و غل کا سمندر طوفان بدوش تھا کہ یکایک فضا میں ایک یاس انگیز صدا اٹھی۔ اور اردگرد کے مجمع پر سکوت بن کر چھا گئی۔ ایک لمحہ کے بعد پھر وہی صدا اُٹھی اور یوراج کے کانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی اُس کے دل میں بیٹھ گئی۔ یوراج تڑپ کر اُٹھا اور راستے کو صاف کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا۔ مہاراج غصے سے کف در دہاں تھے اُمراء و وزراء حیرت و استعجاب سے دانتوں میں انگلی دبائے کھڑے تھے۔ تماشائی خوف و ہراس سے حواس باختہ تھے ایک غریب اور معصوم لڑکی بیہوشی کے عالم میں فرشِ خاک پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے پھٹے پُرانے مگر آج کے لئے دُھلے ہوئے کپڑے اُس کی عریانی کو پورے طور پر ڈھانپنے سے قاصر تھے۔ وہ بھی شاید یوراج کو ایک نظر دیکھنے کے لئے آئی تھی۔ اُس کی خاموش آنکھیں محبت اور عقیدت کی داستان کہہ رہی تھیں۔ بکھرے ہوئے بال چاند سا چہرہ کمسنی اور

بھولاپن۔ وہ معصومیت کی دیوی تھی۔ اس کی پیشانی پر خون کی ایک لکیر پھیلی ہوئی تھی۔ گویا سورج کی پہلی کرن حور صبح کا بوسہ لے رہی ہے۔" پہلے جنم میں میں نے کونسا پاپ کیا تھا۔ جو اس جنم میں مجھے مہاراجہ کے ہاں پیدا کر دیا۔ اس تمام پاپ کا خون میری گردن پر ہے۔" یہ کہکر یوراج نے اپنا خوبصورت ریشمی رومال نکال کر اُس کی پیشانی پر باندھ دیا۔ اور اُس کے تلووں کو سہلانا شروع کر دیا۔

مہاراجہ صاحب پہلے ہی چراغ پا ہو رہے تھے۔ اب اُن کے جوش غضب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انھوں نے محفل برخاست کرنے کا حکم دیا اور یوراج کو ساتھ لیکر اپنے محل کی طرف چل دیے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف قدم اُٹھانے لگے۔ ہر شخص اس واقعہ سے کم و بیش متاثر تھا۔ کسی نے یوراج کی نیکدلی ثابت کی اور کسی نے اُس کو بچپن سمجھ کر رد کر دیا۔

(۳)

"تو نے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ بھری محفل میں تو نے وہ کام کیا۔ جس کو دیکھ کر تمام شرفا ششدر رہ گئے۔ تو کسقدر ذلیل اور کمینہ ہے۔"

مہاراجہ بکرم نے یوراج کو علیحدہ کمرے میں لیجا کر کہا۔

پریم ساگر کی آنکھیں نمناک تھیں۔ اُس کی گردن ادب سے جھکی ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"تو نے چنڈالوں کا سا کام کیا۔ تو نے تمام خاندانی شرافت کو بٹہ لگا دیا ہے۔ تو ایک ذلیل غلام لڑکی پر فریفتہ ہے۔"

اس اتہام نے یوراج کی مہر سکوت کو توڑ دیا۔

"یہ اتہام ہے پیارے پتا جی۔ یہ سراسر اتہام ہے میں اس پر کبھی فریفتہ نہیں ہوں۔ مگر کیا کسی کی جان بچانا گناہ ہے؟"

"چل دُور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جا۔ تیری زبان گُدی سے کھنچوا دونگا۔ اگر پھر تیری زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکلا۔ ہمارے گھر میں مہاتما بدھ کی رُوح نازل ہو رہی ہے۔"

"مگر کیا مہاتما بدھ ایسے ہی ناپاک تھے جو آپ اُن کی رُوح کے نزول کو شگون بد سمجھتے ہیں۔ مہاراجہ بکرم اب جامے سے باہر ہو گیا۔ جوش غضب نے اُس کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اُس نے کڑک کر کہا۔ "دُور ہو جا۔ میری آنکھیں تجھے دیکھنے سے بیزار ہیں۔ جا میدانوں اور جنگلوں میں جہاں سانپ تیرا خون پی جائیں۔ اور جہاں درندے تیری ایک ایک ہڈی کو چبا جائیں۔ میری وسیع سلطنت میں تیرے لئے کوئی پناہ نہیں ہے۔"

مہاراج نے پریم ساگر کو بازو سے پکڑ کر باہر دھکیل دیا۔ اور شام کی چھپاتی ہوئی تاریکی کے حوالے کر دیا۔

پریم ساگر کی ماں مدت سے پیوند خاک ہو چکی تھی۔ اُس کی تصویر اب اس کی

آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ وہ اُس کی یاد میں پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ فقیرانہ کمل اوڑھ کر وہ دریا کے کنارے کنارے چلا گیا۔ تاریکی کے سناٹوں میں اُسے یہی آواز سنائی دیتی تھی۔ کہ تو راہ راست پر ہے۔ دریا کی لہریں گنگناتی چلی جاتی تھیں اور اسکو صاف سنائی دیتا تھا۔ کہ تو راہ راست پر ہے۔ ستارے آج زیادہ پاکیزہ اور روشن نظر آتے تھے۔ وہ بھی عالم رقص میں یہی گاتے تھے "پریم ساگر تو راہ راست پر ہے۔" اسکی ماں کی پُراطمینان تصویر بھی اسے یہی کہتی سنائی دیتی تھی۔ "اے مملکت محبت کے بادشاہ تو راہ راست پر ہے۔"

وہ چلتے چلتے تھک گیا۔ اور آخر ایک درخت کے تلے بازوؤں کا تکیہ بنا کر سو گیا۔ خواب میں اُس نے دیکھا۔ کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک بلند ٹیلے پر سیر کر رہا ہے تھوڑے فاصلے پر ایک وسیع باغ ہے۔ جو محبت اور خوشی کے نعروں سے معمور ہے۔ وہاں پھولوں کی فراوانی سے روشوں پر تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ خاردار جھاڑیوں کا نام و نشان بھی نہیں پرندے پھولوں کو لپٹ لپٹ کر چومتے ہیں۔ اور فرطِ محبت سے نغمہ سرا ہیں۔ کیونکہ وہاں دام صیاد ناپید ہے۔ پریم ساگر کی ماں نے اُس کے شانے کو ہلا کر کہا تو اس کا باغبان ہے مگر یاد رکھ کہ یہ پھول عجز و محبت کے جھونکوں سے شگفتہ ہوتے ہیں۔ کبر و نخوت کا سانس اُن کے لئے بادِ سموم ہے۔"

پریم ساگر نے اپنی ماتا کے چرنوں میں گر کر کہا۔ "میں ایسا ہی مالی بن کر رہونگا۔"

اُس کی ماں نے اُس کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔

"اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک اب اِس باغ کا راستہ بھی دیکھ لے۔ دیکھ وہ ٹیلے کسقدر ہیبتناک ہیں۔ وہاں بڑے بڑے تاریک غار ہیں۔ جن میں بچھو اور درندے رہتے ہیں۔ اُن جھاڑیوں میں زہریلے سانپ ہیں۔ اس سفر میں دُور دُور تک پانی نایاب ہے۔" پریم ساگر کا دل بیٹھ گیا اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "ماتا کیا مجھے اکیلے ہی جانا ہوگا۔"

"ہاں مجھے اکیلے ہی جانا ہوگا۔ کیونکہ اس باغ کے مالک کا یہی فیصلہ ہے کہ صرف وہی شخص اس کا باغبان ہو سکتا ہے۔ جو اکیلا اس سفر کو طے کرے۔ یہ شرط نہایت عجیب ہے مگر اُس کے فیصلے پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔ دیکھ میرے پیارے پریم میں تجھ کو ایک راز کی بات بتاتی ہوں ——"

وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ پریم ساگر کی آنکھ کھل گئی۔

"ایک پریشان خواب تھا۔ رات کی تاریکی کسقدر گہری ہے۔ فطرت خواب استراحت میں محو ہوا خاموش، درخت خاموش، دریا کی موجیں خاموش، پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں خاموش ہیں۔ مگر میری رُوح کیوں بیقرار ہے؟" اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ مگر خواب کے عہد و پیمان اُسکو

یاد آ گئے۔ اور وہ کھیر جی کڑا کرکے اسی حالت میں چل دیا۔

(۴)

"آہ میں اُسے ایک نظر بھی نہ دیکھ سکی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے میری پیشانی پر اپنا رومال باندھا تھا۔ اُس نے رومال کو آنکھوں پر رکھ کر چوم لیا۔" "اُس نے میرے تلوے سہلائے۔ اُف ــ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لوگ غلط کہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ چاند زمین کے تاریک غار دوں میں کیسے جا سکتا ہے؟" اس روز سے شانتا انہیں خیالات میں غرق رہتی۔ وہ کوئی کام کاج نہ کرتی تھی۔ اور جب کبھی وہ تنہا ہوتی تو یہی کہتی۔ "میں اپنی روح کے مالک کی باندی بن کر رہونگی۔ آہ۔ وہ کہاں ہے میں اُس تک کیسے پہنچ سکتی ہوں میں پھول ہوں اور وہ ستارہ پھول ستارے تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ ستارہ آسمان سے ٹوٹ پڑے یا گداز ہو کر شبنم ہو جائے۔ مگر پھول کی تگ و دو ہی کیا ہے بس یہی کہ شام کے وقت وہ ٹکٹکی باندھ کر ستارے کو دیکھتا رہے اور چند دنوں کے بعد مرجھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاک میں مل جائے۔" وہ اپنی بے بسی پر آٹھ آٹھ آنسو روتی اور کہتی۔ "اے پرمیشور تو نے اس خاک کے پتلے میں ایسی چنگاریاں کیوں بھر دیں۔ کیا میری قسمت میں سلگ سلگ کر خاک سیاہ ہو جانا ہی لکھا ہے؟"

سُورج طلوع ہو ہو کر غروب ہوتا رہا۔ مگر شانتا کے خیالات کی ندی وہی راگ گاتی رہی۔ اُس کی نگاہیں اس تصویر کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں جو اوراقِ فطرت پر اس کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پیاسی تھیں۔ اور وہ اس چشمۂ محبت کی جستجو میں آوارہ پھرتی تھیں۔ وہ سوچتی کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس کے دماغ میں یہ طوفان کیوں برپا ہے۔ زندگی خواب تھی اور امید سراب کی جھلک کبھی تو مایوس ہو کر رہ جاتی۔ مگر کبھی کبھی پھر کامیابی کی تصویر چھلاوے کی طرح آنکھوں کے سامنے پھر جاتی۔ اور وہ پھر انہیں خیالات میں ڈوب جاتی۔ "میں اپنی روح کے مالک کی باندی بن کر رہونگی۔ اُس کو مجھ سے محبت ہے۔"

گاؤں کے بعض لوگ شانتا کو بیوہ دیکھ کر ہنستے اور اُس کو ستانے کے لئے شہزادے کی کہانیاں سُناتے۔ وہ اُس کو رانی کہہ کر پکارتے وہ شانتا کو دق کرنا چاہتے تھے۔ مگر شانتا اُن سب سے دامن بچا کر کسی تنہائی کے گوشے میں چلی جاتی۔ اور پریتم سانکل کی یاد میں اپنی روح کو مسرور پاتی۔

شانتا گاؤں میں سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کی معصومیت اور اُس کا بھولا پن ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔ اس کی باتیں آبِ حیات کے گھونٹ تھے۔ اور اُس کی خاموشی حیا ساز یا کیا بازی کا لطیف نغمہ۔ وہ ہر نوجوان کے دل کی آرزو تھی شادی کے متعلق آئے دن کوئی نیا پیغام آتا۔ اور جب شانتا کو معلوم ہوتا کہ اُس کی

رُوح کو زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ سخت بے چین ہو جاتی۔ مگر اس حالت کرب میں بھی اُس کے کانوں کو یہی نغمہ سُنائی دیتا "تو اپنی رُوح کے مالک کی باندی بن کر رہیگی"۔ بعض اوقات اُس کو وہم ہونے لگتا کہ اُس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔ اور وہ اسے شیطانی وسوسہ سمجھ کر نکلنے کی کوشش کرتی۔ اُن کی ہنسی مذاق کی باتوں میں خوشی اور اطمینان تلاش کرتی۔ مگر اس ہنگامہ طرب میں اسکے سینے سے خفیف سی صدا اُٹھتی "تو اپنی رُوح کے مالک کی باندی بن کر رہیگی۔ تو ان مجلسوں سے بالاتر ہے"۔ اور شانتا پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی۔ سہیلیاں قہقہے لگاتی ہُوئی اپنے اپنے گھروں کو چلی جاتیں۔ اور وہ اپنے خیالات کی رو میں بہتی ہُوئی کہیں کی کہیں نکل جاتی۔ "میری رُوح بے چین ہے۔ میری آنکھیں تشنہ ہیں۔ آہ مجھے کیا ہو گیا ہے! راگ رنگ میں رل مل جاتا ہے۔ خوشبو بادِ نسیم کے جھونکوں میں جذب ہو جاتی ہے۔ ندی دریا میں اور دریا سمندر میں فنا ہو جاتا ہے۔ اے پرمیشور میرے پریم کا سمندر کہاں ہے۔ جس کی تلاش میں میری رگ رگ بیتاب ہے مَیں چاہتی ہوں۔ اور کسقدر چاہتی ہوں۔ کہ مَیں بھی اپنے پریم کے ساگر میں ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاؤں۔ لوگ فنا سے کیوں خوفزدہ ہیں۔ کیا ان کو معلوم نہیں۔ کہ حیاتِ جاوداں کی لذت اسی میں پنہاں ہے۔" اگر اُس کو کوئی ایسی ہستی مل جاتی جس کی رازداری اور ہمدردی پر اُس کو بھروسہ ہوتا تو وہ اپنا سینہ چیر کر اُس کے سامنے رکھ دیتی۔ مگر محبت پاک اور بے لوث محبت کی امانت اسی سینے کے لئے مخصوص ہے۔ جس میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ دُنیا کے ناپاک کان اس کے لطیف نغمے سُننے کے لئے بہت بوجھل ہیں۔ دُنیا کی ہوس انگیز آنکھیں محبت کو آگ سمجھتی ہیں۔ اور اُن کے لئے وہ آگ ہی ہے کیونکہ وہ ہوس کو محبت سمجھتے ہیں"۔ محبت ایک نور ہے۔ جو ہمارے پیکرِ خاک کو جلا دیتا ہے۔ محبت ایک ضیا ہے۔ جو ہماری روحوں کے تاریک گوشوں کو منور کرتی ہے۔ محبت ایک صیقل ہے جو ہمارے غلیظ اور کثیف جذبات کو صاف اور لطیف بناتا ہے۔ محبت ایک زینہ ہے عرشِ بریں کا اور ایک نغمہ ہے سازِ سرمدی کا۔

شانتا اس خزانے کو لیکر گاؤں سی غیر محفوظ جگہ میں نہیں رہ سکتی تھی۔ جہاں رہزن ہر وقت گھات میں رہتے تھے۔ شام کائنات کے چہرے پر اُداسی کا رنگ پھیر رہی تھی کہ شانتا نے اپنے آپ کو تاریکی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ اُس نے محبت کے خزانے کو اپنے سینے میں اور اپنے حسن کے خزانے کو کمل میں چھپا لیا۔ اور اپنی منزل سے بے خبر جادہ جستجو میں گامزن ہو گئی۔

(۵)

یہ دُنیا کسقدر سریع التغیر ہے۔ جس شہر میں چند روز

پیشتر کھلتے رنگا رنگ شگفتہ تھے آج وہاں زرد پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا کچھ بھی نہیں جو آنکھیں کل تک مست نظارہ سے لذت یاب ہو رہی تھیں۔ آج حیرت واستعجاب میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور وہ قلوب جو فرطِ انبساط سے رقصاں تھے۔ آج موت آسا سکوت میں غرق ہیں۔ خوشی کیا ہے؟ صحرائے زندگی میں سراب کی ایک جھلک، شبِ تاریک میں بجلی کی ایک چمک، ایک طلسم کا دھوکا ہے آفتاب کے غروب ہونے سے پیشتر رنگین بادلوں کے ٹکڑے سطحِ آسمان پر تیرتے پھرتے ہیں۔ دنیا کی محفلیں بھی ایسی ہی ہیں۔ کیونکہ دونوں چشم زدن میں غم واندوہ کی تاریکیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ مہاراجہ بکرم کے سینے پر آج کوئی ہاتھ رکھ کر دیکھے جس طرح طوفان کے بعد سمندر کی رفتار نہایت سست پڑ جاتی ہے اسی طرح آج اُس کے دل کی کیفیت ہے۔ عظیم الشان محلات ویران جنگلوں کی طرح ڈراونے نظر آتے ہیں۔ زرق برق پوشاکیں اس کی آنکھوں میں کھٹکتی ہیں۔ وہ اُداس ہے۔ نہایت اُداس اُس کی روح وزنی پتھروں کے نیچے دبی جاتی ہے۔ اور کوئی طاقت نہیں جو اُن کو ہٹا سکے۔

محفلِ قدرت کس قدر معصوم ہے! اس کا دامن سادہ اور پاک خوشیوں سے ہر وقت معمور رہتا ہے۔ پرندے اپنی الاپ میں مست ہیں اور پھول اپنے حسن میں سرشار دریا کی موجیں جوشِ محبت سے ایک دوسری سے بغلگیر ہو رہی ہیں۔ آبشاروں کی صدائیں کس قدر خمار آگیں ہیں فطرت تسکین کا چشمہ ہے۔ آفتاب کا طلوع وغروب کس قدر طرب انگیز ہے۔ صبح کے وقت اُس کی تاجپوشی کے لئے کائنات کا ذرہ ذرہ نغمہ پیرا ہوتا ہے۔ دنیا اُس کے جلووں سے بقعۂ نور بن جاتی ہے۔ جب وہ غروب ہوتا ہے تو شفق کی رنگینیاں کس قدر دل آویز ہوتی ہیں۔ رنگین بادلوں کے ٹکڑے سُرخ پریوں کی طرح فضا میں لاپروائی سے تیرتے پھرتے ہیں۔ کوہسار کی چوٹیاں گلپوش ہو جاتی ہیں دریا کی مختلف الالوان لہریں رشکِ ارژنگ بن جاتی ہیں اس کی ابتدا اور انتہا دونوں حسن وجمال کی رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ فطرت کا ساز ایک ہی لے پر رہتا ہے مگر ہم ناپاک انسان اپنے جذبات وخواہشات کی بلند آہنگیوں میں اُس کو مٹا دینے کی کوشش کرتے ہیں اس وقت عرشِ بریں سے تسکین کے فرشتے نازل ہو رہے ہیں میٹھی نیند کا خمار کائنات کی آنکھوں پر چھا رہا ہے مگر بکرم کی آنکھیں اس سے محروم ہیں اسکا باجبروت چہرہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد ہے جس پر آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔

"اُس کی فطرت عجیب تھی! میرے عظیم الشان محلات میں اُس کی روح بیقرار رہتی تھی میری شان وشوکت

اُس کی نظروں میں نہ جچتی تھی۔ میرے لاتعداد خزانوں کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور میرے عیش و عشرت کی رنگینیوں میں اُس کے لئے کوئی کشش نہ تھی۔ آہ! میں پاپی اُس کا باپ بننے کے قابل نہ تھا! اے میرے چاند! اے میرے سورج تو کہاں چھپ گیا؟ میری زندگی کی طویل رات تجھ بن کیسے گذرے گی؟"

مہاراجہ بکرم تمام دن گوشۂ تنہائی میں روتا رہتا۔ اور جب شام کے وقت وہ اپنے محل کی چھت پر بیٹھ کر دریا کا منظر دیکھتا تو اُس کے مُنہ سے یہی فقرے نکلتے۔

اُس نے ہزاروں جاسوس بھیجے ہزاروں ہرکارے اِدھر اُدھر دوڑائے مگر ہر روز شام کے وقت وہ مایوسی کے عالم میں اپنے محل کی چھت پر اِدھر اُدھر ٹہلتا اور ان الفاظ کو دُہراتا وہ اپنی آتش مزاجی پر دانت پیستا۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ اُس کے محلات سے اس کی تسکین کا فرشتہ غائب ہوچکا تھا۔ اور اب اس کی زندگی ہیم اضطراب تھی۔ گل اندام نیم عریاں نازنینیں اپنے کرشمہ و ادا سے اس کا دل بہلانا چاہتیں تو وہ ایک خشمگیں نگاہ سے اُن کو دور ہوجانے کا حکم دیتا۔ اور جس طرح خزاں میں رنگین پتیاں ایک ایک کرکے گر جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ خوفزدہ مہ جبینیں ایک ایک کرکے بھاگ جاتیں۔ نوعمر اور حسین و جمیل گانیوالیاں اپنا اپنا ساز چھیڑتیں تو وہ جھلّائے ہوئے شیر کی طرح اُن پر جھپٹ پڑتا۔ اور ان کے طنبوروں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیتا وہ اس گیت کو ڈھونڈھتا تھا۔ جو اس کے حزنی دل کو مہکا کرے۔

(۶)

جوگی طلوعِ سحر کے ساتھ اپنا بربط چھیڑتا ہے۔ کائنات خواب نوشیں سے جمائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی ہے۔ اور اُس کا راگ کائنات کی رگ و پے میں بادۂ خوشگوار کی طرح دوڑتا ہے۔ پرندے اپنی راگنیاں گاتے ہوئے جوگی کے پاؤں میں لوٹتے ہیں۔ وہ ندی کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے اپنے سحر آمیز سروں سے فضا میں محبت کی رُوح پھونکتا ہے۔ اور جب عرصۂ روزگار کا تمام شور و غل تاریکی اور خاموشی کی لہروں میں گم ہوجاتا ہے۔ تو وہ بھی ایک درد انگیز نغمہ گاتے گاتے آغوشِ خواب میں مدہوش ہوجاتا ہے۔ اس جنگل کے شب و روز ایسے ہی گزرتے ہیں۔ جوگی اپنے بربط کو چھیڑ چھیڑ کر فضا کو مخمور کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی صدائیں دُور دُور تک پہنچنے لگیں۔ اور انسانوں کے گروہ بھی کشاں کشاں آنے لگے مرادوں والے اُس کے چرنوں میں گر پڑتے۔ جوگی خود اپنے ہاتھوں سے اُن کو اٹھاتا اور اپنے بربط سے انکی پیشانیوں کو مس کرتا۔ وہ لوگ چلے جاتے اور اُن کی مُرادیں پوری ہوجاتیں۔

(۷)

جس طرح دُور سے گاؤں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مدھم روشنی صحرانورد کو دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح شانتا کے مانوس اور تاریک دل میں پریم ساگر کی صورت تھی۔ ہوا کے نہایت لطیف جھونکوں سے چنگاریاں زیادہ مشتعل ہوتی ہیں۔ اور جب شانتا کے کانوں کو جنگل کے جوگی کی کراہتوں کے چرچے سنائی دیتے تو امید کی دبی ہوئی چنگاری پھر بھڑک اٹھتی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد اُسے ایسا محسوس ہوتا۔ کہ یہ لوگ کوئی افسانہ یا رہنے سنا رہے ہیں۔ اور وہ مایوس ہو کر بیٹھ جاتی۔ وہ اپنے گوش و دل کو فریب خوردہ سمجھتی۔ وہ ان نغموں کے لئے ہر وقت گوش برآواز رہتی تھی۔ دریا کے کنارے کی طرف بھاگتی مگر وہاں تو صرف موجوں کا شور ہوتا تھا۔ وہ درختوں کی طرف بھاگتی ہوئی جاتی۔ مگر آہ! پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ وہ ایک ایک آواز پر ٹھٹک کر رہ جاتی۔ تاریکیوں کے سناٹے میں اُس کے پُرشوق کان اسی آواز کو سنتے صبح کے چہچہوں میں وہ اُسی کو ڈھونڈتی۔ شانتا اس گنوار کی طرح جو قوس وقزح کے پیچھے بھاگ بھاگ کر مایوس ہو جاتا ہے۔ جنگلوں اور صحراؤں میں سرگرداں پھرتی رہتی تھی۔ شام کی خمار آلودہ ہواؤں میں آخر وہ ایک پہاڑ کے دامن میں سو گئی۔

جب نشۂ حُسن سے مخمور صبح نے انگڑائی لی تو ایک آواز نہایت لطیف اور شیریں اس کے کانوں کے پردوں میں خفیف سی سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی اُس کے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ وہ کھنچی جاتی تھی اس سوئی کی طرح جو مقناطیس کی جانب کھنچی جاتی ہے۔ وہ مسحور تھی۔ اُس کبوتر کی طرح جو سانپ کے دلکش نغموں کی جانب اضطراری طور پر کشتیوں کو چلاتے جاتے تھے۔ اور بالآخر چٹان پر ٹکرا کر فنا ہو جاتے تھے۔ وہ بھی اپنی کشتی حیات کو اسی جانب اضطراری طور پر چلائے جا رہی تھی۔ کس کو معلوم ہے۔ کہ وہ چٹان یا ساحل کی جانب کھنچی جاتی تھی۔ وہ ایک عجیب ذی عقل اور بے ارادہ ہستی تھی۔ اسکی آنکھیں بند تھیں مگر وہ اپنے آپ کو ایک پُرنور دنیا میں محسوس کر رہی تھی۔ اُس کا دماغ بیکار تھا۔ مگر وہ صحیح راہ پر گامزن تھی بالآخر یہ کہتی ہوئی "میرا پریم ساگر کہاں ہے" ایک مقام پر دھم سے گر پڑی۔

یہ الفاظ سن کر جوگی کے دل میں جذبات کا محشر برپا ہو گیا۔ پریم ساگر کا متلاشی کون ہے؟ اس کی متجسس نگاہیں اپنے متلاشی کو پہچاننے میں کامیاب ہو گئیں۔ اور ایک مدت کے بھولے ہوئے واقعات پھر تازہ ہو گئے۔ اس کی سولھویں سالگرہ کی دھوم دھام اُس کا ایک بیکس لڑکی کو بچانا مہاراج کا جوشِ غضب سب ایک ایک کر کے اسکی آنکھوں

کے سامنے پھر گئے۔ وہ اس سرور کے عالم میں تھا۔ جسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

"میں۔ فنا۔ ہو چکی ہوں" شانتا عالمِ بیہوشی میں بڑبڑا رہی تھی۔ "اپنے پریم کے ساگر میں" جوگی نے شانتا کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو اپنے پریم ساگر کے آغوش میں ہے۔ جب دریا سمندر میں مل جاتا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دریا کا پانی ہے۔ اور یہ سمندر کا۔ شانتا کی نیم وا آنکھیں زیادہ روشن اور کشادہ ہو گئیں وہ ہم آغوش تھے۔ معلوم نہیں کب سے۔

(۸)

زندگی کی تمام تگ و دو ہو چکی۔ سرکش گردنوں کو جھکایا۔ سورما جوانوں کے دلوں کو تھرایا۔ فلک بوس عظمتوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیا۔ مگر کیا ہوا؟ یہ انجام میری سمجھ میں نہیں آتا۔ انسانوں کی گردنیں میری تعظیم ——— نہیں، بلکہ پرستش کے لئے جھک جاتی تھیں اس وسیع دنیا کی تمام لذتیں میری طرف کھنچی آتی تھیں۔ میرے خزانے نادر جواہرات سے معمور تھے۔ اور میرے محلات ملک فریب نازنینوں سے رشک فردوس بنے ہوئے تھے۔ یک جنبشِ نگاہ گدا کو بادشاہ اور بادشاہ کو گدائے بینوا بنا سکتا تھا۔ مگر کیا ہوا؟ یہ انجام میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہی دنیا جو کبھی روشن اور دلکش تھی۔ آج تنگ و تاریک اور ہیبتناک نظر آتی ہے۔

زندگی کی خوشیاں بھی چھلاوے کی طرح ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں" مہاراجہ بکرم خلوت کے کمرے میں انہیں خیالات میں غرق تھا۔ کہ اس کے وزیر نے اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ "کہو میرے دیرینہ ہمدرد کیا کہتے ہو۔ میرے کمزور کندھے اب سلطنت کے بارِ عظیم کے نیچے دبے جاتے ہیں۔ یہ سلطنت بھی ایک پاپ تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی "ہزاروں دیویوں کی عصمت دری اور کروڑوں بے گناہ انسانوں کے خون کا پاپ میری گردن پر ہے۔ یہ سلطنت بھی ایک ہوس ہے خوفناک اور پر خطر ———" "آخر آپ کا کیا مطلب ہے!" وزیر نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "میں خود اس دیوتا کی تلاش میں جاؤنگا۔ جس کو میں نے درندوں کے سپرد کر دیا تھا۔ شاید میں بھی اسی دریا میں غرق ہو جاؤں جس میں اس وقت اس کی لاش ہے۔ اور پھر ہم دونوں ابد تک ہم آغوش رہیں۔ شاید میں بھی اسی درندے کا ایک لقمہ بن جاؤں۔ جس کے خون میں میرے پریم کا خون ملا ہوا ہے۔ اور پھر ہم کو ایک دوسرے سے کوئی جدا نہ کر سکے"

بکرم سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ زار زار رونے لگا۔ "صبر سے کام لیجئے ہزاروں مخبر ادھر ادھر بھیجے ہوتے ہیں چند دنوں تک کچھ نہ کچھ سراغ مل جائیگا۔ ہاں ایک اور بات یاد آ گئی" بکرم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں خود ہی مخبر کی

طرح اُس کو تلاش کرونگا۔ ہاں مگر وہ کیا بات یاد آئی۔" وزیر نے اپنے تمام حواس کو جمع کر کے کہا۔ "مہاراج! کئی لوگوں سے معلوم ہوا ہے۔ کہ چند میل کے فاصلے پر ایک جوگی رہتا ہے۔ لوگ اس کے پاؤں میں گر جاتے ہیں۔ اور وہ اُن کو اپنے بربط سے مس کر کے اٹھاتا ہے۔ لوگ چلے آتے اور اپنی مرادیں پا لیتے ہیں۔"

"پاؤں میں گر جاتے ہیں! —— نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ آسمان زمین کے پاؤں پر جُھک جائے! آفتاب ذرے کو سجدہ کرے! تو نے یہ کیا کہدیا ہے؟"

بکرم اپنے پرانے فخر و اعزاز کے عالم میں چراغ پا ہو رہا تھا۔ وزیر اجازت لیکر بید کی طرح کانپتا ہوا باہر چلا گیا۔

(۹)

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی کافی ہے۔ مریض جب تمام مستند اطبا کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے۔ تو پھر وہ ایک ناتراشیدہ گنوار کا نسخہ استعمال کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ بکرم کہنے کو تو کہہ گیا تھا کہ آسمان زمین کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ مگر اب وہ خود ہی اپنی تقریر پر عذر کر رہا تھا۔ آہ! احتیاج دُنیا میں کیا کیا انقلابات پیدا نہیں کرتی۔ اُس کی رگ رگ سے یہی صدا اُٹھتی تھی کہ جا اس جوگی کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دے۔ غرور اور پدری محبت کی عجیب کشمکش تھی۔ وہ ہستی جس کے پاؤں میں کل تک لاتعداد نفوس جھک رہے تھے۔ آج سر کو ایک جوگی ایک معمولی جنگل کے جوگی کے قدموں پر جھک جانے کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔ "پریم ساگر تیرے لئے میں کیا کچھ نہ کرونگا —— نہیں —— تیرے لئے نہیں، تیرے لئے جو کچھ کرنا تھا کر چکا ہوں۔ آہ یہ سب کچھ اپنے ہی لئے ہے اپنے بیتاب دل کے لئے اے میرے پریم تو مجھے کہاں تک سزا دے گا۔ اپنے بوڑھے باپ کی حالت پر رحم کر"

بکرم پر چند لمحوں کے لئے سکوت سا طاری ہو گیا۔ دفعتاً اس کے چہرے پر مایوسانہ رنگ پھر گیا۔ "اگر پریم فنا ہو چکا ہے تو وہ جوگی کیا کر سکتا ہے۔ مردوں کو زندہ کرنا صرف پرمیشو کا کام ہے۔ اُس کے پاؤں پر گرنا کہیں گناہ بے لذت ہی ثابت نہ ہو"

بکرم کی حرکات کو وفادار وزیر چھپ چھپ کر تاڑتا رہتا تھا۔ وہ اس موقع کی تلاش میں تھا۔ جبکہ وہ بکرم کو جوگی کے پاس جانے پر فوراً آمادہ کرے۔ آج بھی اُس نے سب کچھ دیکھا۔ اور سُنا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے تمتا رہا تھا۔ اُس نے چند لمحوں کے بعد اندر داخل ہونیکی اجازت چاہی۔

"مہاراج! میری بات پر بھی آپ نے کچھ غور کیا اس جوگی کی بہت دھوم دھام ہو رہی ہے۔ اپنے پریم کے لئے آپ نے بھی کچھ سوچا۔"

بکرم جانے کو فیصلہ کر چکا تھا۔ "ہاں! اس کے لئے میں سب کچھ گوارا کروں گا۔"

(۱۰)

"مہاراج" کہہ کر جوگی اور جوگن بکرم کے چرنوں میں گر پڑے۔ تماشائی حیرت کے عالم میں چاروں انسانوں کو دیکھ رہے تھے۔ "مہاراج! کونسا مہاراج کیا فقیرانہ کمل اوڑھے ہوئے مہاراج ہی ہیں۔ اور یہ اُن کے پاس دوسرا شخص کون ہے؟" یہی سوالات سب کے دلوں میں پیدا ہوتے۔ مگر تمام لوگ سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔ ہاں خود مہاراج بھی نہیں سمجھتے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ تو سجدہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ مگر یہاں خود ان کو سجدے ہو رہے ہیں۔ بکرم نے جوگی کو اپنے دائیں اور جوگن کو اپنے بائیں ہاتھ سے اُٹھایا۔ اور خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے جوگی کو سینے سے لپٹا لیا۔ کیونکہ یہ جوگی وہی پریم

تھا۔ وزیر نے سب کو تمام ماجرا سمجھایا۔ بکرم کے گرد تمام ہجوم جمع ہو گیا۔ اور سب کے سر اُس کے پاؤں میں جھکے ہوئے تھے۔ اُس نے کہا۔ "اب پریم کی اطاعت تم پر لازم ہے۔ میں بن باسی اور سادھو ہوں" بکرم نے پھولوں کے تاج بنائے۔ اور پریم ساگر اور شانتا کو اپنے ہی ہاتھوں سے پہنائے۔ پریم ساگر نے اسی جنگل کو اپنی راج دھانی مقرر کیا تمام امراء اور رؤسا وہیں آکر مقیم ہو گئے۔ اُس کا نام "پریم ساگر" انتخاب کیا گیا۔

ہر صبح راجہ اور رانی پھولوں کے تاج پہنے ہوئے شہر سے باہر نکلتے۔ تمام رعایا اُن کے پیچھے ہوتی اور وہ سب دریا کے کنارے پر راجے اور رانی کی نہیں، بلکہ اپنے حقیقی معبود کی پرستش کرتے۔

اثر صہبائی

خمخانہ راز

پیغمبر ما کہ انبیا راست امام
جبریل آوردش از خداوند پیام
بودش بر حکم فطرت انجام آغاز
در دائرۂ نبوت آغاز انجام

اے ساقی ما بادہ بدہ عصمت خیز
کآمد با دارو گیر باطل بستیز
درساغرم اے ساقی خمخانۂ راز
آں بادہ ز زمرۂ اسمۂ احمد ریز

گرامی مدظلہ

محبّت

اے کشور جاں اے ہنر آرائے تمنّا   جلوہ ہے ترا دیدۂ خوننابہ نشاں میں
ہر داغِ مصیبت ہے چراغ شبِ امکاں   ہر زخم ہے گلدستۂ نو بزمِ جہاں میں

تو نور کی دنیا میں ہے سیّارۂ روشن   تو حسنِ جوانی کی نمائش میں ہے رنگیں
تو ہے حکما کے لیے گنجینۂ تحقیق   تو ہے شعرا کے لئے تخئیل ہمہ بیں

وہ ساز جو ہے مطربِ گلشن کی نوا میں   وہ راگ جو غنچوں کے لئے خوشخبری ہے
چھیڑا ہے اُسی کو نئے انداز سے تو نے   وہ زمزمہ جو شعلۂ آواز پری ہے

طوطی کے لئے جوہرِ آئینہ ہیں ذرّے   بلبل کے لئے نغمۂ الہام ہے تیرا
پروانۂ جاں سوختہ پر شمع ہے گریاں   بہتر کہیں آغاز سے انجام ہے تیرا

تو وہ ہے کہ اقوام میں اک جان دو قالب   تو وہ ہے کہ آزادیٔ مشرق کا ہے پیغام
تو وہ ہے کہ ہے رُوحِ تمدن کا مرقّع   تو وہ ہے ترقی کی ستائش کا ہے انعام

بجلی کی طرح دوڑتا ہے خون رگوں میں   تو نے دلِ خوابیدہ کو بیدار کیا ہے
قربانیٔ ملت کے سبق نوکِ زباں ہیں   اعدا کے مقابل ہمیں تیار کیا ہے

اس راہ میں تابش ہے ترے نقشِ قدم کی   لغزش ہو جہاں عقل کو ہو فلسفہ حیراں
پارینہ روایات نئے سر سے ہوں زندہ   ہو سعیٔ عمل گرمیٔ ہنگامۂ انساں

ہر شے متحرک ہے بقا ہے تری بستی   کاشانہ وہ روشن ہے جہاں شاد ہیں روحیں
مٹ کر بھی میسر ہے انہیں لذتِ جاوید   قانونِ غلامی نہیں آزاد ہیں روحیں

سیّد ابو محمّد ثاقب

روداد محبّت

مصنفہ ٹالسٹائی — حصّہ اوّل — مترجمہ راز چاندپوری

باب چوتھا

کسی دوسری جگہ جانے یا مسرت بخش صحبتوں اور خوشگوار زندگی کی جستجو کا مجھے خیال بھی نہ تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف دیہات میں ایک خاموش زندگی بسر کرنا ایک دوسرے کے لئے جان قربان کرنا' باہم محبت رکھنا۔ اور ہر حال میں جرم و یاور خدائے واحد کا یقین کرنا میرے نزدیک بہترین زندگی تھی۔

میں اپنی تجویز کے مطابق اپنی سالگرہ کے دن عشاء ربانی میں شریک ہوئی۔ اُس دن جب میں گرجے سے واپس ہوئی تو میرا دل اسقدر مسرور تھا کہ میں ہر اُس خیال اور ہر اُس شے سے جو کسی حد تک بھی میری مسرت کو فنا کر دینے والا ہوتا' کانپ اٹھتی۔ لیکن جیسے ہی ہم فٹن سے اُتر کر سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ اس کی گاڑی کے پہیوں کی آواز جس سے ہم خوب واقف تھے پل پر سنائی دی۔ اور میں نے سرجیائی کو آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے مجھے مبارکباد دی اور ہم ایک ساتھ ملاقات کے کمرہ میں چلے گئے۔ جب سے ہم دونوں ایکدوسرے سے واقف ہوئے تھے۔ آجتک کبھی میں اسقدر خاموش اور ساکت نہ رہی تھی جیسی آج صبح کو تھی۔ مجھے اس امر کا احساس تھا کہ میرے اندر ایک نئی دنیا آباد ہے۔ جو اس سے بہت بلند ہے۔ اور جس سے وہ ناواقف ہے۔ مجھے اسکی موجودگی سے مطلق تکلیف نہ ہوتی۔ یقیناً کسی حد تک اس نے اس کو سمجھ لیا ہوگا۔ کیونکہ وہ محبت اور شرافت سے میرے ساتھ پیش آیا۔ اور ایک عجیب طریقہ سے میرا احترام کرتا رہا۔ میں پیانو کے پاس گئی۔ لیکن اُس نے اس کو بند کر دیا۔ اور چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔

اُس نے کہا۔" اس اثر کو جس سے تم متاثر ہو رہی ہو برباد نہ کرو۔ اس وقت تمہاری رُوح مادی نغمہ سے بالاتر موسیقی سے معمور ہے۔"

میں اسکی اس عقلمندی پر اس کی شکرگزار ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی کسی قدر بددل بھی۔ کیونکہ بہت آسانی سے اس نے وہ بات معلوم کر لی تھی۔ جو میری رُوح کے اندر مثل ایک راز

کے ہر ایک سے پوشیدہ رہنی چاہیئے تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اُس نے کہا "میں تمہیں مبارکباد دینے اور الوداع کہنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں کل ماسکو چلا جاؤنگا" یہ کہتے ہوئے اس نے کاتیا کی طرف دیکھا۔ اور پھر میری جانب اچٹتی ہوئی نظر کی۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے چہرے کا رنگ متغیر دیکھ کر خوفزدہ ہو رہا تھا

مگر میں نے تعجب کا اظہار کیا نہ رنج کا، بلکہ میں نے اُس سے یہ بھی نہ دریافت کیا کہ کیا وہ عرصہ دراز کے لئے جا رہا ہے۔ کیونکہ میں جانتی تھی۔ کہ وہ کیا کہیگا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ درصل وہ نہیں جائیگا۔

آجتک میں خود نہیں سمجھ سکی کہ یہ مجھ کو کیونکر معلوم ہو گیا تھا۔ لیکن اس یادگار دن میں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ماضی و مستقبل کی ہر بات مجھے معلوم تھی۔ میں اپنے آپ کو ایک مسرت بخش خواب کی حالت میں پاتی تھی۔ اور جو باتیں ہنوز ظہور میں نہ آئی تھیں۔ وہ میرے پیش نظر تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں عرصہ سے اُن سے واقف تھی۔ تاہم واقعہ یہ تھا کہ یہ باتیں مستقبل میں ظاہر ہونے والی تھیں اور میں جانتی تھی کہ وہ مستقبل سے وابستہ ہیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ فوراً ہی جانیوالا تھا۔ مگر کاتیا جو کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گئی اور اس کو مجبوراً اُس سے رخصت ہونے کے لئے اس کے جاگنے تک انتظار کرنا پڑا۔

ملاقات کے کمرہ میں سورج کی روشنی آرہی تھی۔ ہم چبوترہ پر چلے گئے جیسے ہی ہم وہاں بیٹھ گئے۔ میں نے پورے اطمینان وسکون کے ساتھ وہ گفتگو شروع کی جس پر میری محبت کی قسمت کا فیصلہ منحصر تھا۔ میں نے بیٹھتے ہی سلسلہ کلام شروع کر دیا۔ درآنحالیکہ اس وقت تک کوئی بات نکلی ہی تھی اور نہ کوئی ایسی بات تھی جو ہماری گفتگو میں مخل ہوتی یا جو کچھ میں کہنا چاہتی تھی اس پر کوئی بُرا اثر ڈال سکتی۔ خدا معلوم اطمینان وسکون اور حقیقت کہاں سے میرے بیان میں آ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا میں خود نہ تھی بلکہ میری خواہش سے آزاد کوئی اور شے تھی۔ جو میری زبان میں سرگرم کلام تھی۔ وہ اپنا سر جنگلے پر رکھ کر میرے مقابل بیٹھ گیا۔ اور سوسن کی شاخ اپنی طرف جھکا کر اس کے پتے نوچنے لگا۔

جب میں نے بات چیت شروع کی تو اس نے شاخ کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے ہاتھ پر سر رکھ لیا۔ ایسی حالت بالکل سکون یا اضطراب میں ہر شخص پر طاری ہو جاتی ہے۔

میں نے پُر معنی لہجہ میں اس کے چہرہ پر نظر جما کر پوچھا "تم کیوں باہر جا رہے ہو؟"

اُس نے فوراً ہی جواب نہ دیا بلکہ کچھ وقفہ کے بعد نیچی نگاہ کر کے بولا۔ "ضرورت مجبور کرتی ہے۔"

مجھے معلوم ہوا کہ میرے سوال کے جواب میں جو میں نے

آزادی سے پیش کیا تھا۔ اس کے لئے جھوٹ بولنا کس قدر مشکل تھا!

میں نے کہا: "سنئے! آپ جانتے ہیں کہ آج کا دن میرے واسطے کیسا ہے۔ بہت سی دلہنوں سے یہ دن ایک یادگار دن ہے۔ اگر میں تم سے یہ دریافت کرتی ہوں۔ تو یہ صرف احسان ہی نہیں ہے۔ کیونکہ تم کو معلوم ہے کہ میں تم سے ملنے کی عادی ہوں اور تمہارے دیکھنے کی مشتاق رہتی ہوں لیکن میں صرف اس غرض سے پوچھتی ہوں تاکہ مجھے معلوم ہو جائے اچھا بتاؤ تم کیوں باہر جارہے ہو؟"

اُس نے جواب دیا: "اس معاملہ میں تم سے سچ کہنا میرے لئے بہت دشوار ہے۔ گزشتہ ہفتہ میں تمہارے اور اپنے متعلق بہت کچھ غور وخوض کرتا رہا ہوں۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ مجھے باہر چلا جانا چاہیئے۔ تم کو اس کی وجہ معلوم ہے۔ اور اگر واقعی تم کو مجھ سے اُنس ہے تو تم مجھ سے دریافت نہ کرو۔"

اُس نے اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر پھیرا آنکھیں بند کرلیں اور کہا: "میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے ــــ لیکن تم اس کو بخوبی سمجھتی ہو۔"

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

میں نے کہا: "میں نہیں سمجھ سکتی، مطلق نہیں سمجھتی۔ تم ہی بتاؤ۔ خدا کے لئے آج کے دن کے صدقہ میں مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے، میں نہایت خاموشی کے ساتھ سنونگی۔"

اُس نے اپنی نشست کا پہلو بدلا۔ میری طرف دیکھا اور سوسن کی اُس شاخ کو پھر اپنی طرف کھینچ لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنے لہجہ کو سنبھالتے ہوئے کہا: "اگرچہ اس راز کو الفاظ کا جامہ پہنانا حماقت ہے۔ اور ناممکن نیز میرے لئے دشوار، تاہم میں اس کو بیان کرنے کی کوشش کرونگا۔" اُس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔ اس کی بھویں تنی ہوئی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک باطنی تکلیف میں مبتلا ہے۔

میں نے کہا: "بہتر ہے، فرمایئے۔"

اُس نے جواب دیا: "فرض کرو زید نامی ایک شریف آدمی تھا۔ ضعیف، اور زندگی سے بیزار ــــ اور ایک نوجوان خوش وخرم خاتون، جو خود کشمکشِ حیات سے ناواقف تھی۔ زید عزیزداری کی بنا پر مثل اپنی بیٹی کے اُس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اور کسی دوسرے طریقہ سے محبت کرنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں نہ آیا تھا۔"

اتنا کہکر وہ رُک گیا۔ اور میں خاموش رہی۔

سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس نے یکایک زمین کی طرف دیکھتے ہوئے متانت کے ساتھ جلد جلد کہنا شروع کیا: "لیکن زید نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا۔ کہ وہ دوشیزہ اسقدر کمسن تھی کہ اس وقت تک اس کے نزدیک

زندگی کوئی اہم چیز نہ تھی۔ اور یہ کہ میں اس کے ساتھ ایک مختلف طریقے سے محبت کرنے لگونگا۔ اور میرا طرزِ عمل اس حسینہ کے واسطے سامانِ تفریح بن جائیگا لیکن اس کو مغالطہ ہوا۔ یکایک اس کی روح رنج و غم کے جذبات سے لبریز ہو گئی۔ اور وہ کانپ اٹھا۔ وہ اس لئے خوفزدہ ہوا کہ کہیں اگلے دوستانہ تعلقات منقطع نہ ہو جائیں۔ اس نے اس سے قبل کہ ایسا موقع پیش آئے اس سے جدا ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ کہتے کہتے اس نے بے پروائی کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے پھر اپنی آنکھیں ملیں اور ان کو بند کر لیا۔

میں نے نہایت آہستگی سے پوچھا "مہربانی فرما کر بتائیے۔ کہ اس کو ایک دوسرے طریقہ پر اس حسینہ سے محبت کرنے میں کیوں پس و پیش ہونا چاہیئے؟" میں نے اپنے دلی اضطراب کو دور کیا۔ اور میری آواز سے اطمینان و سکون ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ حقیقت میں اس کو مذاق سمجھ رہا تھا۔

اس نے ایسے لب و لہجہ میں جواب دیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کو تکلیف پہنچی ہے۔

اس نے کہا "تم نوعمر ہو اور اب میں نوجوان نہیں تمہارے واسطے معمولی سے معمولی بات دلچسپی کا باعث ہے اور میرے لئے کسی اور شے کی ضرورت ہے۔ دلخوش کن باتیں جو تم کو پسند ہیں میرے پاس نہیں ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ شاید میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں اور تم کو ملال ہو ——— یہ وہ الفاظ ہیں جو زید کی زبان سے نکلے تھے۔" سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اس نے پھر کہا۔ "خواہ یہ حماقت ہی کیوں نہ سمجھی جائے۔ مگر میں تو یہی کہونگا۔ کہ تم کو میرے جانے کی وجہ معلوم ہو گئی اور اب مہربانی فرما کر اس ذکر کو چھوڑ دیجئے۔"

میرا دل بھر آیا۔ میری آواز کانپنے لگی۔ اور میں نے زور دیکر کہا "نہیں نہیں، یہ گفتگو ختم نہیں ہو سکتی۔ خیر یہ بتاؤ کہ زید کو اس حسینہ سے محبت بھی تھی یا نہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا "اچھا اگر زید کو اس کے ساتھ محبت نہ تھی تو وہ اس کے ساتھ مثل ایک بچہ کے کیوں خوش فعلیاں کیا کرتا تھا؟"

اس نے میری بات کاٹ کر جلدی سے جواب دیا "ہاں یہ زید کا قصور تھا لیکن آخر کار نتیجہ یہ نکلا۔ کہ وہ ایک دوسرے سے دوستانہ طریقہ پر جدا ہو گئے۔"

"مگر یہ تو بہت ہی افسوسناک واقعہ ہے۔ کیا کسی دوسرے طریقے سے اس کا انجام ہونا ممکن نہ تھا؟"

مشکل سے یہ الفاظ میری زبان سے ادا ہوئے تھے کہ میں اپنی اس ناعاقبت اندیشی پر کانپ اٹھی۔

اس نے بیتابانہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں ممکن تھا۔ دو مختلف طریقوں سے نتیجہ نکل سکتا تھا۔ لیکن خدا کے لئے میری بات نہ کاٹو۔ اور جو کچھ میں کہوں،

خاموشی کے ساتھ سُنو" وہ کھڑا ہو گیا۔ اور میری طرف افسردگی کے ساتھ مُسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا "بعض لوگ کہتے ہیں کہ زید دیوانہ ہو گیا تھا۔ اور اس دوشیزہ کی محبت میں از خود رفتہ چنانچہ اُس نے اس حسینہ سے اظہار محبت کر دیا۔ مگر وہ اس کی اس حالت پر صرف ہنس کر خاموش ہو رہی۔ کیونکہ اس کے واسطے یہ صرف ایک مذاق تھا۔ اور زید کے لئے زندگی اور موت کا معاملہ۔"

مَیں کانپ گئی۔ اور چاہتی تھی کہ اس کی گفتگو میں دخل در اندازہو کر اس سے کہوں کہ اس کو میری طرف سے کچھ کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ لیکن اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر مجھے بولنے سے باز رکھا۔

اُس نے مرتعش آواز میں کہا "ٹھہرو، دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ دوشیزہ اُس پر مہربان تھی۔ وہ بیچاری جو ہنوز دُنیا اور دُنیوی معاملات سے اچھی طرح واقف نہ تھی۔ کہ اس کو در اصل اس سے محبت کرنی چاہیے۔ اور اس لئے وہ اس کی منکوحہ بننے کے لئے رضامند تھی۔ اور زید اس کا یقین کر کے پاگل ہو گیا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی زندگی میں نئے سرے سے جان پڑ جائیگی مگر دونوں اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ وہ ایک دوسرے کو فریب دے رہے ہیں۔ بس اب اس ذکر کو چھوڑ دو" وہ خاموش ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اور کچھ کہنے کی اس میں طاقت ہی نہیں ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور میرے سامنے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

اُس نے کہا تھا "کہ بس اس گفتگو کو ختم کر دو" لیکن مجھے محسوس ہُوا کہ وہ میرا جواب سُننے کے واسطے ہمہ تن گوش بنا ہُوا تھا۔ مَیں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر کہہ نہ سکتی تھی۔ کوئی شے میرا گلا دبا رہی تھی۔ مَیں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اسکا رنگ زرد پڑ گیا تھا اسکا نیچے کا ہونٹ کانپ رہا تھا۔ مَیں نے اپنی تمام قوت صرف کر کے اس قفل خاموشی کو توڑا۔ جو میرے لبوں پر آویزاں تھا۔ اور کمزور اور دبی آواز سے' جس کی نسبت مجھے ہر لحظہ ناکامیاب رہنے کا خوف تھا۔ کہا۔

"لیکن ایک تیسرا نتیجہ بھی نکل سکتا تھا"

یعنی یہ کہ زید کو اُس حسینہ سے محبت نہ تھی۔ بلکہ اُس نے اُس کو بے حد صدمہ پہنچایا۔ اور خیال کرتا رہا۔ کہ ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہے۔ پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔ اور اپنے طرزِ عمل کو اپنے لئے موجب فخر سمجھتا رہا۔ میرے لئے نہیں بلکہ صرف تمہارے واسطے یہ ایک بالکل معمولی بات ہے۔ روزِ اوّل سے مجھے تم سے محبت ہے —— ہاں مَیں تم سے محبّت رکھتی ہوں" مَیں نے پھر کہا۔ "بیشک مجھے تم سے محبّت ہے" اور "محبت ہے" کے الفاظ پر میری آواز خلاف عادت نرم و لطیف ہونے کی بجائے وحشیانہ انداز سے بلند ہو گئی۔ جس سے مجھے خود خوف معلوم ہونے لگا۔

وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ پژمردہ

ہوگیا تھا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور اسکی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

مَیں نے زور سے کہا۔ "یہ سراسر ظلم ہے"۔ مجھے خوف معلوم ہوا کہ ضبط گریہ سے میرا دم گھٹ جائیگا۔ مَیں نے پھر کہا۔ "آخر اس کا سبب؟" اور اس کے پاس سے جدا ہونے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

مگر اُس نے مجھے روک لیا۔ اُس نے اپنا سر میرے قدموں پر رکھ دیا۔ اور میرے مرتعش ہاتھوں پر بوسے دینے لگا۔ میرے ہاتھ اُس کے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

اس کی زبان سے نکلا "میرے اللہ! اگر مجھے معلوم ہوتا ـــ"

مَیں نے پوچھا "کیا بات ہے؟ کیا معاملہ ہے؟" مگر میری رُوح مسرت سے لبریز ہوچکی تھی۔ ایسی مسرت جس کو کوئی طاقت مجھ سے نہ چھین سکتی تھی۔ اور اس کا اعادہ کرنا محال ہے۔

پانچ منٹ کے اندر ہی سونیا کاٹیا کے پاس بالاخانہ پر گئی۔ اور گھر میں شور مچادیا۔ کہ "آپا تو سرجیائی کے ساتھ شادی کرنے والی ہیں"۔

پانچواں باب

ہماری شادی کو ملتوی کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور نہ ہم دونوں میں سے کسی کی یہ خواہش تھی۔ کاٹیا ماسکو جانے اور لباس عروسی کی تیاری کا انتظام کرنے کے لئے مضطرب تھی۔ سرجیائی کی والدہ اس پر زور دے رہی تھی کہ شادی سے قبل ایک نئی گاڑی اور فرنیچر مہیّا کرلیا جائے۔ اور مکان کو نئے پردوں سے آراستہ کیا جائے۔ لیکن ہم دونوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر ان چیزوں کی دراصل ضرورت ہوئی تو بعد میں ان پر توجہ کی جائے۔ اور اس طرح میری سالگرہ کے دو ہفتہ بعد شاہانہ جوڑہ، مہمان، برات، دعوت اور دوسرے لوازمات شادی کے بغیر ہمارا عقد ہوگیا۔

سرجیائی نے مجھ کو بتایا۔ کہ اس کی والدہ اس وجہ سے اُس سے ناخوش ہے کہ ہماری شادی بلا ناچ باجے شان و شوکت اور تجدید مکان کے ہوئی۔ حالانکہ خود اس کی شادی میں بتیس ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ پوشیدہ طور پر توشہ خانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ اور داروغہ مکان ماریشکا کے مشورہ سے قالین، پردوں اور ظروف کے انتظام میں لگی ہوئی تھی جو ہماری آسائش کیلئے ضروری تھے۔

میرے یہاں کاٹیا بھی ضعیف العمر دایہ کزمینشنا کی مدد سے اس قسم کے انتظام میں مصروف تھی۔ اور اس کے متعلق اس سے ملامت سے کچھ کہنا بے سود تھا جب سرجیائی اور مَیں اپنے مستقبل پر گفتگو کرتے تھے تو کاٹیا سمجھتی تھی کہ

ہم صرف خیالی، رنگین اور دوراز کار خیالوں میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ لوگ عموماً ایسی حالت میں کرتے ہیں۔ اسکا خیال تھا کہ ہمارے مستقبل کی حقیقی مسرت میرے زرکار و منقش لباس اور مکان کی آرائش پر منحصر ہے۔

پوکروسکوئی اور نکولسکوئی کے درمیان ہر روز چند بار مختلف قسم کی تیاریوں کے متعلق رازداری کے خطوط آتے جاتے تھے۔ اور اگرچہ بظاہر کاٹیا اور اس کی والدہ بہت ہی مہربان معلوم ہوتی تھیں۔ تاہم ان کی تدابیر پوری ہوشیاری اور کسی قدر مخالفت کے ساتھ جاری تھیں۔

اُس کی ماں تاتیانا جس سے اب مَیں اچھی طرح متعارف ہُو چکی تھی۔ ایک دُور اندیش، پابند وضع تعلقہ دار خاتون تھی اور اپنے بزرگوں کے طریقہ کی سختی کے ساتھ پابندی کرتی تھی۔ سرجیائی نہ صرف بیٹا ہونے کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھکر اُس سے محبت نہ کرتا تھا۔ بلکہ وہ اس کو ذی عقل، دنیا میں سب سے بہتر، سب سے زیادہ نیک اور قابل محبت ہستی خیال کرتا تھا۔ تاتیانا ہم دونوں پر عموماً اور خصوصاً مجھ پر ہمیشہ مہربانی کرتی تھی۔ اور وہ خوش تھی کہ اس کا لخت جگر میرے ساتھ شادی کرنے والا ہے۔ لیکن نسبت ہوجانے کے بعد جب مَیں اُس سے ملتی تھی تو وہ اس امر کو میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتی۔ کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بہترین شریک زندگی نہ تھے۔ اور یہ کہ اس بات کو مجھے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ مَیں اس کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہُو چکی تھی۔ اور اُس کے خیال سے متفق تھی۔

کنوار پنے کے آخری دو ہفتوں میں ہم دونوں ایک دوسرے سے روزانہ ملتے رہے۔ وہ دوپہر کو آتا تھا اور آدھی رات تک میرے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن باوجود اس اظہار خیال کے کہ وہ میرے بغیر زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اور مَیں بھی جانتی تھی کہ وہ سچ کہتا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ کبھی ایک پُورا دن بھی بسر نہ کیا۔ اور برابر اپنے کاموں میں پوری توجہ کے ساتھ مصروف رہا۔

ہمارے ظاہری تعلقات شادی کے دن تک بدستور سابق قائم رہے۔ ہم ہنوز مثل سابق ایک دوسرے کو "تم" کہکر مخاطب کرتے تھے۔ وہ میری دست بوسی سے گریزاں رہا۔ اور بجائے ایسے موقعوں کی تلاش کے کہ ہم دونوں خلوت میں بیٹھیں۔ اُس نے ایسے موقعوں پر دیدہ و دانستہ چشم پوشی سے کام لیا۔ وہ دراصل اس خیال سے خائف معلوم ہوتا تھا کہ جو محبت اُس کے دل میں ہے کہیں ترقی کرکے خطرناک صورت نہ اختیار کرلے۔

مَیں نہیں کہہ سکتی کہ آیا وہ خود تبدیل ہوگیا تھا، یا مَیں ہی بدل گئی تھی۔ اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ مَیں بھی اُسی راہ میں گامزن تھی۔ جس پر وہ خود چل رہا تھا۔ اب وہ سادگی اور بھولا پن نظر نہ آتا تھا جو شروع میں مجھے

ناپسند تھا میں دیکھتی تھی کہ بجائے ایک شخص کے جس کی موجودگی سے دل میں عزت اور خوف پیدا ہو۔ وہ ایک ایسا بھولا اور معصوم بچہ معلوم ہوتا تھا جو جوشِ مسرت میں قابو سے باہر ہو۔

میں اکثر اپنے دل میں کہا کرتی تھی کہ" اس میں کوئی خاص تعجب خیز بات نہیں ہے وہ صرف ایک انسان ہے جیسی میں ہوں۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

اب مجھے معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ اور میں اس کو اچھی طرح پہچان گئی ہوں۔ تمام باتیں جو اس کے اندر مجھے نظر آتی تھیں۔ بالکل صاف اور میری طبیعت کے مطابق تھیں۔ حتےٰ کہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق اس کی جو رائے ہوتی وہی میری رائے بھی ہوتی' فرق صرف اسقدر تھا کہ وہ اس کو زیادہ واضح اور بہترین الفاظ میں بیان کر دیتا تھا۔

اس زمانہ میں موسم کی حالت اچھی نہ تھی اور ہم وقت کا زیادہ حصہ گھر میں رہکر گذارتے تھے۔ ہماری بہترین اور محبت آمیز گفتگو پیانو اور کھڑکی کے درمیان بیٹھ کر ہوا کرتی تھی۔ شمع کی روشنی کھڑکی کے آئینوں پر پڑکر منعکس ہوتی تھی جن پر وقتاً فوقتاً بارش کے قطرے گر کر بہنے لگتے تھے۔ چھت پر مینہ برسنے کی آواز سنائی دیتی۔ اور پانی پرنالے کی راہ سے بہکر تالاب میں چلا جاتا تھا۔ کھڑکی پر تری ہی تری ہوتی اور ہمارا خلوتکدہ اس کی وجہ سے نہایت آرام دہ معلوم ہوتا تھا

ایک دن شام کے وقت جب ہم دیر تک اس جگہ بیٹھے رہے تھے تو اس نے کہا" کیا تم کو معلوم ہے کہ میں عرصہ سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں اس پر تمہارے لڑکپن کے زمانے سے برابر غور کرتا رہا ہوں"

میں نے جواب دیا" مجھ سے کچھ نہ کہو۔ میں اسکو بخوبی جانتی ہوں۔"

"بیشک تمہارا کہنا درست ہے۔ مجھے خاموش ہی رہنا چاہئے۔

میں نے دریافت کیا" اوہ! اچھا کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو"

"یہ نہ ہے' کیا تم کو یاد ہے کہ میں نے تم سے زبید اور ایک حسینہ کا قصہ کہا تھا؟"

"اس حماقت آمیز قصہ کو یاد رکھنے کا خیال فضول ہے اس کا انجام جو کچھ ہوا بہتر ہوا۔"

اگر تھوڑا سا زمانہ اور گذر جاتا تو مجھے کبھی مسرت نصیب نہ ہوتی۔ تم نے میری جان بچائی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں تم سے ہمیشہ جھوٹ بولتا رہا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔ اور اب میں اس قصہ کا باقی حصہ ختم کرنا چاہتا ہوں"

میں نے کہا" جناب اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا" گھبرایئے نہیں

میری خواہش صرف اسقدر ہے۔ کہ میں اپنی حقیقت پورے طور پر تمہارے روبرو ظاہر کر دوں۔ جب میں تم سے گفتگو کرنا شروع کرتا تھا تو مجھے دلیل و بحث کی ضرورت ہوتی تھی۔"

میں نے کہا" دلیل و بحث! یہ تو بالکل غیر ضروری ہیں"

اُس نے جوابدیا" لاریب، میں نامناسب طور پر حجت کیا کرتا تھا۔ اپنی غلطیوں کے بعد جب میں دیہات میں رہنے کے لئے آیا تھا۔ تو میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ محبت کے خزانے میں میرا کچھ حصہ نہیں ہے۔ اور میں نے سمجھ لیا تھا۔ کہ اب میرا فرض صرف اسقدر ہے۔ کہ بقیہ زندگی جس طرح بھی ہو خاموشی کے ساتھ گزار دوں۔ مدت کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ تمہارے متعلق میرے جذبات کیا ہیں۔ اور جذبات کی یہ رو مجھے کس طرف لے جا رہی ہے۔ میں ایک بیم و رجا کی حالت میں تھا۔ بعض اوقات مجھے خیال ہوتا تھا کہ تم میرے ساتھ صرف عشوہ سازی کرتی ہو۔ لیکن پھر میرا اعتقاد بدل جاتا تھا۔ دراصل مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مگر اس شام کے بعد ——— تم کو یاد ہوگا۔ جب ہم اس چاندنی رات میں باغ میں گشت لگا رہے تھے ——— میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اور وہ اسقدر زیادہ ہو گئی تھی کہ میرے نزدیک حدود امکان سے باہر تھی۔ اب بتاؤ کہ اگر اس وقت میں اپنے دل میں امید کو جگہ دیتا۔ اور پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تو میرا کیا حشر ہوتا؟ لیکن حقیقت میں مجھے صرف اپنا ہی خیال ہوا۔ کیونکہ میں ایک بدنصیب خودغرض شخص ہوں"

وہ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ اور میری طرف دیکھنے لگا۔

اُس نے پھر کہنا شروع کیا" تاہم اس وقت میرا گفتگو کرنا محض فضول نہ تھا۔ کیونکہ تم جانتی ہو کہ میرے خوفزدہ ہونے کے بہت سے اسباب تھے۔ میں تم سے بہت سے فائدے اُٹھاتا ہوں اور تم کو میری ذات سے کوئی فایدہ نہیں ہوتا۔ تم ہنوز ناتجربہ کار ہو۔ یا بالفاظ دیگر ایک غنچۂ ناشگفتہ۔ تم پہلی بار محبت سے لذت آشنا ہو۔ درآنحالیکہ میں ——— "

میں نے کہا" ہاں اُس کے متعلق سب باتیں سچ سچ کہدو" لیکن یکایک میں ایک ناگہانی خوف سے لرزنے لگی کہ خدا جانے اس کا جواب کیا ہو۔ میں نے پھر کہا" نہیں نہیں ان باتوں کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

اُس نے فوراً ہی میرے خیالات کو معلوم کر لیا۔ اور کہنے لگا" تمہارا مطلب شاید یہ ہے۔ کہ میں نے کبھی پہلے بھی کسی سے محبت کی ہے؟ ہاں میں تمہیں بتا سکتا ہوں سنو میں نے کبھی پہلے کسی سے محبت نہیں کی، مجھے کبھی محبت کے جذبات سے متاثر ہونے کا تجربہ نہیں ہوا"

لیکن یکایک کوئی تکلیف دہ خیال اُس کے دماغ میں

میں آتا ہوا معلوم ہوا۔ اور اُس نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "صرف یہی جگہ ہے جہاں مجھے ایک ایسے دل کی ضرورت ہوتی جیسا کہ تمہارا دل ہے۔ تاکہ میں تم سے محبت کرنے کے لائق بنوں اس لئے تم سے اظہارِ محبت کرنے سے قبل کیا میرے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ میں ان سب باتوں پر غور کر لوں؟ مجھے تم کو کیا دینا چاہیئے؟ صرف "محبت" اور یہی ایک چیز ہے۔"

میں نے اس سے نظر ملا کر کہا۔ "کیا یہ کچھ کم ہے؟"

"کم، میری پیاری! تمہارے لئے یہ بہت کم ہے تم نوجوان ہو۔ حسین ہو۔ میں اسقدر مسرور ہوں کہ اکثر رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔ اور سوچتا رہتا ہوں کہ ہم دونوں کس طرح باہم زندگی بسر کرینگے۔ مجھے اپنی زندگی میں بہت سے تجربے ہوتے اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھ کو وہ سب کچھ مل گیا۔ جو انسان کو خوش و خرم رہنے کے لئے لازمی ہے دیہات کے خلوتکدہ میں خاموش اور تنہا زندگی بسر کرنا، ان لوگوں کو فائدہ پہنچانا جن کے ساتھ سلوک کرنا آسان ہے اور جو اس کے مطلقاً عادی نہیں ہیں۔ پھر کام کرنا ۔۔۔ ایسا کام جو اپنا ثمرہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ پھر آرام کرنا، صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کرنا، کتابیں پڑھنا، موسیقی سے دل بہلانا، اور اپنے ہمجنسوں سے محبت رکھنا میرے خیال میں انسان کو خوش رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اور اس سے بلند کوئی اور معیارِ زندگی میرے سامنے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک ایسے رفیق کا ہونا جیسی کہ تم ہو اور شاید اولاد کی موجودگی بھی۔ غرض یہاں وہ سب کچھ موجود ہے۔ جس کی ایک شخص کو اس دُنیا میں خواہش ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بیشک"

اُس نے جواب دیا۔ "ہاں یہ صرف میرے لئے ہے۔ کیونکہ میرے شباب کا زمانہ گزر چکا ہے۔ لیکن تمہارے واسطے نہیں۔ تم نے ابھی دُنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ تم شاید ہنوز کسی اور ذریعہ سے مسرت حاصل کرنے کی متلاشی ہو۔ اور شاید وہ تم کو مل بھی جاتے۔ اس وقت تم کو اپنی موجودہ حالت ہی میں مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ تم کو مجھ سے محبت ہے۔"

میں نے کہا۔ "جی نہیں، یہ پُرسکون خانگی مسرت ہمیشہ سے مجھ کو پسند رہی ہے۔ اور تم نے صرف میرے اُن خیالات کو ظاہر کیا ہے۔ جن پر میں ہمیشہ غور کرتی رہی ہوں۔"

وہ مُسکرایا اور سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا۔ "میری پیاری! صرف تم کو ہی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہ تمہارے لئے بہت کم ہے، تم نوعمر ہو، حسین ہو۔"

مجھے غصہ آگیا۔ کیونکہ اس نے میرے کہنے کا اعتبار نہ کیا تھا اور میری جوانی اور حسن کو ہدف ملامت بنایا تھا۔

میں نے غصہ کے لہجہ میں دریافت کیا۔ "تو پھر تم مجھ سے کیوں محبت کرتے ہو ۔۔۔ میرے حسن سے یا میری ذات سے؟"

اُس نے تیز اور سحر کن نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا "مجھے معلوم نہیں مگر مَیں تم کو چاہتا ہوں"

مَیں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور اس کی صورت دیکھنے لگی۔

یکایک میرے جذبات میں ایک انقلاب پیدا ہُوا۔ پہلے تو اردگرد کی چیزیں مجھے دکھائی نہ دیں۔ پھر اس کا چہرہ میری نگاہوں سے پوشیدہ ہوگیا۔ صرف اس کی آنکھیں میری نگاہ کے سامنے چمکتی ہُوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ اس کی نظروں نے مجھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ہر شے دھندلی نظر آنے لگی۔ اور ہر چیز میری نگاہوں سے پوشیدہ ہوگئی۔ اور مجھے اس مسرت اور خوف کے احساس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لینی پڑیں۔ جو اس کی نظر سے مجھ پر طاری ہوگیا تھا۔

اس دن شام کے وقت جو ہماری شادی کے لئے مقرر ہُوا تھا۔ دوپہر کے وقت مطلع صاف ہوگیا۔ اور بارش کے بعد جو موسم گرما ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ ہم کو صاف اور فرحت بخش موسم خزاں کی شام نصیب ہوتی۔ ہر چیز نم آلود، خوشگوار اور باصرہ نواز تھی۔ اور پہلی بار باغ کے کنجوں کا منظر خزاں کے مارے ہُوئے پتّوں کے گر جانے سے صاف ہوا تھا۔ آسمان صاف و شفاف اور زرد تھا۔ مَیں سونے کے لئے چلی گئی۔ اور اس خیال سے مسرور تھی۔ کہ ہماری شادی کے دن موسم خوشگوار رہیگا۔

اُس روز مَیں طلوع آفتاب کے ساتھ بیدار ہوئی اور اس خیال میں ڈوبی ہُوئی تھی۔ کہ وہ وقت آگیا ہے جس سے میں لرزاں اور متعجب تھی۔ مَیں باغ میں چلی گئی۔ آفتاب ابھی ابھی طلوع ہُوا تھا۔ اس کی روشنی لیمو کے ان درختوں کے نازک اور زرد پتّوں سے جو روشوں پر سایہ کئے ہُوئے تھے۔ چھن رہی تھی۔ روشیں خشک پتّوں سے ڈھکی ہُوئی تھیں بیرین کے شکن آلود گچھّے شاخوں پر سُرخ ہو رہے تھے۔ جن کے گرد ابتک پالے سے ماری ہُوئی چند پتّیاں لٹک رہی تھیں۔ پودے پژمردہ اور سیاہ تھے۔ پالا زرد سبز گھاس اور مکان کے نزدیک مرجھائے ہُوئے درختوں پر چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ اور صاف و خوشگوار سطح فلک پر بادل کا نام نہ تھا۔

مَیں نے اپنے دل میں کہا۔ "کیا یہی دن ہے؟" کیونکہ جوش مسرت میں مجھے اس کا یقین نہ تھا۔ "کیا واقعی آج وہی دن ہے جبکہ مَیں کل صبح اس گھر میں بیدار نہ ہونگی بلکہ نکولسکوئی کے مسقف مکان میں؟ کیا یہ صحیح ہے۔ کہ اب مجھے اس کے آنے کا انتظار نہ کرنا پڑیگا نہ اس سے ملنے کے لئے جانے کی ضرورت ہوگی۔ اور نہ کاٹیا سے اسکے متعلق گفتگو کرنی پڑیگی؟ کیا اب پوکروسکوئی کے مکان کے ملاقاتی کمرہ میں پیانو کے پاس اُس کے پاس نہ بیٹھونگی؟ کیا اب مجھے اُس کی آمد کے انتظار میں چشم براہ رہنا اور تاریک راتوں میں اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے پریشان ہونا پڑیگا؟"

لیکن اس وقت مجھے یاد آیا کہ کل شام کو اس نے مجھ سے کہا تھا " یہ کل کے واسطے ہے " اور ایک لمحہ کے لئے مجھے اس کا یقین ہو کر پھر کچھ شک سا ہو گیا تھا۔

میں سوچتی تھی کیا یہ ممکن ہے کہ پرسوں نڈیوزا، غریب گریگوری اور کاتیا کے بغیر مجھے اپنی خوشدامن ہی کیساتھ رہنا ہوگا؟ کیا میں اپنی دایہ کو رات کا سلام نہ کہہ سکونگی؟ اور قدیم رسم کے مطابق اب اس کو میرے سینہ پر صلیب کا نشان بنانے اور مجھے اس کو سلام کرنے کا موقعہ نہ ملیگا؟ کیا اب مجھ کو سونیا کو بڑھانے اس کے ساتھ کھیلنے، صبح کو اسے بلانے کی غرض سے دیوار پر دستک دینے اور اس کی دلکش ہنسی کو سننے کا اتفاق نہ ہوگا؟ کیا آج میری شخصیت تبدیل ہو جائیگی اور میں خود اپنے لئے بھی بیگانہ بن جاونگی؟ کیا اب نئی زندگی کا دور شروع ہوگا۔ اور کیا میری آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو جائینگی؛ اور کیا زندگی کا یہ دورِ جدید ہمیشہ قائم رہیگا؟

میں بے صبری کے ساتھ اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ میرے لئے ان خیالات میں تنہا رہنا بہت دشوار تھا۔

وہ جلد ہی آگیا اور جب میں نے اس کو دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ آج میں اس کی شریکِ زندگی بن جاونگی اور اس خیال کے آتے ہی مجھے سکون حاصل ہو گیا۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے والد مرحوم کی روح پر فاتحہ پڑھنے کے لئے ہم گرجا گئے۔

جب ہم گھر کو واپس آ رہے تھے تو مجھے خیال ہوا کہ کاش! وہ آج زندہ ہوتے!! " اور میں خاموشی کے ساتھ اس شخص کے بازو پر سر رکھے ہوئے تھی جو مرحوم کا گہرا دوست رہ چکا تھا۔

نماز کے دوران میں جب میں نے دو زانو ہو کر اپنی پیشانی گرجا کے ٹھنڈے فرش پر رکھی تو میں والد مرحوم کی یاد میں محو ہو گئی اور مجھے پورا یقین تھا کہ ان کی روح مجھے دیکھ رہی ہے۔ اور میرے انتخاب کو پسند کرتی ہے۔ نیز مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ان کی پاک روح ہمارے سروں پر سایہ فگن ہے۔ اور ہمارے حق میں محو دعا ہے۔ ان کی یاد، امید، مسرت اور غم کے جذبات ایک مسرت بخش اور روح پرور جذبہ کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ اور خاموش فضا، اور سرد ہوا نے اس جذبہ کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ خاموشی، وسیع وصاف میدان اور زرد آسمان نے، جہاں سے تیز مگر سکون بخش شعاعیں آ آکر ہر چیز پر پڑ رہی تھیں میرے رخساروں کے رنگ کو بھی نمایاں کر دیا تھا۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی میرے جذبہ سے متاثر ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ میرا ہمقدم تھا۔ اس کا چہرہ، جسے میں بار بار دیکھتی تھی۔ ایسا سنجیدہ اور متین تھا جس سے خوشی یا رنج کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ اور اس وقت فضائے دہر اور میرے قلب کی بھی یہی کیفیت تھی۔

یکایک وہ میری جانب متوجہ ہوا اور مجھے محسوس ہوا کہ

وہ مجھ سے کچھ لینا چاہتا ہے۔ مگر مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ اس شخص کا ذکر نہ کرے جسکے تصور میں اسوقت تک میں محو ہوں

اُس نے والد مرحوم کا ذکر چھیڑا اگرچہ اُن کا نام نہیں لیا۔ اُس نے کہا "ایک مرتبہ اُنھوں نے مجھ سے مذاق میں کہا تھا کہ تم کو ہماری دلربا کے ساتھ شادی کرنا چاہیئے"

مَیں نے اُس کے اس ہاتھ کو جس پر میں سہارا لیے ہوئے تھی۔ جوش میں دبا کر جواب دیا "وہ اسوقت کسقدر خوش ہوتے!"

اُس نے مجھ سے نظر ملا کر کہا "ہاں اُس وقت تم کمسن تھیں۔ میں اُن کو بہت پسند کرتا تھا۔ میں تمہاری آنکھوں کو بوسہ دیا کرتا تھا۔ کیونکہ یہ مثل اُن کی آنکھوں کے تھیں۔ مجھے خیال بھی نہ تھا یہ بذاتِ خود میرے لئے موجب انبساط ہو جائینگی۔ اُس وقت میں تم کو دلربا کے نام سے پکارا کرتا تھا"

مَیں نے کہا "مجھے 'تم' نہ کہو بلکہ 'تُو' کہکر مخاطب کرو"

اُس نے جواب دیا "اس کی تو مجھے خود بھی خواہش ہے۔ مگر اب مجھے یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ تو تمام و کمال میری ہے"

اتنا کہکر وہ خاموش ہوگیا اور اس کی ساکن و مسرور اور مسحور کن نظریں میرے چہرہ پر جم گئیں۔ ہم آہستہ آہستہ راستہ سے گذر رہے تھے۔ اور اناج کے تودوں کے درمیان بمشکل کسی کو نظر آسکتے تھے۔ صرف ہمارے قدموں کی آہٹ اور ہماری آوازیں فضا کی خاموشی کو توڑ دیتی تھیں۔ ایک جانب نالہ کے اُس پار فاصلہ پر صاف کھیت تھے ایک کسان ہمارے نزدیک اپنے بھدّے ہل کے ذریعہ سے خاموشی کیساتھ زمین پر ایک نشان بناتا جاتا تھا۔ جو برابر چوڑا ہوتا جاتا تھا گھوڑوں کا ایک گلہ دامن کہسار میں پھیلا ہوا ہمارے قریب ہی معلوم ہوتا تھا۔

دوسری جانب ہمارے بالکل مقابل پالے سے مارا ہوا موسم سرما کا گیہوں کا کھیت تھا۔ جس میں کہیں کہیں سبز پودے تھے۔ اور جو جنگل کے کنارے کنارے باغ تک اور اُس مکان تک پھیلا ہوا تھا۔ جو اُس کے عقب میں صاف نظر آرہا تھا۔ موسم خزاں کے آفتاب کی پہلی کرنیں ہر شے کو روشن بنا رہی تھیں۔ ہر طرف مکڑی کا جالا تنا ہوا تھا۔ جو ہمارے چاروں طرف ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اور پالے سے مارے ہوئے کھیتوں پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ جالا ہماری آنکھوں سر کے بالوں اور ہماری پوشاک کو چمٹ جاتا تھا۔ جب ہم بات چیت کرتے تو ہماری آوازیں فضائے خاموش میں گونجنے لگتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا ہم تنہا نیلے آسمان کے زیر سایہ ایک ایسی وسیع دنیا میں ہیں۔ جس پر آفتاب کی خوشگوار روشن اور مرتعش شعاعیں کھیل رہی تھیں۔

میں بھی اس کو "تُو" کے محبت آمیز ضمیر سے مخاطب کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کو "تُو" کہکر پکارتے ہوئے مجھے شرم معلوم ہوتی تھی

میں نے جلدی اور آہستگی سے کہا "تو اسقدر تیزی کے ساتھ کیوں قدم اُٹھا رہا ہے؟" اور مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ

سرخ ہوگئی ہے۔

اُس نے اپنی رفتار کم کردی اور محبت و مسرت سے بھری ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

جب ہم گھر پہنچے تو اس کی والدہ اور وہ مہمان جن کو ہم نے مجبوراً مدعو کیا تھا پہلے ہی سے جمع ہو چکے تھے۔ اور اُس وقت تک جبکہ ہم گرجا سے رخصت ہو کر نکولسکوئی جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوئے مجھے اس کے ساتھ تنہائی نصیب نہ ہوئی۔

گرجا قریب بالکل خالی تھا۔ میں نے دزدیدہ نظر سے دیکھا کہ اس کی ماں مسنفدی کے ساتھ مغنیوں کے بیٹھنے کی جگہ پر کھڑی تھی۔ کاٹیا جس کی ٹوپی میں سوسنی فیتہ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف کھڑی اشکبار تھی۔ اور دو تین کسان بھی موجود تھے۔ جو میری زیارت کے شوق میں آئے تھے۔

میں نے اُن کی طرف نظر نہ کی لیکن مجھے اس کی نزدیکی کا احساس تھا۔ میں نے دُعا کے الفاظ سنے۔ اور ان کو منہ ہی منہ میں دہرایا۔ مگر میری روح بیدار نہ ہوئی۔ میں دُعا نہ مانگ سکی بلکہ سادہ لوئی سے قربانگاہ کے پردہ کے قریب پادری کے پیچھے کھڑی ہوئی منقش صلیب اور کھڑکیوں کی طرف دیکھتی رہی کیونکہ مجھے ہر چیز خواب و خیال معلوم ہو رہی تھی۔

مجھے ایک اضطراب آمیز احساس تھا۔ کہ مجھ میں کوئی بڑا انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ جب پادری صلیب لئے ہوئے ہماری طرف مخاطب ہوا، ہم کو مبارکباد دی۔ اور کہا کہ میں نے تم کو بپتسمہ دیا ہے۔ اور خدا نے مجھے یہ اجازت دی ہے کہ تم کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کردوں۔ کاٹیا اور اسکی والدہ نے ہماری پیشانیوں کو بوسہ دیا۔ اور جیسے ہی میں نے گریگوری کی آواز سنی کہ وہ گاڑی والے کو بلا رہا تھا۔ تو میں متعجب اور خوفزدہ ہوگئی۔ کیونکہ سب مراسم ختم ہو چکے تھے۔ مگر میری روح میں کوئی خاص کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ ہاں اس مقدس رسم سے جو میرے لئے ادا کی گئی تھی۔ میرے دل میں کوئی خاص کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ یہ بوسہ ہمارے جذبات کے مقابلہ میں غیر معمولی اور عجیب سا تھا۔

میں نے اپنے دل میں کہا "بس اتنی ہی بات تھی!"

ہم گرجے کے دروازہ کی طرف بڑھے۔ گاڑی کے پہیوں کی آواز گنبد میں گونج رہی تھی۔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ اُس نے اپنی ٹوپی سر پر رکھی اور مجھے سہارا دیکر گاڑی میں بٹھا دیا۔ میں نے گاڑی کی کھڑکی میں سے پالے سے ڈھکے ہوئے ہلال کو دیکھا۔

وہ میرے برابر بیٹھ گیا۔ اور گاڑی کا دروازہ بند کر دیا میرا دل دھڑکنے لگا۔ اور وہ خود اعتمادی جس کی وجہ سے اُس نے ایسا کیا تھا۔ مجھے ہتک آمیز معلوم ہوئی۔

کاٹیا نے میرا سر ٹھیک کرنے کے لئے کہا۔ گاڑی کے پہیئے

ایک پتھر سے ٹکرائے۔ اور پھر ہم کشادہ سڑک پر پہنچکر روانہ ہو گئے۔ میں گاڑی کے ایک کونے میں بیٹھ کر کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ دور افتادہ کھیتوں اور سڑک پر ماہتاب کی سرد اور زرد کرنوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ اگرچہ میں نے اس کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ مگر مجھے اپنے قریب اس کی موجودگی کا برابر احساس رہا۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "کیا یہی اُس لمحہ کا ماحصل ہے جس کے لئے میں بے صبری سے منتظر تھی؟" اور اسکے نزدیک اس طرح بیٹھنے میں مجھے حقارت اور شرم معلوم ہوتی میں اُس سے ہمکلام ہونے کی غرض سے اس کی طرف مخاطب ہوئی۔ مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔ گویا محبت کے پہلے جذبات میں سے اب میرے دل میں کچھ بھی نہ تھا۔ اور اُن کی جگہ شرم اور دہشت نے لے لی تھی۔

اپنی جانب مخاطب پاکر اُس نے کہا۔ "اس وقت تک بھی مجھے اس کا یقین نہ تھا۔ کہ میری تمنا پوری ہوگی"

میں نے جواب دیا۔ "لیکن بہر حال میرے لئے یہ سامانِ وحشت ہے"

اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اور اپنے لبوں سے لگا کر کہا۔ "کیا مجھ سے تم خوفزدہ ہو؟"

میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں بے حس و حرکت تھا۔ اور میرے دل میں ایک تکلیف دہ بے التفاتی پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے آہستگی سے کہا۔ "ہاں"

لیکن فوراً ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ اور یکایک میں نے اُس کے ہاتھ کو دبایا۔ میری رگ رگ میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ میری نظریں اس کی نظروں میں پیوست ہو گئیں اور مجھے معلوم ہوا کہ میں اُس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ بلکہ یہ اضطراب صرف وہ "محبت" تھی۔ جواب پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب میں بالکل اس کی ہو چکی ہوں۔ اور اُس کے زیر فرمان رہنے سے مسرور ہوں (باقی باقی)

چراغِ انجمن

نیرنگ حسن و عشق ہر اک انجمن میں ہے
جو پھول ہے وہ چاک گریباں چمن میں ہے

وہ خوش کہ تم کو داغِ تمنا ہوا نصیب
میں خوش کہ اک چراغ میری انجمن میں ہے

بیتاب ہوں کہ کس کو تماشا بنا دیا
تو بھی تو دیکھ کون تری انجمن میں ہے

جب تو نہ تھا تو شمع بھی تھی انجمن بھی تھی
اب کچھ نہیں نظر میں جو تو انجمن میں ہے

انجمن کی بیکسی بھی ہے ہنگامہ آفرین
غربت میں اس طرح ہے کہ گویا وطن میں ہے

احسن بسمل

کسی کی آرزو

ہرے ہوئے ہیں زخم پھر وہ موسم بہار میں — پڑے ہوئے تھے مضمحل جو سینۂ فگار میں
کھلے ہیں داغ مثل گل جگر کے لالہ زار میں — جو دیکھنے ہو پھول تم میرے گلے کے ہار میں
گندھے ہوئے ہیں لخت دل یہ آنسوؤں کی تار میں

مریض عشق پر کرے اثر کوئی علاج کیا — گلوں کے رنگ و بو سے ہو سرور و ابتہاج کیا
نسیم خوشگوار سے شگفتہ ہو مزاج کیا — مجھے چمن کے سیر کی بتاؤ احتیاج کیا
ہزاروں گل کھلے ہوئے ہیں قلب داغدار میں

تڑپ رہا ہے درد دل طپاں ہے دل کنار میں — بدل رہا ہے کروٹیں جگر بھی اضطرار میں
مچل رہے ہیں طفل اشک چشم اشکبار میں — یہ کس کی یاد آگئی الٰہی احتضار میں
کہ تار ہچکیوں کا ہے بندھا نفس کے تار میں

نہ جانے دھیان ہے کدھر دل شکستہ حال کا — سماں نگاہ شوق میں ہے کس کے خط و خال کا
کہاں ہے دام و دانہ آج طائر خیال کا — بندھا ہوا ہے نزع میں خیال کس جمال کا
یہ میری چشم نیم وا ہے کس کے انتظار میں

مذاق لطف زندگی سے گرچہ ہاتھ دھو چکا — کہاں کا لطف زندگی میں جان کو بھی رو چکا
تپ غم فراق میں حواس و ہوش کھو چکا — جگر بھی آتش دروں سے جل کے خاک ہو چکا
مگر ابھی ہے جان کچھ دل وفا شعار میں

فغاں میں شان دلکشی نہیں اگر نہیں سہی — مذاق نغمہ خوشی نہیں اگر نہیں سہی
شگفتگی و تازگی نہیں اگر نہیں سہی — لہو کی ایک بوند بھی نہیں اگر نہیں سہی
کسی کی آرزو تو ہے دل امیدوار میں

طاہر

آخری ارمان

مارس لیبلانک کے افسانے جیوش لیمپ کا ترجمہ

(بسلسلۂ گزشتہ)

[illegible] نے دروازہ ہلایا۔ شیر نے اپنے کندھوں سے [illegible] دھکا دیا۔ اور اُس کو توڑ کر کھول دیا۔ وہ دونوں اندر پہنچے لیکن فوراً ہی ٹھہر گئے۔ ایک فیر کی آواز دوسرے کمرہ سے سُنائی دی۔ اور پھر دوسری۔ بعد ازاں کسی کے گرنے کا دھماکا ہُوا . . . . جب وہ داخل ہُوئے اُنہوں نے اس آدمی کو سنگ مرمر کے آتشکدہ پرُ منہ کے بل گرے ہوئے پایا۔ وہ حالتِ نزع میں تھا۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ سے نکلکر علیحدہ گر پڑا تھا۔

گینمارڈ جُھکا اور مردہ کے سر کو گھمایا۔ وہ خُون سے شرابور [illegible] اور ٹھوڑی کے دو بڑے زخموں سے بہ رہا تھا

"اب شنا[illegible]ت کیسے ہو" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"یقین کیجئے" شیر نے کہا۔ "کہ یہ وہ نہیں ہے۔"

"[illegible] نے کس طرح کہہ دیا؟ تم نے تو ابھی اسے غور سے دیکھا بھی نہیں۔"

انگریز سراغرساں نے جوابدیا۔

"کیا آپ خیال فرماتے ہیں کہ آرسین لوپن ایسا شخص ہے کہ خودکشی کرے؟"

"لیکن ہم کو یقین ہے کہ ہم نے اُسے باہر پہچان لیا تھا"

"یہ محض واہمہ تھا جس نے ہم کو یقین دلایا۔ یہ شخص ہمارے دماغ کو پراگندہ کر دیتا ہے۔"

"پھر یہ اُس کے ساتھیوں میں سے کوئی ہے"

"آرسین لوپن کے ساتھی خودکشی نہیں کرتے۔"

"تو پھر کون ہے؟"

اُنہوں نے جسم کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں ہالملاک شیر نے ایک خالی نوٹ کیس پایا۔ دوسری میں گینمارڈ نے چند لوئی سکہ پاتے اُس کی پوشاک وغیرہ پر کسی قسم کے نشانات نہ تھے۔

ٹرنک —— ایک بڑا صندوق اور دو بیگ جن میں ذاتی اور ضروری اشیاء کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آتشکدہ کے اُوپر اخباروں کا ایک بنڈل رکھا تھا۔ گینمارڈ نے ان کو کھولکر پڑھا۔ ان سب میں جیوش لیمپ کی چوری کا ذکر درج تھا۔ ایک گھنٹہ بعد جب گینمارڈ اور شیر نے مکان چھوڑا تو انکو اس

عجیب ہستی کا حال ذرہ برابر بھی معلوم نہ ہوا۔ جس نے مجبوراً اُن کے داخلہ سے خودکشی کر لی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کون تھا؟ اُس نے کیوں اپنی جان ضائع کی؟ اس کا جیوش لیمپ کی چوری سے کیا تعلق تھا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب پیچیدہ سوالات اور لاینحل معمے تھے۔

(۱۰)

ہالملاک شیبر نہایت پریشانی کی حالت میں بستر پر گیا جب وہ جاگا تو اُس نے ایک ضروری خط اپنے نام سرہانے رکھا ہوا پایا۔

"آرسین لوپن ایک برلین نامی شخص کی حیثیت میں اپنی دردناک موت کی آپ کو اطلاع دینے کی اجازت چاہتا ہے۔ اور التجا کرتا ہے کہ آپ اس کی میت میں شریک ہو کر عزت افزائی کیجئے۔ جو کہ سرکاری صرفہ سے پنجشنبہ واقعہ ۲۵ جون کو دفن کی جائیگی۔"

دوسرا باب

(۱)

"جناب۔ آپ نے ملاحظہ کیا۔" آرسین لوپن کا خط اپنے ہاتھ میں ہلاتے ہوئے ہالملاک شیبرز نے ولسن کو مخاطب کر کے کہا۔ "اس واقعہ کا بدترین پہلو یہ ہے۔ کہ اس کمبخت کی آنکھیں ہر وقت میری نگران کار رہتی ہیں۔ میرا اہم سے اہم راز بھی اس سے محفوظ نہیں رہتا۔ میں ایک ایسے ایکٹر کی طرح کام کر رہا ہوں۔ جس کے قدم تماشہ گاہ کے مقررہ قوانین کے مطابق اُٹھتے ہوں۔ جس کی ہر گفتگو ہر نقل و حرکت کسی ارفع طاقت کے زیر اثر عمل میں آتی ہو۔ ۔ ۔ ۔ مسٹر ولسن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کیا کہہ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ سمجھے بھی۔"

اس میں ذرا کلام نہیں کہ اگر ولسن ظاہرا ایک معمولی آدمی کی طرح مگر باطناً ۱۰۲ و ۱۰۴ ڈگری کی حرارت بخار کے درمیان مدہوش نہ سو رہا ہوتا۔ تو وہ ضرور شیبرز کی باتیں سمجھتا

لیکن شیبرز نے اس بات کی قطعی پرواہ نہ کر کے کہ آیا وہ اسکی گفتگو کو سُن رہا ہے یا نہیں۔ اپنا سلسلہ کلام یوں جاری رکھا

"اس کے لئے ضرورت ہے۔ کہ میرے تمام ذرائع اور دماغی قوتیں پست ہمت نہ ہونے پائیں۔ خوش قسمتی سے یہ چرکے میرے لئے ایسے زخم ہیں جو مجھے تڑپا کر اور زیادہ کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اگر کہیں خدانخواستہ ایک مرتبہ بھی یہ آگ ٹھنڈی ہو جائے اور زخم باقی نہ رہے۔ تو میں پھر ہمیشہ اپنی تقریر اس جملہ پر ختم کر دیا کروں۔" اچھا بھائی، تھنس لو" جلد یا بدیر تم خود اپنے ہی ہاتھوں کسی جال میں پھنس جاؤ گے۔ اچھا، ولسن اس تمام گفتگو کو سُننے کے

بعد کیا تم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کون ہی کی ذات تھی جس نے اولاً تو اپنے سابقہ تار اور اشارات کا جس کو اس نے ناسمجھ ہسٹر پا پر ظاہر کیا۔ اور بعد ازاں اپنی کل خفیہ خط و کتابت کا جو الاتس ڈلین سے کی گئی۔ پتہ بتلا دیا۔۔۔ کیوں دوست کیا تم اس تفصیل کو بھول سکتے ہو۔"

وہ کمرہ میں ادھر اُدھر اسقدر زور سے قدم مار کر ٹہلنے لگا کہ اس کے رفیق کی آنکھ کھل جائے۔

"خواہ معاملات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ اور یہ طریقہ جو میں نے اختیار کیا ہے تھوڑا سا ناقابل اطمینان ہی کیوں نہ نظر آئے۔ تاہم میں نے اس معاملہ کا ایک سرا پکڑ لیا ہے چنانچہ اس کو باقاعدہ شروع کرنے کے لئے میں بہت جلد ماسٹر برٹسین کے تفصیلی حالات معلوم کر لونگا میں نے انسپکٹر گینماڈ سے دریائے سین کے کنارے پر جہاں برٹسین نے پارسل پھینکا تھا۔ ملاقات کا وعدہ کر لیا ہے۔ اب ہم ضرور بالضرور معلوم کر لینگے۔ کہ وہ کون تھا۔ اور کیا چاہتا تھا۔ بقیہ امور کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ میرے اور الاتس ڈلین کے درمیان ایک کھیلا جانیوالا تماشہ ہے۔ اس میں حریف کچھ زبردست نہیں کیوں میاں ولسن۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ میں بہت جلد مرقع تصویر کے خفیہ جملہ کو معلوم کر لونگا۔ اور جان لونگا کہ وہ دو علیحدہ علیحدہ حرف ا۔ک کیا معنے رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ تمام راز انہیں میں مضمر ہے۔"

عین اسی وقت مبڈموانل کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور شیرز کو اس طرح بڑبڑاتے دیکھ کر اُس نے اپنے شانوں کو حرکت دیکر یوں کہا۔

"مسٹر شیرز، میں آپ سے سخت ناراض ہونگی اگر آپ نے میرے مریض کو بیدار کر دیا۔ یہ امر مناسب نہیں۔ کہ آپ خواہ مخواہ اُسے پریشان کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے خاموش رکھنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔"

اس کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے شیرز نے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ اور پہلے روز کی طرح اُسکے ناقابل بیان اطمینان کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔

"کیوں جناب شیرز صاحب یہ آپ ایسی بری طرح مجھے کیوں گھور رہے ہیں۔ آپ کے دل میں یقیناً کوئی شبہ ہے۔ جس کو آپ عمداً چھپانا چاہتے ہیں۔ وہ کیا ہے۔ ذرا براہِ عنایت مجھ پر بھی ظاہر کیجئے۔" تاباں چہرہ، دلربا آنکھوں تبسم زا ہونٹوں اور انتہائی اخلاقانہ انداز سے دونوں ہاتھ ملا کر خفیف سا آگے کو جھک کر اُس نے شیرز سے سوال کیا اور اپنے فقرات کو اسقدر سادگی و خلوص کے ساتھ بیان کیا کہ شیرز کو غصہ آگیا۔ لیکن اس جذبہ کو قطعی دبا کر وہ اُس کے قریب آیا۔ اور دبی زبان سے کہا۔

"کل برٹسین نے خودکشی کر لی۔"

ظاہراً اس کا کوئی مطلب نہ سمجھ کر خاتون نے بھی انہیں الفاظ کا اعادہ کر دیا۔ "کل برٹین نے خودکشی کر لی ....."

فی الحقیقت اس کے چہرہ پر نہ تو کسی تبدیلی کے آثار نمایاں ہوئے نہ کسی غلط بیانی کی کوشش کا اظہار۔

"اچھا، تم کو معلوم ہو چکا ہے" شیرز نے چڑچڑا کر کہا۔

"اور اگر یہ بات نہیں۔ تو کم از کم وہاں سے روانہ ہو چکی ہو گی۔۔۔ افسوس۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ تم کافی سے زیادہ چالاک ہو آخر یہ حیلہ سازی کیوں۔"

اس نے تصویروں کی کتاب کو جسے قریب کی میز پر رکھ دیا تھا۔ فوراً اُٹھا لیا۔ اور اس کے کٹے ہوئے اوراق کھول کر کہنے لگا۔ "کیا تم مجھے بتلا سکتی ہو۔ کہ یہاں سے غائب شدہ حروف کو میں کس طرح ترتیب دُوں تا کہ میں اس رقعہ کا صحیح مفہوم معلوم کر سکوں۔ جو تم نے جیوش لیمپ کی چوری سے چار یوم قبل برٹین کو بھیجا تھا"

"اجی حضرت، کیسی ترتیب، کون برٹین، کیسی جیوش لیمپ کی چوری۔"

خاتون نے یہ الفاظ مکرر وسہ کرر بآہستگی دُہرائے۔ گویا ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

شیرز نے پھر اصرار کیا۔

"ہاں، وہ الفاظ جن کو تم نے استعمال کیا... اچھا تو کاغذ کے پرچے پر تم نے برٹین کو کیا لکھا تھا؟"

"وہ الفاظ جو میں نے استعمال کئے..... میں تو یہ کہہ رہی تھی... کہ....."

ایکبارگی خاتون نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"آخاہ... یہ بات ہے... میں اب سمجھی..... گویا چوری میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ یعنے کوئی شخص ایم برٹین نامی ہے۔ جس نے جیوش لیمپ چرایا۔ اور کل خودکشی کر لی... میں اس شریف آدمی کی دوست ہوں۔ خوب، شیرز صاحب آہا۔ کیا بات پیدا کی ہے۔"

"خیر... کل شام کو ایونیو ڈی ٹرنس میں دوسری منزل پر تم کس سے ملنے گئی تھیں؟"

"اپنی کپڑا سینے والی میڈموازل لیجنز سے۔ کیا آپکا یہ خیال ہے کہ میرا دوست ایم برٹین اور میری درزن ایک اور صرف ایک ہی ہستی ہیں"

یہ گفتگو سُنکر شیرز کو پھر شک ہُوا۔ اور وہ سوچنے لگا۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ ضبط دل اور خیالات کو اس درجہ قابو میں لیا جا سکے۔ کہ دوسرا شخص قطعی دھوکا کھا جائے۔ خوف، مسرت، پریشانی کا چھپا لینا تو ممکن ہے۔ مگر لاپروائی اور پُر جوش قہقہے ایک شئے دیگر ہیں۔ بہرکیف اُس نے کہا۔

"اچھا صرف ایک آخری سوال.... گزشتہ شام کو گارڈی نارڈ کے سٹیشن پر تم نے مجھ کو کیوں مخاطب کیا تھا.... اور کیوں یہ التجا کی تھی کہ میں اس چوری کے معاملہ کو تحقیق کئے بغیر

واپس چلا جاؤں۔"

"اوہ مسٹر شیرز، آپ اب بہت زیادہ رازجوئی کی کوشش کر رہے ہیں۔" خاتون نے ہنوز اسی قدرتی انداز سے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اچھا، اب میں آپ کو یہ سزا دیتی ہوں۔ کہ اب آپ سے کچھ نہ کہونگی۔ اور دیکھئے جب تک کہ میں عطار کے پاس سے واپس نہ آجاؤں۔ آپ مریض کی تیمار داری کریں۔ مجھے ایک بہت ہی ضروری نسخہ تیار کرانا ہے۔ میں جلد واپس آؤنگی۔"

یہ کہکر وہ کمرہ سے رخصت ہوگئی۔

"اف مجھ کو فریب دیا گیا۔" شیرز نے بکنا شروع کیا "لاحول ولاقوۃ...... میں نے تو اس سے کوئی بات نہ معلوم کی۔ خود جو کچھ معلوم تھا اُسے آگاہ کر دیا۔"

اس وقت اسے اس نیلگوں ہیرے اور اُن سوالات جرح کے واقعات یاد آئے۔ جو اُس نے میڈم کلاٹلڈ ڈسٹیج[۱] کو مجبور کر کے معلوم کئے تھے۔ اس دوشیزہ خاتون نے بھی اس چالاکی سے کام لیا تھا جس کا اظہار وہ قبل ازیں سنہرے بالوں والی خاتون سے دیکھ چکا تھا۔ اب اس نے خیال کیا کہ وہ دوبارہ ایک ایسی ہستی کے مقابل ہے جو آرسین لوپن کی حفاظت میں اسی کے زیر اثر اسی کی ہدایات پر کاربند ہے۔ اور جو اہم ترین خطرناک صورتوں میں بھی انتہائی سکون و سنجیدگی کے ساتھ راز کو مخفی رکھ سکتی ہے۔

"شیرز...... شیرز......"

یہ ولسن کی آواز تھی۔ شیرز بستر کے قریب گیا۔ اور جھک کر پوچھنے لگا۔ "کہو بھائی کیا حال ہے۔ کیا طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو رہی ہے۔"

ولسن نے اپنے لبوں کو جنبش دی۔ لیکن آواز نہ نکل سکی۔ آخر کار کئی بار کی کوشش کے بعد اُس نے کہا۔

"نہیں...... شیرز...... یہ وہ نہیں تھی...... یہ...... نہیں ہو سکتی۔"

"تم اس وقت کیا بیہودہ باتیں بک رہے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ وہ یہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں لوپن سے تربیت و تعلیم یافتہ عورت کی موجودگی میں ایسی بیوقوفی کی باتیں کرتا ہوں کہ سارا دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ وہ مرقع تصویر کے متعلق تمام حالات سے واقف ہے۔ اور میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ ایک گھنٹہ سے کم ہی وقفہ میں لوپن کو اس وقت کی تمام گفتگو کا حال معلوم ہو جائیگا۔ ہاں ایک گھنٹہ سے کم میں...... ارے توبہ۔ یہ میں ایک گھنٹہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ ممکن ہے اس وقت تک اُسے سب کچھ معلوم ہو چکا ہو۔ یہ عطار اور ضروری نسخہ کی بھی خوب

[۱] میڈم کلاٹلڈ ڈسٹیج یا سنہرے بالوں والی خاتون کی حیرت انگیز کارروائیاں۔ آرسین لوپن کے کارناموں کے ساتھ دیکھنا ہوں۔ تو ناول ایرسٹ آف آرسین لوپن، کا ترجمہ خونی ہیرا ملاحظہ فرمایئے۔ جو لاہور ہی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

رہی۔ سب مکر و فریب۔۔۔۔ چالاکی۔"

ولسن کی نگہداشت و تیمارداری کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر وہ کمرہ سے تیزی کے ساتھ باہر نکلا۔ اور ایونیو ڈی مین کی طرف چل دیا۔ وہاں اُس نے بیڈموازل کو ایک عطار کی دکان میں داخل ہوتے دیکھا۔ دس منٹ بعد وہ سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی دو یا تین بوتلیں ہاتھ میں لئے باہر آئی اور جب مکان کی طرف واپس ہونے لگی۔ تو وہ ایک شخص سے مخاطب ہوئی۔ جو اُس کے پیچھے ہاتھ میں ٹوپی لئے اس طرح خوشامدیں کرتا آرہا تھا گویا بھیک مانگ رہا ہو۔

وہ لڑکی اُس کو کچھ دیا۔ اور پھر اپنی راہ چلنے لگی۔

"اُس نے ضرور اُس سے گفتگو کی"۔ انگریز جاسوس نے دل میں کہا۔

یہ ایک فطرتی شک تھا نہ کہ یقین کامل تاہم اس کے اصولِ تحقیق میں اس سے کوئی تغیر واقع نہ ہوسکتا تھا۔ چنانچہ خاتون کو چھوڑ کر وہ اس نقلی فقیر کے تعاقب میں لگ گیا۔

وہ اس طریقہ سے ایک دوسرے کے عقب میں پلیس سینٹ فرڈی نینڈ تک پہنچے۔

متعدد مرتبہ اپنی آنکھیں دوسری منزل کی کھڑکی کی طرف اٹھا کر داخل ہونے والے لوگوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نقلی فقیر نے برسین کے مکان کے گرد چکر لگایا۔

تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہ ایک ٹرام گاڑی میں سوار ہوگیا۔ جو نوئیلی کی طرف جارہی تھی۔ شیبرز بھی سوار ہوا۔ اور اُس شخص کے پیچھے تھوڑے فاصلہ پر ایک شریف آدمی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ جس کا چہرہ اس اخبار سے جسے وہ بہت انہماک کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ بالکل چھپا ہوا تھا۔ جب یہ سب شہر پناہ کے قریب پہنچے۔ تو اخبار نیچا ہوا۔ اب شیبرز نے گینمارڈ کو پہچانا گینمارڈ نے اُس شخص کی طرف اشارہ کرکے شیبرز سے کہا۔

"یہ وہی گزشتہ رات والا آدمی ہے۔ جو برسین کے ہمراہ تھا یہ احاطہ کے قریب ایک گھنٹہ سے پھر رہا تھا۔"

"برسین کے ہاتھ کوئی نئی بات معلوم ہوئی۔"

"ہاں آج صبح ایک خط اس کے نام کا آیا ہے۔"

"آج صبح کو۔۔۔۔ تو پھر ضرور یہ کل صبح برسین کی موت کی خبر کاتب کو معلوم ہونے سے قبل ڈاک میں ڈالا گیا ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک۔ یہی بات ہے۔ خط تو حاکمِ تفتیش کے پاس ہے۔ لیکن مجھے اُس کے الفاظ بجنسہٖ یاد ہیں۔ سنئے۔ "وہ کسی قسم کے راضی نامہ پر تیار نہیں۔ وہ ہر چیز لینا چاہتا ہے پہلی چیز اور وہ چیزیں جو دوسری واردات میں اڑائی گئیں۔ اگر نہیں تو وہ سب معاملات آشکارا کردیگا۔" اس پر کسی کے دستخط وغیرہ نہیں" گینمارڈ نے کہا۔ "اب آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کہ یہ چند مہمل سطور ہمارے لئے چنداں مفید نہیں۔"

"مسٹر گینمارڈ۔ میں سراسر آپ کا ہمخیال ہوں لیکن صرف اتنا ضرور ہے کہ میں ان سطور کو نہایت دلچسپ خیال کرتا ہوں۔"

"آخر کوئی وجہ۔ ذرا مجھے تو بتایئے۔"

"اپنے خاص ذاتی وجوہ کی بنا پر۔" شیرز نے کہا۔

ٹرام ایوڈی چیٹیوبر رکی۔ وہ شخص نیچے اترا۔ اور خاموشی کے ساتھ آگے روانہ ہوا۔

شیرز اس کے عقب میں اس قدر نزدیک پہنچ گیا کہ گینارڈ کو مجبوراً کہنا پڑا۔ "اگر وہ ذرا بھی مڑا تو ہم لوگوں کو دیکھ لیگا۔"

"وہ اب ہرگز نہ مڑیگا۔"

"یہ آپ نے کیسے کہدیا۔"

"یہ آرسین لوپن کا ساتھی ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں۔ کہ وہ اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈالے ہوئے چل رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے ذرا ہراس نہیں۔"

"بایں ہمہ ہم بھی اس کا نہایت احتیاط کے ساتھ تعاقب کر رہے ہیں۔"

"یہ کوئی بات نہیں۔ اگر وہ چاہے تو ہم لوگوں کے پنجہ سے ایک منٹ میں نکل سکتا ہے۔ اس کو اپنی ذات پر کامل بھروسہ ہے۔"

"آیئے۔ آیئے۔ ذرا میری طرح چھپتے ہوئے چلے آیئے دیکھئے۔ وہ ہوٹل کے دروازہ پر دو پولیس کانسٹبل سائیکل لئے کھڑے ہیں۔ اگر میں انہیں آواز دیکر اپنے دوست کی نگرانی کا حکم دیدوں تو پھر دیکھوں۔ یہ کیسے ہمارے پنجہ سے نکلجاتا ہے۔"

"باوجود اس کے ہمارا دوست ذرا بھی پریشان نظر نہیں آتا۔ آہا۔۔۔ لیجئے وہ خود ہی انہیں آواز دے رہا ہے۔"

"بخدا۔" گینارڈ نے کہا۔ "اس شخص کے ہتھکنڈے تو دیکھئے یہ شخص واقعی اُن دونوں پولیس والوں کے نزدیک ٹھیک ایسے وقت پہنچا جب وہ اپنی سائیکل پر سوار ہونیکی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس نے صرف چند لفظ اُن سے کہے اور یکدم ایک تیسری سائیکل پر جو ہوٹل کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ سوار ہوگیا۔ اور تیزی کے ساتھ اُن دونوں پولیس والوں کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔

انگریز جاسوس نے بڑے زور سے فرائشی قہقہہ لگایا۔

"فرمائیے حضرت۔ میں نے آپ سے کیا کہا تھا۔ جونہی ہم وہاں پہنچیں وہ خود ہی مع ہمارے دونوں ساتھیوں کے چلتا بنا ایم گینارڈ صاحب دیکھ لیا آپ نے وہ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے۔ یا آرسین لوپن۔۔ سائیکل سوار پولیس والوں کے ساتھ۔۔۔۔ کیا میں نے آپ سے عرض نہیں کیا تھا۔ کہ ہمارا دوست بہت ہی سنجیدگی سے کام لے رہا ہے۔"

"اچھا تو پھر اب" گینارڈ نے غصہ میں چلا کر کہا۔

"میں کیا کر سکتا تھا۔ یہ آپ نے ہنسنے کا اچھا موقعہ نکالا"

"چلتے چلتے۔ غصہ نہ ہوجئے۔ ہم بہت جلد عوض لے لینگے۔ فی الحال ہمیں صرف ذراسی امداد کی ضرورت ہے۔"

"ایونیوڈی نوئیلی کے خاتمہ پر فولین فانٹ سارجنٹ

میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"بہت خوب.... اُس کو ہمراہ لیکر آپ دونوں میرا ساتھ دیجئے۔"

گینمارڈ چلا گیا اور شیرز سائیکل کے نشانات پر روانہ ہوا۔ جو آسانی کے ساتھ سڑک پر نظر آتے تھے۔ اُس نے بہت جلد معلوم کر لیا۔ کہ یہ نشانات دریائے سین کی طرف رہبری کر رہے ہیں۔ اور یہ تینوں آدمی اُسی طرف کو گئے ہیں جہاں گزشتہ شب کو بریسن گیا تھا۔

چنانچہ وہ اُس پھاٹک پر پہنچا۔ جہاں وہ گزشتہ شب کو گینمارڈ کے ساتھ آڑ لیکر چھپا تھا۔ کچھ اور آگے بڑھ کر اُسنے متعدد پہیوں کے نشانات یکجا باہم دیکھے۔ جس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ کچھ دیر کے لئے وہاں ٹھہرے تھے عین اسی کے مقابل یہ زمین کا ایک نوکیلا اور پتلا حصّہ دریا میں گھسا چلا گیا تھا۔ اور اس کے سرے پر ایک پُرانی کشتی اس سے بندھی ہوئی ہل رہی تھی۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں بریسن نے وہ پارسل پھینکا تھا۔

شیرز نشیب کی طرف آگے بڑھا۔ چونکہ یہاں پر کنارہ بتدریج ڈھالو ہوتا گیا ہے۔ اس لئے دریا کا یہ حصّہ بہت پایاب ہے۔ وہ یہاں اُتر کر پارسل کا بآسانی کھوج لگا سکتا تھا۔ بشرطیکہ وہ وہاں اس وقت تک موجود ہو۔ اور وہ تینوں شخص اُسے قبل ازیں نہ نکال چکے ہوں۔

"نہیں۔ نہیں" اُس نے اپنے دل میں کہا۔ "اُن کو اتنا کافی وقت نہیں ملا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ...... مگر ہاں..... یہ لوگ آخر اس طرف کیوں آتے۔

بالکل قریب ہی دریا میں ایک شخص کشتی پر بیٹھا ہوا اطمینان سے مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا۔ شیرز نے اُس سے دریافت کیا۔

"کیوں جناب... آپ نے تین آدمیوں کو سائیکل پر سوار اس طرف آتے دیکھا ہے"؟

"جی ہاں.. تین آدمی..... ٹھیک ہے۔ جہاں آپ کھڑے ہیں۔ وہاں سے صرف چند گز ہٹ کر وہ لوگ کھڑے ہوتے تھے۔"

یہ کہکر اس نے اپنی ڈگ کا سرا بغل میں دابا۔ اور جیب سے نوٹ بک نکالکر ایک ورق پر کچھ عبارت لکھی۔ اُس کو پھاڑا اور شیرز کے ہاتھ میں دے کر اپنی کشتی آگے بڑھا دی۔

انگریز جاسوس کے بدن میں سنسنی پیدا ہوگئی اُس کاغذ میں جو اُسے دیا گیا تھا کیا دیکھتا ہے کہ وہی حروف جو تصویری کتاب سے غائب تھے۔ اس میں درج ہیں۔

ج - ب - ا - د - و - ع - ی - ج - - -

- - ک - - ا - - ؛ ۲۳

(باقی باقی)

پیغامِ خواب

علی الصبح زرینہ نے اپنی خادمہ ماہرویہ کو یہ کہتے سُنا۔

"آری! مَیں وہ خط تو ڈاک میں ڈالنا بھول ہی گئی۔ جو سر اردشیر نے دیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ یہ نہایت اہم خط ہے۔ اُف کسقدر غضب ہو گیا" زرینہ نے مُسکرا کر کہا۔ "لاؤ مَیں باہر جا رہی ہوں میں ڈاک میں ڈال دونگی" خادمہ نے خط حوالے کر کے اطمینان کا سانس لیا۔ زرینہ اُسے مریض کے متعلق چند ہدایات دیکر سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی۔

زرینہ ایک بلند قامت اور حسین عورت تھی مگر لوازمات حُسن میں سے عربدہ جوئی اور شعلہ مزاجی اسکے چہرے سے زیادہ ہویدا تھے باایں ہمہ سر اردشیر جو چند روز سے صاحب فراش تھے اس کے حسن کی پرستش کرتے تھے۔

زرینہ نے خط پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ اس پر مسٹر جمشید جی دارووالا۔ عبدالرحمٰن سٹریٹ۔ بمبئی کا پتہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا۔ اُس نے خط کو بھاپ کے ذریعہ کھولا۔ جوں جوں وہ پڑھتی گئی اس کے چہرہ پر غیظ و غضب اور خونخواری کے علامات بیّن طور پر متشکل ہوتے گئے۔ اُسنے لفافہ آگ میں ڈال دیا۔ جسے چند لمحوں میں غضبناک شعلوں نے خاک سیاہ کر دیا۔ مگر زرینہ کی نگاہیں بدستور غیظ و غضب کا مسکن بنی رہیں۔ اس کے پندرہ منٹ بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماہرویہ داخل ہوئی۔ اور اُس نے اطلاع دی۔ کہ سرجن آگئے ہیں۔ زرینہ کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔

خادمہ نے تشفی آمیز لہجہ میں کہا "آپ دل کو ڈھارس دیں۔ سر اردشیر نوجوان اور کافی طاقتور ہیں۔ وہ مرض کا خوب مقابلہ کر سکینگے۔ اور امید ہے کہ عنقریب صحتیاب ہو جائینگے" زرینہ نے متبسم ہونے کی کوشش کی۔ مگر تبسّم کی شعاعیں اس کے لب لعلیں تک آکر غم واندوہ کی زردی میں منتقل ہو گئیں۔

"مَیں جانتی ہوں کہ غم کرنے سے کچھ نہ بنیگا۔ مگر اردشیر موت کا ذکر اس تذبذب سے کرتے ہیں۔ کہ میرا دل اندر سے بیٹھا جاتا ہے۔ انہوں نے میرے دل میں ایک ایسا ہول بٹھا دیا ہے کہ اب میں لاکھ کوشش کرتی ہوں پھر بھی اس خیال کو دل سے نہیں مٹا سکتی۔

(۲)

سر اردشیر کی وفات کے بعد مسٹر جمشید جی کا رویہ نہایت سخن رہا۔ اور وہ ایک سال کے لئے مشرق اقصےٰ کی سیاحت کو چلے گئے۔ سوختہ اختر زرینہ سوگ اور ماتم میں

مبتلا ہو گئی۔ اور بمبئی کا غم انگیز ماحول چھوڑ کر اپنی بہن کے ہاں پونا میں جا بسی۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ جب سوگ کا ایک سال ختم ہو جائیگا تو زرینہ ضرور مسٹر جمشید جی کیساتھ مناکحت کر لینگی۔ اور یہ کسی کے نزدیک بُرا بھی نہ تھا کیونکہ زرینہ اور سر اردشیر کے حلقہ احباب و اقارب میں مسٹر جمشید نے کافی ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ بلکہ سر اردشیر کی روکھی پھیکی طبیعت کو دیکھتے ہوئے لوگ بعض دفعہ اس حیرت کا اظہار کر دینے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ کہ رنگین مزاج زرینہ اپنی زندگی کے آٹھ سال کس طرح ان کے ساتھ گزار سکی۔ اس لئے زرینہ اور جمشید جی کے تعلقات کی بحث و نیز عوام کے نزدیک اس خشک زندگی کا کفارہ قرار پاتی۔ جو اُس نے سر اردشیر کی رفاقت میں گزارے تھے۔

ایک دن یکایک نوکر نے آکر اطلاع دی۔ کہ مسٹر جمشید جی سفر سے ابھی ابھی آئے ہیں۔ زرینہ ملاقات کے کمرے میں آئی۔ اور جمشید جی کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہاں وہ آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آگ کی انگیٹھی ان کے پاس جل رہی تھی۔ مسٹر جمشید جی کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ عرصہ بیمار رہ چکے ہیں۔

"ہاں! تو زرینہ میں تم کو عجیب بات سُنانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے بخوبی جانتی ہو۔ میں توہم پرست نہیں ہوں۔ نہ مجھے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ گزشتہ سال میں نے ایک ہی خواب تیس مرتبہ دیکھا ہے! کیا یہ عجیب بات نہیں ہے۔

زرینہ نے نہایت بیباکی سے پوچھا "کیسا خواب؟"

"میں نے سر اردشیر کو خواب میں دیکھا۔ وہ اور میں گہرے دوست تھے۔ اس لئے ان کا خواب میں نظر آنا بظاہر تعجب انگیز یا حیرت خیز نہیں ہے۔ مگر اُن کا تیس مرتبہ ایک ہی حالت میں نظر آنا خالی از علت نہیں۔ مجھے ہر مرتبہ یہی نظر آیا۔ گویا وہ میرے پاس کھڑے ہیں اور کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ مجھے اُن کا چہرہ صاف نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وفات سے پہلے وہ مجھے کوئی پیغام دینا چاہتے تھے مگر نہ دے سکے۔

انگیٹھی کے شعلے دھیمے ہو گئے تھے اس لئے مسٹر جمشید جی یہ نہ سمجھ سکے کہ زرینہ کا رنگ رُخ اُڑ گیا ہے۔ تاہم اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے تو اُنہوں نے تمہارے لئے کوئی پیغام نہیں دیا۔ تمہیں یاد ہو گا۔ تم ان سے عملِ جراحی سے ایک ہفتہ قبل ملے تھے؟"

جمشید جی نے کہا۔ "ہاں" مگر اُس وقت تو معمولی باتیں ہوتی رہیں کبھی سیر و شکار کا تذکرہ ہوا کبھی اُن کمروں کا جو اُنہوں نے اپنی کوٹھی کے مشرقی پہلو پر بنائے تھے اُنہوں نے مجھے کوئی دلی راز نہیں بتایا۔ بات تو چاہے کچھ بھی نہ ہو مگر اُن کا اس طرح ہر مرتبہ خواب میں نظر آنا حیرت ناک ہے کیونکہ مجھے کبھی خواب نہیں دکھائی دیتے۔ اور اب بھی خواب میں صرف

وہی نظر آتے ہیں۔ اس وقت جمشید کے چہرے سے ایک پریشان تعجب ٹپک رہا تھا۔

(۳)

چند ہفتے سکوت و سکون سے گزر گئے۔ مسٹر جمشید جی کبھی پونا ہی میں اٹھ آتے۔ اور زرینہ سے ہر روز ملاقاتیں رہنے لگیں۔ وہ زرینہ پر عاشق تھے۔ اور دل و جان سے چاہتے تھے کہ جلد ہی شادی کی ظاہری رسوم ادا ہو جائیں۔ تاکہ جس طرح اُن کے دل مل چکے ہیں اُسی طرح وہ دُنیا کے قواعد و ضوابط کے مطابق لطف اندوزِ محبت ہو سکیں۔ اگر ان سے پوچھا جاتا کہ کیا آج کی زرینہ وہی ہے جو ایک سال قبل سرار دشیر کی حینِ حیات میں تھی۔ تو انہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ نہیں! اب زرینہ کی شعلہ مزاجی کچھ تبدیل ہو گئی تھی۔ البتہ اوصاف ماقبل کی کچھ علامات بطور یادگار رہنا حال قائم تھیں مسٹر جمشید جی اس خوشگوار تبدیلی سے بہت خوش تھے۔ مگر اس خوشگوار زندگی میں انہیں صرف تکرارِ خواب کا خار کھٹکتا تھا۔ ایک روز جمشید نے زرینہ سے کہا۔

"اس خواب نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے کہیں میری جان کا لاگو ثابت نہ ہو۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ اردشیر مجھے کیا کہنا چاہتے تھے۔"

زرینہ نے متانت سے کہا۔ "پیارے جمشید! تم اس خواب کا اتنا خیال کیوں کرتے ہو۔ بات یہ ہے۔ کہ جب سونے لگتے ہو۔ تو تم یہ یقین کر لیتے ہو۔ کہ تم خواب پھر دیکھو گے اور تمہاری قوتِ متخیلہ وہی نظارۂ خواب تمہارے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ اگر تم سرار دشیر کو بھلا دو تو تم ہرگز انہیں خواب میں نہ دیکھو گے۔"

دو ہفتہ بعد جب ان کی شادی کی مقررہ تاریخ میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا۔ مسٹر جمشید جی آئے اور ایک موٹر میں بیٹھ کر زرینہ کے ساتھ سیر کو گئے۔

آسمان صاف تھا اور ہوا دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ موسم بہار کی آمد آمد کے باعث ہر جگہ نشوونما کے آثار پائے جاتے تھے۔ شہر سے کچھ دور موٹر ٹھہرائی۔ اور دونوں نیچے اتر آئے۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر زرینہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"میرے پیارے جمشید تمہیں کیا ہو گیا؟"

جمشید جی نے کرب و اضطراب کو چھپانے کی کوشش کی

"تم تو کہتے تھے کہ ایک ہفتہ سے خواب نہیں دیکھا"

"بیشک میں نے ایسا ہی کہا تھا۔ مگر محض اس خیال سے کہ تم کو تکلیف نہ ہو۔ ورنہ اس ہفتہ میں ایک روز بھی ایسا نہیں گزرا کہ سرار دشیر خواب میں نہ آئے ہوں۔"

زرینہ نے منہ پھیر لیا۔ وہ اپنے جذبات کو چھپانا چاہتی تھی۔

"میں تم سے یہاں ایک خاص بات دریافت کرنے کے لئے آیا ہوں۔ کل شام کے وقت میری اتفاقیہ ماہرو بیہ

سے بات چیت ہوئی تھی۔"

زرینہ خوف و ہراس سے زرد پڑ گئی۔ اور جمشید کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر اس طرح دیکھنے لگی۔ گویا یہ نگاہیں قیامت تک جدا نہ ہونگی۔

"میں اس کو خوب پہچانتا ہوں۔ جمشید نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ میں اسے تمہارے پاس کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید اُسے سر اردشیر نے کوئی پیغام دیا ہو۔ جو وہ تجھے دینا بھول گئی ہو۔ اس لئے میں نے اُس سے مدعائے دل بیان کیا۔ تم قیاس کر سکتی ہو کہ اس نے کیا جواب دیا ہوگا۔"

زرینہ ساکن اور صامت بیٹھی رہی گویا وہ ایک لعبت مرمرین ہے۔ جو کیف حیات سے بیگانہ ہے۔ اس کی نگاہیں بدستور غیر ارادی طور پر جمشید جی کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔

جمشید جی نے پھر کہا۔" ماہرویہ نے مجھے بتایا کہ جس روز سر اردشیر پر عمل جراحی ہوئی۔ اس روز انہوں نے مجھے ایک خط جو تمہارے نام تھا ڈاک میں ڈالنے کے لئے دیا تھا وہ خط زرینہ نے ڈاک میں ڈال دینے کے لئے لے لیا تھا۔

چند لمحے دونوں کے مابین موت کی سی خاموشی طاری رہی موسم بہار کا اُٹھتا ہوا جوبن زرینہ کے افسردہ چہرہ کی ہنسی اُڑا رہا تھا۔ اُس نے کانپتے ہوئے کہا۔

"اب تو مجھے راز کا انکشاف کرنا ہی پڑیگا۔ لو سنو پہلے میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں۔ کہ مجھے اردشیر سے شادی نہ کرنی چاہیے تھی میرے دل میں اس کے لئے کوئی محبت نہ تھی مگر وہ میرے پیچھے اس طرح ہاتھ دھو کر پڑا کہ میرے لئے سوائے قبولیت کے کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے انکار کے بعد خودکشی کر لیگا اس لئے میں نے اس سے شادی کر لی۔ مگر ہماری شادی مسرت و شادمانی کا منبع ثابت نہ ہوئی۔

وہ نہایت ضعیف الطبع تھا۔ میں نے اسے جی بھر کر اس چیونٹی کی طرح ستایا جو پیروں کے نیچے آکر سسکیاں بھرا کرتی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ جانتا تھا۔ کہ میں تمہیں چاہتی ہوں اور تم مجھے چاہتے ہو۔

ایک روز صبح کے وقت جب میں نے ماہرویہ کی زبانی سُنا کہ اردشیر نے ایک خط تمہارے نام ڈاک میں ڈالنے کے لئے دیا ہے۔ تو مجھے حیرت ہوئی۔ کہ اُس نے یہ خط مجھے کیوں نہ دیا۔ چنانچہ میں نے ماہرویہ سے وہ خط لے لیا اور کھول کر اُسے پڑھا۔ اُس خط نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور مجھے تسلیم کرنا پڑا۔ کہ میں نے اردشیر سے نہایت کمینہ سلوک کیا۔ میں نے اُسے ایذائیں پہنچائیں اور تکلیفیں دیں مگر اُس خط نے میرے جذبات کو سخت مجروح کر دیا۔ وہ مجھے ابتک حرف بحرف یاد اور میری آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اُس خط کا مضمون یہ تھا۔

"جمشید! مجھے معلوم ہے۔ تم زرینہ سے عشق رکھتے ہو
لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ تم کو اس دوزخ میں نہ گرنا پڑے
جس میں میں نے آٹھ سال گزارے ہیں تو خدا کے لئے
اس سے ہرگز شادی نہ کرنا تم جانتے ہو مجھے بھی زرینہ
سے عشق تھا۔ مگر کاش میں نے اُسے نہ دیکھا ہوتا۔ میں
نے اُس کے ہاتھوں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں
اگر میں کوشش بھی کرتا تو اس کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ جمشید
تم میرے دوست ہو اور تم کو معلوم ہے میں تمہارا
بہی خواہ ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ اب میں زندہ نہیں
رہ سکتا۔ اور نہ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ اس قدر
حسین نہ ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

"یہاں اُس کے ضعف نے یارائے تحریر نہ دیا
اور خط غیر مکمل رہا تھا" زرینہ نے بڑے زور سے
کہا۔ "جمشید تمہارا خواب مسیحا تھا۔ اردشیر تمہیں بار بار
روکنے کے لئے آتا تھا۔ جونہی تم نے خواب کا تذکرہ
کیا میں سمجھ گئی تھی۔ مجھے ہر روز یہی خدشہ لگا رہتا تھا
کہ کسی روز وہ تمہیں خواب میں اصل حال نہ بتا دے۔
اور وہ دن میری شادمانی کے لئے یوم ماتم ہو۔

زرینہ خاموش ہو گئی۔ ایک لمحہ انتظار کے بعد وہ
اُس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اور آہیں بھرنے لگی
"میں نے اُسے آٹھ سال تکلیف دی۔ اب اُس نے
مجھے مبتلائے رنج و غم کر دیا۔ انصاف یہ ہے کہ اس
کا انتقام بجا ہے۔ اب تم یہ کہنے کی تکلیف گوارا نہ کرو
میں اسے برداشت نہیں کر سکونگی۔

تم خوش قسمت ہو۔ کاش تم ماہرو بیسے نہ ملے ہوتے
یہ کہکر زرینہ نے اپنی باہیں جمشید جی کے گلے میں حائل
کر دیں۔ اور نہایت لجاجت سے بولی "پیارے جمشید!
کیا تم خواب کے پیغام پر عمل کرو گے؟"

جمشید جی نے نہایت حقارت سے اسکی باہیں
جھٹک دیں۔ اور خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ زرینہ نرگس گیاہ
پر غنچۂ افسردہ کی طرح گر پڑی۔

پورن سنگھ ہُنر

اختلافِ جذبات

اے گردنِ بلند قداں در کمندِ تو ۔۔۔ رعنائی آفریدۂ قدِّ بلندِ تو ۔۔۔ محتشم

صید از خرم کشد خم جعد بلندِ تو ۔۔۔ فریاد از تطاولِ مشکیں کمندِ تو ۔۔۔ شیخ علی حزیں

تبصرہ بہ اشاعات جدیدہ

تحفہ:۔ انجمن اربابِ اُردو سرور نگر حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ ہے۔ جو ماہ محرم الحرام ۱۳۴۳ھ سے جاری کیا گیا ہے۔ رسالے کے مقاصد اشاعت بہت اہم ہیں یعنی توسیع و اشاعت زبان اُردو۔ ایسے رسالوں کو اگر استقلال میسر ہو تو اُردو کی ترقی تیقن ہے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ سرورق خوبصورت، حجم بمع ٹائیٹل ۴۸ صفحے کاغذ معمولی لکھائی چھپائی گوارا۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔ جو حجم کے لحاظ سے کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا پتہ سے طلب فرمایئے۔

عالمگیر۔ علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی اتنے مضامین کا ماہوار رسالہ ہے۔ جو زیر ادارت جناب حافظ محمد عالم لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ پیش نظر نمبر علمی مضامین سے بالکل کورا ہے۔ اکثر و بیشتر مضامین ادبی ہیں۔ جناب مطلب حسین صاحب کا افسانہ تھیٹر کا پردہ بلحاظ زبان اور پلاٹ کے خوب ہے۔ "لیمپ کی چوری" جو متعدد اشاعتوں میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ مارس لیبلانک کے اس معرکتہ الآرا سراغرسانی کے ناول سے ماخوذ ہے۔ جس کا نام جیوش لیمپ ہے۔ اور جو 'آخری ارمان' کے نام سے ہزار داستان میں نصف سے زاید چھپ چکا ہے۔ ادب لطیف کا عنصر غالب ہے۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت معمولی۔ حجم ۴۸ صفحے۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ چندہ سالانہ ۴؎ دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے طلب فرمایئے۔

بنارسی حور:۔ اس نام کا جولائی سے ایک ماہوار رسالہ بنارس چھاونی سے جاری ہوا ہے۔ سرورق پر علم روحانی علم سیمیا۔ علم ریمیا۔ علم موسیقی۔ علم سامدرک۔ میجک اور ناولس وغیرہ وغیرہ الفاظ درج ہیں۔ ٹائیٹل پیج کی سہ رنگی تصویر کے علاوہ ایک اور تصویر بھی ہر رسالے میں ہوتی ہے۔ "اس کے علاوہ" بنارسی حور کے ایک ہزار خریداروں کے لئے خاص رعایت کر دی گئی ہے۔ جو لوگ اس کے ابھی سے خریدار ہو جائینگے۔ ان سے پانچ روپیہ کے بجائے صرف تین روپیہ سالانہ چندہ لیا جائیگا" (خواہ تین روپیہ سالانہ چندہ بھی زیادہ ہی کیوں نہ ہو) ہم فی الحال اس کے متعلق کوئی اور رائے قائم کرنا نہیں چاہتے لیکن یہ ضرور کہینگے کہ ایسے قلیل حجم اور چھوٹے سائز کے رسالے میں اتنے شعبوں کا التزام سودائے خام ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ ہلکا حجم ۳۶ صفحے تقطیع ۱۸×۲۲/۸ ملنے کا پتہ :۔ مینیجر بنارسی حور۔ بنارس چھاونی

شارہ۔ مجلہ ادبیہ جس کے دبیر مینا زبیری مارہروی (علیگ)

ہیں۔ علیگڈھ سے جاری ہوا ہے۔ پہلے نمبر میں جناب ساغر نظامی سیابی (علیگ) ایڈیٹر پیمانہ کی نظم طلوع بالکل مہمل چیز ہے۔ کئی مضامین اچھے بھی ہیں۔ امید ہے کہ اگلے نمبروں کو زیادہ کامیاب بنانے میں جناب مینا سعی بلیغ فرمائینگے تقطیع ۲۲×۲۷/۸ لکھائی چھپائی گوارا کاغذ معمولی قیمت عوام سے ۱۲؍ سالانہ۔ معاونین سے عہ؍ سرپرستوں سے ے۵؍ سے زیادہ۔ مینجر ستارہ دارالنشور علیگڈھ سے خط و کتابت کیجئے۔

نیرنگ خیال۔ لاہور سے اس نام کا ایک ماہوار اسلامی رسالہ زیر ادارت جناب حکیم محمد یوسف حسن جاری ہوا ہے۔ مضامین نگاروں میں جناب سید امتیاز علی تاج۔ جناب ریاض حسین بی۔ اے اور ابو رشید عبدالمجید صاحب سالک بی۔ اے وغیرہ بلند ادیبوں کے نام ہیں۔ ایسے ایسے رسائل کا جاری ہونا اُردو زبان کے لئے ایک نیک شگون ہے۔ امید ہے کہ جناب ایڈیٹر نیرنگ خیال کا ہر نمبر پہلے سے زیادہ وقیع اور نظر فریب بنانے کی کوشش فرمائینگے اور ہمارے اس اعتماد کو غلط ثابت ہونے کا موقع نہ دینگے ہماری رائے میں اگر مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں زیادہ سختی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اور اگر نثر منثور کے ٹکڑوں کو بالکل ہی بند کردیا جائے تو یہ سب سے اچھا ہوگا۔ رسالہ کے ہر نمبر میں ہندوستان کے مایۂ ناز مصور جناب عبدالرحمٰن چغتائی (جن سے ناظرین ہزار داستان ناواقف نہیں ہیں) کے قلم سے بہترین تصاویر شائع ہوتی ہیں۔ جو رسالے کے لئے باعث فخر ہیں۔

لکھائی چھپائی کاغذ قابلِ اصلاح سائز ۲۲×۲۹/۸ حجم ۵۰ صفحے۔ چندہ سالانہ ے؍ پیشگی۔ ملنے کا پتہ مینجر رسالہ نیرنگ خیال۔ بارود خانہ لاہور

حنیف۔ لدھیانہ سے اس نام کا ایک ماہوار رسالہ زیر ادارت غازی محمود دھرمپال بی۔ اے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہر نمبر تقریباً یکصد صفحوں کا ہوتا ہے۔ شروع سے لیکر آخر تک عموماً ایک ہی مضمون سے پُر ہوتا ہے پہلے نمبر میں ہندو مسلم اتحاد کا بنیادی پتھر اور دوسرے نمبر میں خنجر بیداد نکل چکے ہیں۔

تقطیع ۲۲×۱۸/۸ کاغذ لکھائی چھپائی معمولی قیمت سالانہ چھ روپے (ے؍) فی پرچہ ۱۲؍ جو زیادہ ہے

مینجر حنیف لدھیانہ سے طلب فرمائیے

ایڈیٹر

نوٹ

گنجائش کے نہ ہونے کے باعث کتب موصولہ پر ریویو نہ ہوسکا۔ انشاءاللہ انپر اشاعت آئندہ میں تنقیدی نگاہ ڈالی جائیگی۔

ایڈیٹر

قیمت سالانہ چھ روپے — رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴ — قیمت ششماہی ۔۔۔ فی پرچہ ۱۰/

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹر: محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۵ — اشاعت ماہ اکتوبر ۱۹۲۴ء — نمبر ۴

تصویر: مظفر الممالک نظام الملک آصف جاہ اعلیٰحضرت سر میر عثمان علیخاں صاحب بہادر سلطان دکن خلد اللہ ملکہ

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر چھپا اور محمد اسمٰعیل لکھیسر پبلشر و پروپرائیٹر نے دارالاشاعت ادب لطیف کیلئے چمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

دریا بہ حباب اندر

صفحۂ ادارت

وہ شخص جو نیکی کے مقدس قانون کا احترام نہیں کرتا، نہ صرف اوروں کے لئے بلکہ خود اپنے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ وہ زہر آلود عناصر جن سے وہ فضائے خارجی کو مسموم کر دیتا ہے۔ اُس پر بھی اپنا مہلک اثر دکھا کر رہتے ہیں۔ خود اُس کی ذات اُس کے لئے خوفناک ہو جاتی ہے۔ اور یہ قدرت کا سب سے بڑا انتقام ہے جو وہ ایک گنہگار سے لے سکتی ہے۔ "قطرہ میں طوفان" اسی حقیقت کا ایک لطیف اظہار ہے۔ اس افسانے کے متعلق یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ اس کے مصنف جناب حامد اللہ افسر ہیں۔ آپ نے اسے ہمیں عنایت کیا تھا۔ لیکن اُس وقت جب ہزار داستان مطبع میں تھا۔ ہم اسے غیر متوقع طور پر معاصر "پیمانہ" میں چھپا ہوا دیکھ کر بیحد متعجب ہوئے۔

جناب مدیر "پیمانہ" نے ہماری اس حق تلفی کا اس "حسنِ اتفاق" کو الزام دیا ہے کہ وہ اسے جناب افسر سے لے آئے تھے اور یہ انہیں بعد از وقت معلوم ہوا کہ یہ ہزار داستان کو بھیجا جا چکا ہے۔ ہم اس "حسنِ معذرت" کے لئے اُنکے ممنون ہیں۔

"صحبتِ ناجنس" اُردو کی زود اثر پذیر طبیعت پر جو مخرب اثر مترتب کر رہی ہے۔ وہ اگر اسی طرح رفتہ رفتہ سرایت کرتا گیا تو خوف ہے کہ کہیں اُس کی قلبِ ماہیت نہ ہو جائے۔ غلام ربانی صاحب نے اپنے مفید اور دلچسپ مضمون میں اسی غیر محسوس اثر کو نمایاں کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم آئندہ کی ممکنات کا خیال کرتے ہوئے اصلاحِ زبان کی طرف متوجہ ہوں۔

"دیوانہ بزعمِ خویش ہشیار" ایک دیرینہ کرمفرما کا عطیہ ہے جنکی کوششیں ہزار داستان کے ایک گزشتہ دورِ خوشگوار میں اُس کے شاملِ حال رہ چکی ہیں۔ اور ہمیں وثوق ہے۔ کہ اس کا مستقبل بھی اُن سے کسبِ فیض کر سکیگا۔ یہ افسانہ "ایڈگر ایلن پو" کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔ جو امریکہ کا بہترین مختصر افسانہ نگار ہے۔ اور جس کی شخصیت کا نقشِ دوام ادبیاتِ حاضرہ کے صفحات پر ثبت ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کیفیاتِ اندرونی کا غائر مطالعہ ہے جسکی ذکاوتِ حس اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک معمولی جذبہ نفرت نے اُسے قتل پر آمادہ کر دیا۔

ہدیۂ مبارکباد

بہ تقریب قبولیت سند اعزازی "سلطان العلوم" منجانب بندگان عالی متعالی مظفر الممالک ۔ نظام الملک آصف جاہ ۔ اعلیحضرت سر میر عثمان علی خاں صاحب بہادر سلطان دکن ۔ خلد اللہ ملکہ و ادام اللہ اقبالہٗ

احکام خلاف حق کا رد بھی اصلاح رسوم نیک و بد بھی
تعلیم علوم لا تعد بھی ترویج فنون مستند بھی
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تو شاہ ادانی و اعالی تو سایۂ لطفِ لایزالی
تو گنج معارف و معالی تو مہر سپہر بے مثالی
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تو واقفِ شانِ علم و حکمت تو مرتبہ دانِ علم و حکمت
تو جانِ جہانِ علم و حکمت تو روحِ روانِ علم و حکمت
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تو گوش بہ فغانِ اُردو تو دادرسِ زبانِ اُردو
تو یاورِ بیکسانِ اُردو تو رہبرِ کاروانِ اُردو
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تحقیق کا اہتمام تجھ سے تدقیق کا انصرام تجھ سے
تدریس کا انتظام تجھ سے فیضانِ علوم عام تجھ سے
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

ہر علم کو انتساب تجھ سے ہر جہل کا سدِ باب تجھ سے
ہر چشمۂ فن میں آب تجھ سے جو ہے سو وہ فیضیاب تجھ سے
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک

اس نام سے شہرتِ ابد بھی — خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تو نورِ جبینِ ملک و ملت — تو مہرِ مبینِ ملک و ملت — تو حافظِ دینِ ملک و ملت — تو حصنِ حصینِ ملک و ملت
سلطانِ علوم کی سند بھی — سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی — خاقانِ زمن! تجھے مبارک

رفعت بھی تری کنیزِ بے دام — عظمت بھی تری کنیزِ بے دام — سطوت بھی تری کنیزِ بے دام — عزت بھی تری کنیزِ بے دام
سلطانِ علوم کی سند بھی — سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی — خاقانِ زمن! تجھے مبارک

دولت کا قیام تیرے دم سے — صولت کا نظام تیرے دم سے — نصفت کو دوام تیرے دم سے — بہبودیٔ عام تیرے دم سے
سلطانِ علوم کی سند بھی — سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی — خاقانِ زمن! تجھے مبارک

اقبال کو افتخار تجھ سے — اجلال کو افتخار تجھ سے — ہر حال کو افتخار تجھ سے — ہر قال کو افتخار تجھ سے
سلطانِ علوم کی سند بھی — سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی — خاقانِ زمن! تجھے مبارک

ہر ملک میں تیرے کام کی دھوم — ہر قوم میں تیرے نام کی دھوم — ہر سو ترے احتشام کی دھوم — ہر سو ترے جودِ عام کی دھوم
سلطانِ علوم کی سند بھی — سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی — خاقانِ زمن! تجھے مبارک

ہر وقر ترے لئے سزا ہے — ہر فخر ترے لئے بجا ہے — ہر عزّہ ترے لئے روا ہے — تو علم و حکم کا دیوتا ہے
سلطانِ علوم کی سند بھی — سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی — خاقانِ زمن! تجھے مبارک

ہر جود و عطا ترے لئے ہے — ہر بذل و سخا ترے لئے ہے — ہر فضلِ خدا ترے لئے ہے — دنیا کی دعا ترے لئے ہے
سلطانِ علوم کی سند بھی — سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی — خاقانِ زمن! تجھے مبارک

آزاد اگرچہ اک گدا تھا — نو وارد شہر و بے نوا تھا — لیکن یہ سماں وہ دلکشا تھا — خوش ہو کے صدا لگا رہا تھا
سلطانِ علوم کی سند بھی — سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی — خاقانِ زمن! تجھے مبارک

(آزاد انصاری)

قطرہ میں طوفان

مدنی کے کتب خانہ کی ہر کتاب پر طرزی کی نظر ٹھوکر کھاتی تھی، کیسا بیش قیمت مجموعہ ہے۔ اس شخص کی زندگی قابلِ رشک ہے، ایسی نایاب کتابیں جسکے قبضہ میں ہوں پھر اُسے دُنیا میں کسی چیز کی ضرورت نہیں

سورج کی آخری کرنیں کمرے کی سفید دیواروں پر نور برسا رہی تھیں۔ نظر پڑتے ہی پلٹتی تھی۔ مارچ کا مہینہ بھی کیسا عجیب اور پُرلطف مہینہ ہوتا ہے۔ اور پھر نور نگر کی سرزمین، حقیقت یہ ہے کہ ہوا کا ہر جھونکا فطرت کی عشق پرستیوں کا اثر لئے ہوئے تھا،

جس وقت طرزی ایک قدر شناس کی نگاہ سے کتابوں کی پشت کے سنہری حرفوں کے پڑھنے میں مصروف تھا مدنی کی نظر اُس کی بلند اور نازک گردن پر پڑی۔ ذرا سے اشارے میں کیا کچھ ہو سکتا ہے! کیسا دل خوش کن خیال تھا!

مدنی اور طرزی دونوں دوست تھے، آج کے نہیں بیس سال کے دوست تھے، دونوں ادیب اور دونوں شاعر تھے

طرزی بہت حساس تھا، وہ برداشت نہ کرسکتا تھا کہ اُس کے کسی دوست کو اُس کی نسبت کوئی بدگمانی یا غلط فہمی پیدا ہو اور اگر پیدا ہو جائے تو اولین موقعہ پر اُسے دور کرنے کی کوشش کرتا تھا یہی خیال آج اُسے بمبئی سے نور نگر تک کھینچ لایا،

طرزی کو فضا کی ہر چیز سے محبت تھی، وہ چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز اُس سے محبت کرے شاید یہی وجہ تھی کہ طرزی ایک مقبول مصنف تھا، دنیا اُس کی قدر کرتی تھی اور اُس کی زندگی ایک کامیاب زندگی سمجھی جاتی تھی،

مدنی کے دماغ میں اس وقت خیالات کا ایک حشر برپا تھا، "اُس کمبخت نے میری زندگی تباہ کر دی، اُس نے ہمیشہ میری ترقی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ میری ناکامی اور میری کس مپرسی کا سبب ہوا، دکھاوے کے لئے ظاہرداری کے واسطے میرا مربی میرا معاون، میرا مددگار کیا کیا نہ بنا مگر صرف لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ طرزی مدنی کو ایک نہایت معمولی آدمی سمجھتا ہے، اُف کسقدر خودبین، کسقدر خودپسند، کسقدر

مغرور ہے، میں سب جانتا ہوں میں تیری رگ رگ سے
واقف ہوں، مجھ پر تیرے سیاہ اور کثیف دل کا حال
روشن ہے"

مدنی کے خیالات مبالغہ میں ڈوبے ہوئے
سہی مگر حقیقت سے زیادہ دور نہ تھے۔ ایک حد تک یقیناً
طرزی اُس کی ناکامیوں کا باعث ہوا۔ لاہور کے مشہور
رسالے "سروش" کی ایڈیٹری کے لئے جب مدنی رسالے
کے مالک مرزا نسیم سے ملا تو دل میں کسقدر خوش آئند
امیدیں لیکر آیا تھا، کسقدر جوش اور سرگرمی سے کام کرنیکا
ارادہ تھا۔ کیسے کیسے منصوبے گانٹھے تھے مگر نتیجہ کیا"
ہوا، سروش کی ایڈیٹری پر طرزی کا تقرر ہوگیا، یہ مانا
کہ رسالہ ایک سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا مگر اس
حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اس رسالہ
کے تعلق نے طرزی کو ملک کے مشہور ادیبوں کی صف
اوّل میں جگہ دی، غالباً یہی مدنی کے ساتھ ہوتا،

اس واقعہ کے پانچ برس بعد مدنی کا ناول
"مجنون خواب" شائع ہوا، یہ تین سال کی شبانہ روز
جانکاہی کا نتیجہ تھا، کسقدر امیدیں اس سے وابستہ
تھیں مگر سب بے سود، اس کی اشاعت سے ایک ہی
ہفتہ بعد طرزی کا مشہور ناول "طوفان" شائع ہوا، غل مچگیا،
ہر شخص کے ہاتھ میں طوفان نظر آنے لگا۔ ریلوں میں، ہوٹلوں

میں جہاں دیکھو طوفان موجود ہے، طرزی کا نام ہر زبان پر
تھا، اور لطف یہ کہ طوفان میں "سوائے چند ہوش رُبا اور
پُر درد واقعات کے اور کچھ نہ تھا" ممکن ہے آپ یہ کہیں
کہ ایک ناول سے دوسرے ناول کی اشاعت پر کیا اثر
پڑ سکتا ہے۔ مگر اتنا تو سوچئے کہ "اگر طوفان نہ شائع ہوتا
یا کم سے کم اتنی جلد نہ شائع ہوتا تو پبلک کا وہ محدود، نادان،
بے خبر، خود پرست اور خود رائے طبقہ جو صرف چرب زبانی
سے ایک کتاب کی اشاعت پر زبردست اثر ڈالتا ہے
یقیناً "مجنون خواب" کو ہاتھوں ہاتھ لیتا" مگر یہ نہ ہوا طوفان
شائع ہوا اور دو ہی چار ہفتہ میں اُس کی اشاعت کہیں
سے کہیں پہنچ گئی،

اس کے بعد اور بہت سے واقعات ہوئے،
اور ہمیشہ کسی نہ کسی صورت سے یہ دُبلا پتلا، کاغذی، لاغر
انسان مدنی کی راحت اور اُس کی کامیابی میں رخنہ انداز ہوا ہے
مدنی کے دماغ پر ان تمام واقعات کا بہت گہرا
اثر تھا، طرزی کا خیال اس کے لئے کسی ڈراؤنے بھوت
سے کم نہ تھا۔ نور نگر کے ایک غیر آباد حصہ میں پڑے ہوئے
رات دن اپنی ناکامیوں پر افسوس کرتا رہتا، نہ دوست نہ
احباب نہ کوئی ہمدرد نہ قدرشناس۔ وہ ناکام رہا لیکن
اس میں خود اس کا قصور نہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس علمی
تبحر اور ادبی مذاق کے ہوتے ہوئے اس کا قصور کیونکر

ہوسکتا تھا یہ تو زندگی کی جدید روشوں اور معیشت کے نئے طریقوں کا قصور ہے، تعلیم، تربیت اور تہذیب کا کھوٹ ہے، اس مجہول مسالے کی خطا ہے جس کی آمیزش سے انسانی اِدراک اور شعور اور فہم کا خمیر گوندھا گیا ہے ——— اور ان سب سے زیادہ سنگین تقصیر طرزی کی ہے،

مدنی چاہتا تھا کہ کبھی طرزی کی صورت نہ دیکھے کبھی اس کے سامنے نہ آئے، کبھی اس کا نام بھی نہ سُنے۔ مگر جس وقت اُسے ذیل کا تار موصول ہوا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ تھی،

"کیا تم اتوار اور پیر کو نورنگر میں رہوگے؟ دو روز تمہارے پاس قیام کرنا چاہتا ہوں" طرزی جیلانی

مدنی نے بار بار آنکھیں مل کر تار پڑھا۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ طرزی کا تار ہے اور پھر ——— پھر ایک راز ہو یا نہ جذبہ کے اثر میں ایک حقارت آمیز کشش کی وجہ سے ایک گہرے پوشیدہ مقصد کی تحریک سے جس کا تجزیہ کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی مدنی نے تار کے جواب میں لکھ دیا

"آجاؤ میں نورنگر ہی میں رہونگا"

چنانچہ طرزی نورنگر آگیا اور یقین کیجئے کہ اس طویل مسافت کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ اُس نامعلوم شکایت کو دور کرے جو مدنی کو پیدا ہوگئی تھی۔ اور جس کا علم اُسے شیبانی کے ذریعہ ہوا تھا،

"مدنی! مجھے بتاؤ تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے، میرے لئے یہ خیال تکلیف دہ ہے کہ تم مجھ سے کسی وجہ سے ناراض ہو، ممکن ہے کہ وجہ شکایت محض کوئی غلط فہمی ہو، ممکن ہے واقعی مجھ سے کوئی فروگذاشت ہوئی ہو"

طرزی نے یہ الفاظ خلوص نیّت سے کہے تھے اس کا دل صاف تھا وہ چاہتا تھا کہ مدنی کا دل بھی اُس کی طرف سے صاف ہو جائے،

مدنی نے جواب دیا "کوئی بات نہیں ہے، مدنی نے غلط کہا، مدنی نے جھوٹ بولا مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے"

طرزی نے خوش ہوکر کہا "مجھے بڑی مسرت ہوئی تعجب تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہوسکتی ہے جس سے تمہیں کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہے، میں تمہارا مخلص دوست ہوں، مجھے تم سے محبت ہے"

جب طرزی کی گفتگو جاری تھی اُس وقت مدنی کی نفرت اور حقارت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ تیز اور مہلک زہر کو خوش ذائقہ شربت ظاہر کرکے خود ہی پی گیا،

(۲)

اگلے روز صبح کے وقت طرزی نے پھر مدنی

سے کہا " مدنی ایک بار پھر کہہ دو کہ تمہارا دل میری طرف سے صاف ہے ۔ مجھے اطمینان ضرور ہے مگر کبھی کبھی کچھ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید تم کچھ ناراض ہو "

مدنی نے نیچے سے اوپر تک طرزی کو دیکھا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ خیال آیا کہ یہ دونوں آگ کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں نکال کر پھینک دوں اور پیشانی کے نیچے دو گہرے گڑھے چھوڑ دوں، خون میں بھرے ہوئے اور روشنی سے محروم، کاش میں اسقدر بے بس نہ ہوتا،

" بھائی میں تم سے کل شام کہہ چکا ہوں، آخر شکایت کی کوئی وجہ بھی ہو "

طرزی نے کہا اس وقت میں بہت ہی خوش ہوں، مدنی مجھے تم سے محبت ہے اور ہمیشہ سے محبت ہے میں نے ہمیشہ تمہاری فطرت شناسی اور نکتہ رسی کی تعریف کی ہے، تمہارا وہ ناول ..... اس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا، کچھ خواب کے متعلق ہے ــــــ "

" مجنونِ خواب "

" ہاں " مجنونِ خواب " مجھے بہت پسند ہے، اس پر کچھ قدامت پرستی کا اثر سہی لیکن اس میں کسی کو کلام نہیں کہ وہ تمہارے کمال انشا پردازی کا نمونہ ہے اس کی اشاعت یقیناً امید سے کم رہی،

" ہاں اشاعت کم رہی "

" زمانہ قدرشناسی میں ذرا سست ہے، تمہاری قدر ضرور ہوگی، آج نہ سہی کل سہی۔ قابل قدر چیز کامیاب ہو کر رہتی ہے "

" ہاں میری قدر ہوگی "

" میری بات تو ظاہر ہے کہ جتنی مقبولیت مجھے ہوئی ہے اُس کا میں ہرگز مستحق نہ تھا۔ لیکن مجھے مقبولیت ضرور حاصل ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، مجھے کسر نفسی کی ضرورت نہیں ہے، لیکن تمہارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، ابھی دنیا نے تمہاری قدر نہیں پہچانی، تم میں ایک کامیاب انشا پرداز اور ادیب کی تمام خصوصیات موجود ہیں صرف اتنی بات ہے ــــــ بھائی بُرا نہ ماننا، تم میرے دوست ہو، مجھے حق حاصل ہے کہ اپنے نزدیک جو خامیاں تمہارے اندر دیکھوں تمہارے منہ پر اُن کا اظہار کر دوں ــــــ صرف اتنی بات ہو کہ تم اپنے زمانے سے کچھ پیچھے ہو، تم زمانے کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے اور اس کی وجہ ظاہر ہے، تم تنہائی پسند ہو، دنیا سے الگ نورنگر کے ایک گوشہ میں پڑے ہو تمہیں کیا خبر ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے "

مدنی نے اپنی داہنی طرف آسمان کی سمت دیکھا اس کی پیشانی پر خفیف سی شکن پڑی اور پھر نظر پ

طرزی کی طرف رجوع ہوئیں۔

طرزی کی تقریر جاری رہی "میں تو چھ مہینہ بمبئی میں رہتا ہوں، وہاں دلچسپی اور تفریح کی ہر چیز موجود ہے تین مہینہ کشمیر میں صرف کرتا ہوں اور تین مہینہ اور مختلف مقامات مثلاً بنارس ہردوار وغیرہ کی سیر کرتا ہوں،

کشمیر! اُف کشمیر! اس نام میں کیسی کشش ہے!

مدنی کے دل پر چوٹ سی لگی، اُسے کشمیر جانیکا کسقدر شوق تھا، کاش کسی طرح دو ہی چار روز کے لئے اس فردوس ارضی کی زیارت نصیب ہوتی، مگر کبھی اتنا روپیہ نہ ہوا کہ وہاں جا سکے اور اس خود بین، خود پسند مغرور جاہل کو دیکھو ——

مدنی کچھ بے چین ہو کر اُٹھا اور دریچہ کے باہر کی طرف جھانک کر بولا "طرزی ٹہلنے کے لئے چلتے ہو، یہ تفریح کے لئے بہت اچھا وقت ہے،

(۳)

یہ فقرہ زبان سے نکلنے کے بعد مدنی کے چہرہ پر حیرت سی چھا گئی، خدا جانے اُس نے ٹہلنے کی تجویز کیونکر پیش کر دی، آخر طرزی کو وہ کیوں ٹہلنے کے لئے لیجائے، نور نگر کی فضا اس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جیسے بہت سے دیو دوزانو بیٹھے ہوں خوبصورت جھیلیں، سبزہ زار یہ سب چیزیں اس غریب کے لئے ایک چھوٹے سے کشمیر سے کسی طرح کم نہ تھیں، کسقدر ظلم اور ناانصافی ہے کہ اس میں بھی طرزی شریک ہو جائے

مدنی کو خیال ہوا کہ کہیں اور کسی نے تو یہ ٹہلنے کی تجویز پیش نہیں کی ہے، اس خیال کا اسقدر غلبہ ہوا کہ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا بھی کہ شاید واقعی کوئی تیسرا شخص کمرے میں موجود ہو،

آخر دونوں تفریح کے لئے چلے، سڑک پہاڑوں کے بیچ میں ہو کر گئی تھی، جب بلندی پر چڑھنا ہوتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک سیدھی آسمان تک جا رہی ہے۔ جب نشیب میں اُترنا ہوتا تھا تو یہ نظر آتا تھا کہ سبزہ زار کے اندر کسی جھیل میں غرق ہو گئی ہے،

طرزی نے مدنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا، "مدنی! تمہارے ساتھ اس طرح تفریح کے لئے چلنا کیسا لطف انگیز ہے، مجھے آج کا دن عمر بھر یاد رہے گا، میرا ضمیر جذبات سے گوندھا گیا ہے، میں زود حس ہوں اور گداز دل رکھتا ہوں، بھائی دنیا چند روزہ ہے محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے سہارے وقت مسرت سے گذر سکتا ہے، تم بہت ہی تنہائی پسند ہو، یہ نہ ہونا چاہئے"

طرزی کے لفظ مدنی کے سینہ میں تیر کی طرح

اُتر گئے، اس چھوٹے سے کمزور ہاتھ کا مس کسقدر عجیب تھا، اتنی دور سے تم دل کی حرکت کی آواز سن سکتے تھے، بار بار بے اختیار جی چاہتا تھا کہ دونوں ہاتھوں سے اس دبلے پتلے ہاتھ کو ایسی زور سے موڑا جائے کہ ہڈیوں کا چورا ہو جائے ——— اُف کھولتے ہوئے پانی کی طرح خون میں جوش آتا ہے۔ مگر کچھ بس نہیں چلتا،

مدنی ذرا ٹھٹکا، "یہ نورنگر کی حد ہے، وہ سرا ہے، یہاں کے قریب ہی پہاڑیوں کے بیچ میں ایک بڑی خوبصورت جھیل ہے، میں اکثر اس میں تیرتا ہوں۔ چلو تمہیں دکھاؤں تم بہت پسند کرو گے"

(۴)

نورنگر کے قرب وجوار میں بہت سی جھیلیں تھیں اور سب پہاڑوں کے درمیان میں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قد آور دیو ناف تک پانی میں خاموش کھڑے ہیں۔ چند بادل پہاڑوں کی چوٹیوں کا تکیہ بنائے سو رہے تھے۔ ہر طرف سکوت تھا، آسودگی تھی، سکون تھا، کیسا پیارا سماں تھا، کسقدر دلکش نظارہ تھا۔ طرزی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زمین سے اُدھر چل رہا ہے۔ کوئی اُسے اُٹھا کر لئے جا رہا ہے،

مدنی نے کہا "یہ جھیلیں بہت گہری ہیں، اتھاہ ہیں، اتھاہ ہیں آجتک کوئی ان کی تہ تک نہیں پہنچ سکا ہے"

طرزی نے کہا "مجھے کبھی تیرنا نہ آیا، ہمیشہ پانی سے ڈرا، یہ خیال دماغ میں جم جاتا ہے کہ ڈوب جاؤں گا"

مدنی خیال میں غرق ہو گیا، طرزی اس سے دو قدم پیچھے تھا۔ ان کے داہنی طرف ایک چٹان ہے پہاڑ کی تلیٹی میں پتھر کی چند کانیں تھیں، سونی، ویران، افتادہ اور اُجاڑ، یہاں ذرا چڑھاؤ زیادہ تھا، طرزی کا سانس پھول گیا، کانوں کے نیچے ہوتے ہوئے دونوں پانی کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ پانی کبھی سنہرا، کبھی میلا، کبھی بھورا، کبھی سفید مختلف رنگوں میں پیش نظر تھا۔ آخر مدنی ایک پہاڑ کی گود میں تاریک پانی کے کنارے ٹھہر گیا "یہ جھیل مجھے بہت پسند ہے سب سے علیحدہ ہے اور چاروں طرف سرسبز وشاداب پہاڑ ہیں، شفق کی ہلکی ہلکی روشنی میں پہاڑ کیسے عجیب معلوم ہوتے ہیں، گویا اُن کے چوڑے چکلے سینوں پر زندگی مچل رہی ہے۔" طرزی اس وقت ہم یہاں تنہا ہیں، کسقدر سناٹا چھا رہا ہے، اب تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو جائیگا اور بس پھر تاریکی ہے، طرزی کیسی پیاری جھیل ہے، تمہیں معلوم ہے یہ میرے دل کا ٹکڑا ہے ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بلا شرکت

غیرے اس کا مالک ہوں، جیسے تم اپنی تمام تصانیف کے، اپنی تمام عزت اور شہرت اور کامیابی کے مالک ہو، وہ میری ملکیت ہے اور یہ سب چیزیں تمہاری ملکیت ہیں،

طرزی :- "اُف! پانی کسقدر تاریک ہوتا اور ڈراؤنا ہے"،

مدنی! "یہ جھیل یہاں کی سب جھیلوں سے زیادہ گہری ہے، کوئی تہ کی خبر نہ لاسکا، مجھے اس سے بہت اُنس ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ ایک دن مجھ پر اپنا راز سربستہ کھول دیگی"،

طرزی کو اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی، اُسنے کہا "تمہاری جھیل بہت خوبصورت اور دلفریب ہے اب چلو، راستہ سخت اور پیچیدہ ہے، ہوا میں خنکی اور ٹھر پیدا ہوگئی ہے،

مدنی طرزی کا ہاتھ پکڑکر ایک طرف کو چلا "دیکھو پانی میں نکلی ہوئی اس چٹان کے سرپر سے جھیل کیسی بھیانک معلوم ہوتی ہے، یہ نظر آتا ہے کہ پہاڑ برابر قریب تر آتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں گے اور ہم بیچ میں کچل کر رہ جائیں گے"،

اب دونوں چٹان کے سرے پر پہنچ گئے، اس میں شک نہیں کہ پانی یہاں سے بہت تاریک اور عمیق معلوم ہوتا تھا، جیسے ہی طرزی نے جھک کر پانی میں جھانکا۔ مدنی کا ہاتھ اُس کی پتلی اور نازک گردن پر تھا، ایک ہلکا سا جھٹکا بہت کافی ہوا، تیز اور باریک چیخ کی آواز آئی۔ پانی کی موجوں میں جنبشِ اضطراب نمودار ہوئی، ایک بے چین دائرہ پیدا ہوا، پھر وہ بڑھا، وسیع ہوا، اور زیادہ وسیع ہوا اور پھر خاموشی تاریکی ہوگئی،

(۵)

خاموشی بڑھتی رہی، جھیل پر قابو حاصل کرلینے کے بعد وہ اور بڑھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بےحس و حرکت سنسان پہاڑوں کے پاس انگشت برلب پہنچی اور پھر اُنہیں بھی پار کرگئی، مدنی وہیں کھڑا رہا، اس کی نظر جھیل کے تاریک پانی پر جمی ہوئی تھی، وہ خیالات کی گہرائیوں میں غرق تھا۔ اُسے ایک قسم کی تسلّی تھی، تسکین تھی، اطمینان تھا، وہ گو مسرور نہ تھا، خوش نہ تھا مگر مغموم اور ملول بھی نہ تھا،

آخر طرزی رخصت ہوا، وہ یاوہ گو، ہرزہ سرا، خود بیں، خود پسند، مغرور وجود رخصت ہوا، طرزی نے دیکھا کہ جھیل مسکراتے ہوئے اُس کے چہرہ کو تک رہی ہے اور کہتی ہے "تم نے جو کچھ کیا بہت خوب کیا، میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہوں، اس کار نمایاں کے انجام

دینے والے دو ہیں، میں اور تم، مجھے تم پر فخر ہے"

اس وقت مدنی کا دماغ مصروف تھا، تیزی سے کام کر رہا تھا، ناکامی کی آگ میں جل رہا تھا، آخر عمل کا وقت آ گیا، جو کچھ کرنا تھا کر گذرا، مدنی نے چاروں طرف نظر اُٹھا کر سنجیدہ اور سلیم پہاڑوں کو دیکھا، وہ مفتخر تھا ———— اور وہ سرد تھا، لرزاں تھا، ہاتھ پیر قابو میں نہ تھے، اندھیرا گہرا ہوتا جاتا تھا، بہت دیر ہو گئی ہے اب یہاں سے چلنا چاہئے،

مدنی گھر کی طرف چلا، سردی سے اُس کے دانت بج رہے تھے، سارا جسم کانپ رہا تھا وہ گھر کی طرف جا رہا تھا اور جانا نہ چاہتا تھا، اس وقت جمیل کی جُدائی اُسے گوارا نہ تھی، جمیل اُس کی دوست تھی، دنیا میں سوائے اس جمیل کے کوئی اُس کا ساتھی نہ تھا، کوئی رازداں نہ تھا، کوئی ہمدرد نہ تھا، جمیل سے چھوٹ کر وہ بالکل تنہا رہ جائیگا۔ بے یار و مددگار رہ جائے گا ———— اب وہ گھر کی طرف جا رہا تھا، مگر گھر تو اب بالکل خالی ہے، ایک مہمان قیام پذیر تھا، اب وہ وہاں نہیں ہے، اب وہ کبھی نہ آئیگا،

مدنی یکایک دوڑا، یہ نہیں معلوم کیوں، اُسے سوائے اس کے اور کوئی خیال نہ تھا کہ جمیل سے جدا ہونے کے بعد اب وہ تنہا رہ گیا، دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑوں سے آواز پیدا ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اور اُس کے پیچھے دوڑ رہا ہے، مدنی ٹھہر گیا اور پیچھے دوڑنے والا بھی ٹھہر گیا، اُس نے شام کے سناٹے میں گہرے سانس بھرے، اس وقت اُسے گرمی معلوم ہو رہی تھی، سر سے پیر تک پسینہ میں شرابور تھا، پیشانی سے رخساروں سے پسینے کے قطرے برابر ٹپک رہے تھے، ٹانگیں کانپ رہی تھیں، دل دھڑک رہا تھا، تھوڑی دیر ٹھہر جانے سے کچھ سکون ہوا، پھر دوڑا، اور زیادہ زور سے دوڑا، بستی کے مدھم مدھم چراغ نظر آئے، کچھ یقین ہوا کہ سب کچھ اسی طرح ہے کوئی چیز بدلی نہیں ہے، مگر ابھی یہ خیال دل سے نہیں نکلا کہ کوئی پیچھے پیچھے آ رہا ہے، کئی مرتبہ پلٹ کر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا،

مدنی کا دماغ اس وقت اسقدر تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا، آخر یہ پیچھے کون آ رہا ہے، جمیل ہے، ہاں جمیل اس کے ساتھ ساتھ ہے، پھسلتی ہوئی لغزش کرتی ہوئی، رپٹتی ہوئی آ رہی ہے، مدنی نے جمیل کی آواز سُنی، "جو کچھ کیا ہے ہم دونوں نے ساتھ کیا ہے، میں یہ نہیں چاہتی کہ تم تنہا ذمہ داری کا بار سنبھالو، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہیں تنہا نہ چھوڑونگی"

آخر مدنی گھر پہنچ گیا، اپنے کمرے میں ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا، کمرے کے اندر ساری چیزیں اُسی طرح موجود تھیں، کتابیں بھی وہی تھیں جن پر طرزی للچائی ہوئی نظریں ڈال رہا تھا، میز بھی وہی کرسیاں بھی وہی، آرام کرسی پر لیٹتے ہی مدنی کو نیند آگئی، بڑی دیر تک بے خبر سوتا رہا، جب کافی وقت گذر گیا تو ملازم نے آکر جگایا اور کہا کھانا تیار ہے، کمرے میں دو موم بتیاں جل رہی تھیں جو بہتیرا اُچک اُچک کر کمرے کو روشن کرنا چاہتی تھیں، مگر پھر بھی تاریکی کم نہ ہوتی تھی، وہ طرزی کا انتظار کر رہا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اب وہ نہ آئیگا، بار بار دروازے کی طرف دیکھتا تھا مگر اُدھر اندھیرا اسقدر گہرا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا، کھانا چنا ہوا رکھا تھا اور رکھا رہا، اس نے ایک لقمہ بھی نہ توڑا، اُٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھولی، باہر کو جھانکا، معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے کان کسی آواز کے منتظر ہیں، بے چین پانی کی آواز اس سناٹے میں کچھ ہل چل، کچھ اضطراب، جیسے کوئی تالاب، کوئی جھیل، جوش میں اپنی حدوں سے نکل جاتی ہے، درختوں کے پتوں کی جھڑ جھڑاہٹ —— اکدم گھبرا کر اُس نے کھڑکی بند کر لی، کمرے میں چاروں طرف دیکھا کچھ نظر نہ آیا،

(۶)

مدنی سونے کے لئے بستر پر لیٹا، نیند کا پتہ نہ تھا۔ دماغ تیزی کے ساتھ مصروف تھا، دل دھڑک رہا تھا، اُسے بار بار خیال ہوتا تھا کہ مجھے کوئی آواز دے رہا ہے، وہ ہمیشہ کھڑکیاں کھول کر سویا کرتا تھا، آج چاندنی ایک مریض کی طرح ایک روگی کی طرح ناتواں اور زرد رو اُس کے کمرے میں داخل ہوئی، مدنی نے کھڑکی کی طرف دیکھا، اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی چیز حرکت کر رہی ہے، میلی میلی زرد چاندنی میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی، مدنی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، بالکل بہتا ہوا پانی معلوم ہوتا تھا، مدنی کے ہوش اُڑ گئے، اُس کے کانوں میں کھڑکی کے باہر پانی کے اکٹھا ہونے کی آواز آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی برابر چڑھتا آرہا ہے، تیزی سے نہیں۔ بے چینی کے ساتھ نہیں بلکہ آہستہ آہستہ مگر بڑی کثرت سے،

مدنی بستر پر بیٹھ گیا اور جھک کر دیکھا، کھڑکی کے نیچے پلنگ کے قریب پانی ہی پانی نظر آیا، اُس نے چوکھٹ کی طرف بہتے ہوئے دیکھا، پھر اُسے رکتے ہوئے، اور پھر پلنگ کی طرف کو آتے ہوئے دیکھا عجب یہ ہے کہ کھڑکی کے باہر پانی کے چڑھنے کا شور تھا مگر کمرے کے اندر خاموشی طاری تھی، ہلکی چاندنی میں پانی

برابر چڑھ رہا تھا، مدنی نے بستر سمیٹ لیا اور سرہانے کی طرف دوزانو بیٹھ گیا، نیچے کو دیکھا ایک چیخ ماری، کمرے کی زمین چکدار پانی کے قبضہ میں تھی، پلنگ کے آدھے آدھے پائے غرق تھے، پانی چڑھ رہا تھا، بلا روک ٹوک بلا وقفہ کے چڑھ رہا تھا، اس کے روکنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی، کاش وہ کسی طرح دروازہ تک پہنچ سکتا، پاؤں پلنگ کے نیچے لٹکائے، پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا، جیسے ہی وہ جھکا ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اُسے پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے، مدنی اوندھے منہ زمین پر آیا، اس کا سر اس کا منہ ٹھنڈے پانی میں تھا اس نے ہاتھ پاؤں مارے، اب پانی سینے تک آگیا، چیخ ماری، پھر چیخ ماری، سامنے شیشہ تھا، کتابیں تھیں، تصویریں تھیں، مگر کسی پر اثر نہ ہوا، دروازے کی طرف جانے کی کوشش کی مگر سب بیکار، اب پانی اس کی گردن کے قریب تھا، کسی نے یکایک اُس کے پیر کا انگوٹھا پکڑ کر کھینچنا شروع کیا، بہتیرا چھوٹنے کی کوشش کی مگر کارگر نہ ہوئی، "مجھے چھوڑ، ظالم چھوڑ، مجھے تجھ سے نفرت ہے، میں تیرے پاس جھیل کی بھیانک تاریکی میں آنا نہیں چاہتا"—— یہ کہتے اُسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک سرد ہاتھ نے اُس کا منہ بند کر لیا، دم گھٹنے لگا، پانی آنکھوں پر چھا گیا اور پھر اندھیرا ہی اندھیرا تھا،

صبح کو ملازم ناشتے کے لئے پوچھنے آیا، آواز دی، "سرکار! سرکار!" کچھ جواب نہ ملا، اندر آیا خوف سے کانپنے لگا، یہ کیا ہوگیا، اس کے آقا کی آنکھیں اُبلی پڑتی تھیں، بتیسی بند تھی، باہر جاکر محلہ والوں کو بلایا، سب نے مل کر لاش کو اُٹھایا کوئی غیر معمولی بات معلوم نہ ہوئی ایک صراحی بیشک اوندھی پڑی تھی اور اُس کا پانی کمرے کے فرش پر پھیل گیا تھا اور بس،

حامد اللہ افسر

دیر میں مَیں خاک بسر ہی رہا	عمر کو اس طور بسر کر گیا
کس کو میرے حال سے تھی آگہی	نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
گو نہ چلا تا مژہ تیر نگاہ	اپنے جگر سے تو گذر کر گیا
مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں	میر بھی شام اپنی سحر کر گیا (میر)

شہیدانِ محبت

گاڑی میں ایک دوشیزہ سوار ہوئی، جس کی آنکھوں نے آسمان نیلی فام سے کسب رنگ کیا تھا۔ اور برف سے بُشرہ کا حُسن و بیاض۔ غزالِ رعنا سے گردن کا حسن و تناسب، اور ملائکہ سے طہارتِ قلب، اس کا جمالِ ظاہری جمالِ باطنی سے زیادہ نہ تھا۔ حُسنِ آداب، جودتِ عقل اور کمال تہذیب شائستگی میں وہ اپنے جمالِ ظاہری سے مشابہ تھی۔

دوشیزہ کا نام "لینا" تھا لینا اپنی سہیلی کے یہاں دو روز رہی۔ اور یہ دن اُس خلوص و محبت اور لطف و مسرت سے گزارے جس کی تمنا کسی متنفس کو ہوسکتی ہے۔

لینا کو جو لوگ رخصت کرنے آئے تھے۔ انہیں ایک نوجوان "گیولف" بھی تھا۔ گاڑی روانہ ہونے کے بعد یہ نوجوان اپنے رفقا سے الگ ہوکر ایک دوسرے راستہ پر چلدیا۔ اور تھوڑی دُور جاکر ایک بڑی چٹان پر جا بیٹھا۔ وہ دیر تک وہاں سے اس شہر کو جانیوالی گاڑی کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ جہانتک نگاہوں نے کام دیا۔ یہ حسرت آگیں نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ آخر کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ دلکش گاڑی نگاہوں سے پنہاں ہوگئی۔ نوجوان ٹھنڈی سانسیں لیتا ہوا اُٹھا۔ اُس کا دل خدا جانے اس وقت کہاں تھا۔ اس بد حواسی میں اپنے جی میں کہنے لگا۔

"کون یہ خیال کرسکتا تھا کہ یہ دل حزین محبت کے لئے پھر زندہ ہوسکیگا۔ مَیں تو سمجھا تھا کہ وہ مرگیا اور مرکر یاس و نا امیدی کی تاریکیوں میں دفن ہوچکا۔ نہ صرف وہ بلکہ اسکے ساتھ اس کی تمام تمنائیں اور اُمنگیں بھی مدفون ہوچکیں۔ کیا قدرت نے پھر یہی فیصلہ کیا کہ وہ پھر اپنے گوشۂ قبر سے محبت کے لئے زندہ ہوکر اُٹھے۔ وہ پھر اعادۂ محبت کرے۔ اور پھر دوبارہ اور زیادہ سخت موت مرے۔ نہیں نہیں یہ ہرگز نہیں۔ بلکہ صرف اتنی بات ہے کہ میرا ایک دوشیزہ سے تعارف ہُوا۔ اور اس ملاقات میں اس کے اخلاق اور شریفانہ جذبات نے اس کی شرافت نفس اور تہذیب نے مجھے متاثر کیا۔ مَیں یہ سمجھنے لگا کہ اسکی محبت دل میں گھر کرگئی ہے۔ حالانکہ بات یہ ہے کہ آج رات کو مَیں اسکی تہذیب و ذکاوت کے اعتراف سے زیادہ اور کچھ خیال نہیں کرسکتا۔ اور نہ کرنا چاہیے۔ دلِ غمگین جا اور پھر اُسی اپنے گوشۂ قبر میں آرام لے۔ اس خیال کو چھوڑ، ہوسِ محبت نہ کر۔ تیرے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہوچکا ہے کہ بدبختی کی زندگی بسر کرے۔ اور آخر فنا ہوکر بے نام و نشان ہوجائے۔"

نوجوان گیولف چٹان پر بیٹھ گیا۔ اور دو گھنٹے تک اپنے دل سے سرگوشیاں کرتا رہا۔ اب اُسے سورج کی کرنوں کی تابش محسوس ہوئی۔ جو بیدردی سے اُسے اپنا نشانہ بنا رہی تھیں۔ اب وہ اپنی

جگہ سے اُٹھا اور گھر کو روانہ ہوا۔ وہ جا رہا تھا۔ مگر پاؤں بوجھل اور سر جھکا ہوا دل دھڑک رہا تھا۔ اور خیالات پریشان تھے۔ سینے میں اضطراب تھا۔ جیسے کوئی ہرن کا بچہ کلیلیں کر رہا ہو۔ آج کا دن اُس نے اپنے تمام دوستوں سے الگ تنہائی میں گزارا وادیوں کے سایہ دار خلوتخانوں میں اور پہاڑی ٹیلوں پر سبزہ زا میں اور دامن کہسار کے خود رو پھولوں میں۔ ان مناظر قدرت کی دلفریبیوں اور نیرنگیوں نے بہت چاہا کہ نوجوان گیوتلف کے دل کو ان افکار و خیالات کے ناخوشگوار موضوع سے دوسری جانب متوجہ کریں۔ جس نے اس کے دل کو انتشار میں ڈال رکھا تھا۔ مگر وہ اپنے عزم میں کامیاب نہ ہوئیں۔ رات نے جب اپنا پردہ ظلمت دنیا پر ڈالا۔ چار و ناچار وہ اپنے گھر واپس آیا اور اپنے کمرہ میں آکر خاموشی سے بستر پر لیٹ رہا۔ ہر چند وہ کوشاں تھا کہ دل کی الجھنوں سے کسی طرح نجات پائے۔ مگر ان آلام و افکار سے طبیعت نہ ہٹی۔ اور خیالات ایک منٹ بھی صبح کے اس واقعہ شورہا سے کسی طرح نہ جدا ہوتے۔ جبکہ وہ لینا کو رخصت کرنے گیا تھا۔ اور وہ اُس کا دل لے گئی۔ آخر چار و ناچار اُسے یقین کر لینا پڑا۔ کہ دوشیزہ لینا کا فریفتہ جمال اور شکار محبت ہو چکا ہے۔ اور بغیر اس کے صبر و سکون دشوار ہے۔

اِدھر لینا نے بھی ایک شدید کشش محسوس کی۔ جو اُسے نوجوان گیوتلف کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس سے قبل وہ محبت کا مفہوم صرف اسقدر جانتی تھی۔ جتنا اُس نے شاعروں کے کلام اور افسانوں کو پڑھ کر سمجھا تھا۔ وہ نام کے سوا گیوتلف سے واقف نہ تھی۔ مگر رخصت کے وقت برابر محبت کا اثر اُس پر ہو رہا تھا۔ اب اس قابل ہو گئی تھی کہ محبت کی تلخی اور شیرینی میں امتیاز کر سکے۔

اس حادثے کے دو ہفتہ بعد گیوتلف نے اپنے کو لینا کی ملاقات کے لئے جانے پر مجبور اور جاتا ہوا پایا۔ مگر وہ خود نہیں جانتا تھا۔ کہ کہاں جا رہا ہے۔ آخر پہنچا۔ ملاقات ہوئی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ لینا بھی اس کی شیفتہ ہو چکی ہے۔ اب اسکے قلب ناشکیب کو کچھ صبر و سکون حاصل ہوا۔ اور اس نے اپنے راز درون سے لینا کو آگاہ کیا۔ اپنا دل اُس کے حضور میں پیش کیا۔ لینا نے اُس کی دعوت محبت کو لبیک کہا۔ اور محبت کا معاہدہ ہو گیا۔ دونوں میں پُر از خلوص پیمانِ وفا ہوئے اور اس عہد و پیمان کے بعد یہ دونوں خوش نصیب و کامگار ہستیاں ایکدوسرے سے جدا ہوئیں۔

(۲)

یہ ایک مشہور مثل ہے کہ سدا دن یکساں نہیں رہتے اور انسانی تاریخ کوئی واقعہ ایسا پیش نہیں کرتی کہ کامیابی کے بعد ناکامی کی صورت نہ دیکھنا نصیب ہوئی ہو۔ وصال کے بعد فراق نے صورت نہ دکھائی ہو۔ نہ کوئی ایسی اُلفت جسے غم جدائی نے مجروح نہ کیا ہو۔ لینا اور گیوتلف کی محبت کو ابھی دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ انکو مصیبت فراق پیش آئی۔ کیونکہ ضروریات معاش نے گیوتلف کو ترک وطن اور اپنے محبت کدہ کی مفارقت پر مجبور کیا۔ آخر وہ مکان اور مکین سب سے رخصت ہوا لیکن وداع لینا

کی ساعت وہ ساعت تھی کہ پتھروں کے دل بھی اس پر روتے تھے۔ دونوں نے پھر تجدید عہد کی اور محبت پر ثابت قدم رہنے کی قسمیں کھائیں۔ پھر ایک دوسرے سے جدا ہوتے اس طرح کہ آنسوؤں کی تابش رخساروں پر نمایاں تھی۔ دلوں کو پاش پاش کئے دیتی تھی۔ اور ایک موہوم سی امید کے سوا کوئی ان کو تسلی دینے والا نہ تھا۔

جس زمانے میں گیولف تلاش معاش میں مصروف تھا اس نے زندگی کی تمام خوشیوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور اپنی تمام ہمت اس پر صرف کرنے لگا۔ کہ اسقدر روپیہ جمع کرے جو اسکی اور اسکی ملکۂ قلب کے عقد محبت کے لئے کافی ہو اور آئندہ خوشگوار زندگی میں دنیا کی ناخوشگوار فکروں سے بے نیاز رکھے۔ اسی دوران میں اس کو لینا کا ایک خط ملا۔ جس کا مضمون یہ تھا۔

حبیبی! قضا و قدر نے یہ فیصلہ کر لیا ہے اور غالباً اسکا یہ وہ فیصلہ ہے جسے کوئی قوت نہیں بدل سکتی کہ میرا یہ خط تمہارے نام آخری خط ہوگا۔ مگر یہ خیال نہ کرنا چاہیئے۔ کہ میں نے تمہاری محبت میں بدعہدی و پیمان شکنی سے کام لیا ہے اور بیوفائی کی یا تمہاری محبت میرے دل سے جاتی رہی۔ نہیں تم آج پہلے سے زیادہ محبوب ہو۔ پیارے! ذرا تحمل سے کام لینا اور میری نسبت کوئی رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کرنا۔ جبتک کہ معاملات کی نزاکتوں کو نہ سمجھ لو۔ اور بات کی تہ کو نہ پہنچ جاؤ اس کے بعد تم کو اختیار ہے کہ میرے عذر کو قابل قبول سمجھو یا ٹھکرا کر ملامت سے کام لو۔ تم جانتے ہو کہ مجھے جو تم سے محبت ہے وہ کسی تساہل شعار کی غفلت یا کسی سونے والے کا خواب پریشان نہیں ہے۔ بلکہ میں تم کو سچے دل سے چاہتی ہوں میرا دل و جان تمہاری محبت کے نشہ سے سرشار ہے بلکہ یہی محبت کی طاقت میری زندگی کا سہارا ہے میں صرف تمہاری ملاقات کی امید پر زندہ اور اپنے لئے ایک تابناک مستقبل کی متوقع تھی۔ میں سوچتی تھی کہ یہ آنیوالا مبارک دور تمہاری معیت میں گزارونگی۔ جبتک میری حیات کا جام زیست موت کے ہاتھوں چھلک کر خیال نہ ہو جاتے۔ اور میں اپنی حیات کا ارمان کو پورا کرتی ہوں۔ تمہاری آغوش میں جان دیدوں لیکن افسوس میری یہ سب زریں آرزوئیں خاک میں مل گئیں جس طرح صبح کی سہانی گھڑیاں اور شبنم کی رشک گہر بوندیں طلوع آفتاب سے فنا ہو جاتی ہیں۔ میں اپنی آرزوؤں کے حصول کی تمام امیدوں سے ہاتھ دھو چکی ہوں۔ اور اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ ان دو محبت پرور جسموں کے شیرازۂ ازدواج میں متحد ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہی جنکی روحیں محبت کے پاک اور استوار رشتہ میں اس سے قبل منسلک ہو چکی ہیں میرے بزرگ چچا جو میرے وارث اور وصی ہیں۔ وہ اس عقد کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا۔ کہ جسوقت تمہارے باپ اپنی جان نازنند اجل کر رہے تھے اسوقت

میں ان سے قسم کھا چکا ہوں کہ تمہاری بچّی کی پرورش اپنی اولاد کے مانند کرونگا۔ اور سنِ بلوغ کو پہنچنے پر اپنے عزیز بیٹے سے شادی کرونگا۔ پیارے گیولف میرے باپ نے اُن کی اس راستے سے اتفاق کیا تھا۔ اور میری منگنی میرے وارث کے فرزند رشید سے کر دی تھی۔ میں اس وقت بالکل نا سمجھ اور نادان تھی میرے پیارے تم جانتے ہو کہ مرنے والے کی وصیت کس قدر عزیز ہوتی ہے۔ اور اسکی تکمیل کتنی ضروری! یہ میرے لئے دشوار ہے کہ اپنے باپ کی وصیت کو پامال کروں چاہے میرا دل ہی کیوں نہ پاش پاش ہو جائے۔

گیولف! تم جانتے ہو کہ ایک دل ایک کی محبت سے زیادہ بار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور یقیناً میرے لئے تمہاری محبت کے سوا کسی اور سے محبت کرنا ایک ناقابل برداشت عذاب ہے اُس وقت بھی تمہیں میرے محبوب رہوگے۔ جبکہ میں لحد کے تاریک گوشہ میں چھپا دی جاؤنگی لیکن اب کیا کروں کہ میرے دل کے مالک تو تم ہو چکے۔ مگر میرے جسم کا مالک تمہارے سوا کوئی اور ہونے والا ہے۔ اور یہ میری آرزو کے بالکل خلاف لہٰذا اب تم کوشش کرو کہ مجھے بھول جاؤ۔ اور میرا نقش لوحِ دل سے مٹا دو۔ اور یہ خیال کر لو کہ لینا دُنیائے حیات سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ پیارے! جب تمہارا جی چاہے تو میری قسمت بلکہ میرے شباب پر دو آنسو بہا لینا۔ کیونکہ اس سے قبل کہ میں لذّت حیات سے متمتع ہوں۔ اور اپنے وجود کا صحیح مفہوم سمجھ سکوں۔ یہ شباب میرے ساتھ یاس و ناامیدی کے تاریک مرقد میں دفن ہونے والا ہے۔

میرا دل شورش غم اور درد و حزن سے پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ جب میں خیال کرتی ہوں کہ میرا یہ خط پڑھتے وقت تم پر کیا گذر رہی ہوگی۔ مگر مجھ کو تمہارے قلب کی مضبوطی، تمہارے استقلال اور قوت ارادی پر پورا اعتماد ہے۔ اور میں خیال کرتی ہوں کہ تم اس زخمِ الیم کو برداشت کر لوگے۔ پیارے! تقدیر پر صابر و شاکر رہو۔ اور اپنے دل کو مجھے بھول جانے کا عادی بناؤ۔ بہت مبارک ہوگا۔ وہ دن جب میں یہ خبر سنونگی کہ تم کو ایک ایسی دوشیزہ مل گئی جو مجھ سے زیادہ تمہاری محبت کے لائق اور مجھ سے زیادہ تمہارے دل کی مستحق تھی۔ اسکی محبت اور رفاقت سے تم اپنی زندگی خوشگوار بنانا۔ اور لینا کو بھول جانا جو تمہاری مصیبت اور بدبختی کا سبب تھی۔ میں تمہارے قدموں پر گر کر التماس کرونگی کہ پیارے! میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ بُرائیاں کی ہیں۔ جو کچھ قصور مجھ سے ہوئے ہیں اُنہیں معاف کر دو۔ میں تمہیں اپنی پاک اور سچّی محبّت کی قسم دیتی ہوں کہ میرے اس قول کی صداقت میں شک نہ کرنا۔ پھر میں تم سے یہ بھی سوال کرونگی۔ کہ جسقدر میرے خطوط تمہارے پاس ہیں۔ اور وہ میری نشانیاں ہیں۔ وہ سب واپس بھجوا دو۔ میں بھی اسی وقت تمہاری دی ہوئی کتابیں واپس کر رہی ہوں۔ اس وقت بھی میرے دل میں

محبت کی آگ بھڑک رہی ہے جو میرے جسم کو جلائے دیتی ہے۔اور میری آنکھوں میں وہ آنسو ہیں جو میری آنکھوں میں زخم ڈالے دیتے ہیں پس پیارے معاف کرو میری حالت زار پر رحم کھاؤ۔اور اپنی محبت کو فراموش کر دو۔" "لینا"

گیولف نے یہ خط ختم کیا ہی تھا کہ اسکے تمام اعصاب میں ارتعاش پیدا ہوا۔دنیا نگاہوں میں تاریک ہوگئی۔اور ایسا معلوم ہوا کہ رگوں کا خون رگوں میں جم کر رہ گیا ہے۔شدت غم سے اس کا دل سنگ پارہ ہوگیا۔چند منٹ تک اسکی آنکھیں پتھرائی رہیں۔رنگ زرد ہوگیا۔جیسے کسی کے چہرہ پر موت کی سفیدی نمایاں ہوجاتی ہے۔اسکے بعد پھر ایک اضطراب پیدا ہوا۔وہ تڑپ گیا اور بے اختیار اسکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے قریب تھا کہ بیہوش ہوجائے۔اور چاہتا تھا کہ خودکشی کرلے پھر یہ خیال آیا کہ خودکشی ضعف قلب کی علامت ہے مصائب پر صبر کرنا انسان کا بہترین جوہر ہے۔آخر گیولف نے اپنا دل مضبوط کیا۔آنکھوں سے آنسو پونچھے۔اور حواس درست کرکے اپنی ملکہ قلب کو خط لکھنا شروع کیا۔مگر یہ محسوس ہوا۔کہ قلم اظہار مافی الضمیر سے قاصر ہے۔آخر لینا سے ملنے کے ارادے سے سفر کا تہیہ کرلیا خصوصاً اس خیال سے کہ بہت ممکن ہے کہ اس سے مل کر اس تجویز کا مقابلہ کرسکے۔جو اس وقت ان دونوں میں سد راہ ہو رہی ہے

تین ہفتہ کے بعد کا ذکر ہے۔کہ لینا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے حالات پر غور کر رہی تھی۔کہ ناگاہ گیولف آتا ہوا دکھائی دیا۔لینا کی نظر پڑتے ہی وہ استقبال کے لئے اٹھی۔اور اپنا ہاتھ بڑھایا۔مگر پھر کچھ سوچ کر پلٹ آئی۔اور کہنے لگی:۔

"نہیں نہیں! اب ہم کو ایکدوسرے سے نہ ملنا چاہئے۔یہ ملاقات ہمارے آلام میں ایک اضافہ اور ہمارے ارادوں میں کمزوری پیدا کردیگی۔آئندہ پیش آنے والے مصائب کے برداشت کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔گیولف پیارے! جاؤ۔جاؤ اور یاد رکھو۔کہ جو کچھ مجھے کہنا اور بتانا تھا وہ سب میں اپنے مکتوب میں بیان کرچکی۔اب اس باب میں کسی بحث کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔خدا کے لئے میرے قلب زار پر رحم کھاؤ۔اور یہ سمجھ لو کہ تم سے مجھ سے ملاقات ہی نہ تھی۔اگر تم ایسا کروگے تو میں سمجھونگی کہ مجھے تم نے میرے مصائب اٹھانے کی طاقت بخشی"

گیولف:"تم نے مجھ سے جو قسم کھائی تھی وہ یاد ہے۔کہ تم میرے سوا کسی سے محبت نہ کروگی۔کیا محض ایک جاہلانہ وصیت کی تائید کے لئے وعدہ خلافی پر آمادہ ہو۔جسکی صحت بھی بجائے خود مشکوک ہے۔اور کیا شریعت عشق میں اس محبت کا قتل اور ان دلی پاک جذبات کا خون حلال ہے۔ہم نے اپنے دلوں کی پرورش خون پلا پلا کر کی ہے۔کیا یہ جائز ہوسکتا ہے۔کہ ہم محض ایک وصیت کی تائید میں جو صرف ایک شاہد رکھتی ہے اور وہ بھی ایک ایسا شاہد کہ دنیا سے رخصت ہوچکا ہے۔دو وفا پرست اور راستباز دلوں کو قربان کردیں۔لینا! تم اپنے دل سے اس وہم کو دور کرو۔ادھر بڑھو۔کہ میں تمہیں اپنے سینے سے لگالوں کہ یہ تمہاری آتش محبت

سے چُھپکا جا رہا ہے۔ اور تمہیں اپنی زوجہ امانتدار زوجہ کہوں تاکہ میں یہ نہ کہہ سکوں کہ تم میری محبت سے برگشتہ ہو کر کسی اور کی جانب مائل ہو۔ لینا نہیں پیارے! تم اس امر محال کی استدعا نہ کرو۔ اور اپنے عزم کو توڑنے پر مجھے آمادہ نہ کرو۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ تمہاری یہ محبّت آمیز باتیں میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو رہی ہیں نہیں! جاؤ جاؤ!! میری محبت تم تک اُس مصیبت کو نہ پہنچائے جسے ابھی صرف میں اُٹھا رہی ہوں۔ مجھے تنہا ہی یہ عذاب جھیلنے دو۔ اور تم کامیاب زندگی بسر کرو۔ اچھا اب وعدہ کرو کہ میرے خطوط واپس کر دو گے۔ اور آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرو گے۔ بیشک گیولف! جدائی زہر تلخ اور زندگی نہایت دشوار چیز ہے لیکن امیدوار مرنا ان دونوں سے زیادہ سخت ہے میں بہت دنوں اس امید میں رہی کہ اپنی آئندہ زندگی تمہارے ساتھ خوشگواری سے گزار سکونگی۔ مگر افسوس اب ایک امر ممکن غیر ممکن ہو گیا۔ اور یہی حلال میرے لئے حرام۔ اب فراق کے سوا چارہ کار نہیں۔ اگرچہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ جائے گیولف! صبر کرو مرد بنو اپنی دانائی کا ثبوت دو۔ اور اپنے استقلال اور مصائب جھیلنے کی ہمّت کا۔ اِس عظیم مصیبت میں میرے مددگار بنو جو تمہاری مفارقت میں مجھے پیش آنے والی ہے۔

لینا یہ کہکر آگے بڑھی، اور گیولف کے قریب آکر اسکی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اُسکے لبوں پر مہرِ محبت ثبت کی۔ وہ بوسہ جس کے نقش میں اُس کی زندگی کی تمام قوت شریک تھی پھر وہ لفظ رخصت کہکر جھٹ اپنے کمرہ سے نکلکر چلی گئی۔ اب گیولف کمرہ میں تنہا رہ گیا تھا۔ جیسے کوئی دیوانہ یا مدہوش۔ حس اور قوت و عزم مفقود ہو چکے تھے۔ وہ پھر سنبھلا اور یہ اندیشہ ہوا کہ کمرہ میں کوئی اور نہ آ جائے۔ اور اُنہیں اس حالت میں نہ دیکھ لے۔ آخر وہ نہایت مایوسی اور غمگینی کے ساتھ باہر نکلا۔ دُنیا تاریک تھی۔ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔

ایسی حالت میں گیولف گھر پہنچا لینا نے آغاز محبت میں جسقدر خطوط لکھے تھے۔ اُن کو نکالکر ایک ایک کر کے پڑھنے لگا سب ختم کر کے وہ پھول اُٹھایا۔ جو لینا نے اسے اس روز دیا تھا۔ جبکہ یہ فکر معاش کے لئے تیار ہوا ہے۔ اور لینا سے رخصت ہونے گیا ہے۔ اس پھول کو اُٹھا کر اُسنے تین بار بوسہ دیا۔ پھر اُن سب خطوط کے ساتھ ایک چھوٹے سے لفافہ میں رکھا۔ اور اس پر لینا کا پتہ لکھ کر ایک رقعہ کے ساتھ بھجوا دیا۔ جس کا مضمون یہ تھا:۔

"افسوس ہماری محبت کو ایک سال سے بھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ حالانکہ میرا خیال تھا۔ کہ مدت العمر یہ باقی رہیگی۔ اور مجھے یقین ہے کہ عہدِ طفلی میں یہ محبت ہلاک ستم ہو جاتی اگر تم اسکی ہلاکت کا ارادہ نہ کر لیتیں میں نے خیال کر لیا کہ مجھ کو تسلّی حاصل ہو گئی۔ میں تم کو بھول گیا۔ اور تمہاری تمام یادگاروں کی واپسی بھی ضروری خیال کرتا ہوں محض تمہارے اس زعم باطل کی بنا پر کہ میں اس صورت میں تپ دروں سے نجات پا سکونگا

یہ سب میں فرض کئے لیتا ہوں۔ لیکن مجبوری ہے کہ جبتک زندہ ہوں تمہیں بھول جانا میرے امکان سے باہر ہے اور تمہاری یہ محبت ہمیشہ رہیگی۔ جس کی کنہ حقیقت کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور میرے نزدیک محبت جذبات شہوانی کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ یہ شہوانی جذبات پورے ہونیکے بعد زائل ہوجاتے ہیں۔ مگر محبت تاحیات برقرار رہتی ہے کیونکہ محبت حیات انسانی ہی کا عنصر ہے۔ میں صرف تمہاری تعمیل حکم میں تمہاری عزیز نشانیاں واپس بھیجتا ہوں۔ اب میرے پاس سوا اس ایک یاد حبیب کے کچھ نہیں ہے۔ جو تمہارے پیکر کو ہر وقت میرے سامنے رکھتی ہے۔ اور میری زندگی کا کوئی منٹ بھی ایسا نہیں گزرتا جبکہ تم عالم تصور میں میرے سامنے نہ ہو۔ پس میں باوجود اس بعد مسافت کے جو میرے اور تمہارے درمیان میں حائل ہے۔ ہر وقت تم کو اپنے پاس پاتا ہوں۔ لینا! اگر تم کو بھی مجھ سے وہی محبت ہوتی جو مجھے تم سے ہے۔ تو میں تنہا تمام دنیا کے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا۔ مگر اب میں تم سے ایسی چیز کا مقابلہ نہیں کرسکتا جو تمہارے امکان میں نہیں ہے۔ اور جبکہ میرا وجود ہی تم پر گراں ہے۔ اور تمہاری اس سعادت کو مکدر و منغص کرتا ہے جسکی تم اپنے وصی کے فرزند سے نکاح کرنے کے بعد متوقع ہو۔ مگر تم سے جو محبت اور تمہاری راحت رسانی کا خیال جو مجھ کو ہے اس کا اظہار پورا پورا کیوں کر ہو۔ اب میں اس ایک بوسہ شیریں کی یاد میں جس نے میری حیات آرزو کا خاتمہ کردیا زندہ رہونگا۔ میں تمہارے اور اس فیصلہ کے درمیان میں جو تم نے کیا ہے۔ حائل ہونا نہیں چاہتا بلکہ میری آرزو ہے کہ میری زندگی میں اور میرے بعد تم کامیاب رہو۔

حزین "گیولف"

ایک روز لینا کا چچا لینا کے پاس آیا۔ دیکھا کہ وہ بہت غمگین اور بے اختیار رو رہی ہے۔ چچا نے رونے کا سبب پوچھا۔ لینا نے کہا۔ مجھے خود نہیں معلوم مگر ہاں یہ ضرور محسوس کرتی ہوں۔ کہ میرا دل کسی خونخوار عقاب کے چنگل میں ہے۔ وہ مجھ کو دباتا ہے۔ جھنجھوڑتا ہے۔ میرا درد و کرب بڑھتا جاتا ہے۔ اور میں اپنے کو نہایت تکلیف و قلق میں پاتی ہوں۔ یہانتک کہ خود مجھے اپنی قبر تنگ نظر آتی ہے۔

چچا۔ لینا آجکل تم گوشہ نشین اور سب سے بہت زیادہ الگ تھلگ رہنے لگی ہو۔ یہ تنہائی تمہارے غم و آلام کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ میں اسوقت یہ خوشخبری لایا ہوں کہ میرا عزیز فرزند گوستاف آگیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے یہ وہی نوجوان ہے جس سے تمہارے مرحوم باپ نے تمہیں منسوب کیا ہے۔ میں اُسے تمہارے پاس بھیجدیتا ہوں تاکہ تمہارے آلام میں کمی ہوسکے۔ اور تمہارا جی بہلائے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد گوستاف اندر داخل ہوا۔ مسرت اور سرور کے آثار اس کے چہرہ سے نمایاں تھے۔ لینا اسکے استقبال کو اٹھی۔ گوستاف لینا کی طرف بڑھا کہ اُسے پیار کرے مگر لینا فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

گوستاف کیوں پیاری لینا تم مجھ سے اسقدر دُور کیوں ہوئی جاتی ہو کیا یہ ہمارے لئے نئی بات ہے۔ اس سے پہلے بارہا ایسا ہُوا ہے۔ کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش اور بوسہ گیر ہُوئے ہیں۔ زمانۂ طفلی کو کیا تم بالکل بھول گئیں؟

لینا۔ ہاں بیشک۔ مگر یہ اُس وقت کا قصّہ ہے۔ جب ہم دونوں ناداں بے سمجھ تھے۔ مگر اب میرے لئے ایک مرد کو پیار کرنا آسان نہیں ہے۔

گوستاف مگر یہ مرد وہی لڑکا تو ہے۔ اور ہم دونوں وہی ہیں جو بچپن میں تھے۔ اب ہم آغوش ہونے میں ہمیں کون چیز مانع ہو سکتی ہے خصوصاً اس حالت میں جبکہ بہت جلد تم میری عزیز بیوی ہونے والی ہو۔

لینا یہ سُنکر گھبرا گئی۔ اور کہنے لگی: بچپن کے بوسے طہارتِ نفس اور سادہ دلی کا ثبوت ہوتے ہیں۔ اور بچّوں کے نزدیک انکا مفہوم ایک حرکتِ لب کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر مرد! اسکے نزدیک بوسہ کا مفہوم خفی ایک اور بھی ہے۔ اور اسرارِ محبت میں سے ایک لطیف راز ہے۔ رہی عورت! تو اس کا بوسہ اگر مجبوری و بے اختیاری سے ہو تو ایک زہرِ قاتل ہے۔ بوسہ لینے والے کو ہلاک کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اور اگر یہی بوسہ محبت سے ہو۔ تو سمجھئے کہ اسکی حیات کامران کا ایک عنصر لطیف ہے

گوستاف میں تمہیں اس لئے پیار کرتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور مجھے خیال تھا کہ یہ محبت ہم دونوں میں مشترک ہے۔

لینا مگر میرا گمان غالب یہ ہے کہ تم محبت کا صرف دعویٰ کرتے ہو حقیقت میں محبت کرتے نہیں ہے۔

گوستاف۔ اچھا اسکی آزمائش کر لو۔ ابھی تم کو معلوم ہو جائیگا کہ میں کہانتک سچّا ہوں۔

لینا۔ شاید میں تم سے کسی ایسی چیز کی استدعا کروں جسے تم محال خیال کرو۔

گوستاف محبت کی بدولت کوئی بات محال نہیں ہو سکتی۔

لینا۔ اچھا تم قسم کھاؤ کہ میری استدعا پوری کرو گے۔

گوستاف میں قسم کھاتا ہوں کہ ضرور پوری کرونگا۔

لینا۔ واقعی تم ذرا بھی اگر میری محبت اپنے قلب میں محسوس کرتے ہو تو اس سے پہلے کہ وہ دل میں جگہ کرے اُسے دل سے نکال ڈالو۔

گوستاف۔ یہ کیوں؟

لینا۔ یہ اس لئے کہ میں تمہاری محبت کا حق ادا نہیں کر سکتی اور اظہارِ محبت کی پذیرائی کے لئے تیار نہیں ہوں اس لئے کہ ایک نوجوان کو اپنا دل دے چکی ہوں میں نے بہت چاہا۔ اور کوشش کی کہ اپنے دل سے اسکی محبت بالکل محو کر دوں اور اپنے دل کو تمہاری محبت اور تمہارے ساتھ نکاح پر مجبور کروں۔ مگر یہ میرے امکان سے باہر تھا۔ اگر مرحوم باپ کی وصیّت نہ ہوتی

گوستاف۔ وصیّت کیسی؟

لینا تمہارے باپ نے مجھ سے بیان کیا کہ میرے مرحوم باپ نے انکو میرا سرپرست اور وصی بنلیا تھا۔ اور انکا ذاتی خیال یہ تھا کہ مجھے تمہاری زوجیت میں دینگے۔ اور یہی اُنکی آخری وصیّت ہے۔

گوستاف۔ مگر تمہارے باپ نے یہ وصیّت اس شرط پر کی ہوگی کہ ہم دونوں میں محبت بھی ہو۔ اور ہم دونوں عقد پر راضی ہوں

ورنہ ہر ایک اپنے عقد کے لئے مختار ہے۔ جس کے ساتھ چاہے کرے۔ میں بھی تم سے چھپاتا نہیں کہ اس وقت صرف یہ سوچکر آیا تھا کہ اپنے مافی الضمیر سے تم کو آگاہ کردونگا۔ اور اگر دیکھونگا کہ تم کو واقعی مجھ سے محبت ہے اور میرے ساتھ عقد پر آمادہ و راغب ہو تو میرے لئے بھی اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ تمہاری رغبت خواہش کو نہ ٹھکراتا۔ خواہ میرا قلب اُس اجنبی دوشیزہ کی سوزش محبت سے پاش پاش ہی کیوں نہ ہو جاتا جس کے ساتھ عشق و محبت کی طرح ڈالنے میں مجھے کوئی امر مانع نہ تھا۔ سوا اس کے کہ میرا خیال تھا کہ تم میری واپسی کی منتظر ہو۔ اس لئے کہ میں تمہارے شوہر بننے کی عزت حاصل کروں۔ اب رہی وصیت تو "اذا فات الشرط فات المشروط" اب ہم دونوں کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ اپنے اپنے محبوب تک پہنچنے میں ایک دوسرے کی امداد کریں اچھا اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارے حبیب کا کیا نام ہے۔ وہ کہاں رہتے ہیں۔

لینا۔ اُن کا نام گیولف ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیونکہ تقریباً چار ماہ سے بے نشان ہیں۔

گوسٹاف شدت اضطراب سے بے حال ہو گیا مگر اپنی پریشانی اور اضطراب کو چھپانے کی کوشش کی۔ لینا نے اس کی مضطربانہ حالت سے واقعات کا اندازہ کرلیا۔ اور کہا آخر یہ نام سنکر آپ کیوں اسقدر مضطرب ہوئے۔

گوسٹاف۔ اس وجہ سے کہ وہ تو میرا دوست اور بچپن کا رفیق ہے۔ اور ابھی دو گھنٹہ پیشتر میں اُس کے پاس تھا۔ وہ بہت کرب و آلام میں پڑا ہے۔ عالم نزع سے ہم آغوش ہے۔

لینا۔ (بڑی زور سے آہ سرد بھر کر) کیوں کیا ہو گیا؟

گوسٹاف۔ ابتک اطباء تشخیص مرض نہیں کر سکے چار مہینے سے برابر علاج ہو رہا ہے۔ مگر بجائے صحت کے ناتوانی اور بیماری بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اب تو معالج بھی علاج سے عاجز اور تندرستی سے مایوس ہو گئے ہیں۔ میں نے خود سنا ہے آج تو وہ یہ کہہ رہے تھے کہ کل تک اس نوجوان کا بچنا دشوار ہے۔

گوسٹاف اس جملہ کو ختم نہ کرنے پایا تھا کہ لینا بیہوش ہو کر گر پڑی۔ گوسٹاف نے لپک کر اُٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کے مُنہ پر پانی چھڑکا۔ تھوڑی دیر میں کچھ افاقہ ہوا تو لینا فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور گوسٹاف سے کہا۔

لینا۔ آیئے ہم آپ دونوں گیولف کے یہاں چلیں میں اُس کے لئے بہترین دوائے شفا ہوں۔

گوسٹاف۔ مگر لوگ کیا کہینگے۔

لینا۔ میں اپنے حبیب کے سوا کسی کی پروا نہیں کر سکتی۔ آیئے جلد آیئے۔

یہ کہکر لینا اُس کا ہاتھ پکڑکر جھٹ روانہ ہوئی۔ گھر سے نکلکر دونوں ایک کرایہ کی گاڑی پر سوار ہو کر چل دیتے گاڑی ایک نہایت معمولی اور چھوٹے سے مکان کے سامنے

جاکر ٹھہری۔ دونوں اُتر کر اندر داخل ہو ہی رہے تھے کہ دیکھا ایک ڈاکٹر باہر آرہا ہے۔ جس کا چہرہ بالکل اداس ہے اور نہایت پریشان و دل گرفتہ معلوم ہوتا ہے۔ گوسٹاف نے پوچھا کہ آپ کے مریض کا کیا حال ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "حالت بہت نازک ہو چلی ہے۔ نزع کا عالم ہے اور گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہے"

لینا انتہائے رنج والم سے چیخ اٹھی۔ اور بیمار کے کمرہ کی طرف دوڑی۔ دیکھا کہ بیمارِ ناتواں سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بستر پہ صرف ایک خیالی پیکر ہے آنکھوں میں کچھ نم اور ہونٹوں میں کچھ جنبش تھی۔ وہ ایک عالمِ بےخبری میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس کی محبوبہ بھی کچھ نہ سمجھ سکی سوائے ایک لفظ کے اور وہ کیا تھا۔ "لینا" لینا جھٹ اس کے قریب گئی۔ اور بولی "گیولف۔ پیارے گیولف ہوشیار ہو تمہاری محبوبہ لینا حاضر ہے وہ تمہاری خدمت اور تیمارداری کیلئے آئی ہے۔ آنکھیں تو کھولو!

بیمارِ ناتواں نے آنکھیں کھولیں۔ اور غور سے اُسے دیکھا اُس کا چہرہ آسمانی نور سے چمکنے لگا۔ اور یہ کہتے ہوئے آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی۔ "وہاں ملینگے" اس کے بعد اپنی جان ہمیشہ کے لئے حوالۂ اجل کر دی ....

لینا پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پاؤں میں رعشہ محسوس ہوا۔ گھٹنے جھکے۔ اور حزن و یاس کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ گری۔ مرنیوالے نوجوان کے گلے میں ہاتھ ڈال دئے۔ اُسے پیار کیا اور نہایت درد سے روتی ہوئی اس کے سینے سے چمٹ گئی گوسٹاف جھٹ اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا۔ کہ "لینا" کو ہٹائے۔ مگر آہ! وہ ایک ہم تھی بے جان۔

محوی صدیقی

ہمنشیں اب امتیازِ ظاہر و باطن نہیں
آج چاک دل سراچاکِ گریباں ہوگیا

پھر اسی کو ڈھونڈھتی ہیں میری نظریں ہر اندن
تیرا وہ جلوہ جو ان آنکھوں سے پنہاں ہوگیا

عشق میں جس چیز کو ناچیز ہم سمجھے تھے نور
آج وہ قطرۂ لہو کا زیب داماں ہوگیا

شیام کشور نور

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اقبال

تدبیر و تقدیر

آلودۂ خوں ہر دم تدبیر نظر آئی — تقدیر کے ہاتھوں میں شمشیر نظر آئی
محروم تماشا نے دیکھا تو یہی دیکھا — ہر چیز اُسے اپنی تصویر نظر آئی
محروم تماشا نے جب پا عنت دیکھا — ہر چیز اُسے اپنی تصویر نظر آئی
جو ختم ہوئی کوشش تو ٹوٹ گئی ہمت — تدبیر کے پردے میں تقدیر نظر آئی
کیوں تنگ نظر زاہد! کوثر کا سماں دیکھا؟ — ہم نا نہ خرابوں کی توقیر نظر آئی؟
آنکھوں سے اُٹھے پردے جب وقت نے آگھیرا — اُس وقت ہمیں اپنی تصویر نظر آئی
ناکام محبت کو ناکام تمنّا کو — بگڑی ہوئی عالم کی تقدیر نظر آئی
وابستۂ اُلفت کو پابستۂ وحشت کو — آزادیٔ صحرا بھی زنجیر نظر آئی

اللہ رے یہ پر تو میرے دلِ محزوں کا
فطرت بھی مجھے احسنؔ دلگیر نظر آئی

سید احسن

غزل

بتاؤں کیا تمہیں کس باغ کی بہار ہوں میں — ہو کوئی دیکھنے والا تو آشکار ہوں میں
یہ کون آیا ہے تربت پہ میرے ماتم کو — یہ کس کی یاد میں مرنے پہ شرمسار ہوں میں
مآلِ گل پہ تو گریاں ہے قطرۂ شبنم — مآلِ قطرۂ شبنم پہ اشکبار ہوں میں
مٹا نہ مجھکو فرادا اپنے غمِ پنہاں — کہ غم نوازوں کی دنیا میں یادگار ہوں میں

قصورِ غیر پہ ملنے لگی سزا شائق
گلہ عدو نے کیا تھا گناہگار ہوں میں

اودے سنگہ شائق

گوتم بدھ

پدبش بجیر! گوتم بدھ کے واقعاتِ زندگی میں سے
ذیل کا واقعہ مجھے ایک برہما کے پروہت نے سنایا تھا

اکثر شام کے وقت راجکمار سدھارتا ایک ندی کے کنارے جا بیٹھا کرتا تھا۔ یہ جگہ اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے کچھ ایسی دلفریب تھی کہ وہ اسے اپنے شاہی باغ سے زیادہ پسند کیا کرتا تھا۔ یہاں بیٹھکر اُسے دنیا کے بکھیڑوں سے رہائی مل جاتی تھی اور اطمینان قلب میسر آتا تھا۔ اکثر وہ صاف شفاف پانی میں قدرت کی نیرنگیوں اور کنول کے پھولوں کو تیرتا ہوا دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ وہ گھنٹوں دنیا کی ابتدا اور انتہا پر غور کیا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ موت کا راز معلوم کرے مگر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہمیشہ زندہ رہے مگر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر قسم کے حوادث و مصائب سے محفوظ رہے۔ مگر کامیاب نہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ مسرور و کامیاب رہنے کی کوشش کرتا تھا مگر یہ مشکل تھا اس کی بےبسی و بیچارگی اُسے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتی تھی کہ اُس کی محدود قوتوں سے پرے کسی اور قوت طاقت کا وجود [illegible] اور اس کے مثل تمام فانی موجودات پر ہر لحظہ و ہر آن حکومت کرتی ہے۔ وہ اس راز کو معلوم کرنا چاہتا تھا مگر نہ کر سکتا تھا۔

ایک دن شام کے وقت کپلوستو کے بازاروں میں پھرنے کے بعد جونہی وہ ندی کے کنارے پہنچا ہوا کے ایک تیز و تند جھونکے نے اُسے بیدار کر دیا۔ اُسے معلوم ہوا کہ ہوا نے اُس کے گرد ہالہ بنا لیا ہے اور اُس کی زبردست قوت کسی نامعلوم طاقت سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے۔ اُس کا دل گھٹنے لگا اور اس کمزوری کی حالت میں وہ لیسو رہا۔ اکو ڈھونڈھنے کے لئے اُٹھا اُس نے کنول کے پھول کو پانی پر کانپتے ہوئے دیکھا۔ اُس کا دل غم سے لبریز ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اُس کی قوت گویائی کچھ دیر کے لئے سلب ہو چکی تھی۔

تین دن وہ متواتر وہاں جاتا رہا۔ ہر روز غروب آفتاب کے وقت ہوا کا جھونکا آتا اور درختوں کے پتّوں میں سے گذر جاتا اور ہر روز کنول کا پھول اُس کی مشق سے زیادہ کانپتا۔ چوتھے روز اُس نے دیکھا کہ

اُس کے پتے پژمردہ ہو رہے تھے اور چھٹے دن جب وہی جھونکا پھر آیا تو کنول کا پھول ہمیشہ کے لئے پانی کی گود میں سو گیا۔ اُسی وقت ایک سفید ریش بڈھے کی شکل اُس کی آنکھوں میں پھرنے لگی جسے اُس نے شام کو بازار میں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ باغ میں پھولوں کی پژمردگی نے اس کے خیالات پریشاں میں اور بھی اضافہ کیا۔ اس کا دل غم سے لبریز ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کیا قانون فنا کی گرفت اُس پر قابو نہ پا سکیگی؟ اب اُسے یقین ہو گیا کہ موجوداتِ فانی سے ماوراء و مافوق کسی اور شے کا وجود ضروری ہے۔

وہ لیشودھرہارا کے پاس آیا جو بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر وہ چپ چاپ اُس کے پاس کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں کسی اندرونی غم کا پتہ دیتی تھیں۔ لڑکی نے اُس کے چہرے سے معلوم کر لیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

"میرے سرتاج......" وہ بچہ کی بھولی صورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی

"لیشودھرہارا" شہزادے نے بات کاٹتے ہوئے کہا "راہولا کو زندہ نہیں رہنا چاہئے"

لڑکی نے بچہ کو چھاتی سے لگاتے ہوئے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ شہزادے نے کہا۔

"میں نے آج مشاہدہ اور تجربہ سے پا لیا ہے کہ زندگی اور زندگی کی ہوس ایک دائمی رنج پیدا کرتی ہے میں نے دیکھ لیا ہے کہ بڑھاپا۔ بڑھاپے کی کمزوری اور موت ہر جگہ ہے۔ اور یہ ہماری ہی وجہ سے ہے کہ ایک معصوم پھول کو دکھ اور پاپ ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کیا مہادیوتا کو بھی موت سے نجات نہیں دلوا سکتی۔ موت کا قانون اٹل ہے اس نے......"

"ہش" لڑکی نے بات کاٹتے ہوئے کہا "مگر راہولا کو کیوں زندہ نہیں رہنا چاہئے؟"

"نجات" اپنی نجات کے لئے" سدھارتھ نے جھک کر اُس کے کان میں کہا

"لیکن جب موت زندگی کی انتہا ہے تو پھر کیوں نہ اسے اس وقت تک زندہ رہنے دیا جائے"

یسودھارا نے التجا کرتے ہوئے کہا

"زندگی آخر زوال پذیر ہے"

"میرے باپ نے مجھے دنیا سے دور رکھنے میں بڑی بھاری غلطی کی۔ یہ ناممکن تھا کہ میں دنیا کے تغیرات کا مشاہدہ نہ کرتا۔ مجھے آخر حقیقت معلوم ہو گئی۔ اب ہمیں اس بچہ کو ان تکالیف سے دور رکھنا لازمی ہے"

"میرے سرتاج اگرچہ مجھے آپ کے حکم کی تعمیل میں عذر نہیں مگر ذرا ٹھہرئیے اسقدر عجلت سے کام نہ لیجئے

اور مجھے اجازت دیجئے کہ میں تین دن کے اندر اس معمہ کو حل کردوں اور پھر اگر میں کامیاب ہوجاؤں تو بچہ کو زندہ رہنے دیجئے۔"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد سدھارتا نے اُسے تین دن کی مہلت دی۔ تیسرے دن شہزادہ یسودہارا کے پاس آیا اور معصوم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"پھر؟"

"کیا آپ نے نہ کہا تھا کہ زندگی اور زندگی کی ہوس دائمی رنج پیدا کرتی ہے۔ مگر یہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ رنج بجائے خود ایک تکلیف دہ چیز ہے۔ جب راہولا پیدا ہوا تو مجھے بیحد تکلیف رہی اور ابھی تک وہ تکلیف رفع نہیں ہوئی کہ دوسری آیا چاہتی ہے دنیا میں کئی ایسے ہیں جنہوں نے زلیست کا نصب العین محبّت قرار دے رکھا ہے۔ اگر محبت کے معنے یہی ہیں تو یہ ایک اور غلطی ہے۔ فرمائیے اسقدر کھلی حقیقت کی کیونکر تردید ہوسکتی ہے۔

"یسودہارا" شہزادے نے جواب دیتے ہوئے کہا "تمہارے الفاظ مطلب سے خالی ہیں۔ تم نے جو کچھ بھی کہا ہے یہ ہماری مساعی کوششوں کے بالکل برعکس ہے جس کی ہم جدوجہد میں ہیں۔ ہر چیز جو ہماری نظر سے گذرتی ہے اُس میں کئی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور اگر یہ نہ ہو تو دنیا قائم نہیں رہ سکتی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی یہ تبدیلیاں بھی ایک بڑی مصیبت ہیں۔"

"اچھا تو مجھے پھر دو موقعے دئیے جائیں" لڑکی نے التجا کرتے ہوئے کہا

بڑی مشکل۔ شہزادے نے مان لیا۔ دوسرے دن اُس کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ بحث کرنے لگے۔

"سنو! اسے بارہ برس تک زندہ رہنے دو تاکہ وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہولے اور پھر آپ کو اس کا جواب دے سکے۔"

شہزادے کی بھویں سکڑنے لگیں

"تم ایک عورت کی طرح بحث کرتی ہو اور ہر ایک چیز کو غلط سمجھتی ہو۔ اگر بچہ کو زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے دیا جائے تو اس کی زندگی کی ہوس اور زیادہ ہوجائیگی اور یہی ایک بدی ہے۔ زندہ رہنے کی ہوس اس پر اپنا غلبہ پالیگی۔ نہیں یسودہارا تمہارے الفاظ مجھے قائل نہیں کرسکے۔"

تیسرے دن راہولا کی موت کی گھڑیاں گنتے گنتے کسی خیال سے یسودہارا کو ذرا تسکین ہوئی اور وہ سدھارتا کا انتظار کرنے لگی اور جونہی وہ کمرے میں

داخل ہوا بول اُٹھی

میرے سرتاج. آپ کہتے ہیں دنیا کی ہر ایک چیز فانی ہے۔ زندگی کی ہر ایک ساعت، ہر ایک گھڑی، موت کا پیغام لاتی ہے۔ دنیا فانی ہے اور اسکی ابتدا اور انتہا نامعلوم، یہ درست ہے اور بجا مجھے آپکی صداقت پر کامل یقین ہے۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حقیقت کس چیز کا نام ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کیا آپ کے بعد جو پیدا ہوگا وہ بھی آپ ہی کا ہم خیال ہوگا؟ فرض کیا، اگر وہ کہے کہ زندگی کی ہر ایک ساعت، ہر ایک گھڑی اپنے ساتھ نئی پیدائش، درختوں اور پھولوں میں نئی روح لاتی ہے جو آپ کے عقیدہ کے بالکل برعکس ہے کیونکہ ہر ایک انسان کا نقطۂ نظر مختلف رہا ہے۔ اور یہی خیال اس بچہ کا ہو تو پھر؟ آپ کے الفاظ ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ تبدیلیاں لازمی ہیں اور جب ہر ایک چیز فانی ہے تو آپ ہی بتائیے کہ کیا آپ کے الفاظ ہمیشہ قائم رہ سکیں گے۔

جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکی تو اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں کیونکہ اُس نے اپنی تمام عقل اس میں لگا دی تھی۔ شہزادہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ یسودھارا کو کچھ امید بندھ گئی۔

"یسودھارا۔" شہزادے نے اس پر نظر جماتے ہوئے کہا "تم نے بیشک مجھے اپنے دلائل سے قائل کر دیا ہے مگر تمہارے الفاظ میری حقیقت کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ آج تم نے اپنی حکمت عملی سے مجھے مغلوب کر لیا ہے۔ مگر کل میرے الفاظ کی صداقت دنیا میں ایک شورش برپا کر دیگی اور دنیا اس غلط راستے سے صراطِ مستقیم پر آجاویگی۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے یسودھارا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا "راہولا اب زندہ رہے گا"

لڑکی نے فرطِ مسرت سے دونوں باہیں شہزادے کے گلے میں ڈال دیں مگر اُس نے اُسے علیحدہ کر کے کرسی پر بٹھا دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

رات کو آدھی رات کے وقت جب کائنات محو خواب تھی۔ وہ اٹھا۔ ایک نظر یشودھارا پر ڈالی جو بچے کو گلے سے لگائے نیند کے مزے لے رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور چُپ چاپ دونوں کو الوداع کہتے ہوئے محل سے رخصت ہو گیا۔ دوسرے دن طلوع آفتاب کے وقت دو آدمی ریاست سے جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اُن میں سے ایک کا نام بڈھے پروہت نے کہا گوتم بدھ تھا۔ جس نے دنیا کی تبدیلیوں میں حقیقت اور صداقت کی ایک نئی روح پھونکی ہے۔ (ترجمہ)

افتخار الرسول بدر

جذبات افسر

برسات کے یہ دو چار ستارے شام سے سوئے جاتے ہیں
جھینگر کی دھیمی آوازوں میں نیند کے جھونکے آتے ہیں

جب دل پہ نہ ہو قابو اپنا کیا ضبط کریں کیا صبر کریں
مجھ جیسے کاش وہ ... جو آ آکر سمجھاتے ہیں

دل غم سے بیٹھا جاتا ہے کیا حال ہوں ہمدردوں سے
لکنت سی زباں میں ہوتی ہے جب پوچھنے والے آتے ہیں

کس درجہ شوخ طبیعت ہیں یہ عشق و محبت والے بھی
برسات کی تنہا راتوں میں گا گا کر دل بہلاتے ہیں

ہم جس کو موت سمجھتے ہیں پیغام حیات جاوید ہے وہ
یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں

دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جن کو محبت ہو
خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھل کھل کر رہ جاتے ہیں

ہے حسن کی دنیا بھی افسر محروم سکوں کی نعمت سے
دل دھک دھک کرنے لگتا ہے جب سامنے وہ آجاتے ہیں

حامد اللہ افسر

غیر فانی احساس

اے گذشتہ زمانے، اے گذرے ہوئے دور زریں میں تجھے نہیں بھولا میری تنہائیاں اور میری صحبتیں تیری یاد سے معمور ہیں۔

اس وقت جبکہ میں محو سکوت، اور زمانہ کی کشمکش سے آسودہ ہوں میری فضائے حیات میں تیری یاد کے ہزار نغمے ترنم ریز ہیں۔

میری صدائے شوق کی امواج حزیں صرف تیرے کانوں پہ ٹکراتی ہیں، اُن کا ارتعاش پیہم صرف تیرے لئے ہے کیونکہ تیری ہی ذات اُن کا مرجع ہے، اور میری حیاتِ غم آشنا کا تنہا مرکز۔

اگر میں تیری یاد نہ کروں تو میں اس یاد نہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت تیری آنکھیں پھرتی رہتی ہیں۔

میری حیاتِ فانی میں تیری یاد کی غیر فانی طاقت موجود ہے اور تیرے خیال کی محویت اس یاد کے استمرار اور دوام کا سلسلہ بڑھاتی رہتی ہے۔

کائنات کا حسن تیرے جمال کے انعکاس سے پیدا ہوتا ہے، اور ستاروں کی گردش تیری گردشِ چشم کی تقلید ہے،

(ماخوذ از ترکی)　　ابو المحاسن محمود علی خاں

صحبت کا اثر

اُردو زبان پر

یہ امر مسلمہ ہے کہ زبان کی اشاعت و ترقی اہلِ زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ جوں جوں کسی مُلک کے لوگ علوم و فنون میں ترقی کرتے جاتے ہیں ان کی زبان وسیع اور ادب سے مالامال ہوتی جاتی ہے۔ اشاعت زبان کے بڑے ذرائع اخبارات و رسائل اور کتابیں ہیں لیکن ان کے علاوہ بعض اور بھی اسباب ہیں۔ جو بالواسطہ زبان کی نشر و اشاعت میں معاون ہوتے ہیں۔ اُردو کے خیرخواہوں کو ریلوے کمپنیوں کا ممنون ہونا چاہیئے کہ ان کی ریلوں نے تجارتی مال کی باربرداری کے ساتھ اُردو زبان کی حمل و نقل بھی اپنے ذمہ لے لی ہے۔ اگرچہ یہ اُردو بگڑی ہُوئی اُردو ہے۔ مگر مُلک میں اس سرے سے اُس سرے تک ریلوے اسٹیشنوں پر بولی جاتی ہے۔ بہار، ممالک متوسط، سندھ، گجرات، مہاراشٹر، بمبئی غرض بیشتر حصہ ملک کی ریل گاڑیوں میں جب دو مسافر آپس میں بات کرتے ہیں تو عموماً اُردو میں بولتے ہیں۔ ہر شخص اپنے مخاطب کو اُردو داں فرض کر لیتا ہے۔ اگرچہ ان موقعوں پر بعض اوقات طرح طرح کے دلچسپ اور انوکھے فقرے سُننے میں آتے ہیں مگر لوگ اپنی بساط کے موافق اسی زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں

انگریزی ادب نے ہماری زبان کو جس قدر فائدہ پہنچایا ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں لیکن انگریزوں نے دانستہ یا نادانستہ اردو کی جو خدمت کی ہے۔ اس کا نتیجہ وہ زبان ہے جو ان کے اردلیوں اور بہروں میں رائج ہے۔ اس فرقہ کے لوگ اول تو تعداد میں کم ہیں۔ دوسرے ان کو ارتباط و اختلاط کے موقع کم ملتے ہیں۔ اس لئے اُن کی زبان کم سُننے میں آتی ہے لیکن انگریزوں کی اُردو حدود ریلوے میں خوب حکومت کرتی ہے۔ ریلوے ملازم تعداد میں لاکھوں ہیں۔ اور سب ایک رشتۂ ارتباط میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک خاص زبان بولی ہے جس کو ہم "ریل کی اُردو" کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت ہماری غرض اس معجون مرکب سے ہے جس سے تقریباً ہر شخص کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی قواعد و ترکیب ملکی اختلاف السنہ کے باوجود ہر جگہ تار کے کھمبوں کی طرح ایک ہی سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے۔ قلی اور خلاصیوں سے لیکر ڈرائیور، گارڈ، ٹکٹ کلکٹر، چیکر اور اسٹیشن ماسٹر تک خواہ وہ ہندستانی

یا نیم ہندوستانی یا انگریز سب ایک ہی اُستاد کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ "گاڑی چھوڑ" یا "سیٹی ہوگیا" "اے! جلدی کرو گاڑی جاتا ہے" "تم کہاں جائیگا" وہ عام جملے ہیں جو چند گھنٹہ کے سفر کے بعد مسافر کے کانوں میں بس جاتے ہیں۔اور اس وقت ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جبکہ ہم دہلی، لکھنو اور ان کے درمیانی اسٹیشنوں پر بھی یہی ڈھلے ہوئے جملے سُنتے ہیں حالانکہ اس خطہ میں اکثر بابو، قلی اور دیگر ملازم اُن شہروں کے باشندے ہوتے ہیں جن کی زبان ٹھیٹ اُردو ہے

یہ "ریل کی اُردو" صرف ملازمان ریل تک محدود نہ رہی بلکہ مرض متعدی کی طرح اپنے جراثیم پھیلانے لگی۔اور سب سے پہلے ان لوگوں کو متاثر کیا۔جو ان کے زیادہ قریب تھے۔ہم متھرا کے اسٹیشن پر یہ آواز سُنتے ہیں۔"متھرا کا پیڑا" اس موقع پر "پیڑا" کو جمع کے صیغہ میں استعمال کرنا چاہیے۔آگرہ کے پلیٹ فارم پر مٹھائی فروش آواز لگاتا ہے "آگرہ کا پیٹھے کا مٹھائی" برج کی نواح میں یہ جملہ سُن کر ہم سے ضبط نہ ہو سکا۔اور مٹھائی فروش کو اس کی غلطی سے آگاہ کیا مگر وہ ہنس کر چل دیا۔اور پھر وہی "آگرہ کا پیٹھے کا مٹھائی" الاپنے لگا۔گویا مٹھائی کی تذکیر سے اس کی بکری پر کوئی خاص اثر پڑتا تھا۔معلوم نہیں کہ اس زبان میں ایسی کونسی گھلاوٹ ہے جس کے اثر سے ریل کے مسافر بھی نہیں بچ سکے۔اکثر مسافر جتنی دیر ریل میں بیٹھتے ہیں۔وہ "کمپنی بہادر" کی زبان بولتے ہیں۔ان کا مخاطب ہندوستانی گارڈ، ٹکٹ کلکٹر یا چیکر کوئی ہو سب سے انگریزی میں بات کرتے ہیں۔اور اگر ریل کے ادنےٰ ملازم یا قلی وغیرہ سے بولنے کی ضرورت پڑے تو وہی "ریل بھاشا" استعمال کرتے ہیں ہم نے اچھے خاصے پڑھے لکھے اُردو دان حضرات کی زبان سے بارہا یہ جملے سُنے ہیں۔"اے پانی والا!" "چائے والا!" "اِدھر آؤ!" یہی بزرگ جب ریل سے اُتر کر اپنے مکان پر جاتے ہیں تو "برف والے" یا "آم والے" کہہ کر پکارتے ہیں۔طلسم ہوش ربا اور بوستان خیال میں بعض طلسم اس قسم کے ہیں۔ہمیں اندیشہ ہے کہ "ریل کی اُردو" انگریزی فتوحات کی طرح کہیں ریلوے کی حدود سے آگے نہ بڑھنے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ ریل نے زبان اُردو کی اشاعت میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور کی ہے لیکن جو اسباب کسی چیز کی ترقی میں معاون ہوتے ہیں وہی بعض اوقات موجب زوال بن جاتے ہیں۔تاہم اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس کے ذمہ دار انگریز یا ان کے انجن اور ریل گاڑیاں نہیں ہیں بلکہ ہمارے ریل کے بابو ہیں۔یہ بابو صاحبان تھوڑے بہت لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے ریلوے ملازموں میں ان کا عنصر غالب ہے۔ یہ طبقہ انگریزی بولنے کا بہت دلدادہ ہوتا ہے۔ اُردو یا دوسری مُلکی زبانوں سے اس کو ایک قسم کی مغائرت اور نفرت ہوتی ہے۔ اگر یہ حضرات انگریزی کی بجائے ہندوستانی زبان کو مُلکی زبان سمجھیں تو "ریل کی اُردو" کا سارا بانکپن جاتا رہے۔ کیونکہ قلیوں یا دیگر ادنےٰ ملازموں کا تعلق زیادہ تر انہی بابو صاحبان سے ہوتا ہے صرف یُورپین ملازم ہی باقی رہے۔ ان کا حلقۂ اثر صرف ریلوے کی حدود کے اندر محدود ہے۔ اور اگر ہندستانی بابو لوگ اُس کی توسیع میں مدد و معاون نہ ہوں تو وہیں تک محدود رہے۔

ہمارے خیال میں اس زبان کا جنم بھوم بمبئی ہے۔ اس شہر کی بڑی زبانیں انگریزی، گجراتی اور مرہٹی ہیں لیکن انگریزوں کے علاوہ اُردو (اگر یہ اُردو کہی جاسکتی ہے) کم و بیش یہاں کا ہر شخص سمجھتا ہے۔ "بمبئی کی اُردو" صورت شکل اور طرح و ترکیب میں "ریل کی اُردو" کی بہن ہی معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں یہاں اس نئی زبان کی پیدائش و اشاعت کے اسباب و علل سے بحث نہیں لیکن اب یہ زبان اپنے ننھے سے جزیرہ نما سے نکلکر گردونواح میں قدم جمارہی ہے۔ پونا، احمد نگر، ناسک اور اورنگ آباد دکن کے ہوٹلوں اور بازاروں میں اس کا سکّہ رائج ہوگیا ہے۔ شاید ناظرین کو یہ سُنکر تعجب ہوگا کہ یہ زبان صرف انہی اضلاع تک محدود نہیں بلکہ دہلی تک دھاوے مار رہی ہے۔ دہلی کے پچاس فیصدی باشندے ٹریم کار کو ٹھہرانے کے لئے ایک نہایت ہی بھونڈا لفظ "باندھ لے" استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ٹریموے کے ملازم (جن میں بعض مقامی باشندے بھی شامل ہیں) "گاڑی چالو ہوگئی" کہتے ہیں۔ ہوٹلوں میں چائے کی پیالی کی جگہ عوام کی زبان پر "کوپ" چڑھ گیا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ لفظ "کوپ" کہاں تک قبول کرنے کے لائق ہے۔ مگر اب سے دس بارہ سال پیشتر وہاں اس کا وجود نہ تھا تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ "باندھ کے" "چالو" "کوپ" اور اسی قبیل کے بعض اور ٹکسال باہر لفظ بمبئی سے وہاں پہنچے ہیں اور اس قدیم راجدھانی میں سرعت کے ساتھ شرف قبول حاصل کر رہے ہیں۔ جہاں ہر شخص عام اس سے کہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا جاہل مطلق، نئے الفاظ وضع کرنے اور غیر الفاظ کو اُردو بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بمبئی کے تجارتی الفاظ اور کارخانوں کی اصطلاحیں ریل میں بیٹھ کر مُلک کے بڑے بڑے شہروں میں گشت لگاتی ہیں۔ اور وہاں کارخانوں، ہوٹلوں، سینما اور تھیٹریکل کمپنیوں کے ذریعہ عوام کی زبان میں داخل ہوتی ہیں۔

ہمارا قیاس ہے کہ اب سے دس سال بعد شمالی شہروں کے بازاروں میں بمبئی کا یہ مال عام ہو جائیگا۔ اور یہ ایک بے پناہ سیلاب ہے جس کا روکنا محبان اردو کے لئے دشوار ہے۔

غلام ربانی

گریۂ بے اختیار

(۱)

یہ کون رو رہا ہے لپٹ کر مزار سے
مضطر ہے رُوح گریۂ بے اختیار سے

شبنم کے اشک سبزے کی غفلت گلوں کے داغ
کیا کیا نہ لیچلا چمن روزگار سے

اے نالہائے نیم شبی حشر زا نہ ہو
مَیں ڈر رہا ہوں صبح شب انتظار سے

عبرت ہے ہم کو دفتر ہستی کا ہر ورق
پردہ فنا کا اُٹھتا ہے نقش و نگار سے

ثاقب ہمیں ہیں حسرت و حرماں کی یادگار
زندہ ہے نام عشق دلِ بیقرار سے

(۲)

کہتے ہیں جام دل کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کے
کچھ ذوق میکشی نہ رہا اُن سے چھوٹ کے

دامن چھڑا کے ہاتھ سے، جاتے ہو تم کہاں
مجھ کو تباہ کر کے مرے دل کو لوٹ کے

کس طرح ضبط غم ہو کہ میری متاع صبر
لیجاتے ان کی شوخ نظر لوٹ لوٹ کے

وعدہ کیا تھا ہم سے گئے اور ہی کہیں
کیا سچ ہے یہ مثل کہ نہیں پاؤں جھوٹ کے

ذرّے ہیں لالہ گوں شفق آلودہ ہے زمیں
چھالے بہے ہیں دشت میں یوں پھوٹ پھوٹ کے

کچھ درد ہی کے دم سے تھا اس زندگی کا لطف
راحت ملی نہ پھر مجھے اس غم سے چھوٹ کے

ثاقب ہے اور بادیۂ معرفت کی سیر
آزاد ہے وہ قیدِ علائق سے چھوٹ کے

سیّد ابو محمد ثاقب

دیوانہ بزعم خویش ہشیار

میں نے مانا کہ میں اس وقت گھبرایا ہوا تھا' بے حد گھبرایا ہوا تھا اور اب بھی ہوں۔ مگر لوگ مجھے دیوانہ کیوں کہتے ہیں؟ میرے ہوش و حواس مجھے جواب نہ دے چکے تھے۔ جواب دینا کیا معنی؟ وہ پہلے سے زیادہ کام کر رہے تھے۔ جسے میری بیماری کہا جاتا ہے۔ وہ صحت کی علامت تھی۔ اُس نے میرے حواس کو مُردہ نہ کیا تھا' بلکہ ان میں نئی جان ڈال دی تھی۔ اور قوا اور میری قوت سماعت بلا کی تیز ہو گئی تھی۔ زمین و آسمان اور دُنیا بھر کی صدائیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ پھر میں دیوانہ کیونکر ہوا؟ ذرا گوش ہوش سے سنو۔ کہ میں کس صحت و درستی کس سکون و اطمینان سے ساری کہانی لفظ بہ لفظ بیان کر سکتا ہوں۔ اور پھر اندازہ کرو کہ میں دیوانہ ہوں یا فرزانہ۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال اوّل اوّل مجھے کیونکر آیا۔ لیکن جب وہ ایک بار میرے ذہن میں سما گیا تو اس کا نکلنا محال تھا۔ میں نے جو کچھ کیا' نہیں جانتا کیوں کیا' کس لئے کیا۔ باعث پوچھو تو نامعلوم' مدعا کہو تو اُس کا نام و نشان نہیں۔ بوڑھے سے مجھے دلی الفت تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے برائی نہ کی تھی۔ اُس نے کبھی مجھے ناخوش نہ کیا تھا۔ اس کی دولت کی مجھے ہوس نہ تھی جہاں تک اب میرا خیال ہے اسکی آنکھیں — ہاں اسکی آنکھیں جو کچھ تھیں وہی تھیں۔ میں کیا کہوں اُس کی آنکھیں کیسی تھیں؟ ایک گدھ کی سی آنکھیں ہلکے نیلے رنگ کی آنکھیں جن پر ایک جھلی سی چھائی ہوئی تھی۔ جب اُس کی آنکھیں میری آنکھوں سے چار ہوتیں تو میرا خون خشک ہو جاتا۔ اس لئے میں نے ارادہ کر لیا' اور میرا یہ ارادہ روز بروز زیادہ راسخ ہوتا گیا' کہ اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ تاکہ وہ آنکھیں پھر کبھی مجھے دکھائی نہ دیں۔

تم سمجھے ہوئے ہو کہ میں دیوانہ ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ دیوانوں کو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی' اور میری یہ حالت نہیں۔ کاش تم نے دیکھا ہوتا کہ میں کس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ کس طرح اونچ نیچ کو دیکھ بھال کر' بُرے بھلے کو سوچ سمجھ کر میں اپنا کام کرتا تھا۔ تم نے میری حکمت عملی' میری مصلحت اندیشی دیکھی ہی نہیں۔ تم دیکھتے تو کہتے۔ جس ہفتے میں اُس کا قصہ پاک کرتا ہوں' اُس ہفتے میں نے اُس کے ساتھ پہلے سے بڑھ چڑھ کر مہربانی کا سلوک کیا۔ اور آدھی رات گئے

مَیں اُس کے کمرے کا دروازہ کھولتا تھا۔ چپکے سے، آہستہ سے، کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اور پھر جب دروازہ اتنا کُھل جاتا کہ میرا سر بآسانی گزر سکتا، تو میں ایک مدھم، بالکل مدھم لالٹین کمرے میں داخل کرتا، اور اس کے بعد اپنا سر دروازے میں سے گزارتا۔ تم اگر دیکھتے کہ میں کس ہوشیاری اور چالاکی سے یہ سب کام کرتا تھا تو تم مجھے بہت داد دیتے۔ مَیں اپنے سر کو آہستہ، نہایت آہستہ جنبش دیتا تھا، کہ کہیں بوڑھا آہٹ پاکر جاگ نہ اُٹھے ایک گھنٹے کے عرصے میں کہیں جاکر مَیں اپنا سر بمشکل اتنا آگے لے جاتا تھا کہ بوڑھے کو بستر پر لیٹا ہوا دیکھ سکوں۔ تمہیں کہو، کیا کوئی دیوانہ اتنا دانا ہوسکتا ہے!

پھر جب مَیں اپنا سر پورے طور پر کمرے میں لیجا چکتا، تو مَیں لالٹین کی بتی کو اکساتا، بیحد احتیاط سے، کیونکہ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ اس کی آواز نہ سُن پائے اور میں بتی کو صرف اس قدر اکساتا کہ ایک ننھی سی کرن اُسکی ڈراؤنی آنکھوں پر پڑتی۔ اور یہ سب کچھ مَیں نے لگاتار سات راتوں تک کیا۔ مگر ہر بار بوڑھے کی آنکھیں بند ہوتی تھیں، اور اس لئے مَیں اپنا کام انجام نہ دے سکتا تھا۔ کیونکہ بوڑھے سے مجھے کچھ دشمنی نہ تھی۔ دشمنی تھی تو اُس کی آنکھوں سے تھی۔ اور ہر روز علی الصباح مَیں بے دھڑک اس کے کمرے میں چلا جاتا، اور بڑی جرأت و دلیری سے اُس سے باتیں کرتا، اور ایک بے تکلف لہجے میں اُس کا نام لیکر اُس سے پوچھتا کہ رات کیسی گذری؟ اب تم سمجھے کہ اس میں مَیں نے کیا مصلحت مضمر رکھی تھی؟ کوئی بہت ہی دانا بینا آدمی ہوتا جو میرے رویّہ سے بھانپ لیتا کہ مَیں بلاناغہ، جب آدھی رات ادھر ہوتی تھی اور آدھی اُدھر، چوری چھپے اُس کے کمرے میں جاکر اُس کو سوتے دیکھا کرتا تھا۔

جب آٹھویں رات آئی تو مَیں نے پہلے سے زیادہ حزم و احتیاط سے کام لیا۔ گھڑی کی سوئی مجھ سے زیادہ تیزی سے حرکت کرتی ہوگی۔ اُس رات سے پہلے مجھے کبھی اپنی قوت، اپنی عقلمندی کا کامل احساس نہ ہوا تھا۔ کامیابی کی امید سے مجھے جو خوشی ہو رہی تھی وہ میرے ضبط کئے ضبط نہ ہوتی تھی۔ ذرا سوچو تو سہی کہ مَیں ادھر آہستہ آہستہ دروازہ کھول رہا ہوں۔ اور اُدھر اُس کے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں کہ میرے دل میں کیا ہے اور مَیں کیا کیا چاہتا ہوں! اس سے مجھے خوشی کیونکر نہ ہوتی؟ ہاں خوشی کے مارے میری باچھیں کھلی جاتی تھیں، اور شاید اُس نے میری ہنسی سُن بھی لی تھی۔ کیونکہ اُس نے بستر پر یکایک کروٹ لی۔ گویا چونک گیا ہے۔ تم سمجھتے ہوگے کہ مَیں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا! نہیں، ہرگز نہیں، مجھے ڈر کس بات کا تھا؟ اُس کے کمرے میں

ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا (کیونکہ اُس نے چوروں کے خوف سے کھڑکیاں سب بند کر رکھی تھیں) اور اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ دروازے کو کُھلتے نہیں دیکھ سکیگا۔ چنانچہ میں بےخوف وخطر اپنے کام میں لگا رہا۔

مَیں اپنا سر کمرے میں داخل کر چکا تھا۔ اور بتّی کو کُھسانے والا تھا کہ میرا ہاتھ دروازے کی چٹکنی پر سے پھسل گیا۔ ایک آن میں بُوڑھا چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اور پکارنے لگا۔ "کون ہے؟ کون ہے؟"

مَیں چپکا رہا اور اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ پورے ایک گھنٹے تک مَیں نے ذرّہ برابر جنبش نہ کی۔ اور اس درمیان میں، مَیں نے بوڑھے کے بستر پر لیٹ جانے کی آواز نہ سُنی۔ وہ اب تک چوکنّا ہو کر بستر پر بیٹھا ہُوا تھا جس طرح میں راتوں کو اُٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ جاتا ہوں، اور رات بھر موت کی گھڑیاں گنا کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ گزرا تھا کہ ایک چیخ کی آواز میرے کان میں آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ آواز کیا معنی رکھتی ہے۔ یہ آواز شدّتِ درد یا انتہائے غم کی آواز نہ تھی۔ یہ وہ دھیمی بھرّائی ہُوئی آواز تھی جو اس وقت رُوح کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔ جب رُوح خوف کے شکنجے میں جکڑ جاتی ہے۔ مَیں اس آواز سے خوب واقف تھا۔ اکثر آدھی رات کے وقت جب ساری دُنیا محوِ خواب ہوتی ہے، یہ آواز خود میرے سینے سے گونج کر اُٹھی ہے اور رات کے سنّاٹے میں اسکی غیر فطری گونج نے میرے ہول وہراس کو دوبالا کر دیا ہے۔ ہاں، مَیں اس سے خوب واقف تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ اس وقت بوڑھے کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اور مجھے اُس کی حالت پر رحم آگیا اگرچہ مَیں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ جب سے وہ چونک کر اُٹھا تھا۔ اُس وقت سے اب تک وہ ہلا جلا نہ تھا اُس کا خوف لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا ہوگا۔ وہ اپنے خوف کو بےوجہ قرار دینے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ مگر اُس کا دل نہ مانتا ہوگا وہ ضرور سوچتا ہوگا: "کچھ بھی نہیں، صرف ہوا کی سرسراہٹ ہے۔ یونہی کوئی چوہا ہوگا۔ یا کوئی جھینگر ہے۔ کہ ایک ہی بار بول کر چپ ہو گیا ہے۔"

وہ ضرور ان باتوں سے اپنے دل کو تسکین دینے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ مگر بے سود، بالکل بے سود۔ کیونکہ قضا اُس کے سر پر کھیل رہی تھی۔ موت کا فرشتہ اُس کی طرف آ رہا تھا۔ اور اُس کے پروں کا تاریک سایہ اُس پر پڑ چکا تھا۔ اسی تاریک اور نظر نہ آنے والے سائے کا ہولناک اثر تھا جس نے اُسے میری موجودگی محسوس کرا دی حالانکہ وہ اس قدر حواس باختہ ہو گیا تھا کہ نہ کچھ دیکھ رہا تھا نہ سُن رہا تھا۔

جب مجھے صبر وسکون سے انتظار کرتے ہوئے بہت وقت گزر گیا، تو مَیں نے ارادہ کیا کہ کمرے میں ذرا

شنی کر دوں۔ چنانچہ میں نے بتی کو اکسانا شروع کیا۔ تم
مازہ نہیں کر سکتے کہ کس آہستگی سے ـــــ یہاں تک کہ ایک
ھی سی کرن، تارِ عنکبوت سے باریکتر، چمک کر اس کی
مناونی ڈراونی آنکھوں پر پڑی۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں، خوب کھلی تھیں، اور اُن کو
یکھ کر میرے غصّے کی کچھ انتہا نہ رہی۔ وہ مجھے اچھی طرح
کھائی دے رہی تھیں۔ وہی بدنما نیلا نیلا رنگ، وہی خوفناک
ھلّی جس کو دیکھ کر میری رُوح کانپ اُٹھی۔ اُس کا چہرہ یا
س کے جسم کا اور کوئی حصّہ مجھے نہ نظر آرہا تھا، کیونکہ میں نے
درتی طور پر روشنی کی کرن عین اُس کی آنکھوں پر ڈال دی
تھی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جسے تم غلطی سے میری دیوانگی
صوّر کئے ہوتے ہو۔ وہ دراصل میرے حواس کی غیر معمولی
کاوت ہے۔ اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میرے اس
ل کی سچائی میں کچھ شک نہیں ہو سکتا۔ اور میں تمہیں بتائے
یتا ہوں۔ کہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اُس وقت میرے کانوں
یں ایک ایسی آواز آئی جیسی اگر کسی گھڑی کو روئی میں لپیٹ
و تو اُس میں سے آتی ہے۔ میں اس آواز کو بھی خوب پہچانتا
ھا۔ یہ آواز بُوڑھے کے دل کے دھڑکنے کی آواز تھی۔ اِس
سُن کر میرے خون میں ایک جوش پیدا ہُوا۔ جس طرح جنگ
کے میدان میں ڈھول کی آواز سے دلاوروں کے حوصلے

بڑھ جاتے ہیں۔

لیکن اس حالت میں بھی میں اپنے جوش کو دبائے
خاموشی سے کھڑا رہا۔ گویا ایک بُت تھا، بےحس و حرکت
میرے ہاتھ میں لالٹین کو کیا مجال جو ذرا بھی جنبش ہُوئی ہو
میں یہ آزمانے لگا۔ کہ کتنی دیر تک میں کرن کو اسکی آنکھوں
کے نقطۂ انجذاب پر مرکوز رکھ سکتا تھا۔ اس عرصے میں
اُس کے دل کا بے ہنگم شور بڑھتا گیا۔ وہ لحہ بہ لحہ بلند تر
اور تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ یقیناً اُس کا خوف انتہائی درجے
پر پہنچ گیا تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھک دھک
کر رہا تھا۔ تم نے سنا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میں تمہیں بتا
چکا ہوں کہ میں بہت ذکی الحس ہوں، اور یہ امرِ واقعہ ہے
آدھی رات کے وقت اُس پرانے مکان کی سنسان خاموشی
میں ایک ایسی عجیب و غریب آواز سُن کر مجھ پر اک عجیب
وحشتناک اثر ہُوا۔ تاہم میں کچھ دیر اور طبیعت پر جبر کئے
اپنی جگہ قائم رہا۔ لیکن اس دھک دھک نے میری جان
کھالی۔ لحظہ بہ لحظہ وہ زیادہ بلند ہوتی جاتی تھی۔ اور اب مجھے
ایک تازہ خوف دامنگیر ہُوا۔ کہیں کوئی ہمسایہ اس آواز
کو نہ سُن لے۔ اگر کسی نے ذرا آواز سُن لی تو بات بگڑ جائیگی
بس اب بُوڑھے کا وقت آگیا تھا۔ ایک فلک دوز نعرہ کے
ساتھ میں اس کی طرف جھپٹا۔ اس نے صرف ایک چیخ
ماری۔ صرف ایک چیخ، اور پھر خاموش ہو گیا۔ آنکھ جھپکنے

کی دیر نہ گزری تھی کہ میں نے اسے بستر سے فرش پر گھسیٹ لیا۔ اور بستر اُس پر ڈال دیا۔ پھر میں نے اطمینان کی سانس لی اور یہ دیکھ کر کہ میری کوشش ٹھکانے لگی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ لیکن کئی منٹ تک بوڑھے کا دل بدستور دھڑکتا رہا۔ اُس کی آواز اب وہی آواز تھی۔ جو ایک رُوئی میں لپٹی ہُوئی گھڑی کی ہوتی ہے۔ تاہم اس کا مجھے چنداں خوف نہ تھا۔ کیونکہ گھر کی چار دیواری کے باہر اس آواز کو کوئی نہ سُن سکتا تھا۔ آخرکار یہ آواز بھی خاموش ہوگئی۔ اب بوڑھے میں زندگی کی رمق بھی باقی نہ تھی۔ میں نے بستر کو اُٹھا کر لاش کو بغور دیکھا۔ وہ بالکل ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ پھر میں اُس کے دل پر ہاتھ رکھ کر کافی دیر تک دیکھا کیا لیکن وہاں حرکت کا نام بھی نہ تھا۔ بوڑھے کی زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میں خوش تھا کہ اس کے بعد اُس کی آنکھیں مجھے کبھی تکلیف نہ دیں گی۔

اگر اب بھی تم اس بات پر اڑے ہُوئے ہو کہ میں دیوانہ ہوں تو یہ سُن کر کہ میں نے کیا کیا تدبیریں لاش کے چھپانے کے لئے اختیار کیں تم ضرور اپنی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ رات گزری جاتی تھی اور میں وقت کی قلت کے خیال سے جلدی جلدی لیکن خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ سب سے پہلے میں نے لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ سر الگ، بازو الگ، ٹانگیں الگ

پھر میں نے کمرے کے چوبی فرش پر سے تین تختے ہٹائے۔ اور اُن کے نیچے لاش کے ٹکڑے چھپائے پھر میں نے تختوں کو ایسی ہوشیاری اور پُرکاری سے اپنی جگہ پر رکھ دیا کہ اور کسی انسان کی آنکھ تو کیا خود اُس بوڑھے کی آنکھ بھی سرمو فرق نہ دیکھ سکتی تھی۔ دھونے دُھلانے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ خون کی چھینٹ تک کہیں نہ پڑی تھی۔ میں ایسا عقل کا دشمن نہ تھا کہ کوئی داغ کہیں لگنے دیتا۔ میں نے پہلے ہی سے ایک برتن تیار کر رکھا تھا کہ خون کا قطرہ بھی زمین پر نہ پڑنے پائے۔

میں جب اس کام دھندے سے فارغ ہُوا۔ تو چار بجے تھے لیکن اب تک ہر طرف اندھیرا تھا۔ ابھی گھڑیال بجا تھا کہ باہر کے دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ میں نے کسی قسم کے خوف و خدشہ کے بغیر جا کر دروازہ کھولا۔ تین آدمی داخل ہُوئے۔ جنہوں نے نہایت شائستہ انداز میں اپنے آپ کو پولیس کے افسر کہہ کر اپنا تعارف کرایا۔ رات کے وقت کسی ہمسائے نے چیخ کی آواز سُنی تھی اُسے شبہہ گزرا اس لئے اُس نے تھانے میں جا کر اطلاع کر دی۔ اور اب یہ لوگ تفتیش کے لئے آئے تھے۔

میں مُسکرایا۔ آخر مجھے خوف کس بات کا تھا؟ میں نے ان لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ چیخ کے متعلق میں نے اُنہیں بتایا کہ میں نے خواب میں ڈر کر چیخ ماری تھی میں نے

برسبیلِ تذکرہ یہ بھی بتادیا کہ بوڑھا گھر سے باہر کہیں گیا ہوا تھا۔ رہی تلاشی۔ اس کی نسبت میں نے عرض کیا کہ "آپ کا گھر ہے جہاں چاہیے جائیے۔ اور اچھی طرح دیکھ بھال لیجئے۔" میں ان کو گھر کے ایک ایک حصے میں لے گیا، اور آخر کار کمرے کی باری آئی۔ وہاں میں نے ان کو بوڑھے کا زر و مال محفوظ دکھا دیا۔ اور مجھ کو اپنی خوبیٔ قسمت پر اتنا اعتماد تھا کہ میں نے کرسیاں لا کر کمرے میں رکھ دیں۔ اور ان سے آرام کرنے کی درخواست کی۔ ذرا میری جرأت دیکھنا کہ میں خود اس جگہ بیٹھا جہاں بوڑھے کی لاش مدفون تھی۔

افسروں کو پورے طور پر تسلی ہوگئی۔ میرے طور طریق نے ان کے دل سے شک رفع کر دیا۔ میری ہر بات سے سکون اور دلجمعی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور میں خندہ پیشانی سے گفتگو میں شریک رہا۔ لیکن جب ان کو بیٹھے ہوئے دیر ہوگئی۔ اور انہوں نے اٹھنے کا نام نہ لیا، تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ کہ میرے چہرے کا رنگ اُڑ رہا ہے۔ مجھ پر ان کا طولِ کلام گراں گزرنے لگا۔ اور میں سوچنے لگا کہ "یہ لوگ جاتے کیوں نہیں؟" ان کی بیزار کن باتوں سے میرے سر میں درد ہونے لگا۔ اور میرے کان بجنے لگے لیکن اب بھی تخفیف تصدیعہ کی امید نے صورت نہ دکھائی۔ میرے کانوں میں ایسا محسوس ہونا شروع ہوا کہ سیٹیاں بج رہی ہیں۔ اور یہ سیٹیاں بلند ہوتی جا رہی ہیں۔ میں نے اس احساس کو مٹانے کے لئے زیادہ باتیں کرنا شروع کیں مگر یہ آواز اتنی بلند ہوگئی کہ گویا ڈھول بج رہے ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرے کانوں کی سنسناہٹ نہیں کہیں باہر سے آواز آرہی ہے۔

میں اس سے انکار نہ کرونگا کہ میرے چہرے کی رنگت اس وقت بالکل زرد پڑ گئی۔ لیکن میری گفتگو میں پہلے سے زیادہ روانی تھی، اور میری آواز پہلے سے زیادہ بلند تھی۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری آواز کے ساتھ اس نامعلوم آواز نے شرط باندھی ہے۔ وہ بھی لحہ بہ لحہ بلند ہوتی جاتی تھی۔ اور وہ آواز وہی آواز تھی، جو ایک روئی میں لپٹی ہوئی گھڑی کی ہوتی ہے۔ میرا دم خشک ہونے لگا۔ مگر افسروں نے اس آواز کو نہ سنا۔ اب تک نہ سنا۔ میں جوشِ تقریر میں بلند آہنگی سے باتیں کرنے لگا۔ مگر اس آواز کی بلند آہنگی بھی ترقی کرتی گئی۔ میں ذرا ذرا سی باتوں پر گلا پھاڑ پھاڑ کر بحث و تکرار کرنے لگا۔ مگر اس آواز کا بے پناہ ہنگامہ بھی بڑھتا چلا گیا میں فرش پر زور زور سے پاؤں مارتا ہوا اِدھر اُدھر جاتا تھا۔ گویا ان لوگوں کی باتوں سے جوش میں آگیا ہوں۔ لیکن میرے پاؤں کی دھمک ایسی تھی جیسی نقار خانے میں طوطی کی آواز۔ میں فرطِ مایوسی سے سوچتا تھا یا الٰہی

اب کیا کروں؟ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا تھا' ان ناخواندہ مہمانوں کو کوستا تھا۔ لیکن اُن پر مطلق اثر نہ ہوا۔ میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کرسی کے پایوں سے شور مچانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ آواز سب آوازوں سے بلند تھی۔ اور لحہ بہ لحہ بلند تر ہوتی جاتی تھی۔ تاہم وہ لوگ اُسی طرح مزے سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اُنھوں نے اس آواز کو نہ سُنا ہو! نہیں نہیں' وہ ضرور اس کو سُن رہے تھے!۔۔ اُن کے دل میں شک تھا!۔ وہ سب کچھ جانتے تھے!۔۔ یہ اُن کی ستم ظریفی تھی کہ مجھ پر ظاہر نہ کرتے تھے!۔۔ اُس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا' اور اب بھی میرا یہی خیال ہے۔ مجھ میں اس ذہنی تکلیف کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی! میں انکے زہر خند کی تاب نہ لاسکتا تھا!۔۔ اُن کا ریاکارانہ تبسم مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا!۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ زور سے چیخوں' ورنہ میرا دم گھٹ جائیگا اور مر جاؤنگا۔ اور پھر ذرا سُننا۔۔ وہی آواز۔ دھک! دھک! دھک! دھک!

میں پکار اُٹھا۔ "بدمعاشو! اب یہ مکاری رہنے دو۔ میں جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ ان تختوں کو ہٹا دو! یہ' یہ۔۔ یہ اُسی کے دل کی آواز ہے"

م۔ ہ۔ ح

بادۂ معرفت

در حضرت شیخ عرض ما بے ادبی ست — آں شیخ کہ نائب رسولِ عربی ست
ما از درِ گنج بخش محروم روِیم — در قاعدۂ کرم بسا بوالعجبی ست

در شہرِ گرامیست کہ معنی نظر ست — در پنجۂ مرگ سخت بے بال و پر ست
در تلخیِ نزع حکم آمد باجل — بگذار کہ ایں مرید گنج شکر ست

خونابِ جگر تراود از چشم ترم — زد خیمہ بر اوجِ عرش آہ سحرم
نازم بدماغ خویش و بر شورش خویش — شوریست ز محبوب الٰہی بسرم

گرامی

شمع

اے پیکرِ نورانی، ناطورۂ زیبائی　　تو بزم کی رونق ہے، تو زینتِ کاشانہ
موقوف تجھی پر ہے ہنگامۂ ہر محفل　　روشن ہے ترے دم سے خلوت کا نہاں خانہ

پنہاں تری ہر ضَو میں اسرارِ محبت ہیں　　سینہ ہے ترا مخزن انوارِ حقیقت کا
تو سوزِ محبت میں جلتی ہے سرِ محفل　　دل والوں کو دیتی ہے پیغام محبت کا

راتیں ہیں ترے دم سے پُر نور زمانے کی　　ہیں شاہ و گدا تیرے دلدادہ و شیدائی
ہر جا ہے ترا جلوہ، ہر سو ہے ترا پرتَو　　اک بزمِ عروسی ہو یا عالمِ تنہائی

مسلک ہے ترا الفت، جلنے سے تجھے مطلب　　ہو گوشۂ تنہائی یا محفلِ رندانہ
ایمان کی خلوت ہو یا کفر کی مجلس ہو　　مندر ہو کہ مسجد ہو، کعبہ ہو کہ بت خانہ

تو شمعِ سرِ محفل تو شمعِ سرِ مدفن　　تو رونقِ آبادی، تو زینتِ ویرانہ
ہر حال میں جویا ہے ہر اہلِ نظر تیرا　　مے خانۂ عشرت ہو یا غم کا نہاں خانہ

پروانۂ سوز آگیں عاشق ہے ترے رُخ کا　　دیوانہ ہے وہ تیرا، تو اُس کی ہے شیدائی
اک آگ محبت کی دونوں کے دلوں میں ہے　　جل بجھتے ہو تم دونوں محفل ہو کہ تنہائی

اک شعلۂ لرزاں ہے ظاہر میں اگرچہ تو　　رخشندہ مگر تجھ میں انوارِ حقیقت ہیں
اک لطف ہے ظاہر میں اک کیف ہے باطن میں　　پیدا ترے پیکر سے اسرارِ حقیقت ہیں

واقف ہے ازل سے تو اسرارِ محبت کی　　دیتی ہے زمانے کو تو درس محبت کا
قسمت ہے تری اچھی قسمت کی دَھنی ہے تو　　شاہد ہے ترا جلنا، جل بجھ کے فنا ہونا

میرا دلِ سوزاں بھی اک شمع محبت ہے　　ہوتا ہے مجھے اس پر تیرا ہی گماں پیہم
ہے شعلہ بسر تو بھی، آتش بجگر میں بھی　　اُٹھتا ہے مرے دل سے دن رات دھواں پیہم

آ دل میں تجھے رکھ لوں اے سوختۂ الفت　　تو مہر و وفا بن جا اس گوشۂ خلوت میں
اک روز تو مرنا ہے، آ ساتھ ہی ہم دونوں　　جل جائیں محبت میں، مٹ جائیں محبت میں

انیس ظہیری

احساسِ فرض

کائناتِ ہستی سالمات کا ایک رابطہ ہے۔ اُس کا ذرّہ ذرّہ بجائے خود قائم ہے۔ اور اُس کے ساتھ ہی دوسرے ذرّوں پر اُس کا دار و مدار ہے۔ اگر عناصر میں اشتراکِ عمل نہ ہوتا۔ تو یہ دُنیا وجود میں نہ آتی۔ اور نظامِ ہستی ترکیب نہ پاتا۔ اس لحاظ سے کوئی چیز بیکار نہیں۔ موجودات ہمارے جسم کی طرح ایک جسم ہے۔ جس کا کوئی عضو معطل نہیں۔ اگر کوئی عضو معطل ہو جائے۔ تو نہ صرف اپنے لئے بلکہ ساری دُنیا کے لئے بنائے فساد ہے۔ نباتات۔ جمادات، حیوانات ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مخصوص حلقے میں بروئے کار ہے۔ زمین گردش میں مصروف ہے۔ اجرامِ فلکی چاند، سُورج اور تارے اپنے وقت پر طلوع ہوتے ہیں۔ اپنے وقت پر غروب ہوتے ہیں۔ موسم معینہ وقت پر آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ ان غیر مشاعر چیزوں سے کہیں زیادہ حیوانات اپنے فرائض کے پابند ہیں۔ چرند درند کو لیجئے۔ وہ اپنے محدود دائرۂ عمل میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ چلنا پھرنا، چرنا چگنا، یہ اُن کے آئے دن کے کام ہیں۔ جو انکے تحفظِ حیات کے لئے ضروری ہیں۔ اور وہ انہی میں مصروف و سرگرم رہتے ہیں۔ قدرت نے حفظِ نسل کا فرض ان کے ذمے کر دیا ہے اور وہ اس فرض کو بالالتزام ادا کرتے ہیں۔

کچھ انہی پر منحصر نہیں۔ کچھ نہ کچھ کام ہر چیز کے سپرد کیا گیا ہے جو اس کی تخلیق کا راز اور اُس کی ہستی کا مقصد و مدعا ہے اُسکے پورا کرنے کا نام فرض ہے۔

ہر شخص کو اپنی زندگی کے مخصوص دائرے میں بعض فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ فرائض زندگی کے ادا کرنے میں بعضوں کے عوارض و حالات مساعد ہوتے ہیں۔ اور بعضوں کی راہ میں مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ لیکن مُبارک ہیں وہ لوگ جو رکاوٹوں کا سامنا کر کے ثبات و استقلال سے اپنے ہمجنسوں کی بہتری اور بہبودی میں کوشاں رہتے ہیں۔ ہر فردِ بشر دُنیا کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ جُدا بات ہے کہ اُس کا حلقۂ اثر وسیع ہے یا محدود۔ اگر کوئی شخص صرف اپنے عیال و اطفال اور اعزّہ و اقارب کی پرورش اور نوازش کرتا ہے۔ تو اس طرح بھی دُنیا میں خیرِ کثیر کا باعث ہوتا ہے۔ مانا کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو براہِ راست کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی بساط کے موافق افادۂ عام کا باعث ہوتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ فیض و برکت کے سرچشمے وہ لوگ ہیں۔ جو آپس میں مل جلکر رہنے سہنے

والے انسانوں کو اخوت کے رشتہ زرّیں میں مربوط کئے ہوئے ہیں۔ پھر وہ انسان جو اپنے ملک و قوم کے خادم ہوتے ہیں۔ جو فائدہ ان کی ذات سے نوع بشر کو پہنچتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ کہ ایثار و صداقت کے پتلے وہ عظیم الشان ہستیاں ہیں۔ جن کا مدعائے حیات خدمت کرنا ہے۔ اور وہ اسی کے ذریعے مخدوم ہوتے ہیں۔ وہ ہمہ گیر محبت کے حلقہ بگوش ہو کر فنا کی قیود سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو فنا کر کے ایک شمع کشتہ کی طرح بقائے حقیقی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اس دُنیا کی تاریک فضا میں اپنے کارناموں سے ایک شمع ہدایت روشن کر جاتے ہیں دُنیا کی وہ مسلم بالشان ہستیاں جن کے آستانِ شہرت پر خلقِ خدا آج تک جبیں فرسائی کرتی ہے۔ وہ اکابرِ تاریخ جنہوں نے اپنے بعد میں آنیوالی نسلوں سے خراج عقیدت وصول کیا ہے۔ اُنہوں نے اپنی ہستی کو مٹا کر جریدۂ عالم پر خلوص و ایثار ایک انمٹ نقش ثبت کر دیا ہے۔

وطن و قوم کی خدمت بجائے خود ایک اعلیٰ فرض ہے۔ لیکن اس سے کہیں گرانمایہ فرض وہ فرض ہے جو تمام نوعِ انسانی کی طرف سے بحیثیتِ مجموعی ہم پر عاید ہوتا ہے اس فرض کا دائرہ صرف دُنیا کے اُس حصّے اور انسانوں کی اُس مخصوص جماعت تک محدود نہیں جس میں اتفاق محض نے ہمیں پیدا کر دیا۔ بلکہ اس کا دائرہ دُنیا کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک محیط ہے"۔ یہ وطنیت کا جذبہ وطن پرستی سے بدرجہا زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ وہ لوگ جو اپنے برادرانِ ملک و ملّت کی خدمت کے لئے اپنے آپکو وقف کر دیتے ہیں۔ اور اپنے حاصل عمر کو اپنے یارانِ وطن کی راہ میں نثار کر دیتے ہیں۔ بیشک ہر طرح کی تعریف کے قابل ہیں۔ لیکن وہ آزاد مشرب ہستیاں جو اپنے آپ کو قیود سے آزاد کر کے ساری دُنیا کو اپنا مرکزِ عمل بنا لیتی ہیں۔ ان سے کہیں رُتبے میں زیادہ ہیں۔

اپنے ملک کی ترقی و بہبودی کے لئے جان لڑا دینا' اپنے وطن پر نثار ہو جانا بلاتفریق مذہب و ملّت اپنے ہمجنسوں کی خدمت کرنا یہ بیشک اہم فرائض ہیں۔ لیکن اعلےٰ قسم کا فرض وہ فرض ہے جو پوشیدہ طور پر انسانی نظروں سے غائب ادا کیا جاتا ہے۔ یہ اُس بزرگ و برتر اور ذوالجلال ہستی کی طرف سے ہم پر عاید ہوتا ہے۔ جس نے ہمیں اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا۔ اور ہمیں عقل و شعور سے مشرف کیا۔ ذاتِ باری ہماری عبادت و ریاضت کی محتاج نہیں لیکن اس کا شکر و سپاس ایک ایسا فرض ہے جس کا ادا کرنا ہم کو مقصود بالذات سمجھنا چاہئے۔ اور اگر مفاد دُنیوی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اُس حالت میں بھی بندے اور خدا کے درمیان عبودیت کا رشتہ ہماری حقیقی ترقی کا باعث ہے۔ کیونکہ یقین اور اعتقاد میں کبھی مغلوب

نہ ہونے والی طاقت ہے۔ فرض کا ادا کرنا بذات خود ایک رُوحانی مسرت ہے۔ جس پر زمانے بھر کی سب خوشیاں نثار ہیں۔ کیونکہ قدرت کے قانون نے ہم پر جو فرائض عاید کئے ہیں۔ وہ تحفظ زندگی کے لئے ضروری اور اس لئے خوشی کا باعث ہیں۔

فرض کے ادا کرنے میں جو محویت انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اُسے مصائب و آلام کے احساس سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہ قوتیں جو خُدا کی طرف سے ہمیں بعیت کی گئی ہیں۔ اگر بروئے کار نہ لائی جائیں۔ تو زنگ خوردہ ہو جاتی ہیں۔ اور جس وقت فنا ہونے کے قریب پہنچتی ہیں تو حفظ نفس کے طبعی قانون کے مطابق ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح فساد کا باعث ہوتی ہیں۔ یہی سوچ کر سقراط نے یہ کہا تھا۔ کہ "میں اپنے مقدس ہتھیاروں کی جو میرے مالک نے میرے سپرد کئے بے وقری نہیں کرونگا۔ اور نہ میں اس جگہ کو چھوڑونگا جس کی محافظت کے لئے مجھے تعینات کیا جائیگا۔"

سقراط کا یہ قول خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اگر کوئی سپاہی جسے کسی خاص کام پہ مامور کیا گیا ہو۔ اگر وہ اپنے فرض کو فراموش کر دے۔ تو اُس کے رفیقانِ کار پر جن کی کامیابی کا دارو مدار بہت حد تک اُس پر ہے۔ کیا گزریگی۔ یا ایک دوسری مثال لیجئے اگر کسی کل کے پُرزوں میں سے ایک پُرزہ اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو کیا سارا کارخانہ بگڑ نہ جائیگا؟ بعینہ اسی طرح ہر ایک فرد بشر پر جماعت انسانی کی بہبودی کا انحصار ہے۔

فرض زندگی کا جوہر ہے۔ کیونکہ فرض عمل کے ارتقا کا معراج ہے۔ اور عمل وہ چیز ہے جس کے ذریعے سے زندگی اپنی ہستی کا ثبوت دیتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے۔ کہ فرض زندگی ہے۔ اور یہ کہنا بھی نادرست نہ ہوگا۔ کہ زندگی ایک فرض ہے۔ کیونکہ اگر قدرت کو اپنی مخلوقات کے ہر ایک فرد سے کوئی کام لینا منظور نہ ہوتا تو غالباً نہ یہ دُنیا ہوتی، نہ زندگی ہوتی۔ وہ علّتِ غائی جو اس دُنیا اور زندگی کی تخلیق کا باعث ہُوئی ہے۔ اس بات کی متقاضی ہے کہ کوئی شے کسی ضرورت کے بغیر پیدا نہ کیجاتی اس بات سے بعض غفلت کیش لوگ ایک نہایت ناجائز فایدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اُس کا عذر یہ پیش کرتے ہیں۔ کہ شاید قدرت نے کچھ نہ کرنے کا فرض ہم پر عاید کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ تقدیر الٰہی کو اپنے اعمال کا کفیل قرار دیکر خود التزام سے بری ہو جانا چاہتے ہیں۔ لیکن ایک انسانِ کامل کے لئے قسمت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اور خاصکر جب ادائے فرض کا مسئلہ اُس کے درپیش ہو۔ اور اگر قسمت واقعہ میں کوئی چیز ہے تو وہ اپنے آپکو اپنے اعمال کا مختار سمجھ کر قسمت کا مقابلہ کرنے پر

آمادہ ہو جاتا ہے اور اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کا احساس اُس کے ضمیر میں ہے۔ ذوقِ عمل اسی چیز کا نام ہے اور اسی کا تقاضا تھا کہ انسان نے ازل کے دن دو جہان کے کام اپنے ذمے لے لئے۔ انسان کا عمل کسی خارجی طاقت کا محکوم ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور اپنے اعمال کا مختار اور ممکنات عالم پر قادر ہے۔ جب تک اُس کی عقل باقی ہے یعنی دوسرے الفاظ میں جبتک وُہ زندہ ہے وہ اپنی قسمت آپ بناتا ہے۔ البتہ جب قدرت اُس سے اپنا کام لے چکے، اور اُس سے علم و عمل کی قوتیں واپس لینا چاہے، تو اُس حالت میں اور صرف اُس حالت میں وہ مجبور ہے اُسے صرف موت پر اختیار نہیں، باقی ہر بات میں وہ خدا کا نائب ہے۔ اور خدا کی صفات کا حامل ہے۔ اُس کی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ اُس کا نصب العین پست نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ خُدا سے ادھر ہر چیز بن سکتا ہے۔

ابو الخیر محمد عبداللہ

تبصرہ اشاعات جدیدہ

حکایات پنجاب مسز فلورا اینی سٹیل ایک انگریز مصنفہ ہیں۔ اور بہت سی مقبول کتابیں آپ کی تصنیفات میں ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کے چند سال پنجاب میں گذارے۔ اور پیشِ نظر کتاب انہی سالوں کے تجربات کا نتیجہ ہے۔ مسز سٹیل ایک اندازِ خصوصی کی مالک ہیں جس کا امتیازی وصف دلچسپی ہے۔

اس کتاب کو سیّد عبدالقادر صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے "اُردو کے لباس میں ترجمہ کیا" اور لالہ مہر چند سیٹھی صاحب ایم۔ اے۔ ایس۔ سی نے "بعد نظر ثانی کے ترمیم کیا" ترجمہ بامحاورہ اور سلیس ہے۔ تاہم اُس میں اصل کی خوبیاں بہت حد تک برقرار رکھی گئی ہیں۔ کتاب کی عبارت ابھی اصلاح طلب ہے۔ کتابت و طباعت کے لحاظ سے "حکایاتِ پنجاب" نفاست کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس۔ لندن۔

باغبان۔ یہ کتاب بھی میکملن اینڈ کمپنی کی تازہ ترین مطبوعات میں سے ہے۔ اسے حامد حسن صاحب بچھراونی نے جو اخبار "سعید" کانپور کے ایڈیٹر ہیں سر رابندرا ناتھ ٹیگور کی مشہور تصنیف "گارڈنر" سے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمے

میں یہ خوبی ہے کہ "ٹیگوریت" بدستور قائم ہے۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ٹیگور کے شیدائی کیوں اُردو کی تنگ دامانی کا خیال نہیں کرتے۔ اور اس جنسِ گرامی کے وفور کو سمیٹنے کی بے سود کوشش کرتے ہیں۔

مکاتیب امیر مینائی۔ کسی مصنف سے ذاتی طور پر واقف ہونیکا شرف تو اُس کے معاصرین ہی کو نصیب ہو سکتا ہے۔ لیکن سوانحعمریوں کی بدولت بعد میں آنے والے لوگ بھی کسی قدر واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ سوانحعمری کے تمام اصناف میں سے بہترین صنف خود نوشتہ سوانحعمری ہے۔ کیونکہ اُس میں مصنف خود اپنی زبانِ قلم سے اپنی داستانِ زندگی بیان کرتا ہے۔ بعض مصنفین کے خطوط اُن کی شخصیت سے اسقدر مملو ہوتے ہیں۔ کہ وہ کسی اعتبار سے خود نوشتہ سوانحعمری سے کم پایہ نہیں رکھتے۔ غالب اور اکبر کے مکاتیب بُعدِ زمانی و مکانی کے پردے کو چاک چاک کر کے ہمیں اُن کے رُوبرو کر دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان سے ہمکلام ہو رہے ہیں۔ اور ہمیں اُن سے نہ صرف روحانی قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ بلکہ اُن کا وجودِ جسمانی بھی ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ یہی وصف اُستاد امیر احمدؒ امیر مینائی کے مکاتیب کا طغرائے امتیاز ہے۔ وہ اپنے خطوط میں اپنے درمیان اور پڑھنے والے کے درمیان کوئی اجنبیت و غیریت کا پردہ حائل نہیں رہنے دیتے، اُن کے الفاظ مُنہ سے بولتے ہیں اُن کا صفحہ صفحہ گویا اُنکی لوحِ دل ہے۔ یہ خطوط اُن کی سیرت کی ایک مکمل تفسیر ہیں جو اُس وقت جبتک اُن کا نام اُردو ادب میں باقی ہے اُن کی شخصیت کو ہر دلعزیز بناتے رہینگے

ہمیں مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب مدیر رسالہ "قند پارسی" کا ممنون ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان مکاتیبات کی تالیف و ترتیب انہی کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ شروع میں ۱۰۶ صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ فاضل مؤلف نے اپنی طرف سے شامل کیا ہے جس میں انہوں نے حضرت امیر مرحوم کی ذات و صفات پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ مقدمے کا ایک حصہ ایسا ہے جس سے شاعری کے دلدادہ اس کامل الفن اُستاد سے ایک معنوی تلمذ کا رشتہ پیدا کر کے کسب فیض کر سکتے ہیں۔ ہماری مراد اُن اصلاحوں سے ہے جو اُستاد نے مختلف وقتوں میں اپنے شاگردوں کو دیں اور جن کا نمونہ اس کتاب کے پورے ۲۰ صفحوں پر درج ہے۔ اگر فاضل مؤلف اس امر کی اجازت دیں تو ہم ایک بات میں اُن سے اختلاف رائے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے امیر اور داغ کا موازنہ کرنے میں جو کئی صفحے سیاہ کر دیئے ہیں تو اس سے کیا حاصل ہے؟ کیا ان دو اُستادوں کے درمیان تفریقِ مراتب کر دینے سے اُنکے درجوں میں فرق آ جائیگا جو اُنکو اپنی اپنی جگہ ادب اُردو کی تاریخ میں حاصل ہیں؟ کتاب ظاہری خوبیوں سے حسبِ خاطر خواہ آراستہ نہیں کاغذ لکھائی چھپائی سب معمولی قیمت ۸ عہ ملنے کا پتہ: مولوی احسن اللہ خاں وکٹوریہ کالج گوالیار

ناکامِ محبّت کے خیالات

(۱)

او تغافل کیش اگر یونہیں رہیں بے مہریاں　　ایک دن خاموش پھر میری زباں ہو جائیگی
یہ مری ہستی، کہ ہے اک شعلۂ زارِ آرزو　　ظلمتِ شہرِ خموشاں میں نہاں ہو جائیگی
گو مرا پیکر فنا ہو جائے گا لیکن مری　　سادگی الفت کی زیبِ داستاں ہو جائیگی

محفلِ ہستی سے محرومِ تمنا جاؤں گا
نقش صدقِ عشق کا لیکن بٹھاتا جاؤں گا

(۲)

شام کو دنیا کے ہنگاموں سے جب گھبرا کے تو　　باغ میں پھولوں سے اپنی روح کو بہلائیگی
جب نہ پائے گی کہیں بوئے محبت کا نشاں　　جب گلستاں کی کلی ہر ایک مرجھا جائیگی
آہ! پھر اس وقت اے مستِ مئے پندارِ حسن　　یاد آ آ کے مری تجھ کو بہت تڑپائیگی

روح جنت کے لئے پھر پرفشاں ہو جائیگی
عارضی ہستی تری بھی جاوداں ہو جائیگی

(۳)

ہوں گے پھر فردوس کے پھولوں میں دونوں ہمکناں　　خوگرِ فتنہ نہیں جس سرزمیں کا آسماں
جس کی ہر آواز میں ہے بربطِ الفت کی گونج　　جس کی ہر وادی میں ہیں چشمے بہشت کے رواں
پھر وہاں ہونگے ترے لبہائے لعلیں کے ایاغ　　جن کی ہستی میں ہے تاثیرِ حیاتِ جاوداں

بے نیازِ لطف و جورِ آسماں ہو جائے گا
چند جرعے پی کے کیفِ جاوداں ہو جائے گا

"آثر صہبائی"

ہولناک بیابان

پہلے زمانے میں ملک سکاٹ لینڈ کے شمال میں ایک عظیم الشان بیابان تھا۔ گھنے جنگل، سر بفلک سلسلہ ہائے کوہ برفانی چوٹیاں۔ غرضیکہ انسان کا قدم صدیوں سے وہاں نہ پہنچا تھا۔ سیاہ بادلوں کی گھٹائیں چھائی رہتی تھیں اور تند و تیز ہواؤں کے طوفان برپا رہتے تھے۔ برفباری شب و روز غضب ڈھاتی تھی۔ سفید بھیڑیئے اور ریچھ کی قسم کے درندے افراط سے پائے جاتے تھے۔ اسکاٹلینڈ کے لوگ جو فطرتاً اوہام پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس بیابان کو بھوتوں کے جنگل کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

سر چارلس کے عہد شباب کا آغاز تھا۔ دربار شاہی میں اس کی بہادری و شہ زوری زبان زدِ خاص و عام تھی۔ سالانہ کھیلوں میں اس نے سپہ گری کے تمام انعام حاصل کئے تھے۔ حسین شہزادیاں۔ امرا و وزرا کی دوشیزہ لڑکیاں اس کی نظر التفات کی خواہشمند تھیں۔ عہد سلف کے سورماؤں کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ وہ بھی حوادث کی جستجو میں ہر چہار سو بادیہ پیما ہو۔ دنیا کی طرح طرح کی بلاؤں کا سامنا کرے۔ اور اثنائے سفر میں کسی حسین عورت کو مصیبت سے بچائے اور اس سے شادی کرے۔ چنانچہ اپنی اس خواہش کے مطابق یکہ و تنہا عازم سفر ہوا۔ عجیب و غریب حادثات رستے میں پیش آئے مگر سر چارلس کی ثابت قدمی سب پر غالب آئی۔ ڈاکو درندے وغیرہ سب کو تہ تیغ کیا۔ آخر اس دشت وحشت انگیز کے کنارے پہنچا جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

میلوں تک سنسان۔ آسمان پر بادل ٹوپ چھائے ہوئے تھے کبھی کبھی یخ کے تودے گر پڑتے تھے۔ دوپہر کو شام کا عالم تھا۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز خاموشی کو ہولناک بنا رہی تھی سیاہ ہیبتناک و تاریک وادیاں۔ ڈراؤنے غار ہیبت کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ خاموش بھیانک شکلیں۔ کریہ منظر بھتنے دور سے افق میں سیاہ پانی کی جھیلوں پر رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اور قریب پہنچنے پر ہوا میں غائب ہو جاتے تھے۔ دیار کے درختوں کے تاریک سائے برگھات میں بیٹھے ہوئے درندوں کا احتمال ہوتا تھا۔ اس اندھیرے منظر میں دور دراز سفید برف پوش

یند کرنے والے۔ میرے سامنے آتا کہ تجھے تیری نامردی
کی سزا دوں۔"

یکایک ایک خیرہ کن ضیا اس کمرے میں
ظاہر ہوئی۔ اس زرد روشنی میں سر چارلس کو چودہ قبریں
نظر آئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب قبریں پھٹ گئیں
ہر قبر میں چمکدار زرہ بکتر زیب تن کئے ہوئے ایک
شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ چودہ نظریں سر چارلس کے سینے
میں گڑ گئیں۔ ہر ایک اپنی نامرادی کی ایک علیحدہ کیفیت
رکھ رہی تھی۔ تمام شکلوں پر مردنی اور یاس برس رہی تھی
دو ڈراؤنی آوازوں نے مُہرِ سکوت کو یکبارگی توڑا۔

"سر چارلس باز آؤ"

سر چارلس سہم گیا۔ اس پر غشی سی طاری ہو گئی۔ اُٹھا
تو منظر غائب تھا۔ مگر اس کا دل زور سے دھڑک رہا
تھا۔ بیم و ہراس کے آثار اس کے چہرے سے عیاں
تھے۔ انتہائے خوف سے اسے پسینہ آ گیا تھا۔ آہستہ
آہستہ اس کی مردانگی نے اس کے دل پر دوبارہ قابو
پایا۔ وہ جرأت جو تکلیف کی انتہا اور یاس سے پیدا ہوتی
ہے۔ اس کے سینے میں پیدا ہو گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا
تو ایک طرف اسے کچھ دھندلی سی روشنی نظر آئی اس
کی طرف بڑھا۔ وہ آگے جانے کا راستہ
تھا۔

(۴)

دروازے میں ایک سفید ریش آدمی کھڑا تھا
وہ سر چارلس سے نہایت تپاک سے پیش آیا اور
اُسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ سر چارلس حیران تھا
کہ اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ وہ بھوتوں کا جنگل
وہ قلعہ وہ چودہ بہادروں کی روحیں اور یہ سفید ریش
بوڑھا یکہ و تنہا اس قلعے میں سکونت پذیر۔ کچھ اس کی
سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس نے بوڑھے سے اس کیفیت
کا مطلب پوچھا۔ بوڑھا خاموش سر چارلس کو ایک
عالیشان دیوان میں ہمراہ لے گیا۔ جس کے مقابلے
میں شاہ سکاٹلینڈ کا دربار ہیچ تھا۔ وہاں دونوں بیٹھ
گئے اور بوڑھے نے اپنا حال بیان کرنا شروع کیا:۔
"سر چارلس تمہارے اسکاٹلینڈ کے شمال
میں سویڈن ناروے تک ایک نہایت عظیم الشان
سلطنت ہے جو اسکاٹلینڈ سے کئی گنا بڑی ہے۔
اس مملکت میں کوئی انسان آباد نہیں۔ فقط بھوت پریت
اُڑتے پھرتے نظر آتے ہیں تم اس سلطنت کے بادشاہ
کے مہمان ہو"

سر چارلس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا۔ وہ بوڑھا
جلال و شوکت شاہی کا مرقع تھا۔
"مگر سر چارلس اس سلطنت کی تباہی نزدیک ہے۔

کیونکہ میں نے جوشِ جوانی میں عالمِ انسانی میں سے ایک حور وش شہزادی پر عاشق ہو کر اُسے یہاں بالجبر لاکر اسیر کر دیا تھا۔ اور صدیوں سے ہمارے خاندان میں یہ رسم چلی آئی ہے کہ جب ہم میں سے کوئی تاجدار حوا کی کسی بیٹی سے محبت کریگا اور اُسے بالجبر قید کر لیگا تو اس شہزادی کا پیدا ہوا ں چھڑانے والا اس سلطنت کی تباہی کا موجب ہوگا۔ تم چودہ نامراد بہادروں کی قبریں دیکھ چکے ہو۔ وہ میرے ہاتھ سے قتل ہوئے ہیں"

سر چارلس کے دل پر دہشت طاری ہوگئی اس کا ہاتھ اس کے نیام تک پہنچ گیا تھا۔ اس بوڑھے بادشاہ کی جگہ ایک ڈراؤنی پرہیبت شکل جس کی آنکھوں سے شرارے نکلتے تھے اور آسمان کی طرف اُڑ جاتے تھے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک کرخت آواز اس دیوان میں گونجی:

"سر چارلس سلامتی کی خواہش ہے تو یہاں سے چلے جاؤ"

"سلامتی کی خواہش نہیں۔ مجھے اسیر شہزادی کو رہا کرنے کی خواہش ہے"

(۵)

سر چارلس ایک میدان میں کھڑا تھا۔ سامنے ایک برج پر وہی حسین شہزادی اپنا رومال ہلا رہی تھی جو اس کے خوابوں اور ارمانوں کی تصویر تھی۔ یکایک آسمان پر تاریکی چھا گئی۔ ہولناک آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ کریہ منظر شکلوں نے سر چارلس کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور حملہ آور ہوئیں۔ سر چارلس ہر چہار طرف تلوار مارتا تھا۔ لیکن وہ مخلوقِ عجیب غول در غول آن موجود ہوتی۔ اور نہایت ہولناک چیخوں سے حملہ آور ہوتی تھی۔ مگر اس شور کے علاوہ ایک اور شور سر چارلس کو سنائی دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سمندر اپنے ہزاروں تھپیڑوں اور طوفانوں کی فوج لئے اس کی مدد کو آ رہا ہے۔

سر چارلس کے بازو تھک گئے۔ آخر کار اس نے اس قتل بے سود کو چھوڑ کر سامنے برج کی طرف راستہ صاف کرنے کا ارادہ کیا جس طرف اس نے رخ کیا ایک ایک قدم پر کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ دروازے کو توڑ کر سر چارلس برج میں داخل ہوا۔

سمندر کا شور اب بہت بڑھ گیا تھا۔ غیر انسانی دشمن اُسے چھوڑ کر اپنی سلامتی کے لئے آوارہ و سرگردان ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ سمندر کی لہریں ٹوٹ ٹوٹ کر قلعہ کی دیواروں سے ٹکراتی تھیں۔ زلزلۂ عظیم برپا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طوفان لمحہ بھر میں تمام عالم کو فنا کر دیگا۔

حسرت و مایوسی کا مرقع سر چارلس کے پیشِ نظر تھا۔ ایک حور تمثال شہزادی کی لاش فرش پر نظر آئی جسکے کپڑے خون آلود تھے۔ نزع کی تکلیف سے اُس کی شکل

نہایت دردناک معلوم ہوتی تھی۔ فضا کی تاریکی اس المناک منظر کی وحشت کو اور بڑھا رہی تھی۔ سر چارلس آگے بڑھا دیکھا تو ایک طرف اس غرقاب سلطنت کے آخری سلطان کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ شمشیر کے دستہ پر تھا جو اس کے سینہ میں نیام ہو چکی تھی۔ اس کے مردہ لبوں میں کچھ خفیف سی حرکت پیدا ہوئی۔

"آہ محبت" اور وہ لب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

سمندر بہت چڑھ آیا تھا۔ زلزلے کے ہچکولوں سے وہ برج ہلا اور گر پڑا .... آف سر چارلس! ایک عظیم الشان سلطنت کی جگہ طوفان کی تاریکی اور سمندر کا شور تھا ممکن ہو کہ آجتک بحیرۂ شمالی کی تہ کی گہرائیوں میں ایک بادشاہ قلعہ کے کھنڈروں کے نیچے ان تین نامرادوں کی ہڈیاں پڑی ہوں

(نوٹ) محققین نے دریافت کیا ہے کہ کبھی سکاٹلینڈ سکنڈے نیویا سے خشکی کے ذریعے ملحق تھا۔ مگر کسی زلزلے یا طوفان کی وجہ سے سکاٹلینڈ کے شمال کی خشکی زیر آب ہو گئی ممکن ہو یہی اس افسانے کا سین ہو

محمد جمیل واسطی

بزم دوشیں

آہ! وہ ناز ہائے بے انداز
آہ! وہ لطفِ سجدہ ہائے نیاز

آہ! وہ برقہائے حُسن و جمال
آہ! وہ شعلہ ہائے قلب گداز

آہ! وہ زخمہائے رُوح فزا
آہ! وہ چشمہائے تیرانداز

آہ! وہ بزمہائے چشم فروز
آہ! وہ نغمہ ہائے گوش نواز

آہ! وہ شور ہائے نوشا نوش
آہ! وہ بادہ ہائے روح گداز

آہ! وہ جستجوئے عشرتِ نو
آہ! وہ آرزوئے نو انداز

آہ! وہ نعرہ ہائے مستانہ
آہ! وہ ہاؤ ہوئے دیوانہ

اثر صہبائی

نغماتِ آزاد

کم و بیش ہر جو صلابت چکا ہے — نہ کچھ آرزو ہے نہ کچھ مدعا ہے
نہ اُمید ٹوٹے نہ ارمان نکلے — ہمارا مرض ہر طرح لا دوا ہے
مقدر مخالف، زمانہ مخالف — جسے دیکھتا ہوں، ترا ہمنوا ہے
ذرا داشتہ داشتہ مہرباں ہو — کوئی چشم اُلفت سے ناآشنا ہے
جہانتک ہو، اغماض جائز نہ رکھیے — کہ اُمیدواروں کا دل ٹوٹتا ہے
خوشا وہ زمانہ کہ تجھ پر فدا تھے — دل ابتک وہی فرصتیں ڈھونڈھتا ہے
اچانک ترا یاد آنا ستم تھا — کوئی روح کھینچے لئے جا رہا ہے
نہ اگلا سا عالم نہ پہلی سی دُنیا — خداوند عالم! یہ کیا ماجرا ہے
بڑی سے بڑی کوششیں ختم ہولیں — اب امدادِ غیبی! ترا آسرا ہے
کبھی متصل کوششیں کرکے دیکھو — ہمیشہ سے ہمت کا حامی خدا ہے
کٹھن منزلو! رحم سے کام لیجو — کوئی پا پیادہ سفر کر رہا ہے
موافق ہواؤ! کچھ امداد کیجو — کہ ٹوٹی سی کشتی ہے طوفاں بپا ہے
تباہی کو بیڑے سے لاگ آپڑی ہے — خدا ہی مری ناؤ کا ناخدا ہے
تلاطم کے صدمے ڈبو کر رہیں گے — حقیقت میں بیڑے کا وقت آلگا ہے

اب آزاد آزادیاں بھول جاؤ
کہ قیدِ علائق سے پالا پڑا ہے

آزاد انصاری

تھی مصلحت کہ ترک کر ہجراں میں جان دیجئے
دل کھول کر نہ غم میں میں ایک بار رویا
(میر)

روداد محبّت

مصنفہ ٹالسٹائی

حصّہ دوم

مترجمہ راز چاندپوری

پہلا باب

دن، ہفتے حتیٰ کہ دیہات کی زندگی کے دو مہینے ایک عالم خود فراموشی میں گذرے، لیکن اس کے ساتھ ہی ذوق وشوق، محسوسات اور مسرّت سے لبریز یہ دو ماہ پوری زندگی سے بے نیاز کر دینے والے تھے۔

اپنی دیہاتی زندگی کی تنظیم کے متعلق میرے اور اُس کے خیالات ہماری پیش بینی کے مطابق ظہور پذیر نہ ہوئے، مگر ہماری زندگی، ہمارے خیالات کے مقابلہ میں مایوس کن نہ تھی۔ میں اُس سے صرف اسکی محنت ومشقت، ادائے فرض، قربانی اور بے غرضانہ دوسروں کی خدمت گذاری کی وجہ ہی سے محبّت نہ کرتی تھی بلکہ اس کے برخلاف میری حیات جذب وشوق، ایک دوسرے سے محبّت کرنے، محبّت کئے جانے کی خواہش، ایک مستمر مسرّت اور دنیا کی ہر چیز سے بے خبری کی کیفیات سے لبریز تھی۔

بعض اوقات وہ کتب خانہ میں جاتا اور اپنے معاملات کی انجام دہی میں مصروف ہو جاتا۔ کبھی وہ شہر چلا جاتا اور ریاست کے کاموں میں غرق ہونے کی وجہ سے مجھ سے جدا رہتا، لیکن میں دیکھتی تھی کہ میری جدائی اس کو شاق گذرتی ہے اور وہ خود بھی اس کا معترف تھا کہ میرے بغیر دنیا کی ہر شے اس کے لئے محض بیکار ہے۔ اس کے لئے اس بات کا تصوّر بھی ممکن نہ تھا کہ میرے بغیر اُس کو کسی چیز سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔

میری حالت بھی بالکل ایسی ہی تھی۔ میں کتابیں پڑھنے، نغمہ سرائی کرنے، اُس کی والدہ کے ساتھ گفتگو کرنے اور گھر کے کام کاج اور مدرسہ کے کاموں میں مصروف رہتی تھی، لیکن میں یہ سب کچھ محض اس وجہ سے کرتی تھی کہ ان میں سے ہر چیز سے اس کو تعلق تھا۔ مگر جب کبھی مجھے یہ خیال ہوتا کہ فلاں کام سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے تو میرے قوائے عمل بیکار ہو جاتے اور اس کے سوائے دنیا میں کسی اور کا خیال کرنا بہت

عجیب معلوم ہوتا۔

ممکن ہے کہ میرا یہ خیال لغو اور خود غرضی پر مبنی ہو، لیکن اس خیال سے مجھے ایک بے پایاں مسرّت حاصل ہوتی تھی اور میں اپنے آپ کو ساری دنیا سے برتر و اعلیٰ سمجھتی تھی۔

میری نگاہ میں ساری دنیا میں صرف وہ ایک شخص تھا اور میں اُس کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت، لائق اور مکمل انسان خیال کرتی تھی، اس لئے میرا مقصد حیات صرف اس کے واسطے زندہ رہنا تھا یا اپنے آپ کو اس کے سامنے اس حیثیت سے پیش کرنا تھا جو ہر امکانی صورت میں مکمل سمجھی جاسکتی ہے۔ اور میں بھی دنیا کی اس بہترین ہستی کی نظر میں ایسی ہی عورت بننے کی کوشش کرتی تھی۔

ایک بار وہ میرے کمرہ میں اُس وقت آیا جبکہ میں نماز میں مصروف تھی۔ میں نے اُس پر نظر ڈالی اور بدستور عبادت میں مصروف ہوگئی۔ وہ میز پر بیٹھ گیا اور اس خیال سے کہ میری نماز میں خلل نہ پڑے ایک کتاب کھول کر پڑھنے لگا، لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے گھور کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا مجھے بھی بے ساختہ ہنسی آگئی اور میں نماز کو جاری نہ رکھ سکی۔

میں نے پوچھا "کیا تم نماز پڑھ چکے ہو؟"

"ہاں۔ مگر تم اپنا فرض ادا کرو، میں جاتا ہوں"

"کیا تم نماز نہیں پڑھتے؟ مگر مجھے امید ہے کہ تم سجدہ دیا کرتے ہو۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے پاس سے جانے کے لئے کھڑا ہوگیا لیکن میں نے اُس کو روک لیا اور کہا:-

"میرے پیارے! آج میری خاطر میرے ساتھ نماز پڑھ لو"

وہ بے قاعدہ طور سے اپنے ہاتھ نیچے کر کے میرے برابر کھڑا ہوگیا اور متین صورت بنائے رُک رُک کر نماز پڑھنے۔ وقتاً فوقتاً وہ میری طرف دیکھتا جاتا تھا تاکہ اُس کو معلوم ہو جائے کہ میرے چہرہ سے پسندیدگی اور مسرّت ظاہر بھی ہوتی ہے یا نہیں اور مجھے اُس کی ہمّت افزائی کا کہاں تک خیال ہے۔

جب وہ نماز پڑھ چکا تو میں نے قہقہہ مارا اور اُسکو اپنے سینہ سے لگالیا۔

اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اُس نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیکر کہا "یہ تمہارا ہی اثر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میں اب پھر دس برس کا بچّہ بن گیا ہوں"

ہمارا مکان دیہات کے اُن قدیم مکانوں میں

سے تھا جس میں ایک خاندان کی کئی نسلیں آپس میں ادب و تعظیم اور ادب کے ساتھ زندگیاں بسر کر چکی تھیں، وہ سراپا اُس خاندان کی محبت اور سچائی کا آئینہ تھا۔ اور جب مجھے اُس میں رہنا پڑا تو یکایک وہ اگلی محبت اور صداقت میرے افسانۂ محبت کا ایک جزو بن گئی۔

مکان اُس قدیم طریقہ پر آراستہ تھا جسکو ٹاٹیانا پسند کرتی تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مکان کی آرائش کا سامان خوبصورت اور بیش قیمت تھا لیکن ملازم، فرنیچر اور خوراک، غرض ہر چیز کی یقیناً بہتات تھی۔ ہر ایک چیز صاف ستھری، باقاعدہ اور تعجب انگیز تھی۔ استقبالیہ کمرہ عمدگی اور قرینہ کے ساتھ فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دیواروں پر تصاویر آویزاں تھیں بھاریدار چاندی بیش قیمت نفیس قالین فرش پر بچھے ہوئے تھے۔

ملاقات کے کمرے میں پرانی وضع کا ایک بڑا پیانو رکھا ہوا تھا اور اُسی میں دو مختلف الوضع الماریاں اور ایک سیب کی میز تھی ٹاٹیانا کی عنایت سے میرا خلوت کدہ مختلف صدیوں اور وضع کے خوبصورت فرنیچر سے آراستہ تھا۔ منجملہ دوسری چیزوں کے وہاں ایک قدیم محراب دار آئینہ بھی تھا جس پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے ہمیشہ حیا آتی تھی، لیکن آخر کار یہ آئینہ مثل ایک قدیم دوست کے میرے لئے ایک محبوب شے بن گیا۔

ٹاٹیانا کی آواز مکان میں سنائی نہ دیتی تھی۔ یعنی وہ بہت آہستگی کے ساتھ گفتگو کرتی تھی مگر ہر کام گھڑی کی رفتار کی طرح جاری رہتا تھا۔ اگرچہ مکان میں ضرورت سے زیادہ خادم موجود تھے مگر شور و غل کا نام نہ تھا۔ یہ تمام خادم بغیر ایڑی کے ملائم جوتے پہنتے تھے کیونکہ ٹاٹیانا جوتوں کی چرچراہٹ اور ایڑیوں کی کھٹ کھٹ کو بہت ناپسند کرتی تھی۔ تمام خادم اس مکان میں رہنے پر نازاں تھے اور وہ ضعیف العمر خاتون کے سامنے جاتے ہوئے خوف کھاتے تھے اور میرے شوہر سے اور مجھ سے بزرگانہ شفقت کے متمنی رہتے تھے۔ حقیقت میں وہ اپنے فرائض ایک عجیب انہماک کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

مستقلاً ہر شنبہ کو مکان کا فرش دھویا جاتا اور قالینوں کو جھاڑا جاتا تھا۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو "نغمۂ تشکر" کی محفل منعقد ہوتی تھی اور متبرک پانی چھڑکا جاتا تھا۔ ہر بار جبکہ ٹاٹیانا اُس کے لڑکے یا میری سالگرہ کا دن آتا (اور میرے لئے پہلی بار اس موسم خزاں میں یہ دن آیا تھا) تو تمام ہمسائے مدعو کئے جاتے تھے اور یہ رسم ٹاٹیانا نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، برابر ہوتی چلی آئی تھی۔

میرا شوہر خانگی معاملات میں دخل نہ دیتا تھا اور صرف کھیتی باڑی اور ملازموں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

اور یہ کام اُس کے لئے بہت کافی تھا۔ موسم سرما میں بھی وہ بہت سویرے اُٹھتا اور عموماً میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی باہر چلا جاتا تھا۔ وہ عام طور پر صبح کی چائے کے وقت واپس آتا تھا جس کو ہم تنہا پیتے تھے۔ اُس وقت کام کی تکان اور پریشانی کے بعد قریب قریب ہمیشہ اُس کے چہرہ سے ایک ایسی مسرت کی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا جس کو ہم "وحشیانہ جوش وخروش" کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے۔

اکثر میں اُس کو اس امر کی ترغیب دیتی کہ وہ اپنی صبح کی کارگذاریاں بیان کرے اور وہ ایسی خرافات بکتا کہ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ بعض اوقات میں اس سے اصرار کرتی کہ مجھے حقیقی واقعات بتائے اور وہ ان خرافات سے باز رہ کر مجھے اصلی حالات سُناتا۔ میں اُس کی نگاہوں اور اُس کے لبوں کی حرکت کو دیکھتی اور مجھے کوئی بات یاد نہ رہتی، کیونکہ میں تو صرف اُسکو دیکھنے اور اُس کی آواز سننے کی مشتاق رہتی تھی۔

وہ کہتا "اچھا جو کچھ میں نے کہا ہے اُسکو بیان کرو" اور میں اُس کی گفتگو کا پہلا لفظ بھی نہ بتا سکتی۔ یہ بڑی خرابی تھی کہ وہ مجھ سے سوائے ہمارے ذاتی معاملات کے کسی اور شے کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ کہتا رہتا تھا۔ میں مشکل سے تمیز کر سکتی تھی کہ جو کچھ وہ کرتا رہتا ہے وہ کیا ہے؟ بہت عرصہ کے بعد میں اس کے کاموں کو سمجھنے اور ان میں دلچسپی لینے کے قابل ہوئی۔

ٹاٹیانا دوپہر کے کھانے کے وقت تک ہمارے پاس نہ آتی تھی، وہ صبح کی چائے تنہا پیتی تھی اور صرف ایک خادمہ کو ہمارے پاس بھیجتی تھی۔ ہماری مخصوص محویت اور مسرت سے لبریز مختصر دنیا میں ٹاٹیانا کا یہ پیغام بالکل عجیب اور ہمارے جذبات سے اسقدر مختلف ہوتا تھا کہ اکثر میں خادمہ کی گفتگو سُنکر بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔ خادمہ دست بستہ ہوکر سنجیدگی کے ساتھ "ٹاٹیانا نے دریافت کیا ہے کہ کل کی تفریح کے بعد آپ کی طبیعت کیسی رہی اور اُس نے اپنے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ میں رات بھر درد میں مبتلا رہی اور ایک بیوقوف کُتا ساری رات گاؤں میں بھونکتا اور میری نیند میں خلل انداز ہوتا رہا۔ اور اُس نے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ آج کا کھانا کیسا پکا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ آج ٹارس نے کھانا نہیں پکایا بلکہ نکولشکا کو تجربہ کے لئے آج پہلی بار کھانا پکانے کی اجازت ملی تھی اور غالباً اُس نے کچھ برا کھانا نہیں پکایا خصوصاً بوریاں بہت عمدہ پکائی ہیں۔ مگر اسکے ساتھ ہی اُس نے سنبوسے بہت زیادہ پکالئے ہیں"

دوپہر کے کھانے کے وقت تک ہم بہت کم ایک جگہ بیٹھتے تھے۔ میں اپنا دل بہلانے کی غرض سے

کتابوں کا مطالعہ کرتی تھی۔ وہ کچھ لکھتا رہتا یا دوبارہ باہر چلا جاتا تھا لیکن چار بجے جب ہم دوپہر کا کھانا کھا چکتے تو ملاقات کے کمرے میں چلے جاتے۔ ٹاٹیانا اپنے کمرہ سے باہر آتی، چند ملنے والے اور شریف نادار خواتین جن میں سے اکثر ہمارے یہاں رہتی تھیں، ہمارے پاس جمع ہو جاتیں۔ عموماً ہر روز میرا شوہر قدیم رسم کے مطابق دوپہر کے کھانے کے لئے جاتے وقت، اپنا ہاتھ اپنی ماں کے ہاتھ میں ڈال لیتا تھا مگر وہ اصرار کرتی تھی کہ وہ اپنا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈال لے اور عموماً روزانہ ہم دروازہ میں پھنس جاتے تھے کیونکہ دروازہ ہم سب کے ایک ساتھ گذرنے کیلئے کافی کشادہ نہ تھا۔ اُس کی ماں کھانے کے وقت صدر میں بیٹھتی اور مؤدب و مہذب طریقہ سے گفتگو کا آغاز ہوتا چند الفاظ جو میں اور میرا شوہر ایک دوسرے سے کہتے وہ کھانے کے وقت کی صحبتوں میں بالکل مختلف ہوتے تھے۔ وقتاً فوقتاً ماں بیٹوں میں مباحثہ ہوتا اور وہ ایک دوسرے کو طعن آمیز کلام سے مخاطب کرتے تھے۔ مجھے خصوصیت سے ان مباحثوں اور طعن تشنیع سے لبریز گفتگو میں لطف آتا تھا کیونکہ یہ مباحثے اُس محبت کو جو دونوں کو ایک دوسرے سے تھی واضح کر دیتے تھے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ٹاٹیانا استقبالیہ کمرہ میں چلی جاتی اور اپنی بڑی آرام کرسی پر بیٹھکر تمباکو پیتی یا نئی خریدکردہ کتابوں کے اوراق کاٹتی۔ میں اور میرا شوہر یا تو بلند آواز سے کوئی کتاب پڑھتے یا ملاقاتی کمرہ میں جاکر پیانو سے دل بہلاتے۔ ہم ان ایام میں بہت زیادہ مطالعہ میں منہمک رہتے تھے۔ مگر موسیقی ہماری دلکشی اور اعلیٰ درجہ کی مسرت کا باعث تھی، ہمارے دل اس سے ہر بار تازہ لطف حاصل کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے ہمیں ایک دوسرے کے حالات سے بار بار واقفیت حاصل ہوتی تھی جب میں اُس کے پسندیدہ ترانے بجاتی تو وہ کمرہ کے ایک گوشہ میں صوفے پر جا بیٹھتا جہاں میں اُسکو بمشکل دیکھ سکتی تھی اور وہ بہت ہی حجاب کے ساتھ ان جذبات و تاثرات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا جو موسیقی سے پیدا ہوتے تھے، لیکن اکثر جبکہ اس کو میرے وہاں پہنچنے کی اُمید نہ ہوتی تھی میں پیانو کو چھوڑکر اُس کے پاس پہنچ جاتی اور اُس کے چہرہ کے تاثرات کا مشاہدہ کرتی اور اُس کی آنکھوں میں ایک غیر فطری چمک اور نمی دیکھتی جس کو وہ مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی بے فائدہ کوشش کرتا۔ ٹاٹیانا اکثر ہم کو ملاقاتی کمرہ میں دیکھنے کی خواہش کرتی لیکن وہ ہماری صحبت میں خلل انداز ہونے سے ڈرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ایک مصنوعی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہماری طرف بغیر نظر اُٹھائے کمرہ سے گذر جاتی۔ مگر نہیں جانتی تھی کہ اس کو اپنے کمرہ میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس لئے

جلد واپس چلی جاتی تھی۔

شام کے وقت میں وسیع ملاقاتی کمرہ میں بیٹھ کر چائے انڈیلتی اور گھر کے تمام آدمی ایکبار پھر دسترخوان پر جمع ہوجاتے۔ صیقل شدہ سماوار کے سامنے اس مبارک رسم کو ادا کرنے کیلئے بیٹھنے اور گلاسوں اور پیالوں کو تقسیم کرنے سے میں عرصہ تک پریشان رہتی مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہنوز اس ذمہ داری کے قابل نہیں ہوں اور بڑے سماوار سے چائے انڈیلنا اور پیالوں کو طشتری میں رکھ کر یہ کہنا کہ "یہ پیتر کے لئے ہے اور یہ ماریا منچنا کے لئے۔ پھر یہ دریافت کرنا کہ آیا یہ چائے خوشگوار ہے یا نہیں" بعد ازاں دایہ اور خادموں کے آگے شکر رکھنا میرے لئے تکلیف دہ تھا۔

میرا شوہر عموماً کہا کرتا تھا "بہت عمدہ ہے، بہت خوب ہے۔ تم تو اس طرح کام کرتی ہو جیسے کہ ایک نوعمر حسین خاتون کرسکتی ہے"، اور اس کے الفاظ مجھے ہمیشہ پہلے سے زیادہ پریشان کردیتے تھے۔

چائے نوشی کے بعد ٹاٹیانا یا تو اپنے خلوتخانہ میں چلی جاتی تھی یا ماریا منچنا سے پیشین گوئیاں سنتی تھی۔ اس کے بعد وہ ہمکو بوسہ دیتی اور ہمارے اوپر صلیب کا نشان بناتی اور ہم اپنے کمرہ میں واپس چلے جاتے۔ تاہم عموماً ہم آدھی رات تک بیٹھے رہتے اور یہ سب سے بہتر اور پرلطف وقت ہوتا تھا۔ وہ اپنے گذشتہ واقعات بیان کرتا اور ہم نئی نئی تجاویز سوچتے۔ بعض اوقات ہم فلسفیانہ گفتگو کرتے اور حتی الامکان بہت ہی آہستگی کے ساتھ سرگرم کلام ہوتے تاکہ ہماری آواز بالاخانہ پر نہ سنی جاسکے اور ٹاٹیانا کو جو جلد سوجانا پسند کرتی تھی، کسی قسم کا شبہ نہ پیدا ہو۔ بعض اوقات ہمیں بھوک معلوم ہوتی، ہم دبے پاؤں الماری کے پاس جاتے۔ نکیٹا کی دوراندیشی کی بدولت رات کے کھانے کا بچا ہوا کچھ ٹھنڈا کھانا ملجاتا اور اسے ہم اپنے خلوتکدہ میں بیٹھکر صرف ایک شمع کی روشنی میں کھالیتے۔ ہمیں قدیم شاندار مکان میں جس پر ٹاٹیانا کی شکل میں قدامت کی روح عرصہ سے حکمراں تھی، ہم مثل مہمانوں کے رہتے تھے۔ نہ صرف ٹاٹیانا بلکہ ملازم، قدیم کنیزیں، فرنیچر اور نقاشی کو دیکھکر میرے دل میں ایک عزت کا احساس اور ایک قسم کا خوف پیدا ہوتا اور میں سمجھتی کہ ہم اس صحبت میں رہنے کے قابل نہیں ہیں اور نیز ہمارا فرض ہے کہ ہم یہاں بہت احتیاط اور ہوشیاری سے رہیں۔

اب ان گذشتہ واقعات پر غور کرتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو واقعی بہت زیادہ بے اطمینانی اور تکلیف ہوئی تھی۔ وہ سخت گیر اور راسخ قواعد اور مکان کے اندر جاسوسوں کا مجمع ہمارے لئے یقیناً موجب پریشانی تھا، لیکن اس وقت اس پابندی سے ہماری محبت استوار ہوگئی۔

اُس نے یا میں نے کبھی کسی طرح اسکو ظاہر نہ ہونے دیا کہ ہم کو کسی چیز سے تکلیف پہنچتی ہے۔ بلکہ اسکے برخلاف اُس نے باوجود اس حقیقت کے کہ یہ باتیں ہم کو ناپسند تھیں استقلال کے ساتھ نظرانداز کردیا تھا۔ تمنکا کا ملازم مٹری، جو تمباکو پینے کا بہت ہی شائق تھا، دوپہر کے کھانے کے بعد روزانہ اُس وقت جبکہ ہم ملاقاتی کمرہ میں ہوتے تھے۔ میرے شوہر کے دار المطالعہ میں جاتا اور اُس کی الماری سے تمباکو نکال لیتا تھا۔ اُس وقت سرجیانی کی وہ حالت قابل دید ہوتی تھی جب وہ ایک بے اندازہ خوشی کی حالت میں دبے پاؤں میرے پاس آتا اور مجھے آگاہ کرنے کے لئے اپنی اُنگلی کو حرکت دے کر اور آنکھ جھپکا کر مٹری کی طرف اشارہ کرتا جسکو کبھی خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ سرجیانی کو کچھ شک ہوگیا ہے۔ اور جب مٹری بغیر ہماری طرف دیکھے ہوئے دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خوش ہوتا ہوا واپس چلا جاتا تو میرا شوہر کہتا "تم بہت خوبصورت ہو" اور میرا بوسہ لے لیتا۔

بعض اوقات اس چشم پوشی، معافی اور صریح لاپروائی سے مجھے تکلیف ہوتی۔ مجھے اس بات کا خیال نہ ہوتا تھا کہ مجھ میں بھی ایسی ہی کمزوریاں موجود ہیں، مگر میں اس کی اس چشم پوشی کو اس کی کمزوری سے تعبیر کرتی تھی۔ میں اپنے دل میں کہتی کہ "وہ مثل ایک ایسے بچہ کے ہے جو اپنی خواہش کے ظاہر کرنے کی جرأت نہیں رکھتا"

ایک بار جب میں نے اُس سے کہا کہ مجھے تمہاری کمزوری پر تعجب ہے تو اُس نے جواب دیا "آہ! میری پیاری!! کیا میرے لئے یہ مناسب ہوسکتا ہے کہ میں کسی پر ناراض ہوں جبکہ میں ہر طرح خوش ہوں؟ میرے لئے یہ بہت آسان ہے کہ میں لوگوں پر سختی کرنے کے بجائے اُن کو اپنی حسب منشا کام کرنے دوں۔ مدت ہوئی کہ میں اس سے مطمئن ہوچکا ہوں اور کوئی بھی ایسی حالت نہیں ہے جس میں خوش رہنا ناممکن ہو۔ دیکھو ہم کسقدر مسرور ہیں۔ میں کسی پر ناراض نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ میرے لئے کسی پر ناراض ہونے کے برابر کوئی دوسری بُری چیز نہیں ہے۔ کیا تم میرا کہنا باور کروگی اگر میں کہوں کہ جب میں دروازہ کی گھنٹی سُنتا ہوں یا کوئی خط پڑھتا ہوں یا عموماً جب میں سوکر اُٹھتا ہوں تو مجھے خوف معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ کوئی تبدیلی پیدا ہوجائے کیونکہ موجودہ حالت کے مقابلہ میں کوئی چیز بہتر نہیں ہوسکتی"

میں نے اُس کے کہنے کا یقین کرلیا۔ لیکن اسکا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہ امر میرے لئے موجب مسرت تھا لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ حالات ایسے ہیں جیسے ہونا چاہئیں اور ان میں کوئی تغیر ممکن نہیں اور ہمیشہ سب آدمیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری جگہ دوسری

قسم کی خوشی ہو جو شاید اس سے مختلف ہو لیکن اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

اس طرح دو ماہ گذر گئے۔ موسم سرما، کہرے اور پالے کے طوفان کے ساتھ آ گیا اور باوجود اس کے کہ ہمارے اندر کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم ہمیشہ کے لئے اپنی گذشتہ حالت پر مراجعت کر رہے۔ وہ اب پہلے کی بہ نسبت اپنے کاموں میں زیادہ مصروف رہنے لگا اور مجھے فراموش کر دیا۔ اور میرا پہلا خیال پھر میرے ذہن میں آ گیا کہ اس کی روح میں ایک خاص دنیا آباد ہے جس میں میں داخل نہیں ہو سکتی۔

اُس کی اس مستقل بُردباری سے مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں اس سے پہلے کی بہ نسبت کم محبت نہ کرتی تھی اور نہ مجھے اس کی محبت سے کچھ کم مسرت ہوتی تھی لیکن میری محبت سکون پذیر اور اُس کی ترقی مسدود ہو چکی تھی اور اب محبت کے علاوہ بے چینی کی ایک نئی کیفیت میرے دل و دماغ پر طاری ہو رہی تھی۔

اس تجربہ کے بعد کہ مجھے اُس سے محبت ہے محبت کا سکون پذیر ہو جانا ناخوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ میں جو چاہتی تھی وہ ہیجان و اضطراب تھا نہ کہ پُرسکون زندگی کی خاموشی، اور بجائے متین خیالات کے میں ذاتی قربانی کو پسند کرتی تھی۔ میرے اندر ایک غیر محدود طاقت تھی جس کے لئے ہماری خاموش زندگی میں بروئے کار آنے کا میدان نہ تھا۔ میں دلگیر اور اُداس رہتی تھی اور اپنی اس حالت کو ایک بُری چیز کی طرح پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی اور مصنوعی ملائمت اور خوشی کا اظہار کرتی تھی جس سے وہ خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

اُس نے مجھ سے پہلے میری دماغی حالت کا اندازہ کر لیا تھا اور تجویز کیا کہ ہم کو شہر میں چلنا چاہیئے۔ مگر میں نے اس سے التجا کی کہ کہیں نہ جاؤ اور اپنے طرزِ زندگی کو تبدیل نہ کرو اور اپنی مسرت کو ضائع نہ ہونے دو۔ دراصل میں خوش و خرم تھی لیکن یہ خیال میرے لئے تکلیف دہ تھا کہ اس عالمِ مسرت میں میرے لئے کوئی محنت اور قربانی کرنے کا موقع نہ تھا۔ حالانکہ میں ہر امکانی محنت برداشت کرنے اور ذاتی قربانی کرنے کے لئے بیچین تھی۔ مجھے اُس سے محبت تھی اور میں دیکھتی تھی کہ میں اس کے لئے سب کچھ ہوں، لیکن میں چاہتی تھی کہ سب لوگ ہماری محبت کو دیکھیں میری خواہش تھی کہ کوئی شے ہماری محبت میں سدِ راہ ہو اور میں پھر بھی اس کی محبت میں بیخود بنی رہوں۔

نہ صرف میرا دماغ بلکہ میرے جذبات بھی سرگرم عمل تھے۔ مگر ان سب سے مقدم ایک دوسرا جذبہ یعنی جذبۂ شباب تھا۔ مجھے جدوجہد کرنے کی آرزو تھی اور ہماری خاموش زندگی میں اس کا امکان نہ تھا۔

خدا جانے اُس نے مجھ سے کیوں کہا تھا کہ ہمیں شہر میں سکونت اختیار کرنا چاہئے جبکہ میری خواہش صرف اسیقدر تھی ؟ اگر وہ مجھ سے ایسا نہ کہتا تو شاید میں سمجھ لیتی کہ جس جذبے سے میں تکلیف اُٹھا رہی ہوں وہ لغو اور فضول ہے اور میں غلطی پر ہوں کیونکہ وہ قربانی کا موقع جس کی میں متلاشی تھی مجھے اپنے اس جذبہ کو دبانے میں حاصل تھا۔

باوجود اس کوشش کے کہ ایسا نہ ہو یہ خیال متواتر پیدا ہوتا گیا کہ شہر میں جا کر اس افسردگی اور دلگیری سے نجات حاصل کرنا میرے اختیار میں ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات نامناسب معلوم ہوتی تھی کہ میں محض اپنی تفریح طبع کے لئے اس کو اُن سب چیزوں سے جدا کر دوں جن سے اُس کو محبت ہے۔

لیکن وقت گذرتا گیا، مکان کی دیواروں پر برف کے تودے جم گئے اور ہم ہمیشہ اور ہمیشہ کے لئے تنہا رہنے لگے۔ تاہم ہمیشہ ایک دوسرے کی نگاہ میں وہی تھے جو پہلے سے تھے، مگر باہر دوسری جگہ روشنی اور زندگی کے دائرہ میں مردوں اور عورتوں کے گروہ تکلیف و راحت کے مزے لے رہے تھے اور ہمارے خیال یا ہمارے حقیر وجود سے بے خبر تھے۔

میرے لئے یہ احساس سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا کہ ہماری زندگی ہر روز ایک منجمد صورت اختیار کرتی جاتی ہے، ہمارے احساسات سرد پڑتے جاتے ہیں اور ایک خاموش و مطمئن طریقہ ہمارا جزو زندگی بن رہا ہے۔ صبح کو ہم خوش رہتے، دوپہر کو مؤدب ہو جاتے اور شام کو ایک دوسرے کے ہمدرد بن جاتے تھے۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ "اس کا خیال جو ہے کہ نیکی کرنا اور قابل احترام زندگی بسر کرنا اچھی بات ہے اور ایسا کرنے کیلئے ہنوز ہمارے پاس وقت ہے، لیکن کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے ہنوز میرے دل میں خواہشات کا دریا موجزن ہے"۔

یہ وہ بات نہ تھی جو میں چاہتی تھی۔ مجھے ایک ہنگامہ کی ضرورت تھی۔ جو کچھ میں چاہتی تھی وہ یہ تھا کہ جذبات زندگی کی رہنمائی کریں نہ کہ زندگی جذبات کی رہبر بنے۔ میں چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ ایک عمیق غار کے کنارے جاؤں اور کہوں "دیکھو میں آگے قدم بڑھاتی ہوں اور میں اس میں کود پڑونگی، دیکھو میں کودتی ہوں اور اپنی ہستی کو برباد کرتی ہوں" اور میری تمنا تھی کہ اس وقت اُس کا چہرہ زرد پڑ جائے اور وہ اپنے مضبوط بازوؤں میں مجھے پکڑ کر اُس غار سے پیچھے ہٹالے حتیٰ کہ میرا جوش دل سرد پڑ جائے اور پھر وہ مجھ کو جہاں چاہے لے جائے۔

ان حالات اور واقعات نے میری صحت پر برا اثر

کیا اور میں کمزور ہونے لگی۔ ایک دن صبح کو میری حالت معمول سے زیادہ خراب تھی۔ وہ اپنے فرائض کو انجام دے کر افسردہ و دلگرفتہ واپس آیا جو ایک غیر معمولی واقعہ تھا میں نے اُس کی افسردگی کو فوراً معلوم کر لیا اور اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے لیکن وہ مجھ سے کچھ کہنا نہ چاہتا تھا اور صرف اسقدر کہا کہ "اس وقت اس کے اظہار کا موقع نہیں ہے اور نہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہے"

مجھے بعد میں معلوم ہوا پولیس انسپکٹر ہمارے کاشتکاروں کے پاس آیا اور میرے شوہر سے گستاخانہ برتاؤ کر کے علاوہ کاشتکاروں سے ایک ناجائز مطالبہ کرنا تھا۔ اُس نے اُن کو ڈرایا دھمکایا۔ میرے شوہر پر اس ناگوار واقعہ کا ابتک اثر باقی تھا۔ وہ مغلوب الغیض ہو رہا تھا اور اس لئے اُس نے مجھ سے اس کا ذکر کرنا پسند نہ کیا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے محض اس واسطے اس واقعہ کو بیان کرنا نہیں چاہتا کہ میں ہنوز اُس کی نظر میں مثل اُس بچے کے ہوں جو اُسکے معاملات میں حصہ نہ لے سکتا ہو۔

میں نے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور اپنی زبان سے کچھ نہ کہا اور ماریا منچنا کو جو ہماری مہمان تھی چائے پینے کیلئے بُلا بھیجا۔ چائے نوشی کے بعد جس کو میں نے بعجلت ختم کیا تھا، ماریا منچنا کو ساتھ لے کر ملاقاتی کمرہ میں چلی گئی اور زور زور سے اِدھر اُدھر کی ایسی بیکار باتیں کرنے لگی جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کمرہ میں آیا اور وقتاً فوقتاً ہماری طرف نظر ڈالتا رہا۔ اس کے بار بار دیکھنے سے میرے دل پر ایسا عجیب اثر ہوا کہ مجھے گفتگو کرنے اور مسرور ہونے کی بہت خواہش ہوئی۔ ہر ایک بات جو میری زبان سے نکلتی یا ماریا منچنا کہتی مجھے ہنسنے پر مجبور کرتی تھی۔ بغیر کچھ کہے ہوئے وہ اپنے دارالمطالعہ میں چلا گیا۔ اور باہر سے دروازہ بھیڑ لیا۔ جیسے ہی وہ ہم سے اتنی دور ہو گیا کہ میری آواز اُس کے کانوں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ میرا جوش مسرت یکایک سرد پڑ گیا جس کا احساس ماریا منچنا کو بھی ہوا اور اُس نے مجھ سے حقیقت حال دریافت کرنے کی خواہش کی۔

میں نے اُس کے سوال کا کچھ جواب نہ دیا، میں صوفے پر بیٹھ گئی اور میرا دل بھر آیا۔

میں نے اپنے دل سے پوچھا "وہ میری اس حرکت کی نسبت کیا خیال کرتا ہوگا، شاید ایک بیکار شے جو اُس کے لئے ضروری معلوم ہوتی ہے لیکن جب وہ مجھ سے کچھ کہیگا تو میں اُس کو بتاؤں گی کہ واقعی یہ محض لغو اور بیکار ہے۔ نہیں، شاید وہ مجھے بیوقوف سمجھتا ہے اور اس لئے خاموش رہکر مجھے ذلیل کرنا اور خود بالاتر رہنا چاہتا ہے لیکن اگرچہ اُس جگہ کوئی دلچسپی نہیں ہے اور مجھے لطف زندگی حاصل کرنے اور اِدھر اُدھر گھومنے کی خواہش ہے۔ تاہم میں

اُسی طرح حق بہ ہوں جس طرح وہ خود ہے۔ میری آرزو ہے کہ ہمیشہ ایک ہی جگہ ہمارا قیام نہ رہے تاکہ مجھے اس بات کا احساس نہ ہو کہ ہمارا وقت کس طرح گذر رہا ہے۔ میں ترقی کرنا چاہتی ہوں اور ہر روز بلکہ ہر گھڑی ایک نیا انقلاب دیکھنے کی متمنی ہوں مگر وہ ایک ہی جگہ خاموشی کے ساتھ دن گذارنا اور مجھے بھی پیچھے روکنا چاہتا ہے۔ اور یہ اس کے لئے بہت آسان ہے کیونکہ شہر میں جانا ضروری نہیں ہے بلکہ خود اُس کو میری ہی طرح ہو جانا چاہئے۔ ظاہردار نہ بننا چاہئے۔ نہ کسی کا سدراہ ہونا چاہئے بلکہ سادگی سے زندگی بسر کرنا چاہئے۔ یہ وہی نصیحت تھی جو اس نے مجھے کی تھی لیکن وہ اس پر عمل نہ کرتا تھا اور یہی بڑی مصیبت تھی۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرا دل اُمڈ رہا ہے اور میں اُس سے ناخوش ہوں۔ جوش دل کی اس نمائش شے میں کانپ اُٹھی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے پاس چلی گئی وہ اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا جب اُس نے میرے پاؤں کی چاپ سُنی تو بے التفاتی اور لاپروائی سے ایک لمحہ کے لئے میری طرف دیکھا اور پھر لکھنے میں ہو گیا۔ اس کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر مجھے ملال ہوا اور میں اُس کے نزدیک جانے کے بجائے اس میز کے کنارے کھڑی ہو گئی جس پر وہ لکھ رہا تھا اور ایک کتاب کھولکر ورق گردانی کرنے لگی۔ ایک مرتبہ پھر وہ لکھتے لکھتے رُک گیا اور میری طرف دیکھکر بولا "دلربا! تم کچھ خفا سی ہو"

میں نے افسردگی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھکر جواب دیا "تم کیوں پوچھتے ہو؟ کیا صرف رازجوئی کیلئے؟"

اُس نے دلکش اور محبت آمیز تبسم کے ساتھ اپنا سر ہلایا مگر اس کے جواب میں فوراً ہی میرے لبوں پر تبسم نہ نمایاں ہوا اور یہ پہلا موقع تھا۔

میں نے دریافت کیا "آج تم کو کیا تکلیف پہنچی ہے تم مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "صرف ایک معمولی بات ہے ایک معمولی ناگوار واقعہ۔ تاہم میں اب تم کو بتا سکتا ہوں۔ دو کاشتکار شہر میں بلائے گئے ہیں ——"

مگر میں نے اُس کو اپنی بات ختم کرنے کا موقع نہیں دیا اور کہا

"جب میں نے چائے کے وقت تم سے دریافت کیا تھا تو تم نے کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"اس لئے کہ شاید میں کوئی ناشائستہ بات نہ کہہ بیٹھوں کیونکہ اُس وقت میں غصہ میں تھا"

"لیکن میں تو اُسی وقت پوچھنا چاہتی تھی"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تم خیال کرتے ہو کہ میں تم کو کوئی مدد نہیں دے سکتی"

اُس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا " یہ کیا بات ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ تمہارے بغیر میری زندگی دشوار ہے۔ تم نہ صرف مجھے ہر کام میں مدد دیتی ہو بلکہ ہر کام تم خود کرتی ہو۔ تم کو ایسا خیال کیونکر پیدا ہوا؟" پھر اُس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا " میں صرف تمہارے لئے زندہ ہوں۔ ہر ایک چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ میں محض تمہاری موجودگی کی وجہ سے خوش وخرم رہتا ہوں کیونکہ تم ضرورت ۔۔۔"

" ہاں میں جانتی ہوں کہ میں مثل ایک محبوب بچہ کے ہوں جس کو خاموش رکھنے کی ضرورت ہے" میں نے یہ ایسے لب ولہجہ میں کہا جس سے وہ پریشان ہو گیا اور دراصل پہلی بار میری دماغی حالت کا اندازہ کر کے اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ میں نے پھر کہا " میں خاموش رہنا نہیں چاہتی، تمہارے پاس کافی سکون موجود ہے جو ہم دونوں کے لئے کافی ہے"

اُس نے میری بات کاٹ کر اور اس خیال سے خوفزدہ ہو کر کہ جو کچھ میرے دل میں ہے میں کہہ ڈالونگی جلد جلد کہنا شروع کیا " اچھا ایک سنو کہ کیا بات ہے اور بتاؤ کہ کس طرح اس کا فیصلہ کر سکتی ہو؟"

اگرچہ مجھے اس واقعہ کو سننے کا بہت اشتیاق تھا مگر میں نے اس کی خودداری کو شکست دینے کی غرض سے کہا " میں اب سننا نہیں چاہتی۔ میں زندگی سے متنفر کرنا پسند نہیں کرتی۔ میں اُسی طرح رہنا چاہتی ہوں جس طرح کہ تم"

اُس کا چہرہ جو ہمیشہ ہر جذبہ سے بہت جلد متاثر ہو جاتا تھا رنج وغم اور متانت کے جذبات کا آئینہ بن گیا۔

میں نے کہا " میں اُسی طرح زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں جس طرح تم لیکن تمہارے ماتحت نہیں ۔۔۔"

مگر اُس کے چہرہ پر کچھ ایسے آثار ملال پیدا ہو گئے کہ میری زبان رُک گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

اُس نے دریافت کیا " بیشک تم میری ہم پلہ ہو۔ ہم دونوں میں فرق مراتب کیا ہے؟ بجز اس کے کہ مجھے پولیس اور رشتہ داروں سے سابقہ پڑتا ہے اور تم کو نہیں"

میں نے جواب دیا " نہیں صرف یہی فرق نہیں ہے"

اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا " خدا کے واسطے میرا مطلب سمجھو۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے لئے متفکر رہنا ہمیشہ تکلیف دہ ہے۔ مجھے زندگی کا کافی تجربہ ہے اور میں اس سے بخوبی واقف ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے اور دراصل اسی لئے میں تم کو پریشانی سے بچانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ میری زندگی صرف تمہاری محبت پر منحصر ہے اور اس لئے تم میری زندگی کو متلاطم نہ بناؤ"

میں نے بغیر اُس کی طرف آنکھ اُٹھائے ہوئے کہا " تم ہمیشہ سچ کہتے ہو"

مجھے اس احساس سے افسوس ہوا کہ اس کی طبیعت پھر صاف و سکون پذیر ہوگئی ہے حالانکہ میرا دل ہنوز پریشان اور رنج و ملال سے پُر تھا اور میں اپنی اس حرکت پر پشیمان تھی۔

اُس نے کہا "دلربا! تم کو یاد ہوگیا ہے ؟ سوال یہ نہیں ہے کہ آیا تم حق پر ہو یا میں بلکہ صورت حال اسکے برخلاف ہے۔ اچھا بتاؤ تم کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟ بغیر سوچے مجھے گفتگو نہ کرو، پہلے اچھی طرح غور کرلو اور پھر مجھکو بتاؤ کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم مجھ سے ناخوش ہو اور یقیناً تمہارے پاس اس کی کوئی معقول وجہ ہوگی لیکن مجھے بھی تو بتاؤ کہ میں کس طرح قابلِ الزام ہوں ؟"

مگر جو کچھ میرے دل میں تھا میں اس کو کس طرح ظاہر کرسکتی تھی اس لئے کہ اُس نے میرے خیالات کا فوراً اندازہ کرلیا تھا؛ میں اُس کے سامنے پھر مثل ایک بچہ کے تھی اور بغیر اُس کی رائے اور مرضی بنی کے کچھ نہ کرسکتی تھی۔ ان سب باتوں نے مجھے اور بھی غضبناک بنادیا۔

میں نے کہا "مجھے تم سے کسی قسم کی شکایت نہیں ہے، البتہ عموماً ہر چیز مجھے تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے اور میں اس کو پسند نہیں کرتی، لیکن تم کہتے ہو کہ ایسا ہی ہونا چاہئے اور اس لئے تم حق بجانب ہو"

میں نے یہ کہا تو مگر اُس کی طرف نظر نہ کی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی، اُس کا سکوت غائب ہوگیا اور تکلیف و خوف کے آثار اُس کے چہرہ پر چھا گئے۔

اُس نے آہستگی کے ساتھ پریشان لہجہ میں کہا "میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ میری بات کا جواب نہ دو بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں اُس کو سنو۔ آخر تم مجھے کیوں ستاتی ہو؟"

لیکن میں نے اس کے سلسلۂ کلام کو منقطع کردیا اور کہا "میں جانتی ہوں کہ تم حق پر ہو۔ بہتر یہ ہے کہ تم کچھ نہ کہو" میں نے پھر کہا "ہاں تم حق پر ہو" گویا بولنے والی میں نہ تھی بلکہ کوئی ناپاک روح میرے اندر بول رہی تھی۔

اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "اگر تم کو معلوم ہوتا کہ تم کیا کررہی ہو ——"

میں نے بے اختیار رونا شروع کیا اور میرا دل کچھ ہلکا ہوا۔ وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔ مگر اپنی زبان سے کچھ نہ کہا۔ مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا، اپنی حالت پر شرمندگی ہوئی۔ میں نے اُس کی طرف نظر نہ کی، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری طرف سرد مہری یا تشویش سے ضرور دیکھ رہا ہے۔ میں نے نگاہ اُٹھائی اُس کی دلکش محبت آمیز نظر میرے چہرہ پر اس طرح جمی ہوئی تھی کہ گویا وہ مجھ سے معافی کا خواستگار ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا:۔

"مجھے معاف کرو۔ مجھے خود معلوم نہ تھا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں"

"ہاں، لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نے کیا کہا اور جو کچھ تم نے کہا سچ کہا"

"میں نے پوچھا "کیا؟"

اُس نے کہا "ہم کو پیٹرسبرگ جانا چاہئے کیونکہ یہاں ہماری دلبستگی کا کوئی سامان نہیں ہے"

میں نے جواب دیا "جیسی تمہاری مرضی"

اُس نے مجھے گلے لگا کر بوسہ دیا اور کہا "مجھے معاف کرو، میں تمہارا گناہگار ہوں"

اُس شام کو میں دیر تک اُس کی خاطر سے باجا بجاتی رہی اور جبتک وہ کمرہ میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا تو منہ ہی منہ میں کچھ کہتا رہا۔ اُس کو گنگنانے کی عادت تھی اور میں اکثر اُس سے پوچھا کرتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ ذرا سے غور کے بعد جو کچھ وہ کہتا ہوتا یا اُس کے مشابہ کوئی بات سُناتا۔ عموماً وہ کوئی شعر پڑھتا اور کبھی کبھی کوئی خوفناک بات کہتا۔ لیکن اس سے مجھے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسکا خیال کیا ہے۔

میں نے اُس سے پوچھا "تم آپ ہی آپ کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا اور تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد مسکرایا اور لرمنتف کا ایک شعر پڑھا جسکا مطلب یہ تھا۔

"وہ بیوقوف ہے جو ہنگامہ آرائی کا خواہشمند ہے اور سمجھتا ہے کہ ہنگامہ میں سکون قلب حاصل ہو جائے گا"

میں نے اپنے دل میں کہا "بیشک، اس کی حیثیت ایک آدمی سے بالاتر ہے، وہ ہر ایک بات جانتا ہے اُس سے محبت نہ کرنا کس طرح ممکن ہے"

میں آگے بڑھی، اُس کا بازو تھام لیا اور اُسکے ساتھ ٹہلنے اور اُس کے برابر چلنے کی کوشش کرنے لگی۔

اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "اچھا"

"ہاں اچھا" میں نے آہستگی سے جواب دیا اور عجیب مسرت اور شادمانی نے ہم کو گھیر لیا۔ ہم لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے پنجوں کے بل، تمام کمروں میں دوڑتے پھرے اور ملاقاتی کمرے میں پہنچکر ٹھہر گئے اور اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ہماری اس حرکت پر گری گوری ناراض ہوا اور طاتیانا کو بھی تعجب ہوا جو استقبالیہ کمرہ میں بیٹھی ہوئی تاش کھیل رہی تھی۔

دو ہفتہ کے بعد کرسمس سے پہلے ہم پیٹرسبرگ پہنچ گئے +

(باقی باقی)

راز چاندپوری

غزل

زینت افزائے نظر جلوۂ رعنائی ہے
محوِ دیدار بھی مصروفِ خود آرائی ہے

خود نہیں تجھ کو خبر کون تماشائی ہے
خود فراموش تری شانِ خود آرائی ہے

کھل گیا غنچۂ دل غنچۂ گل کی صورت
کھلکھلاتی ہوئی گلشن میں بہار آئی ہے

تم تو کیا اب مجھے آتا نہیں اپنا بھی خیال
غفلت آباد مرا عالمِ تنہائی ہے

آہ جب دستِ جنوں سلسلہ جنباں نہ رہا
تو سنا ہم نے کہ گلشن میں بہار آئی ہے

ناصحو نشۂ مے ہے مجھے ہر موجِ شباب
کس طرح آپ میں آؤں کہ بہار آئی ہے

ہو گیا ترکِ تعلق سے اسیرِ خلوت
مجھ کو گھیرے ہوئے ہنگامۂ تنہائی ہے

جلوہ ساقیٔ فطرت کا ہوں دیوانہ میں
ساغرِ بادہ مجھے لالۂ صحرائی ہے

مقتلِ عشق سے بچ کر نہ گیا کوئی ہنر
اور تجھ کو بھی یہاں آج قضا لائی ہے

پورن سنگھ ہنر

تخئیل

دیوانہ و عاشق و سخنور
تخئیل کے سربسر ہیں پیکر

دیوانے کی چشمِ وحشت آگیں
ہے دیکھتی ہر طرف شیاطیں

عاشق، مبتلا جو وہم کا ہے
دیو اس کی نظر میں مہ لقا ہے

حیرت آلودہ چشمِ شاعر
ہے فرش سے تا بہ عرش سائر

تخئیل کے زادگانِ موہوم
لوگوں کی نظر سے جو ہیں معدوم

دیتا ہے انہیں بصد لطافت
شاعر کا قلم کمالِ صورت

اشکال جو نیست ہیں سرِ دست
لیتی ہیں پہن وہ جامۂ ہست

(شکسپیر) محروم

آخری ارمان

مارس لیبلانک کے افسانے جیوش لیمپ کا ترجمہ

(بسلسلۂ گذشتہ)

آفتاب سطح دریا پر تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا۔

کشتی سوار نے اپنی بڑی ٹوپی کا سایہ لیکر مچھلی کا شکار شروع کر دیا تھا۔ اُس کی جاکٹ اور واسکٹ تہ کی ہوئی قریب رکھی تھیں۔ اُس کی ڈوگ اور پر سطح آب پر اِدھر اُدھر ہل رہا تھا۔ اور وہ بہت غور کے ساتھ کھٹکار کو دیکھتا جاتا تھا۔

ایک منٹ گذر گیا..... مگر کیسا منٹ..... جو بلا کی مُہیب وحشت خیز خاموشی سے پُر تھا۔

"اوہ۔ کیا یہ وہی ہے؟" شیرز کے دل میں یہ اذیت دہ خیال پیدا ہوا۔ اور یکایک اُس پر ساری حقیقت واضح ہو گئی۔

"یہ وُہی ہے۔ یقیناً وہی ہے۔ صرف وہی جو اس طرح کسی گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار کئے بغیر میرے سامنے بیٹھ سکتا ہو اور کسی قسم کے خوف و خدشہ سے متاثر نہ ہو۔ علاوہ بریں کتاب کی تصویروں کا حال اُس کے سوا دوسرا کون جان سکتا ہے۔ الائس نے ضرور کسی قاصد کے ذریعہ اُس کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا"۔

یکایک انگریز جاسوس کو محسوس ہوا کہ اُس کے ہاتھ آپ سے آپ پستول کے کُندے کو پکڑ لیا۔ اور معاً اُسکی آنکھیں اُس شخص کی پُشت پر ٹھیک گردن کے نیچے نشانہ لیکر جم گئیں۔ صرف ایک جنبش۔ اور فیصلہ ہے۔ ذرا گھوڑا دبانے کی دیر تھی۔ کہ اس عجیب و غریب انسان کی زندگی کا وہیں خاتمہ ہو جاتا۔

مگر کشتی سوار نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔

شیرز نے خشمگیں انداز سے اپنے پستول کو فیر کرنے کی نیت سے اُٹھا لیا۔ اور قریب تھا۔ کہ فیر کر دے۔ مگر یکایک کسی خیال یا اس فعل کے ارتکاب کی ہیبت نے جس کو وہ دل سے ناپسند کرتا تھا۔ اُسے روک دیا۔ موت یقینی تھی۔ سارا کھیل بگڑ جاتا۔

"اوہ" اُس نے دل میں کہا۔ "اس کو ذرا اُٹھنے دو۔ تاکہ اپنی حفاظت کر لے۔ اگر نہیں۔ تو وہ صرف

اپنی ذاتی بیوقوفی کو الزام دے سکتا ہے۔ میں بری الذمہ ہو جاؤنگا۔۔۔ بس ایک سکنڈ اور۔۔۔ نہیں تو فیر کردونگا۔۔۔۔" عین اُسی وقت قدموں کی چاپ سُنکر اُس نے اپنا سر موڑا۔ اور کیا دیکھتا ہے۔ کہ انسپکٹر گنیمارڈ معہ دوسرے مددگاروں کے آرہا ہے۔

معاً اپنا خیال بدل کر اُس نے جست کی۔ اور ایک ہی چھلانگ میں کشتی کے سکون کو جنبش میں بدلتا ہوا اُس شخص پر جا پڑا۔ اور اُس کو نہایت مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ کشمکش میں۔ دونوں کشتی کی تہ میں گر پڑے۔

"کیا خوب" لوپن نے اپنے کو چھڑانیکی کوشش کرتے ہوئے کہا "اچھا پھر۔ اس دھر پکڑ کا کیا مطلب فرض کیجیے کہ ہم میں سے ایک کسی دوسرے پر حاوی ہو جائے تو کیا فائدہ۔ ابھی ہمیں اتنا معلوم نہیں۔ کہ آپکو میرے ساتھ یا مجکو آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ یہاں ٹھہر کر ہم دونوں بالکل بیوقوفوں کی طرح وقت ضایع کریں گے"

دونوں چپّو پانی میں ڈالدیے گئے۔ کشتی چلنے لگی۔ ساحل پر صدہا لوگوں نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ اس طرف لوپن کہنے لگا:۔

"میری مہربان یہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا آپ نے ہر بات میں عقل سے کام لینا ختم کردیا۔۔۔۔ یہ عمر۔۔۔ اف یہ بیوقوفی کی باتیں۔ لاحول ولاقوۃ۔۔۔۔۔ اے حضرت ۔۔۔۔۔ کچھ ہوش کی دوا کیجیے۔۔۔۔۔۔ آپ کو شرم آنی چاہیئے"

لوپن نے اپنے کو آزاد کرلیا۔

دوبارہ پکڑنے کا ارادہ ترک کرکے پریشانی و غصہ کی حالت میں شیرز نے اپنا ہاتھ جیبوں میں ڈالا۔ اور غصہ میں قسمیں کھانے لگا۔ اسی اثنا میں لوپن اُس کا پستول چھین کر اپنے قبضہ میں کرچکا تھا۔

شیرز نے اپنے گھٹنے خم کردیے۔ اور ایک چپو پکڑ کر کشتی کو کنارے کی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ اور اُس طرف لوپن نے دوسرا چپو لیکر سر توڑ کوشش کی کہ کشتی کو دھار میں گھسیٹ لے جائے۔

"فتح۔۔۔۔ یا شکست۔۔" لوپن نے کہا "بہر حال اس سے کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ کشتی کے چلانے میں زور لگا رہے ہیں۔ تو میں بھی حتی الامکان کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ یہی ہم اور آپ کر سکتے ہیں۔۔۔۔ اس واسطے کہ دور زندگی میں ہم ایک کوشش بلا کسی پس و پیش کے شروع کردیتے ہیں۔۔۔ مگر فیصلہ ہمیشہ قسمت کے ہاتھ ہوتا ہے۔۔۔۔ آپ دیکھتے ہیں۔۔۔ وہی قسمت آج بھی اپنے دیرینہ دوست ارسین لوپن ہی کے حق میں فیصلہ کر رہی ہے۔۔۔۔ فتح۔۔۔۔ پانی کا بہاؤ مجھے

مدد دے رہا ہے ۔ ۔ "

واقعی کشتی کنارے سے دور ہوتی جاتی تھی ۔

" ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھئے تو لیجئے " پولن نے چلاّ کر کہا ۔

کنارے پر کسی شخص نے پستول کا نشانہ لیا ۔

پولن نے فوراً سر جھکا لیا ۔ ایک فیر سُنائی دیا ۔ اُن کے چاروں طرف کا تھوڑا سا پانی اُچھل گیا ۔ پولن نے زور کا قہقہہ لگایا ۔

" خدایا ۔ ۔ ۔ تیری مدد ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہمارا دوست مسٹر گنیمارڈ ہے ۔ او ہو مسٹر گنیمارڈ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھئے آپ سخت غلطی کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ذاتی حفاظت کی ضرورت کے بغیر آپ کو فیر کرنے کا کوئی حق نہیں ۔ کیا غریب آرسین لوپن نے آپ کو اس درجہ غضبناک بنا دیا ہے کہ آپ اپنے فرائض تک بھول گئے ۔ ۔ ۔ ۔ اُف دیکھئے ۔ وہ دوبارہ تیار ہو رہا ہے ۔ لیکن او بدبخت انسان ذرا ہوشیاری سے کہیں میرے دلی دوست شیرز کو نشانۂ ہلاکت نہ بنا دینا " اُس نے شیرز کو اپنے جسم کی آڑ میں چھپا لیا اور کشتی میں کھڑا ہو کر گنیمارڈ کی طرف رُخ کر لیا ۔

" ہاں اب میں مطلق پروا نہیں کرتا ۔ ارے میاں گنیمارڈ ۔ ۔ ۔ ۔ لو ۔ ۔ ۔ یہاں نشانہ لگاؤ ۔ سیدھا میرے دل پر ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا اونچا ۔ ۔ ۔ ۔ بائیں جانب ۔ ۔ ۔ ۔ دوبارہ خطا نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تیری بیوقوفی کی ۔ ۔ ۔ ایک دوسرا فیر اور سہی ۔ ۔ ۔ لیکن حضرت آپ تو کانپ رہے ہیں ۔ اچھا بس ۔ ۔ ۔ ۔ ہوشیار باش ۔ ۔ ۔ میں بالکل تیار ہوں ۔ ۔ ۔ ایک ۔ ۔ ۔ ۔ دو ۔ ۔ ۔ یہ تین ۔ ۔ ۔ "

فیر ہوا ۔ مگر پھر خالی گیا "

" ان سب کو پھینک دو ۔ توڑ ڈالو ۔ ۔ ۔ کیا سرکار آپ لوگوں کو بجائے پستول کے کھلونے پکڑا دیتی ہے "

لوپن نے ایک لانبا وزنی اور چپٹا ریوالور نکالا ۔ اور بلا نشانہ لئے گولی چلا دی ۔

انسپکٹر گنیمارڈ نے اپنا ہاتھ سر کی طرف بغرض حفاظت اُٹھایا ۔ مگر گولی اُن کی ٹوپی میں سوراخ کرتی ہوئی نکل چکی تھی ۔

" مسٹر گنیمارڈ ۔ ۔ ۔ ۔ کہئے ۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ۔ یہ کچھ عمدہ ساخت کا ہے چونکہ یہ ہمارے کرمفرما و شریف دوست مسٹر ہیلاک شیرز کے پستول کی گولی ہے ۔ اس لئے صرف ٹوپی اُڑاتی ہے ۔ اگر میرے پستول کی ہوتی ۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں ۔ آپ کے بھیجے کا پتہ نہ لگتا " اور اُس نے پستول کو گھما کر کنارہ کی طرف پھینک دیا ۔ جو انسپکٹر صاحب کے پیر کی داہنی جانب آکر گرا ۔

شیرز بھی انداز تعریف سے مسکرا دیا۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ سبحان اللہ۔ . . کتنی پیاری زندگی ہے اور کس درجہ خالص و پاک مسرّت ؟ پھر اس سے لطف اندوز ہونے والے کا کیا کہنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خطرناک مواقع ہی اس کو ایک طبعی خوشی پہنچاتے ہیں یا اس عجیب و غریب ہستی کا واحد مقصد صرف یہی ہے کہ خطروں کی تلاش کرے۔ جو اُس کے لئے حصول مسرّت کا ذریعہ ہیں۔

اسی اثنا میں صدہا آدمی دریا کے دونوں کناروں پر جمع ہو گئے . . .

گنیمارڈ اور اُس کے ہمراہی کشتی کا پیچھا کر رہے تھے۔ جو پانی کے بہاؤ کی طرف لہروں کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ یہ امر یقینی تھا کہ یہ گرفتاری سے ہرگز نہ بچ سکتی تھی۔

"مشفق من۔ خیال تو کیجئے" لوپن نے انگریز جاسوس کی طرف مخاطب ہو کر زور سے کہا۔ "کہ اگر اس وقت ٹرانسوال کی کل کانوں کا سونا بھی آپ کے سامنے پیش کیا جائے۔ تو بھی آپ اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے۔ آپ اس وقت پہلی قطار میں ہیں۔ لیکن اوّل اور سب سے پہلے۔ وہ تمہید یا دیباچہ جس کے بعد ہم دونوں سیدھے آخری ایکٹ میں قدم رکھیں گے۔ وہ کیا ہے؟ آرسین لوپن کی گرفتاری یا بچ نکلنا . . . اس لئے عزیز دوست۔ میری آپ سے صرف ایک عرض ہے اور میں پُرزور التجا کرتا ہوں۔ کہ آپ اُس کا جواب ہاں یا نہیں میں دیکر جملہ شکوک کا خاتمہ کر دیجئے . . . میں کہتا ہوں۔ کہ آپ اس چوری کے معاملہ میں دلچسپی لینا چھوڑ دیجئے۔ ہنوز وقت ہے۔ اور میں اب بھی اس قابل ہوں کہ اُن تمام نقصانات سے جو آپ نے کئے ہیں۔ درگذر کروں بعدہٗ میں بالکل مجبور ہو جاؤں گا۔ کہئے۔ آپ راضی ہیں؟"

"نہیں"

لوپن کے چہرہ پر مایوسی چھا گئی۔ یہ ضد اُسکو بہت تکلیف پہنچا رہی تھی۔ اُس نے پھر کہا۔ "میں اصرار کرتا ہوں۔ اپنے لئے نہیں۔ صرف آپکی خاطر . . . اس لئے کہ مجھے یقین کامل ہے۔ کہ اس معاملہ کے آشکار ہونے پر سب سے پہلے شخص آپ ہونگے۔ جو اپنی بیجا دخل اندازی اور حماقت پر دست تاسف ملیں گے۔ ایک بار اور غور کیجئے . . . کہئے . . . ہاں یا نہیں"

"نہیں"

لوپن نے زور سے اپنے پیروں کو پٹکا۔ اور کشتی کے حصّہ زیریں کے تختوں میں سے ایک کو علیحدہ کیا۔ اور چند منٹ تک اُس میں پیر سے کچھ کرتا رہا۔ جس کو شیرز نہیں دیکھ سکا۔ اس کے بعد وہ پھر اُٹھ کر انگریز جاسوس

کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اور یوں گویا ہوا۔

"میں یقین کرتا ہوں۔ کہ میں اور آپ دریا پر ایک ہی غرض سے آئے تھے۔ یعنی اُس چیز کی تلاش میں جس سے برتسن نے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ کیوں حضرت میں صحیح عرض کرتا ہوں نا؟ میں نے اپنے چند دوستوں سے ملنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور یقین جانئے۔ کہ میں نے دریائے سین کے اندر گہرائی میں کچھ دیر سیر کرنے کا پہلے ہی سے تہیہ کر لیا تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اپنے کپڑے علیحدہ کر چکا تھا کہ یکایک میرے دوستوں نے آپ کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ میں حلفیہ عرض کرتا ہوں۔ کہ یہ اطلاع پانے پر مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ آپ کی تفتیش کی کامیابی کی اطلاع اور خبر مجکو ہر لحظہ پہنچتی رہتی تھی۔ اور یہ بہت ہی آسانی کے ساتھ۔ یعنی جوں ہی کوئی بات میرے متعلق روماریلو سے کی گئی۔ اور اُنہوں نے فوراً مجھے مطلع کیا۔ چنانچہ میں تمام و کمال واقف ہوں۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ ان حالات میں۔ ۔ ۔ ۔"

وہ رُک گیا۔ اس طرف وہ تختہ جس کو اُس نے علیحدہ کیا تھا۔ کچھ تھوڑا سا اوپر اُٹھ آیا۔ اور پانی کے قطرات کشتی کے اندر داخل ہونے لگے۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میں نہیں سمجھتا۔ کہ اس کا کیا انتظام کروں۔ ۔ ۔ غالباً یہ بات ہے۔ کہ اس پرانی کشتی کی تہ میں کوئی سوراخ ہو گیا ہے۔ کیوں مشفق من آپ کچھ ہراساں تو نہیں؟"

شیرز نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔ اور لوپن نے اپنا سلسلۂ کلام یوں جاری رکھا۔

"ہاں تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ ان حالات میں یہ جانکر۔ کہ میں جسقدر اس معاملہ کو نظرانداز کرنیکی کوشش کرونگا۔ اُسیقدر زیادہ آپ سختی کے ساتھ مقابلہ کے لئے خواہشمند ہونگے۔ ۔ ۔ میں اس خیال سے خوش تھا کہ میرے آپ کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہر بات میرے قبضہ میں ہے نتیجہ بہرصورت میرے حق میں تھا۔ چنانچہ فطرتاً میری خواہش یہ ہوئی۔ کہ ہم لوگ ایک بھاری مجمع کے سامنے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تاکہ آپ کی شکست علانیہ طور پر ظاہر ہو جائے۔ اور خواہ کومتی ڈی کروزن ہو یا بیرن ڈی ایمبلولی۔ کوئی بھی میرے مقابلہ میں آپکی مدد کا خواستگار نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ اور اُس وقت تمام مجمع میں میرے عزیز دوست کسی کو بھی یہ دیکھنے کی زحمت نہ ہو کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اُس نے خود ہی قطع کلام کر دیا۔ اور اپنے نیم بند ہاتھوں کو دوربین کی طرح آنکھوں پر لگا کر ساحل کی طرف

غور سے دیکھا۔

"خدا کی قسم بھئی واہ۔ اُنہوں نے ایک شاندار کشتی کرایہ پر لی ہے۔ ایک بہت ہی باقاعدہ جنگی کشتی اور اُسے بڑی تیزی سے چلا رہے ہیں.... یقیناً یہ لوگ پانچ منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے اور میری تباہی ناگزیر ہو جائیگی .... مسٹر شیرز مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ اور پھرتی سے ہاتھ پیر باندھ کر مجھے میرے ملکی قانون کے حوالے کر دیں.....

یا پھر کیا یہ موزوں نہیں۔ کہ جبتک ہماری کشتی تباہ ہو۔ اس قلیل عرصہ کو کارآمد بنا لیا جائے۔ اور ہم باہم ایک دوسرے کو آخری وصیت کرلیں۔ فرمائیے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس مرتبہ لوپن کی حرکات شیرز کی سمجھ میں آئیں۔ کہ اُس نے خود کشتی کی تہ میں سوراخ کر دیا تھا۔ پانی برابر بھرتا آ رہا تھا۔ جوتوں کے تلے تو درکنار۔ اب اُن کے پیر بھی ڈوب گئے۔ مگر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

لیجئے۔ پانی ٹخنوں کے اوپر آگیا۔ انگریز جاسوس نے اپنا تمباکو کا ڈبہ نکالا۔ اور ایک سگریٹ تیار کرکے جلائی۔

" لوپن نے کہا۔

"میرے مہربان دوست۔ اس لاحاصل جد وجہد کا مطلب اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ کہ میں آپ کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کا اقرار کر لوں۔ اور یہ گویا آپ سے شکست کھا جانے کے برابر ہے۔ کیونکہ آجتک میں نے صرف اُن مقابلوں کو پسند کیا ہے جس میں میری فتح و کامیابی یقینی ہو۔ اور مجھے میدان میں آکر سامنا کرنے کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑے۔ میں اسکا ضرور قائل ہوں کہ صرف ہلاک شیرز ہی ایک ایسا شخص ہے۔ جس کا مجھے کچھ خیال ہوتا ہے۔ میں معترف ہوں کہ جبتک وہ میرے راستہ سے نہ ہٹ جائے۔ پریشانیاں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ خیر۔ عزیز دوست..... خوش قسمتی سے آج بھی ایک ایسا موقعہ مل گیا۔ کہ میں آپ سے کھُل کر گفتگو کر سکوں.... مگر دیکھئے تو۔ کہنا بھی کیا ہے.... ایک وصیت.....

افسوس تو صرف اسی بات کا ہے کہ گفتگو بھی ہوئی تو کب ..... ہمارے پیر پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں.....

میں خوب جانتا ہوں۔ کہ یہ صورت حال آپ کے شایان شان نہیں۔ مگر..... ارے ہاں۔ تو میں کیا کہہ رہا تھا..... پیر ڈوبے ہوئے..... نہیں..... بلکہ ٹخنے.....؟

واقعی پانی اُس تختہ تک پہنچ چکا تھا۔ جس پر یہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کشتی ڈوبتی جاتی تھی۔

شیرز اپنی سگریٹ منہ میں دبائے اطمینان سے

آسمان کی طرف نظر کئے بیٹھا رہا۔۔۔ خدایا۔۔۔ کیا لوپن کی نظروں میں باوجود ان خطرات میں گھرا ہونے۔۔۔۔ مجمع کا مرکز نظر بننے۔۔۔ اور پولیس کی جماعت کو تعاقب میں پانے پر بھی۔ مذاق کا بحال رکھنا ضروری ہے۔ کیا دنیا میں کوئی شے بھی ایسی نہیں جو اس کو ذرہ برابر اضطراب ظاہر کرنے پر مجبور کر سکے۔

"کیا!۔۔" دونوں کی زبان سے یک بیک نکلا

"کیا لوگ ایسی ذرا ذرا سی باتوں سے گھبرا جایا کرتے ہیں۔۔۔ استغفراللہ۔۔۔ کیا دریا میں غرق ہو جانا روزانہ پیش آنے والی باتیں نہیں۔۔۔ کیا یہ اس قسم کا واقعہ ہے۔۔۔ جس پر اتنا غور مچایا جائے۔۔"

ایک نے بڑبڑانا۔ اور دوسرے نے گنگنانا شروع کیا۔۔۔ یہاں تک کہ دونوں نے اپنی خودداری برقرار رکھنے کے لئے ایک ہی قسم کے پردے نقاب کی آڑ لی۔۔۔ اور وہ کیا۔۔۔ خطرہ سے انتہائی لاپروائی

اب کشتی ڈوبنے میں منٹوں کی دیر رہ گئی۔

"خاص بات" لوپن کہنے لگا "یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا ہم لوگ ان قانونی بہادروں کے آنے سے قبل ڈوبینگے یا بعد میں۔ اسی پر سب کچھ منحصر ہے۔۔ کیونکہ کشتی کی تباہی کا سوال اب قطعی ہے۔ عزیز دوست۔ وہ نازک موقعہ آگیا کہ ہم باہم دگر اپنی اپنی آخری وصیتیں کر لیں۔ میں اپنا کل ذاتی اثاث البیت اور ترکہ سلطنت برطانیہ کے ایک باشندے موسومی ہرلاک شیرز کے نام چھوڑتا ہوں۔ لیکن۔۔۔۔ واللہ۔۔۔ یہ قانونی گرگے کس قدر تیزی سے اس طرف آرہے ہیں۔ واہ بے گدھو۔ تم لوگوں کی طرف دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔۔ کیسے نیچے تلے ہاتھ اٹھ رہے ہیں۔۔۔ آہا! ذرا سرجنٹ فالنفانٹ کو تو دیکھئے۔۔ واہ پٹھے۔ شاباش۔ کیا کہنے۔ خدا کی قسم اس تعاقب کرنے والی کشتی کا خیال ہی دل خوش کن ہے۔ سرجنٹ فالنفانٹ میں اس مرتبہ آپ کے افسروں سے آپ کی سفارش ضرور کر دونگا۔ اور آپ خاطر جمع رکھیں۔ کہ اس مرتبہ ایک تمغہ آپ کو یقیناً مل جائیگا۔۔۔ مگر آپ کے مسٹر ڈیوزی کہاں ہیں۔۔ اچھا شاید بائیں کنارے پر صدہا آدمیوں کے درمیان کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہونگے۔ تاکہ اگر میں کشتی کی تباہی کے بعد بچ نکلوں تو ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاؤں۔ یا اگر دوسری طرف بھاگوں تو اپنے کنارے پر مسٹر گنیمارڈ اور نیولی کے باشندوں میں گھر جاؤں۔۔۔ استغفراللہ۔ کس قدر پوچ باتیں ہیں۔۔"

پانی نے زور کیا۔ کشتی چکر کھانے لگی۔۔۔۔

شیرز نے گھبرا کر کشتی کا کنارہ تھام لیا۔

"عزیز دوست" لوپن نے کہا "میری آخری التماس ہے۔ کہ آپ اپنی جاکٹ اتار ڈالیں۔ اس سے آپکو تیرنے

میں زیادہ آسانی ہوگی۔ کیا آپ ایسا کرنے کے لئے تیار
نہیں . . . . تو لیجئے۔ بندہ بھی اپنی جاکٹ زیب بدن کئے
لیتا ہے "

اُس نے بھی شیرز کی طرح اپنی جاکٹ پہن لی۔
اور ایک آہ بھر کر کہنے لگا۔

"آپ بھی کیا خوب آدمی ہیں . . . کسقدر افسوس
کی بات ہے۔ کہ آپ ایک ایسے معاملہ میں ضد کر رہے
ہیں۔ جس میں آپ کی بہتر سے بہتر کوشش بھی محض بیکار
ثابت ہوگی . . . . در اصل آپ اپنی مشہور قابلیت کو
ضائع کر کے اپنی شہرت پر داغ لگا رہے ہیں "

"موسیو لوپن" آخر کار شیرز نے اپنی خاموشی کو
توڑتے ہوئے جواب دیا " تم بہت ہی زیادہ گفتگو کرتے
ہو۔ اور اسی وجہ سے اکثر اپنی انتہائی رازداری میں غلطیاں
کر جاتے ہو "

" یہ ایک بہت ہی سخت ملامت ہے "

" ایک لمحہ قبل بہ سلسلہ گفتگو تم نے محض لاعلمی میں
مجھے وہ اطلاع بہم پہنچائی۔ جس کا میں متلاشی تھا "

" وہ کیا . . . . آپ کو کچھ معلومات کی ضرورت
تھی۔ مگر آپ نے مجھ سے اس وقت تک ذکر نہیں کیا "

" اب مجھے تمہاری یا کسی شخص کی حاجت نہیں
گھنٹہ کے اندر میں اس معمہ اور پریشان کن معاملہ کا حل

مسٹر اور میڈم ڈی ایمبلو لی کے حوالہ کر دونگا۔ بس یہی میرا
جواب ہے "

اُس نے بمشکل اپنا جملہ ختم کیا تھا۔ کہ کشتی ان
دونوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے نیچے چلی گئی چشم زدن میں
سطح آب پر ابھری اور یکدم لوٹ کر الٹی تیرنے لگی . . . .

دونوں کناروں سے برابر چیخ پکار کی آوازیں
آرہی تھیں۔ لوگ تشویشناک خاموشی کے ساتھ دیکھتے
اور شور و غل مچانے لگتے تھے۔ کہ یکایک تباہ شدہ کشتی کا
ایک آدمی دوبارہ نظر آیا۔

' یہ کون تھا۔ ہمارا انگریز سراغرساں مسٹر شیرز
شیرز ایک عمدہ پیراک تھا۔ وہ نہایت تیزی
سے فاسفائٹ کی کشتی کی طرف بڑھا . . . .

"مبارک مسٹر شیرز" خفیہ کے سرجنٹ نے چلا کر
کہا " اللہ نے بڑا رحم کیا . . . . ذرا بہت ہی احتیاط سے
ساتھ . . . ہم لوگ اس کی فکر بعد میں کریں گے۔ ہمنے
اُس مقام کا خوب صحیح اندازہ کر لیا ہے . . . . بس یہ
کوشش اور . . . مسٹر شیرز . . . لیجئے . . . اسے پکڑیئے . . "

انگریز جاسوس نے اُس رسی کو جسے ان لوگوں نے
پھینکا تھا۔ پکڑ لیا۔ لیکن جس وقت یہ لوگ اُس کو کشتی کی
طرف کھینچ رہے تھے۔ یکایک پشت کی جانب سے
یہ آواز آئی . . . .

"ہاں ۔ میرے عزیز دوست ۔ آپ حل تو ضرور کرلیں گے ۔ مگر میں حیرت میں ہوں ۔ کہ آپ کو اُس کے متعلق اس وقت تک حقیقی علم نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور خدا معلوم اس سے آپ کو کیا نفع ہوگا ۔ یاد رکھئے ۔ ۔ ۔ اُس کے بعد معاملہ بالکل از دست رفتہ ہو جائیگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تباہ شدہ کشتی کے پیندے پر آرام سے بیٹھے ہوئے ۔ جس پر وہ یہ ضروری باتیں کرنے کے لئے چڑھ آیا تھا ۔ آرسین لوپن نے اپنی تقریر سنجیدگی کے ساتھ اس طرح جاری رکھی ۔ گویا وہ سننے والوں پر ایک خاص اثر ڈالنے کی امید رکھتا تھا ۔

"میرے عزیز و کرم فرما دوست ۔ ذرا خیال کیجئے ۔ ۔ ۔ معاملہ کوئی معاملہ بھی تو ہو ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں اللہ کی عنایت سے کوئی خاص راز ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پھر یاد رکھئے ۔ آپ کی رنجیدہ حالت ایک ایسے معزز شخص کی طرح ہوگی ۔ جو ۔ ۔ ۔ ۔"

فالنفانٹ نے اُس کی طرف پستول کا نشانہ لے رہا ۔

"لوپن ۔ خاموش ۔ بس اب مطیع ہو جاؤ"

"سرجنٹ فالنفانٹ ۔ تم ایک کمینہ خصلت انسان ہو ۔ خواہ مخواہ میری بات کاٹ دی ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تو جناب ۔ ۔ ۔ میں کیا کہہ رہا تھا ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"لوپن ۔ خبردار ۔ ہتھیار ڈال دو"

"فالنفانٹ ۔ یہ کیا بک بک لگائی ہے ۔ کیا کوئی بھی شخص جو میری طرح اطمینان سے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہو اور جسے کوئی خطرہ نہ ہو ۔ تمہارے بکواس کرنے سے مطیع ہو سکتا ہے ۔ ارے میاں تم ایک لمحے کے لئے بھی اس خیال کو دل میں جگہ نہ دو ۔ ۔ ۔ ۔ کہ میں ذرہ برابر بھی خطرہ میں ہوں"

"آخری بار ۔ ۔ ۔ ۔ لوپن ۔ ۔ ۔ ۔ میں مطلع کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ مطیع ہو جاؤ ۔ ۔ ۔"

"سرجنٹ فالنفانٹ ۔ تم کہیں مجھے ہلاک تو نہیں کرنا چاہتے ۔ میرا خیال ہے ۔ کہ تم مجھے زخمی کر دینا چاہتے ہو ۔ بھئی واہ ۔ خدا کی قسم ۔ ۔ ۔ تمہیں میرے بچ نکلنے کا اتنا خوف ہے ۔ ہائے ترے بزدل کی ۔ ۔ ۔ اور فرض کرو کہ اتفاق سے زخم کاری لگ جائے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ ۔ کمبخت بھلے آدمی ۔ ۔ ۔ ذرا تو اپنی پیرزن سال اور ضعیفی کا خیال کر ۔ ۔ ۔ ۔"

گولی چلا دی گئی ۔

لوپن لڑکھڑایا ۔ ذرا دیر تک ٹوٹی ہوئی کشتی سے سہارا لینے کی کوشش کی ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ہاتھ چھوٹ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ پانی میں غرق ہو گیا ۔

(۳)

ٹھیک تین بجے کا عمل تھا ۔ جب یہ واقعات رونما

ہوئے اور ٹھیک چھ بجے جیسا کہ اس نے اعلان کیا تھا ہلاک شیرز تنگ پاجامہ . . . چست جاکٹ جو اُس نے تھولی میں سرائے کے منیجر سے عاریتاً لے لی تھی۔ ایک ہلکی ٹوپی . . . فلالین کی قمیص پہنے۔ ہاتھ میں ریشم کی ایک ڈوری اور ایک پُلندہ لئے ہوئے موٹر یلو میں داخل ہوا۔ . . . اور مسٹر و میڈم ڈی ایبلولی کو ملاقات کا پیغام بھیجکر کمرہ میں پہنچا۔

جس وقت یہ دونوں اُس کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ تو اُنہوں نے اُس کو اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے پایا۔ علاوہ بریں وہ اس لباس میں اس درجہ مضحکہ خیز نظر آیا۔ کہ وہ بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکے شیرز متفکرانہ انداز کے ساتھ کمر جھکائے ایک متحرک مشین کی طرح۔ کھڑکی سے دروازہ اور دروازہ سے کھڑکی کی سمت ہر مرتبہ ایک ہی مقررہ رفتار سے قدم اُٹھاتا ہوا ایک ہی مقام سے بار بار لوٹتا ہوا ٹہل رہا تھا۔

وہ رُکا۔ ایک چھوٹا سا پارسل ہاتھ میں لیا۔ اُسکو اچھی طرح دیکھا۔ اور پھر چہل قدمی شروع کردی۔ آخر کار اُن کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے دریافت کیا۔

"کیا میڈ میزل مکان ہی پر ہے"

"جی ہاں۔ باغ میں۔ بچوں کے ساتھ"

"موسیو ریرن۔ چونکہ یہ ہمارے درمیان آخری گفتگو ہے۔ لہذا میری خواہش ہے۔ کہ اس موقع پر میڈ میزل ڈیمن بھی یہاں موجود ہے"

"گویا آپ اب یقیناً . . . ."

"موسیو آپ ذرا صبر کیجئے . . . حقیقت خود واقعات کی تفصیل سے واضح ہو جائیگی۔ جس کو میں آپ لوگوں کے سامنے حتی الامکان بہت ہی صحت کے ساتھ بیان کرونگا . . . ."

میڈم ڈی ایبلولی اُٹھی۔ اور فوراً ہی مس الائس ڈیمن کو اپنے ہمراہ لے کر واپس آ ئی۔ میڈ میزل جو خلاف معمول کچھ زرد نظر آ رہی تھی۔ میز پر جھک کر کھڑی ہو گئی اور اُس نے یہ تک دریافت نہیں کیا۔ کہ آخراً سے وہاں کیوں طلب کیا گیا ہے۔

شیرز نے اس کی آمد پر مطلق توجہ نہ دے کر ایمڈی ایبلولی کی طرف مخاطب ہو کر۔ یکدم اپنا بیان ایسے لہجہ میں شروع کر دیا۔ کہ کسی جواب کی ضرورت ہی نہ پیش آئے

"کئی دن قائم رہنے والی تفتیش کے بعد۔ گو اکثر واقعات کی بناء پر میرے خیالات درمیان میں تبدیل ہو گئے تھے۔ تاہم اُس بات کا جو اوّلاً میرے ذہن میں آئی تھی میں پھر اعادہ کرتا ہوں۔ کہ جھوش لیمپ کی چوری میں ضرور ایسے شخص کا ہاتھ ہے۔ جو اسی مکان میں رہتا ہے . . ."

(باقی باقی)

قیمت سالانہ چھ روپے　　رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴　　قیمت ششماہی ۳ؔ فی پرچہ ۱۰؍

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹرز

محمد اسمٰعیل نعیم

سیّد عابد علی عابد بی۔ اے　　محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۵　　اشاعت ماہِ نومبر ۱۹۲۴ء　　نمبر ۵

تصویر: میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر چھپا اور محمد اسمٰعیل لکھیسر پبلشر و پروپرائیٹر نے دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے چمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

دریا بہ حباب اندر

صفحۂ ادارت

اس ماہ سے ہزارداستان میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئے گی۔ جو ایک لحاظ سے تبدیلی ہے اور ایک لحاظ سے "قصۂ پارینہ" کی تجدید یعنی میرے محترم دوست سید عابد علی صاحب عابد بی اے۔ اور محمد ہادی حسین صاحب قریشی صدیقی ادارت میں میرے رفقائے کار ہیں ہزارداستان کے اس گزشتہ دور کی طرف جو انکی ادارت میں گزر چکا ہے۔ میں کسی قسم کا اشارہ کرنا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں کیونکہ اس دور کے مضامین اور افسانے مقبولیت عام حاصل کر چکے ہیں۔

ہیگل کا فلسفۂ جمالیات اردو ادب میں ایک بالکل نئی چیز ہے۔ مکرمی محمد ہادی حسین صاحب کے معیارِ انتخاب کی رفعت اور حسن تحریر کے متعلق "غم نصیب" ایک بدیہی ثبوت ہے لیکن جس خوبی و خوش اسلوبی سے انہوں نے اس ترجمے کی دقتوں کو سلجھایا ہے۔ وہ مبارکباد کے قابل ہے۔ دعا ہے کہ ان کی وہ کوششیں جو ادب عالیہ کی ترجمانی میں صرف کر رہے ہیں، سرسبز ثابت ہوں۔

"مخبر" کا تصور اسی جوزف کانراڈ جو دور حاضرہ کے انگریز مصنفین میں ایک امتیازی پایہ رکھتا ہے کے ایک افسانے سے اخذ کیا گیا ہے لیکن موضوع کی نشوونما واقعات کی ترتیب اور تکمیل تمامتر عابد صاحب موصوف کے قلم کی مرہون منت ہے۔ اور اس زاویہ نگاہ سے یہ افسانہ انہیں کا کہا جاسکتا ہے۔

"خود فراموش" ایک انگریزی افسانے کا ترجمہ ہے۔ جو انگریزی زبان کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے افسانوں کا کمال یہ ہے کہ ناظر کی کیفیات افراد قصہ کی کیفیات سے بالکل ممتزج ہو جاتی ہیں۔ صرف اسی صورت میں اس بھول بھلیاں کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔ جو ایسے افسانوں کی خصوصیتِ امتیازی ہے۔ جناب تنویر صاحب اس کامیاب ترجمے کے لئے مستحق ستائش ہیں۔

"ضبطِ خواب" کے متعلق جو کچھ جناب خورشید بیگم صاحبہ تنویر نے سپردِ قلم کیا ہے۔ اس سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن ہم ان کی فاضلانہ علمی کاوش اور طریق استدلال کے ربط و ضبط پر مبارکباد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون ان کے آئندہ علمی مضامین کی پہلی قسط ثابت ہوگا۔ اور اس کے بعد ان کے اکثر ایسے ہی مفید مضامین زینت اوراق ہزارداستان ہوا کریں گے۔

"آخری ارمان" کی آخری قسط اس ماہ شائع ہو رہی ہے۔ میں جناب شمیم بلھوری کی خدمت میں اس افسانے کو کامیابی سے انجام تک پہنچانے پر اپنی طرف سے اور ناظرین ہزارداستان کی طرف سے شکریہ پیش کرتا ہوں!

محمد اسمٰعیل نعیم

ہیگل کے فلسفۂ فنونِ لطیفہ کا مقدمہ

ہم اس مضمون میں جمالیات[لہ] سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ یہ موضوع یوں تو عمومی حیثیت میں تمام عالمِ حُسن پر حاوی ہے۔ لیکن اُسے خاص طور پر صنعت اور وہ بھی صنعت کے ایک شعبۂ منفردہ یعنی فنونِ لطیفہ سے تعلق ہے۔

ایک ایسے موضوع کے لئے یونانی زبان کا لفظ استھیٹک جو عام طور پر مستعمل ہے۔ اپنے لُغوی معنوں میں موزون و مناسب نہیں، کیونکہ اُس کے لُغوی معنی جذباتُ احساسات کے علم کے ہیں۔ اس کو اوّل اوّل وُلف اور اُس کے متبعین نے ایک علم کا نام قرار دیا۔ اُنہوں نے ایک نئے علم کو، یا یہ کہنا چاہیے کہ معلوماتِ انسانی کی ایک ایسی صنف کو جو کچھ مُدّت کے بعد فلسفے کی ایک مستقل شاخ کا درجہ حاصل کرنے والی تھی، اس لفظ سے موسوم کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جرمنی میں صنعت کا ایک نفسیاتی معیار قائم تھا یعنی اُس کی اختراعات اُن جذبات و احساسات کے نقطۂ نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ جن کا اُنہیں محرک تصوّر کیا جاتا تھا مثلاً لذّت، تحسین، خوف، ترحّم وغیرہ۔ یہ نام اس قدر دُور از کار اور وسیع المفہوم ہونے کی وجہ سے اس درجہ غیر متعیّن تھا کہ کوئی دوسرا نام وضع کرنے کی ضرورت درپیش ہوئی۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک لفظ کالسٹک رواج بھی پا گیا۔ لیکن یہ بھی کچھ تسلّی بخش نہیں۔ کیونکہ وہ علم جس کو اس سے تعبیر کیا گیا۔ حُسن سے بحیثیت مجموعی تعلق نہیں رکھتا بلکہ صرف اُس کے ایک جزو یعنی صنعتی حسن سے۔ بہرحال ہمیں چونکہ ناموں کے درست یا نادرست استعمال سے براہِ راست کچھ علاقہ نہیں۔ اس لئے ہم عرفِ عام کی سند کو معتبر سمجھ کر جمالیات کے لفظ ہی کو قابلِ قبول فرض کئے لیتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت نفس الامری ذہن نشین کر لینا

لہ جمالیات کا لفظ جو اُردو میں استھیٹک کا مترادف تجویز کیا گیا ہے۔ صحیح مطلب کو ادا نہیں کرتا۔ اور اُسی مغالطے میں مبتلا ہے جس کا ذکر مصنّف نے استھیٹک کے لفظ سے بحث کرتے ہوئے کیا ہے۔ مَیں اُس کے جواز کی وہی دلیل پیش کرتا ہوں جو مُصنّف نے استھیٹک کے حق میں پیش کی ہے۔ (مترجم)

ازبس ضروری ہے۔ کہ ہمارے موضوع کے لئے مناسب لفظ فلسفۂ صنعت بلکہ اُس سے کہیں انسب فلسفۂ فنونِ لطیفہ ہے مندرجہ بالا عبارت حسنِ قدرت کو خارج از بحث قرار دیتی ہے۔ ہمارے موضوع کی یہ تحدید و تعیین غالباً اس اصول پر مبنی تصور کی جائیگی۔ کہ ہر علم کو اپنی حدود قائم کرنے کا مطلق اختیار حاصل ہے۔ ہم یہ واضح کردینا لازمی سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ اس بنا پر جمالیات کے مبحث کو حسنِ صنعت کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے۔ بلکہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں اُس کا دائرہ حقیقت میں صرف حسنِ صنعت کو محیط ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم اپنی روزمرہ میں علی العموم مختلف چیزوں کو حسن وخوبی کی صفت سے موصوف کرتے ہیں مثلاً انسان کے حسن یا پھولوں کی خوبصورتی کا تو ذکر ہی کیا۔ ہم رنگ، آسمان، دریا جیسی چیزوں کے ساتھ حسین اور اُس کے مترادفات کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم فی الحال اس متنازعہ فیہ مسئلہ کے متعلق بحث نہیں چھیڑنا چاہتے کہ ان اشیاء پر حسن کی صفت کا اطلاق کہاں تک جائز ہے۔ یا بالفاظ دیگر حسنِ صنعت کے پہلو بہ پہلو حسنِ قدرت کا وجود تسلیم کرنا کس حد تک قرینِ صحت ہے۔ ان ثانوی مسائل سے قطع نظر کرکے ہم نفسِ مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمارا دعوےٰ ہے کہ صنعتی حسن قدرتی حسن سے اعلےٰ ہے۔ اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ صنعتی حسن کا سرچشمہ وجود نفس ہے۔ اور جس نسبت سے نفس اور اسکی ابداعات و اختراعات قدرت اور اُس کے زوائد و مظاہر سے افضل ہیں۔ اسی نسبت سے صنعتی حسن کو قدرتی حسن پر تفوق حاصل ہے۔ یہانتک کہ ہم ایک اعتبار سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ادنےٰ سے ادنےٰ خیال جو کسی انسان کے ذہن میں وارد ہو سکتا ہے۔ قدرت کی بہترین مخلوق سے زیادہ پایہ رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ خیال چاہے کتنا ہی پست کیوں نہ ہو۔ اُسے ایک وجود مطلق حاصل ہے اور اُس کی ہستی ایک ذہنی ہستی ہے۔ جو موجوداتِ خارجی سے آزاد ہے۔ دوسری حیثیت سے غور کیا جائے تو اس کے برعکس آفتاب ہمیں نظام کائنات کا ایک جزوِ لاینفک معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک خیال اُس کے مقابلہ میں لاشئے محض تاہم فی نفسہٖ آفتاب کی قسم کوئی قدرتی وجود اپنی ہستی کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ نہ اُسے اپنی ذات کا شعور ہے اور نہ وہ اُسے این و آں سے ممتاز بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے جب ہم اشیاء ماسوا کے تعلق میں اُس پر غور کرتے ہیں۔ تو نہ وہ قائم بالذات ثابت ہوتا ہے اور نہ مقصود بالذات، حاصل کلام ہم اُسے حسین نہیں کہہ سکتے بلا توضیح مطلب یہ کہہ دینا کہ نفس اور اسکی تخلیقات قدرت سے اعلےٰ ہیں۔ کسی بات پر بیّن دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ اعلےٰ ایک ایسا لفظ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ گویا حسن قدرت اور حسن صنعت ہماری فضائے تصور میں ایکدوسرے

کے متصل مقام پذیر ہیں۔ اور اُن کے درمیان بُعدِ مکانی کی ایک حدِّ فاصل حائل ہے۔ بالفاظ دیگر وہ ایک ایسا مابہ الامتیاز مقرر کرتا ہے جو مقداری ہے۔ اور اسلئے بالکل خارجی فی الحقیقت جب ہم نفس اور اُس کی تخلیقات کو قدرت سے اعلیٰ کہتے ہیں تو اس سے ہمارا مُدعا اُن کا مقابلہ کرکے اُن کے اختلاف باہم کو نمایاں کرنا نہیں ہوتا۔ کیونکہ نفس لاشریک اور آپ اپنی صفات کا حامل ہے۔ یہ نفس اور صرف نفس کی صفت ہے کہ وہ حقیقت پر قادر اور بجائے خود تمام کائنات و موجودات کا مجموعہ ہے۔ حتےٰ کہ کوئی حسین چیز صرف اُس وقت حقیقی معنوں میں حسین ہو سکتی ہے۔ جب اُس کی تخلیق و تکوین میں عنصرِ اعلیٰ شریک ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو قدرت کا حُسن اُس حُسن کا فقط ایک پرتو ہے جو نفس سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی وہ ایک ناقص اور غیر مکمل شے ہے جس کا جوہرِ اصلی نفس میں موجود ہے۔

مزید برآں، ہم آگے چلکر دیکھیں گے کہ ہم نے جو صرف فنونِ لطیفہ سے سروکار رکھا ہے۔ تو یہ امر فطری ہے۔ کیونکہ اگر ایک طرف متقدمین نے قدرت کی خوبصورتیوں پر بہت کچھ زورِ تقریر و تحریر صرف کیا ہے۔ اور ہم اُن سے بھی زیادہ ان کی نسبت خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں، تو دوسری طرف یہ بات بھی موجود ہے کہ آجتک کسی کے ذہن میں قدرتی اشیا کے حُسن کی تحلیل، تشریح اور اُس کو ایک مستقل علم کا موضوع بنانے کا خیال نہ آیا۔ اس میں کلام نہیں کہ افادہ کا پہلو مختلف صورتوں میں من حیث العلم نمایاں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں، کہ ادویات، یعنی دافع مرض قدرتی چیزوں کا ایک علم مرتب کیا گیا ہے جو جمادات، نباتات، حیوانات اور کیمیاوی پیداوار کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کے برخلاف قدرت کے حُسن کو ضابطہ کے تحت میں لانے کی کوئی مثال ہمیں نظر نہیں آتی۔ قدرتی حسن سے بحث کرنے میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک غیر محدود وسعت میں پاتے ہیں۔ اور کوئی مقررہ کردہ معیار یا اصل الاصول ہمارے لئے دلیلِ راہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حسنِ قدرت کو ایک منضبط علم کا موضوع بنانے کی کوئی کوشش ابتک رونما نہیں ہوئی۔

سطورِ بالا جو قدرت اور صنعت کے حُسن، اُن کے رابطۂ باہمی اور اوّل الذکر کے نفسِ مطلب سے خارج ہونے کے متعلق بطورِ تمہید لکھی گئی ہیں۔ اُن کا مقصد اس بات کو واضح کر دینا ہے کہ ہم نے اپنے موضوع کی تعیین و تخصیص اپنی رضا و رغبت سے نہیں کی۔ ہم سرِدست اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کی کوشش نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ بحث خود ہمارے موضوع کا ایک حصّہ ہے۔ اور اس لئے ہم مقامِ مناسب کے لئے اُسے اٹھا رکھتے ہیں۔

اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہمیں فی الحال صرف

حسن صنعت سے بحث ہے۔ تو یہ تسلیم کرتے ہی ہم تازہ مشکلات سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا فنونِ لطیفہ کو علمی بحث کا مستحق بھی قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس بدیہی امر سے کس کو انکار ہوگا کہ صنعت اور حسن زندگی کے تمام شعبوں میں مسرت کی رُوح رواں بنکر جاری و ساری ہیں کیا ہماری مادّی اور کیا ہماری ذہنی دنیا دونوں پر انہوں نے ایک رنگین پردہ ڈال رکھا ہے۔ وہ ہمیں حقیقت کی تلخی سے تلخ کام نہیں ہونے دیتے، اور حوادث کے ہنگامۂ شور و شر کو خوش آہنگی میں تبدیل کئے ہوتے ہیں۔ اگر وہ ہماری زندگی میں ایک خوشگوار تنوع نہ پیدا کرتے رہتے تو ہمارے لئے جینا وبالِ جان ہو جاتا اور سب سے زیادہ یہ کہ جب کوئی نیک کام ہماری طبیعت کو مصروف رکھنے کے لئے موجود نہیں ہوتا، تو وہ ہمیں اپنی طرف مائل کر کے بدی سے بچا لیتے ہیں۔ یہ سب درست ہے۔ لیکن صنعت کے وہ جاذبِ نظر نقش و نگار جو زندگی کی زینت ہیں۔ غیر مہذب اقوام کی بےڈھب شکلوں اور ناتراشیدہ ہتھیاروں سے لیکر عروجِ تہذیب کی عالیشان عمارتوں تک جن کی ساخت و پرداخت میں انسانی دماغ کی انتہائی قوتیں صرف ہو جاتی ہیں —— ان میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو زندگی کی غایتِ حقیقی کو پورا کر رہی ہو۔ اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ صنعت کی تخلیقات ہمارے مقاصدِ اصلی کے حصول میں مُخل نہیں ہوتیں بلکہ ہمیں بدی سے بچا کر ہمارے لئے تہذیب و تکمیل کا باعث اور حصولِ مُراد کا ذریعہ بنتی ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کا کام صرف اتنا ہے کہ ہمارے نفس کے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچائیں۔ زندگی کی حقیقی غرض و غایت اس کے برخلاف جدّوجہد چاہتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر صنعت کے حسن سے ایک علمی بحث کرنا اور اُسے ایک اہم مسئلہ سمجھ کر اُس میں موشگافیاں کرنا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوہ کندن کاہ برآوردن۔ بہرکیف اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو صنعت ایک تبعی اور غیر ضروری چیز معلوم ہوتی ہے۔ خواہ ہم اس سے بھی قطع نظر کیوں نہ کرلیں کہ حسن کا اشتغال و انہماک ہمارے لئے ذہنی تفریح کا سامان مہیا کر کے ہماری قوتوں کو آرام پسند بنا دیتا ہے۔ اور ہمارے مفادِ عملی کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے۔ اس دعوئے مفروض کی بنا پر کہ حسن ہمارے لئے عشرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ یہ بارہا ضروری خیال کیا گیا ہے کہ زندگی کے لوازمِ عملی اور خاص طور پر اخلاق و مذہب سے اُس کا رابطۂ قریبی دکھا کر اُسکی قدر و قیمت جتائی جائے۔ اور چونکہ یہ قطعاً دلائل و براہین سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ ایک بالکل غیر مضر چیز ہے۔ اس لئے کم از کم اس بات کو قرینِ قیاس ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ عشرت نقصان کی بجائے نفع کے پہلو زیادہ رکھتی ہے اِس

لحاظ سے اہم مقاصد صنعت کی طرف منسوب کئے گئے ہیں اور بعض لوگوں کی رائے میں وہ عقل اور حواس کو ایک رشتۂ ارتباط میں وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اور ضمیر اور نفسانی خواہشات کی مخالف قوتوں کے درمیان جو آپس میں ایک دائمی کشاکش جاری رکھتی ہیں، مصالحت قائم کرکے اُن کے تنازع باہمی کا انسداد کرتی ہے۔ لیکن اسکے برخلاف یہ رائے پیش کی جاسکتی ہے۔ کہ اگر صنعت کے ان مقاصد کا وجود تسلیم بھی کرلیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ بہت اہم اور سنجیدہ ہیں۔ تو اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ عقل یا ضمیر کو صنعت کی وساطت سے کوئی فایدہ پہنچ جاتا ہے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے۔ عقل اور حواس یا ضمیر اور خواہشات کو آپس میں متحد کرنے کی کوشش لاحاصل ہے۔ کیونکہ وہ فی نفس الامر ارتباط و اختلاط کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ہمیشہ اُن خصائص طبیعیہ کو جو ان میں موجود ہیں، برقرار رکھتے ہیں۔

اگر بالفرض صنعت اس کوشش میں کامیاب بھی ہوجائے تو اُس حالت میں بھی وہ علمی مباحث کی کچھ زیادہ مستحق نہیں ثابت ہوسکتی۔ کیونکہ اُس کو اس طرح کوئی ممتاز حیثیت نہیں حاصل ہوتی۔ وہ محض ایک ادنےٰ خادم بن کر رہ جاتی ہے۔ جو اگر ایک طرف اعلےٰ مقاصد کا تابع ہے۔ تو دوسری طرف لہو و لعب اور بیکاری کا حلقہ بگوش بھی ہے۔ نتیجۂ کلام اُسے ایک ایسی چیز کی حیثیت نصیب ہوتی ہے۔ جو بذاتِ خود مقصود نہیں۔ بلکہ کسی دوسری چیز کے حصول میں مفید مطلب ہے۔ یعنی ایک وسیلہ کی حیثیت۔ پھر بلحاظ وسیلہ کے بھی وہ نقص سے مبرا نہیں۔ اُس کا نقص یہ ہے کہ چاہے یہ بھی کیوں نہ مان لیا جائے۔ کہ وہ اعلےٰ مقاصد کے ماتحت عمل کرکے عظیم نتائج پیدا کرتی ہے۔ تاہم اُس کا آلۂ کار فریب آفرینی ہے۔ کیونکہ حُسن کا تو وجود ہی سراسر ظاہر سے تعلق رکھتا ہے۔ صنعت کا یہ آلۂ کار اعتراض کے قابل ہے۔ اس لئے کہ ایک ایسا مقصد جو حقیقی و معنوی ہو فریب کے ذریعے سے نہ پورا کرنا چاہئے۔ اور اگر بامرِ اتفاق کبھی اس طرح کامیابی ہو بھی جائے تو وہ کامیابی بہت محدود ہوگی۔ اور اس استثنائی حالت میں بھی فریب اپنے جواز کی کوئی دلیل نہیں پیش کرسکتا۔ اسباب و وسائل کو مقاصد کی عظمت کے موافق ہونا چاہئے۔ حقیقی و معنوی چیزیں حقیقی و معنوی چیزوں سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ نہ کہ مجاز و باطل سے اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے علم کا کام یہ ہے کہ نفس کے حقیقی مقاصد کا ایسے طریقے سے مطالعہ کرے جو حقائقِ اشیاء کے مطابق ہو۔ اور عرفانِ حقیقت کا اصلی طریقہ ہو۔

مذکورۃ الصدر وجوہ کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جانا ممکن ہے کہ صنعت علمی تحقیق و تدقیق کے قابل نہیں۔ کہا جاسکتا

ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ گذرِ اوقات کا ایک مشغلہ ہے اور اگرچہ اہم مقاصد اُس کی طرف منسوب کئے جا سکتے ہیں تاہم فی نفسہٖ الامر وہ ان کے منافی ہے اور اس سے ان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اعلیٰ سے اعلےٰ حیثیت جو اُسے دی جا سکتی ہے وہ ایک وسیلہ کی ہے۔ جو تفریح کا سامان مہیا کرنے میں بھی مدد و معاون ہے۔ اور اہم مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فریب و تلبیس کے سوا اُس کے پاس نہ کوئی اپنا مدار وجود ہے نہ ذریعہ عمل۔

اس مسئلہ کا ایک اور قرینِ قیاس پہلو یہ بھی ہے کہ چاہے صنعت عمومی طور پر فلسفیانہ تخیلات کی جولانگاہ بن سکے۔ لیکن مخصوص معنوں میں مستقل علمی بحث کے لئے مناسب نہیں۔ حُسنِ صنعت کا تعلق حس و احساس اور وہم و خیال سے ہے۔ قوتِ متفکرہ سے اُسے کچھ نسبت نہیں۔ وہ معقولات سے خطاب نہیں کرتی۔ بلکہ محسوسات سے۔ اس لئے اس کی تخلیقات کا ادراک علمی ذہنیت سے جدا کوئی قوت چاہتا ہے۔ علاوہ بریں صنعتی حسن کے جس خاص وصف سے ہم لذت اندوز ہوتے ہیں وہ اُسکی اختراعی قوت کی آزادی ہے یعنی اُس کا مطالعہ کرتے وقت قواعد و ضوابط کی پابندیاں ہم پر عاید نہیں ہوتیں۔ صنعت کی تخلیقات میں ہم قانون کی سخت گیری اور غور و فکر کی کاوش کی بجائے راحت و نشاط کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اور مجرّد افکار کی مُبہم دُنیا کے مقابلہ میں الوان و اشکال کی روشن دُنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ صنعت کی حسین مخلوقات متخیلہ کی خود مختار فعلیّت کا نتیجہ ہیں۔ وہ خود قدرت سے زیادہ قید و حصر سے بیگانہ ہیں۔ صنعت کے قبضۂ تصرّف میں صرف خارجی دُنیا کی گوناگوں شکلیں ہی نہیں، بلکہ متخیّلہ کی قوت آفرینش اُن سب میں اپنی طرف سے بھی غیر محدود اضافہ کر سکتی ہے۔ جہاں الہامی قوتیں اس قدر مختلف و متعدد شکلوں میں ظہور پذیر ہوں، وہاں تعجب نہیں کہ قوت متفکّرہ عاجز آ جائے۔ اُس کو اتنی جرأت نہ ہوگی کہ اس وسیع و بسیط موضوع پر تنقیدی نظر ڈال سکے۔ اور جزئیات کے اس دفترِ بے پایاں کو اپنے کلیوں کے تحت میں لا سکے۔ (باقی دارد)

محمد ہادی حسین

زور دِ آشکارا ہم نشیں من زار مینالم
دلِ من اے۔ دلِ من۔ زود کارِ من توقف کن
چہ میپرسی چہا لذت نہاں در سوزِ پنہانست

خوشا دردے کہ از ہم راز و از ناصح نہاں باشد
مآلِ دلفریبی اش بہ سِیم تا چساں باشد
چہ خوش باشد اگر مارا حیات جاوداں باشد

(ذوالفقار علی بخاری)

دُنیائے اضطراب

بیتاب کر رہی ہے تمنائے اضطراب
یارب یہ دل ہے یا کوئی دنیائے اضطراب

دل وقفِ غم ہے جان ہے شیدائے اضطراب
مجھ سا بھی کوئی ہو نہ شناسائے اضطراب

گرمِ فغاں ہوں میں یہ تقاضائے اضطراب
ہر آہ مضطرب میں ہے دُنیائے اضطراب

اُن کی نگاہِ شوخ کی گردش نظر میں ہے
میں آج تک ہوں سرخوش صہبائے اضطراب

دل کو دیا ہے عشق نے کیا کیا فریبِ درد
کس حسن سے ہیں مجھ پہ ستم ہائے اضطراب

جب بیخودیٔ عشق میں اپنی خبر نہ ہو
ہم اُن کو کیا دکھائیں تماشائے اضطراب

پھر برقِ حُسنِ یار کی چشمک نظر میں ہے
پھر ہو رہا ہوں محوِ تماشائے اضطراب

فرحتؔ سکوں پذیر نہ ہوں بے قراریاں
اُترے کبھی نہ نشۂ صہبائے اضطراب

فرحت

ہستی

دو دن کی چاندنی ہے کیا اعتبارِ ہستی
توڑ اس طلسمِ غم کو اے غمگسارِ ہستی

تیری خزاں میں پنہاں گلشن کی رونقیں ہیں
کر داغِ دل سے پیدا رنگِ بہارِ ہستی

پھر تو کہاں، کہاں یہ امید کے تقاضے
کیا اعتبار تیرا اے اعتبارِ ہستی

نوکِ سنانِ غم کو دیکھ ایک دن چبھو کر
پنہاں ہے خونِ دل میں جوشِ بہارِ ہستی

بیکار جا رہا ہے کیوں جوشِ اشکباری
کر خونِ دل سے پیدا نقش و نگارِ ہستی

دُنیائے آرزو میں تیرا وجود ہی کیا
نادار کامرانی بے اعتبارِ ہستی

سُرخی ہے یہ سحر کی یا شام کی شفق ہے
قائم رہیگا کب تک رنگِ بہارِ ہستی

ہادیؔ تڑپ کہ تجھ پر یہ راز منکشف ہو
ہے بیقراریوں میں صبر و قرارِ ہستی

ہادی مچھلی شہری

مُخبر

(۱)

بجلی کی شفاف روشنی نے بارانی رات کے تاریک پردے کو یکبارچاک کر دیا۔ اور کمرے کا تمام سامانِ آرائش اس سرعت سے جگمگا اٹھا گویا الف لیلہ کے کسی مہیب دیو نے طلسمی قوتوں سے کام لیکر جس جگہ پہلے کوئی چیز نہ تھی وہاں شاندار اور نفیس سامانِ زینت بہم کر دیا ہو باہر مینہ ابھی تک برس رہا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے بارش کے قطروں سے لدی ہوئی ہوا آرہی تھی۔ اور روح کے عمق تک جمود کا نقش چھوڑتی چلی جارہی تھی۔ بشیر نے جس کی آنکھیں اس خلاف توقع جگمگاہٹ سے چندھیا گئی تھیں کمرے سے ایک فوری جست کر کے نکل جانے کی کوشش کی لیکن تقدیر کی خوفناک گرفت ایک نوعمر حسین عورت کی صورت میں جو شب خوابی کا لباس پہنے ہاتھ میں ایک پستول لئے نالی کی سیدھ اس کی چھاتی کی طرف کئے ہوئے کھڑی تھی۔ اسکی راہِ فرار کو مسدود کر چکی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں اپنے غیر دانشمندانہ رویّے پر اپنے آپ کو ہزاروں صلواتیں دیں لیکن اس حسین آلۂ تقدیر کی خوشگوار آواز نے اُسے موجودہ حالت کا ایک فوری اور تلخ احساس کرنے پر مجبور کیا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لو۔"

بشیر نے اس نوعمر مخاطب کی طرف بہت غور سے دیکھا لیکن اس نے تعمیلِ حکم میں دیر نہیں کی۔ وہ ہاتھ اپنے سر سے بلند کئے ہوئے بظاہر چپ چاپ کھڑا تھا۔ لیکن اس کے اعصاب نہایت شدت سے متہیج ہو رہے تھے بظاہر اس پر سکون طاری تھا۔ لیکن اس کا دماغ ایک عظیم جدوجہد ایک خوفناک کشمکش سے برسرِ پیکار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ وہ اندازہ کر رہا تھا کہ کیا کوئی صورت ایسی ہو سکتی ہے جس میں اس کی رہائی مضمر ہو۔ اپنے نوعمر دشمن کو اس نے نکاہوں ہی نگاہوں میں بھانپنا شروع کیا۔ وہ چوبیس یا پچیس برس کی ایک غیر معمولی حسین عورت تھی۔ عمر کے اس حصّے میں جب دوشیزگی کا سادہ پن تکمیل شباب کی پختہ کار رعنائی کو جگہ دے دیتا ہے۔ بیباک۔ نڈر۔ اس کی آنکھوں سے کسی جذبے کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ اس نے رہائی کی بہتیری تدابیر سوچیں لیکن کوئی اطمینان بخش معلوم نہ ہوئی۔

آخر کار اس نے اپنا آخری ہتھیار استعمال کیا۔

"بیگم صاحبہ کیا آپ مجھے اجازت نہیں دینگی۔ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا عزت کا باعث ہے۔ اور آپ سے باتیں کرنے کا موقع پانا باعث صد افتخار لیکن وقت بہت غیر ہی ہے۔ اور مجھے خوف ہے کہ میری اس وقت کی موجودگی کی کسی طرح تاویل کی جا سکتی ہے۔ آپ کے رشتہ دار شاید آپ کا خاوند کیا کہیگا۔ بیا میں چور معلوم ہوتا ہوں۔ میرے اس کہنے کو خواہ مخواہ رکیک نہ خیال کیجئے گا۔ اس میں مجھے اپنے بچ نکلنے کا اور آپ کی عزت کا دونوں خیال ہیں۔"

جمیلہ بھی مسکرائی۔ "خوب۔ یہ تیر کارگر نہ ہوا۔ دنیا بھر میں میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ میں خود تمہیں پولیس کے حوالے کرونگی لیکن مجھے اعتراف ہے۔ کہ میں اس غیر متوقع آمد کا باعث دریافت کرنے کی ضرور مشتاق ہوں۔ بھلا میرے کمرے میں کونسی چیز ہے۔ جو ایسے دولتمند چور کو ——"

اتنا کہہ کر اس نے بشیر کے نفیس کپڑوں کی طرف چھچھلتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

جو ایسے دولتمند چور کو یہاں لے آئی۔"

"باور کیجئے۔ کہ میں چور نہیں ہوں۔ مجھے یہاں ایک غلطی مکان کو دریافت کرنے میں غلطی لے آئی۔ لیکن مجھے اتنا کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہندوستانی عورتوں میں اتنی جرأت خواہ جھوٹی ہی ہو۔ بہت کم نظر آتی ہے۔ آپ سے باتیں کرنا یقیناً فرحت بخش ہے۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ آپ کی تربیت کن اصولوں کے ماتحت ہوئی ہے۔ یقیناً اس چار دیواری میں نہیں جس کی مفید فضا۔ نشو و نما کے ہر عمل کو فنا کر دینے والی ہے؟"

جمیلہ نے جس کا چہرہ فصاحت و بلاغت کے اس غیر متوقع اظہار پر تدریجاً سرخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اپنے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

"میری تربیت کسی اصول کے ماتحت ہوئی ہو۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ کہ وہ ایسی فضا میں نہیں ہوئی۔ جہاں رہزنی۔ چوری اور گستاخی سکھائی جاتی ہے۔"

پھر اس نے اور زیادہ تیز ہو کر کہا۔

"تم کون ہو۔ یہاں سے کیا لینے آئے تھے؟"

بشیر سنجیدہ ہو گیا

"آپ کے طعنے بجا ہیں۔ آپ باور نہیں کرینگی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ میں چوری کی غرض سے نہیں آیا تھا۔"

"جی ہاں!"

"ہر ایک چور یہی کہتا ہے۔ ایڈیٹر کی اس متعارف سپر کی طرح کہ ایڈیٹر کا نامہ نگاروں کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہر ایک چور کا انکار جرم بھی مشہور عام ہے۔"

بشیر پھر مسکرایا۔

"یقیناً میرے اس خیال کو تقویت ہوتی چلی جا رہی ہے کہ آپ عام ہندوستانی عورتوں سے بہت مختلف ہیں میں سچ کہتا ہوں۔ میں چوری کی غرض سے نہیں آیا تھا۔ اس فقرے کو ہندوستانی پر محمول نہ کیجئے۔ لیکن میری طرف دیکھئے کیا میں ایک چور معلوم ہوتا ہوں۔"

جمیلہ نے کن انکھیوں سے بشیر کی طرف دیکھا۔ سیاہ رنگ کا فراخ کوٹ۔ رومی ٹوپی۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ لباس کے پہننے میں ایک خاص لطافت۔ متبسم چہرہ۔ کشادہ پیشانی۔ شفاف نیلگوں آنکھیں۔ ٹھوڑی کی ساخت ذرا کرخت۔ جس سے مستقل مزاجی کا اظہار ہوتا تھا۔ ناک مڑی ہوئی۔ اس حلیئے کا نوجوان تھا۔ جسے جمیلہ ایک نگاہِ غلط انداز سے بھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ پچھلے چند لمحوں سے محسوس کر رہی تھی۔ کہ یہ شخص کوئی معمولی چور نہیں۔ اس کے انداز سے شرافت نمایاں تھی۔ اور اس کی گفتگو تہذیب کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ جس میں بار بار اعلےٰ تعلیم کی تابناک نزاکت چمک اٹھتی تھی لیکن اس نے اپنی مرضی کے خلاف ایک ظاہری شبہے سے معمور آواز میں کہا۔

"پھر تم یہاں کیوں ہو؟"

بشیر جو جذبات کی اس مدوجزر کو جمیلہ کے چہرے پر ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پڑھ رہا تھا۔ اب زیرلب متبسم ہو کر خاموش ہو گیا۔ جمیلہ جس کو پچھلے چند لمحوں سے ایک مقناطیسی کشش اس اجنبی کی طرف کھینچ رہی تھی۔ بے اختیار ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ بشیر بھی ساتھ کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس نے پھر اپنے الفاظ کو دہرایا۔

"وقت بہت غیر رسمی ہے۔ اور میری موجودگی کی کسی طرح تاویل کی جا سکتی ہے۔ مگر ......"

وہ دونوں خاموش رہے۔ جمیلہ سوچ رہی تھی۔ کہ یہ اجنبی شخص کون تھا۔ جسے تقدیر کشاں کشاں اس کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کے لئے یہاں لے آئی تھی۔ بشیر خدا جانے کن خیالوں میں مستغرق تھا۔ یکایک وہ چونک کر بولا۔ "لیجئے میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ میں کیوں آیا ہوں۔

میں اپنی جان آپ کے ہاتھوں میں دیتا ہوں۔ خدا جانے کیوں۔ لیکن مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ اگر میں آپ کے دل میں اپنے چور نہ ہونے کا کوئی ناقابلِ تردید نقش نہ چھوڑ گیا۔ تو مجھے تمام عمر افسوس رہے گا۔ میں ایک انقلاب پسند جماعت کا رکن ہوں۔ جس کا کام یہ ہے۔ کہ ان تمام سرمایہ داروں کو جو اپنی دولت کی چمکتی ہوئی ٹکلیوں کو غریبوں کے خون سے رنگین کر کے پیدا کرتے ہیں تباہ کر دیا جائے۔ اس جماعت کے تمام رکن اس کام کا بیڑا اٹھائے ہوتے ہیں۔ اس انجمن کا نام انجمن "لالۂ احمر" ہے۔ آپ کے مکان کے ساتھ سیٹھ پنا لال مشہور جوہری کا مکان ہے۔ یہ وہی شخص ہے۔ جس نے غریبوں کو اپنی دولت

کے مکروہ وسائل سے پیس پیس کر روپیہ جمع کیا ہے۔ مجھے انجمن کی طرف سے اس کام پر مامور کیا گیا تھا۔ کہ میں آج اس کے تمام جواہرت کو اپنے جائز قبضے میں لیکر انہیں دریا بُرد کردوں۔ صرف چند جواہرات رکھ لئے جائیں۔ جو غریبوں کی امداد کے لئے شفاخانوں اور یتیم خانوں میں بھیجدئے جائیں۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ جمیلہ کے ذہن سے گویا یہ بات ہی اُتر گئی تھی۔ کہ اجنبی ایک خلاف قانون کام کرنے پر تلا ہُوا ہے۔ وہ ایک نامعلوم طور پر اپنے آپ کو اس کی طرف راغب پاتی تھی۔ اس کا دل جو اب تک جذبات سے عاری تھا۔ اب ایک طوفانی کشتی کی طرح عجب جذبات کے سمندر میں ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ سراسر مغربی خیالات سے مستفید ہوتی رہی تھی۔ اس لئے اس کا زاویہ نگاہ عام عورتوں سے زیادہ وسیع اور عام مردوں سے زیادہ خطرناک تھا۔ کثرتِ مطالعہ نے اس کے دل کو کئی نئے خیالات کا آماجگاہ بنا دیا تھا۔ اس کی طبیعت رسمی قیود کی ہر جنبش۔ وہمی بندشوں کی ہر شق۔ خیالی رسوم کے ہر عنصر سے فطرتاً و جبلتاً نفرت کرتی تھی۔ اور اس کا دماغ ہر اس نقش کو قبول کرنے کے لئے مستعد تھا جس میں غیر معمولی واقعات کی آمیزش ہو جس میں زندگی کی اس فرسودہ روش سے رہائی کی امید ہو جس میں حادثات کے تسلسل کو برباد کرنے کا کوئی شائبہ ہو۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے بشیر کے اس بیان کو سُنکر کسی تعجب کا اظہار نہ کیا۔

جمیلہ کے خیالات کے سلسلے کو بشیر کی آواز نے توڑ دیا۔ وہ بول رہا تھا۔ اور جمیلہ کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا اس کی آواز موسیقی سے لبریز آواز کہیں دُور سنائی دے رہی ہے۔

"بیگم۔ آپ میری سرگزشت سُن چکیں۔ آؤ میں تمہیں اس فضا میں لے جاؤں۔ جہاں آزادی کی رُوح ہے تمہاری طبیعت کے لئے یہ زندگی یقیناً ناقابلِ برداشت ہوگی۔ میں تمہیں وہاں لے جاسکتا ہوں۔ جہاں عمل کی کشاکش ہوگی اور جمود کا نام تک نہ ہوگا۔ حرکت زندگی کا دوسرا نام ہے کیا وجہ ہے۔ کہ تم زندگی کے اس ورق سے آشنا نہ ہو اس جگہ تمہارے خیالات کے لئے کوئی میدان نہیں۔ ہماری انجمن مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن تم میں ایک مخصوص جوہر ہے۔ اور میں کارپردازانِ انجمن کو مجبور کرونگا۔ کہ وہ تم کو ایک رکنِ خصوصی بنالیں۔ ہماری انجمن کے مقاصد تم سُن چکیں۔ کیا مجھے کچھ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت ہے؟"

جمیلہ کچھ پہلے اثر پذیر ہو چکی تھی۔ اس مؤثر تقریر نے اسے اور مائل کر دیا۔ اس نے اپنے آپ کو خیالات کے شفاف پروں پر پرواز کرتے ہُوئے پایا۔ اس فرسودہ زندگی سے بہت دُور حرکت اور ہمّت کے رنگین بادلوں میں......

اُس نے نہایت آہستگی سے کہا۔ "میں تیار ہوں"

یوں ایک رات کو بشیر نے اپنی انجمن میں ایک رکن خصوصی کا قابلِ قدر اضافہ کیا۔

(۲)

وہ سب خاموش تھے۔ انجمن لالۂ احمر کے انتظامی رکن آج ایک نہایت پیچیدہ گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھے ایسا شاذ ہی ہوتا تھا۔ کہ خلافِ معمول انجمن کا کوئی انعقادِ خصوصی مرتب ہو۔ اور آج تو اس کے علاوہ انجمن کے انتظامی ارکین یعنی وہ چار طلسمی شخصیتیں خود موجود تھیں۔ جن کی نسبت عجیب عجیب روایات زبان زد تھیں۔ اگرچہ انجمن کی تمام سرگرمیاں انہی کے مشورے سے انجام پاتی تھیں۔ لیکن انجمن کی مختلف شاخوں نے تو ایک طرف خود انجمن کے افسروں نے بھی ان کی صورتیں نہ دیکھی تھیں۔ یہ چار انجمن کے حواسِ خمسہ تھے لیکن کوئی شخص ان کی حقیقت سے واقف نہ ہو سکتا تھا۔ انجمن کے ہر رکن کو بالواسطہ انہی کے قطعی اور واضح احکام پہنچا کرتے تھے۔ ہر ایک شخص کو کسی نہ کسی وقت ایک پراسرار اور مہیب قوت کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ جس کے تابع فرمان ہر ایک کام بخیر و خوبی انجام تک پہنچتا تھا۔

وہ ایک دوسرے کی طرف سنجیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر جذبات کی شدت یا تموج کا کوئی نشان نہ تھا۔ لیکن اُن کی آنکھوں میں مستقل مزاجی کی ایک چمک تھی۔ جو ان کے متین اور سکون انگیز انداز کو جھلکا رہی تھی۔ ان میں سے ایک جس کا چہرہ نسبتاً دوسروں سے زیادہ کرخت اور ناخوشگوار تھا۔ اور جس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک بے معنی تبسم کھیلا کرتا۔ دوسروں کو مخاطب کر رہا تھا۔

"واقعات ایک نہایت ناخوشگوار صورت اختیار کر رہے ہیں۔ جس دن سے بشیر نے جمیلہ کو انجمن میں داخل کیا ہے۔ اسی دن سے انجمن کو تقریباً ہر کام میں شکست حاصل ہوئی ہے۔ مجھے اس دردناک حقیقت کے اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہر بات میں ہمیں اپنے خلاف ایک مدافعت کا مرتب نظام نظر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی باقاعدہ کوشش اس وقت تک نہیں کی جا سکتی۔ جب تک کوئی شخص اور ایسا شخص جو انجمن کے مجوزہ کاروبار سے بخوبی واقف ہو تمام جزئیات کی تفصیلات کو پولیس کے کان تک نہ پہنچا دیتا ہو۔"

اس کا لہجہ سکون انگیز اور شائستہ تھا لیکن اس کے بین السطور میں ایک تحریک تھی۔ جس سے جمیلہ پر ایک زہریلے شبہے کا الزام رکھنا مقصود تھا۔ ان میں سے دوسرا جو سب میں معمر معلوم ہوتا تھا بولا۔

"منظور۔ تم ہمیشہ اپنے دل کو اس قسم کے باطل توہمات سے زہر یلا کرتے رہتے ہو۔ مجھے جمیلہ پر پورا اعتماد ہے ہر چند

کہ وہ ایک عورت ہے۔ مگر سینے میں کئی مردوں سے زیادہ جری دل رکھتی ہے۔ ...... "

منظور بات کاٹ کر بولا

" اوہ۔ عورت۔ عورت تو کتنی بار تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی ـــــ حامد۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایک عورت کی موجودگی ہمارے لئے یقیناً تباہ کن ثابت ہوگی۔ خدا جانے کس وقت نسوانیت کی خلقی نرم دلی ہمارے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دے۔"

حامد کچھ جواب دینا چاہتا تھا۔ مگر باقی دونوں جواب تک خاموش بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک اشارۂ بے صبری سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ایک زبان ہو کر بولے

" بس۔ بس۔ جمیلہ کا تذکرہ چھوڑو۔ سردست سوال یہ ہے۔ کہ مخبر کون ہے۔ اور وہ کونسے وسائل ہیں۔ جن سے مخبر کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور پھر اُسے سزا دی جاسکتی ہے۔"

یہ بات سُنکر چاروں کے چاروں سنجیدہ ہو گئے۔ بہت سی تجاویز پیش کی گئیں لیکن سب ناقابلِ اطمینان۔ کوئی بہت عجلت پسند تھی کسی میں خطرے کا عنصر زیادہ تھا کسی میں کامیابی کی توقع موہوم تھی۔ کسی میں وسائل ناقابلِ حصول تھے۔ جوں جوں معاملہ بڑھتا گیا ان کے چہرے زیادہ سنجیدہ ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ان کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

اور ان کے ہاتھ مایوسی اور غصّے کے مخلوط جذبات کی آمیزش سے کانپنے لگے۔

حامد جوش میں کھڑا ہو گیا۔

" یہ انجمن کی تمام زندگی میں پہلا موقع ہے کہ اس طرح کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کس پر شُبہ کروں۔ اور کس پر نہ کروں۔ ربِ عزّت کی قسم پیشتر اسکے کہ میرے دل میں تمہاری طرف سے کوئی شبہ پیدا ہو۔ میں اپنے دل کو گوشت کے ایک ناکارہ لوتھڑے کی طرح نکالکر پھینک دینے پر تیار ہوں لیکن پھر بھی ادائیگی رسوم ضروری ہے۔ پیشتر اس کے کہ کوئی تجویز قابلِ عمل سمجھی جاتے۔ آپ سب صاحبان حلف اُٹھائیے کہ جو تجویز قابلِ تجویز سمجھی جائیگی اُس کا ذکر آپ کے محبوب تریں دوست تک بھی نہ پہنچے گا۔ ہماری تمام کامیابی کا انحصار اس تجویز کے راز سربستہ رہنے پر ہے۔ اگر اس تجویز کی جو میں پیش کرنے والا ہوں بھنک بھی اُڑ کر کسی کے کانوں تک پہنچ گئی تو پھر بربادی ہے۔ بربادی۔ کلیتہً بربادی۔ اس لفظ کے ہر معنی میں بربادی۔"

سُننے والوں کے چہرے اور آنکھیں اشتیاق کا انتہائی منظر بن گئیں۔ وہ مستفسرانہ نگاہوں سے حامد کی طرف دیکھنے لگے لیکن حامد نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

" ہاں۔ منظور۔ تو تم حلف اُٹھاتے ہو۔ یاد ہے۔ کہ یہ صرف ظاہری طور پر ایک فرض کی ادائیگی ہے۔"

"ہاں مَیں حلف اُٹھاتا ہوں۔"

"اور تم محمود؟"

"مَیں بھی۔"

اور پیشتر اس کے کہ حامد باقیماندہ رکن کی طرف متوجہ ہو اُس نے خود کُرسی پر سے اُچھل کر کہا۔ "اور مَیں بھی" اس کے بعد خود حامد نے حلف اُٹھایا۔ اور معمول سے زیادہ نرم آواز میں بولا۔ "صاحبان اس تجویز میں خطرہ ہے۔ کیا جو تجویز مَیں پیش کرنے والا ہوں۔ آپ ضرور اس پر عمل کرینگے چاہے آپ کو اس میں اپنی جان جانے کا خوف ہو۔"

منظور بولا۔ اور اس کی آواز جوش سے بھرّائی ہوئی تھی۔ "کیا ہم اس سے پیشتر کبھی ایسے مواقع پر جان چرُاتے رہے ہیں۔ ضروری ہے۔ کہ یہ دھبہ یہ مخبری کے کلنگ کا ٹیکہ جو انجمن کی تمام شفاف رُوح کو داغدار کر رہا ہے۔ ہر ایک قیمت پر دُور کیا جائے۔"

باقی دونوں نے نگاہوں سے اپنے نمایندے کی تائید کی۔ حامد نے سرگوشیوں میں تجویز کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ ان کے چہروں پر تبسّم کے خفیف نشان پیدا ہوئے۔ جنہوں نے آہستہ آہستہ ہنسی کی صورت پکڑی۔ اور آخر کار وہ ہنسی ایک طویل قہقہے میں تبدیل ہوگئی۔

تینوں حامد کی طرف دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ لیکن وُہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ آخر کار مجلس برخاست ہوئی۔ حامد نے جاتے وقت کہا۔

"شب بخیر۔ صاحبان۔ کل رات ممکن ہے ہم نہ مِل سکیں۔ کیونکہ تجویز خطرناک ہے۔ اور وسائل غیر مطمئن۔"

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک کا شائبہ موجود تھا۔ باقی تین اراکین کے لئے حامد جیسے مستقل مزاج شخص کی زبانی ایسی باتیں سُننا ایک نئی بات تھی۔ اُنہوں نے حامد سے خاموشی میں ہاتھ ملائے۔ لیکن ان ہاتھوں کے ملنے میں ایک خاص معنی تھے۔ وہ گویا زبانِ حال سے جتا رہے تھے کہ آج رات کے معاہدے پر ہاتھوں کے اس ملنے نے تصدیق کی مہر ثبت کردی۔ اور یہ کہ اب کچھ بھی ہو لیکن وہ چاروں ساتھ ہی رہینگے اور ساتھ ہی مرینگے۔ انہوں نے جاتے وقت کمرے کی طرف جس کے سامان پر شام کے دھندلکے کے طویل اور مبہم سائے محیط ہو چکے تھے۔ ایک آخری جھلملتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ باہر اندھیری رات تھی لیکن ان کے دلوں میں بہت زیادہ گہرا اندھیرا تھا۔

(۴)

بشیر نے اپنے ہاتھ کی ایک بے نیازانہ حرکت سے شطرنج کے نقشے کو میز پر سے گرا دیا۔ اور اپنے مقابل شاطر پروفیسر رحیم بخش کی طرف دیکھ کر جو بار بار اپنے چشمے کو ناک پر درست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنس رہا تھا۔ ظاہری مایوسی سے کہا۔ "مَیں تم سے کبھی جیت نہیں

سکونگا۔ ہٹاؤ بھی۔"

وہ دونوں ایک وسیع کمرے میں بیٹھے گزشتہ کارپردازیوں میں جو شکست حاصل ہوئی تھی۔ اس کو شطرنج کے تفکر آلود کھیل میں غرق کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کمرے میں دو تین سادہ میزیں پڑی تھیں۔ جن پر کتابوں اور رسالوں کا ایک انبار تھا۔ یہیں ایک میز کے قریب جمیلہ بیٹھی ہوئی مختلف کتابوں کے اوراق کو بے حس انداز سے الٹ پلٹ رہی تھی۔ اس نے ارغوانی رنگ کی ساڑھی اوڑھ رکھی تھی۔ جس پر نہایت نفیس کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ بشیر جمیلہ کی حرکتوں کی طرف غور آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میانہ قد مگر انداز میں ایسی پختہ کار سطوت تھی۔ جس کی وجہ سے چلتے وقت اس کا قد معمول سے زیادہ بلند معلوم ہوتا تھا۔ سنجیدہ شفاف آنکھیں جن میں بجلیاں کوندتی رہتی تھیں۔ صرف آنکھیں ہی جمیلہ کے اعضا میں ایک ایسی چیز تھیں۔ جو اس کے جذبات کی شاہد ہو سکتی تھیں۔ بشیر سوچ رہا تھا کہ وہ آج معمول سے زیادہ غمگین نہیں تو متفکر ضرور معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دبے پاؤں جمیلہ کے پیچھے جا پہنچا۔ اور آہستہ سے کہا۔ "جمیلہ"

وہ خاموش رہی۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کی آنکھیں سامنے خلا میں کسی چیز پر جمی ہوئی ہیں۔

بشیر نے ذرا زیادہ زور سے کہا "جمیلہ"

وہ چونک اٹھی۔ جس طرح کوئی پرندہ کوئی ہیبتناک آواز سن کر چونک اٹھے۔ اس نے مڑ کر بشیر کی طرف دیکھا۔ اور اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ تھوڑا عرصہ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اور جو باتیں الفاظ کبھی ادا نہیں کر سکتے۔ نگاہوں نے اشاروں میں ادا کر دیں۔

آخر جمیلہ بولی۔ "بشیر آج میرا دل دھڑک رہا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ گویا بہت جلد ہم پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ جس طرح ایک عورت کا ذکی حس ادراک بات کی تہ کو پہنچنے میں جلدی کرتا ہے اسی طرح میرے دماغ میں کسی آنے والے خطرے کے متعلق ایک مبہم سا نقش موجود ہے۔ جو ہر لحظہ روشن تر ہوتا چلا جا رہا ہے"

بشیر نے جمیلہ کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے از راہ مذاق کہا۔ "ہاں۔ تاریخ اپنے آپ کو دُھرا رہی ہے۔ ایک عورت کی قوتِ مدرکہ مبہم اشیاء کا احساس کر رہی ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے ہنس کر جمیلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور سنجیدگی سے کہا۔

"جب تک میری محبت۔ میری روح تمہیں احاطہ کئے ہوئے ہے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا"

جمیلہ نے بشیر کی طرف ایک خاص ادا سے دیکھا۔ اسی طرح جس طرح چند مخصوص موقعوں پر صرف ایک

محبت کرنے والی عورت دیکھ سکتی ہے۔

وہ مسکرانے لگی لیکن بہت جلد اس کا چہرہ پھر مکدر ہوگیا

"پچھلے چند دنوں سے ہمیں ہر معاملے میں شکست ہوتی رہی ہے۔ ضرور ہم میں سے کوئی مخبری کرتا ہے مجھے خوف ہے کہ پولیس ہمارے تعاقب میں نہ ہو۔"

بشیر کا چہرہ فق ہوگیا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں لیکن اس نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔

"ہم میں سے مخبر کون ہو سکتا ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ہمیں شکست ہوتی رہی۔"

جمیلہ نے کہا۔ "نہیں۔ کوئی آواز میرے دل میں کہہ رہی ہے کہ یہ ایک مخبر کا کام ہے۔ یہ ایک مخبر کا کام ہے۔"

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔"

"کیا تین دفعہ مسلسل ہماری تجاویز کا کھل جانا وہم ہے۔ کیا تینوں دفعہ ہمارے اراکین کا گرفتاری سے بال بال بچ جانا وہم ہے۔"

بشیر خاموش رہا۔ پروفیسر رحیم بخش جو اب تک بظاہر ایک کتاب میں غرق تھا۔ اپنے چشمے کو ناک پر اچھی طرح جماتے ہوئے بولا۔

"بشیر مجھے نیچے کی منزل سے پاؤں کی چاپ کی آواز آتی ہے۔ کیا تمہیں بھی کچھ سنائی دیتا ہے۔"

وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کھڑکی کے قریب کان لگا کر سننے لگا۔ بشیر اور جمیلہ دونوں پروفیسر کے قریب آ گئے۔ ان کے بدن کے تمام اعصاب اس وقت ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔ یکایک دروازہ کھلا۔ اور پولیس کے چار آدمی جن کی حراست میں انجمن کی اس خاص شاخ کے باقی تین اراکین تھے۔ ہاتھوں میں پستول لئے ہوئے داخل ہوئے رحیم بخش نے کھڑکی کی راہ سے کودنے کی کوشش کی مگر ناکام۔ اسے ایک مضبوط آہنی گرفت نے جکڑ رکھا تھا۔ جمیلہ نہایت سکون سے بشیر کے ہاتھ میں ہاتھ دئے کھڑی تھی۔ پولیس کے آدمیوں میں سے ایک نے رحیم بخش کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اور پھر بشیر کی طرف بڑھا۔ بشیر پولیس کے آنے پر ہی نہایت مضطرب ہوگیا تھا۔ لیکن اب اس کی پریشانی ناقابلِ بیان تھی۔ اسکے چہرے پر اضطراب کی انتہائی علامات موجود تھیں۔ جو شخص اسے گرفتار کرنے آگے بڑھا تھا بشیر نے اس سے کہا۔

"میں تمہارے افسر سے دو تین باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

سپاہی نے ہتھکڑی نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"باتیں بعد میں کیجئے گا۔"

لیکن بشیر خود تحکمانہ انداز میں ان کے افسر کی طرف بڑھا۔ اور کہا۔

"میں مخبر ہوں۔ مجھے حکومت کی طرف سے اپنی اور اس خاتون کی رہائی کا وعدہ مل چکا ہے۔"

بشیر کے یہ الفاظ گویا بجلی کی طرح تمام موجودہ اشخاص کو بے حس و حرکت کر گئے۔ اراکین اس کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اگر نگاہوں میں مار ڈالنے کی قوت ہوتی تو بشیر اس وقت تک صد ہزار بار مر چکا ہوتا۔ رحیم بخش نے اپنے آپ کو حراست سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اور بشیر کی طرف لپکا۔ لیکن انسپکٹر نے اسے نہایت تندی سے روکا اور کہا۔

"ہمیں اس قسم کی ہدایات مل چکی ہیں۔"

بشیر اب واپس جمیلہ کی طرف لوٹا۔ وہ ایک بت کی طرح ساکن و جامد کھڑی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے حقارت کی ایک آتشیں رو جاری تھی۔ جو بشیر کی روح کو خاک سیاہ کئے ڈالتی تھی۔ بشیر۔ ایک مخبر۔ مخبر۔ مخبر۔ یہ لفظ انگاروں کی طرح اس کے دماغ میں گڑتا چلا جا رہا تھا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا کسی شخص نے جلتے لوہے سے اس کی پیشانی کو داغ دیا ہو۔ بشیر نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔ لیکن جمیلہ نے نہایت تیزی سے اسے پرے ہٹا دیا۔ وہ اب ٹوٹے پھوٹے جملوں میں کہہ رہا تھا۔ "جمیلہ۔ جمیلہ۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا میری محبت اس بات پر غالب نہیں آسکتی۔ بولو۔ کچھ تو کہو۔ کیا تمہارے منہ میں میرے لئے زبان نہیں رہی۔ ہم دونوں چلے جائینگے۔ اس ملعون جگہ سے چلے جائینگے آئندہ زندگی اطمینان سے کسی نئی دنیا میں گزار دینگے۔"

جمیلہ نے منہ پھیر لیا۔

بشیر نے ایک اور آخری کوشش کی۔ "جمیلہ۔ کیا تمہارے دل میں میری ذرا محبت نہیں۔ دیکھو۔ یہ آخری موقع ہے۔ نام نہاد عزت پر اپنی تمام زندگی کو قربان نہ کرو۔"

لیکن جمیلہ نے اسے ہاتھ کے ایک شاہانہ اشارے سے روک دیا۔ جمیلہ کی نگاہوں نے اسے ساکت کر دیا۔ وہ اپنے سر کو جھکاتے ہوئے کھڑا تھا۔ اور اس کے کان میں انسپکٹر کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"آخر ہمیں مخبر کا پتہ چل گیا۔ احمد کا خیال درست تھا۔ مخبر نے خود اپنے منہ سے اپنے جرم کا اقبال کر لیا بیوقوف ہم چاروں انجمن کے انتظامی رکن ہیں۔"

بشیر پر گزشتہ چند لمحوں میں ایسی حالت طاری ہو چکی تھی کہ وہ کسی بات کو سنکر متعجب نہ ہوا۔ پروفیسر رحیم بخش اور باقی اراکین کے ہاتھ سے ہتھکڑیاں اتار دی گئیں۔ وہ تمام حیرت سے اپنے افسروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں اس تجویز کے سوچنے والے کی تعریف کر رہے تھے۔ اوہ۔ پولیس بنکر مخبر کا حال دریافت کرنا کیسی مزیدار بات ہے۔

چند لمحے وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ انکے افعال کی قوت کو پے در پے جذبات کی شدت نے عارضی طور پر تباہ کر دیا تھا۔ لیکن اب پیشتر اس کے کہ کوئی شخص ہاتھ اُٹھا سکے۔ رحیم بخش کہیں سے ایک خنجر نکال کر بشیر کی طرف جھپٹا۔ اور چشم زدن میں اس نے ہاتھ بڑھایا۔ مگر جمیلہ فوراً بیچ میں آگئی۔ اور خنجر بشیر کی چھاتی کے بجائے جمیلہ کی چھاتی میں پیوست ہوگیا۔ سُرخ گرم خون کی ایک دھار نکلی۔ اور جمیلہ بغیر کسی آواز کے ایک مُرجھائے ہُوئے پھُول کی طرح خزاں کے تیز و تند جھونکوں کی تاب نہ لاسکتا ہو زمین پر گر پڑی۔ تمام اراکین نم آلود نگاہوں سے اس منظر کی طرف دیکھنے لگے۔

معصوم جمیلہ کا خون انجمن کی شفاف اور بے داغ رُوح سے مخبری کے داغ کو دھو رہا تھا۔ ہاں وہی جمیلہ جو بشیر کے ساتھ جانے سے انکار کرتی تھی۔ وقت پر محبوب کے لئے قربان ہوگئی۔ جس وقت باقی لوگوں کے ہوش درست ہوتے بشیر جا چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد انجمن کی کوئی تجویز ظاہر نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی انتظامی اراکین بیٹھ کر سوچا کرتے ہیں کہ بشیر کہاں گیا۔ غالباً وہ کسی نئی دُنیا میں موت سے زیادہ بدتر زندگی گزار رہا ہوگا یا شاید موت ہی کے رحمدل ہاتھوں نے اسے اپنے دامنِ عاطفت میں سمیٹ لیا ہو۔

عابد

صعودِ رُوح

نوا تے درد سے معمور ہے سرا آہنگ
تلاش کر نہ مسرت مرے فسانوں میں

شکستِ رُوح سے جب ٹوٹ جائے سازِ حیات
تو جان آئے کہاں سے شکستہ جانوں میں

قریب ختم ہے سوز و گداز کا قصّہ
ہے لطفِ آخرِ شب میری داستانوں میں

خراب صبح ہیں آثار میری محفل کے
مثالِ ہوش ہوں کچھ دم کے مہمانوں میں

یہ مشتِ خاک ہے پھر طالبِ صعود و عروج
الٰہی کوئی زمیں بھی ہے آسمانوں میں

مجھے بھی اب تو نیا کوئی جرعۂ تخلیق
خمارِ زیست سے میں بھی ہوں سرگرانوں میں

ملا کے خاک میں پھر گل طراز کر مجھ کو
نیاز مند ہوں، مغرورِ ناز کر مجھ کو

سیماب

رودادِ محبت

مصنفہ ٹالسٹائی — حصہ دوم — مترجمہ راز چاند پوری

دوسرا باب

ہمارا پیٹرسبرگ کا سفر، ماسکو میں ہمارا ہفتہ بھر کا قیام، اس کے اور میرے رشتہ دار، ہمارا نئے مکان میں رہنے کا انتظام کرنا، سڑکیں، عجیب شہر اور مختلف صورتیں غرض سب کچھ مثل ایک خواب کے گزر گیا۔ یہ تمام چیزیں اس کی دور اندیشی اور اس کی محبت کی وجہ سے اس قدر مختلف الوضع، ایسی نئی اور خوشگوار، ایسی دلکش اور فرحت بخش تھیں کہ ان کے مقابلہ میں دیہات کی ساکت و صامت زندگی ہیچ معلوم ہوتی تھی۔

مجھے کسقدر تعجب ہوا جب دنیاوی فخر و مباہات اور بے پروائی کے بجائے جس کی سوسائٹی میں ملنے کی ہمیں امید تھی۔ سب لوگ (نہ صرف میرے رشتہ دار بلکہ اجنبی بھی) مجھ سے ایسی سچی محبت اور خلوص سے ملے کہ گویا وہ سب میرا ہی خیال کر رہے تھے۔ اور اپنی مسرت کی تکمیل کے لئے صرف میری آمد کے منتظر تھے۔ بالکل خلاف امید میرے شوہر کو بھی اس حلقہ شناسائی میں چند آشنا مل گئے۔ یہ لوگ سب سے بہتر معلوم ہوتے تھے۔ اس نے مجھ سے ان کا ذکر کبھی نہ کیا تھا۔ اور اکثر اوقات جب وہ ان اشخاص کے خلاف کسی رائے کا اظہار کرتا جو مجھے نیک معلوم ہوتے تھے۔ مجھے تعجب ہوتا اور میں اس کو ناپسند کرتی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ انسے کیوں اسقدر رکھائی سے پیش آتا ہے۔ اور ان دوستوں سے الگ رہنے کی کیوں کوشش کرتا ہے۔ جن کو میں پسند کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ نیک لوگوں کے ساتھ جسقدر تعلقات بڑھ سکیں۔ اسی قدر بہتر ہے۔ اور وہ سب نیکدل آدمی تھے۔

دیہات کو خیرباد کہنے سے پہلے اس نے کہا تھا "دیکھو تم جانتی ہو کہ ہم کس طرح یہاں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ یہاں پر ہم بالکل تنہائی کی زندگی بسر نہیں کرتے۔ لیکن وہاں ہم دولت سے بہت دور ہونگے۔ اور اس لئے ہم کو پیٹرسبرگ شہر میں قیام کرنا چاہیئے۔ مگر یہاں کی سوسائٹی میں شریک نہ ہونا چاہیئے ورنہ ہم مصیبت میں مبتلا ہو جائینگے۔ ہاں تمہاری خاطر سے مجھے ایسی خواہش ——"

میں نے پوچھا "ہم سوسائٹی میں کیوں شریک نہ ہوں؟

م کو صرف تھیٹر میں جانا، اپنے اعزا سے ملنا، تماشہ گاہوں ں جاکر دل بہلانا اور خوشگوار نغمے سننا چاہتیں اور ہم بسٹر سے بہت پہلے دیہات واپس آجاتیں گے۔

لیکن جیسے ہی ہم پیٹرسبرگ پہنچے یہ تمام تجاویز فراموش و گئیں۔ یکایک میں نے اپنے آپ کو ایک ایسی نئی دنیا میں یا۔ مجھے اسقدر نئی نئی مسرتیں حاصل ہوئیں اور ایسی نوبہ نو چسپیاں رونما ہوئیں کہ فوراً گذشتہ زمانے اور تمام تجاویز کا یال، اس حالتِ بے خبری میں بالکل جاتا رہا۔

میں نے اپنے دل میں کہا: "وہ سب باتیں فضول ھیں، میں ابھی تک لطف زندگی سے ناآشنا تھی۔ یہ حقیقی ندگی ہے۔ وہاں ہمارے واسطے اور کیا رکھا ہے!"

وہ پریشانی و افسردگی جو دیہات میں مجھے ستاتی رہتی ی۔ یکبارگی پورے طور پر مثل سحر کے غائب ہوگئی۔ اپنی ئی زندگی کے ساتھ مجھے جو محبت تھی اُس میں سکون پیدا و گیا۔ اور اب یہ خیال کہ یہ محبت کم ہوتی جاتی ہے کبھی میرے ل میں پیدا نہ ہوا۔ ہاں مجھے اس کی محبت پر شبہ نہ ہو سکا۔ یرے ہر خیال کو وہ فوراً سمجھ لیتا۔ میرے ہر جذبہ کو وہ معلوم لیتا اور میری ہر خواہش کو پورا کر دیتا تھا۔ اس کی غیر معمولی ہ جسی اب جاتی رہی تھی۔ یا کم از کم اب وہ میرے لئے تکلیف دہ رہی تھی۔

علاوہ ازیں مجھے اس کا احساس تھا کہ پہلے سے زیادہ اب وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اکثر کسی نئے ملاقاتی کے یہاں جانے یا اپنے مکان پر دوسروں سے ملنے کے بعد جب کہ میں میزبانی کے فرائض انجام دیتی اور دل ہی دل میں کسی فروگذاشت کے ہونے سے ڈرتی رہتی تو وہ مجھ سے کہتا۔

"میری پیاری! تم پریشان نہ ہو۔ یقیناً تم نے خوب مہمان نوازی کی۔"

میں بہت خوش و خرم تھی۔ ہمارے پیٹرسبرگ پہنچنے کے بعد فوراً ہی اُس نے اپنی والدہ کو خط لکھا۔ جب اُس نے مجھے بلایا۔ کہ میں بھی اپنی جانب سے کچھ لکھ دوں تو وہ اس پر تیار نہ ہوا۔ کہ میں اس خط کو پڑھ لوں۔ اور معلوم کر لوں کہ اُس نے کیا لکھا ہے۔ مگر بعد میں میں نے وہی کیا جو میں چاہتی تھی۔ میں نے اس خط کو پڑھ لیا۔

اُس نے لکھا تھا: "تم دلربا سے واقف نہیں ہو۔ اور میں خود بھی اس سے بہت کم واقف ہوں۔ خدا جانے اُس نے یہ نیک مزاجی، حلم و بردباری، خوش خلقی، ذہانت و ذکاوت اور حسن کہاں سے حاصل کیا ہے؟ یہ سب باتیں تکلف سے بری اور لطف آمیز ہیں۔ ہر شخص کے دل میں اس کی جگہ ہے حتیٰ کہ اگر مجھ کو خود بھی اُس سے محبت کرنے کا زیادہ موقع ملتا تو میں اس کی محبت کا حق ادا نہ کر سکتا۔"

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اوہو! میں ایسی ہوں کیا واقعی میں ایسی ہی ہوں؟" مجھے بے حد مسرت حاصل

ہوئی اور یہ بھی محسوس ہوا کہ میں پہلے سے زیادہ اب اس سے محبت کرتی ہوں۔ بالکل خلاف امید تمام شناساؤں سے رشتہ اتحاد قائم ہوگیا تھا۔ میرے کانوں میں ہر طرف سے یہی صدا آئی تھی کہ فلاں چچا مجھ سے بہت خوش ہیں۔ اور فلاں پھوپھی مجھ سے بے حد محبت رکھتی ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ پیٹرسبرگ میں میرے مثل کوئی دوسری عورت نہیں ہے۔ ایک اور شخص نے مجھ سے کہا کہ یہ بات میرے اختیار میں ہے۔ کہ میں سوسائٹی میں بہترین عورت بن سکوں اس کے علاوہ میرے شوہر کی چچازاد بہن شہزادی ڈی نے جو ایک دیرینہ مجلس نشیں عورت تھی۔ اور اتفاقیہ طور پر بہت زیادہ میری دلدادہ بن گئی تھی۔ مجھ سے بہت ہی چاپلوسی کی باتیں کیں۔ جن کو سنکر میں مغرور بن گئی۔ جب اس نے سب سے پہلے مجھے محفل رقص میں چلنے کی دعوت دی اور میں نے اپنے شوہر سے وہاں جانے کی اجازت مانگی تو وہ میری طرف مخاطب ہوا اور فریب آمیز تبسم کے ساتھ مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا تم جانا چاہتی ہو؟" میں نے اظہار رضامندی کے لئے اپنا سر ہلایا۔ اور مجھے محسوس ہوا۔ کہ میرا چہرہ سرخ ہوگیا ہے۔

اس نے خوش مزاجی سے قہقہہ مار کر کہا۔ "گنہگار! اپنی خواہش کا اقرار کرتی ہے۔"

میں نے متبسم ہو کر اجازت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیوں؟ تم نے تو کہا تھا کہ سوسائٹی میں شریک ہونا ناممکن ہوگا۔ اور اس کی شرکت تم کو پسند نہیں ہے۔"

اس نے کہا۔ "اگر تمکو وہاں جانے کی ایسی ہی خواہش ہے تو ہم چلیں گے۔"

"بہتر ہے۔ اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے"

اس نے پھر پوچھا۔ "کیا تم واقعی وہاں جانا چاہتی ہو۔ اور تم وہاں جانے کی بہت مشتاق ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے کہا "سوسائٹی بذاتہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے لیکن دنیا کی ناقابل حصول تمنائیں ضرور بری اور ناپسندیدہ ہیں" اور بالآخر اس نے زور دیکر کہا۔ "یقیناً ہم کو وہاں جانا چاہئے۔ اور ہم ضرور چلینگے۔"

میں نے کہا۔ "سچ تو یہ ہے۔ کہ دنیا میں مجھے کسی اور شئے کی اسقدر آرزو نہیں ہے۔ جسقدر اس محفل رقص میں جانیکی"۔

ہم وہاں گئے۔ اور امید سے زیادہ مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ محفل رقص میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہمیشہ سے زیادہ میں ایک مرکز ہوں۔ اور ہر شئے میرے چاروں طرف گردش کر رہی ہے۔ گویا صرف میری ہی خاطر سے ملاقاتی کمرہ روشن کیا گیا ہے۔ اور میرے ہی لئے نغمہ سرائی ہو رہی ہے۔ اور میری ہی تعریف کرنے کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے۔ مجھے

محسوس ہوا کہ سب لوگ مشاطہ اور خادمہ سے لے کر ان نوجوانوں تک جو رقص کر رہے تھے۔ اور ضعیف العمر ہستیاں جو صرف تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ میرا ہی ذکر کر رہے ہیں اور مجھے یہ سمجھاتے ہیں کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں۔ محفل رقص میں میرے متعلق جمہور کی رائے، جس کا ذکر مجھ سے شہزادی ڈمی نے کیا تھا، یہ تھی۔

"میں ایک عدیم المثال اور لاجواب عورت ہوں اور مجھ میں ایک عجیب سادگی، یکرنگی اور خوش وضعی پائی جاتی ہے۔"

اس کامیابی نے میرا دل ایسا بڑھایا کہ میں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے شوہر سے کہا کہ امسال دو تین بار اور میں محفل رقص میں جانا چاہتی ہوں۔ تاکہ ایک بار تو مجھے پورا پورا اطمینان حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ سب کچھ میرے ضمیر کے خلاف تھا۔

میرا شوہر رضامند ہو گیا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری کامیابی سے خوش ہے۔ اور اس نے اپنے پہلے خیالات کو فراموش کر دیا ہے۔ اور وہ پہلی بار بخوشی میرے ساتھ گیا۔

آخرکار وہ اس طرز زندگی سے جو ہم نے اختیار کر رکھا تھا، بظاہر اکتانے اور پریشان ہونے لگا۔ مگر میری حالت ایسی نہ تھی۔ باوجود اس کے کہ وقتاً فوقتاً میں اس کی استفہامیہ نگاہ اپنے اوپر جمی ہوئی دیکھتی تھی۔ مگر میں اس کے معنی نظرانداز کر دیتی تھی۔ غیر لوگوں کو جو دلچسپی مجھ سے پیدا ہو گئی تھی۔ اور جس کا اظہار وہ میرے سامنے کرتے تھے۔ مجھے اس پر بڑا ناز تھا۔ مسرت سے لبریز فضا میں رہنے اور نئی نئی باتوں کا زندگی بھر میں اب پہلی بار مجھے تجربہ ہوا تھا۔ اس کا اخلاقی دباؤ اور اثر یکایک غائب ہو گیا تھا۔ اور مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ اس نئی دنیا میں میں نہ صرف اس کے ہم پلہ تھی۔ بلکہ اس سے بالاتر اور برتر حیثیت رکھتی تھی۔ اور اس لئے پہلے سے زیادہ اس سے محبت کر سکتی تھی۔ میں پہلے نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ میری زندگی میں میرے لئے کوئی ناخوشگوار بات کس طرح پیدا کر سکیگا۔ جب محفل رقص میں داخل ہوتے وقت ہر ایک کی نگاہ میرے اوپر پڑتی تو میرے دل میں خودداری اور غرور کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ مگر وہ اس مجمع کے سامنے مجھ پر اپنا حق جتانے پر مجبور ہو کر جلدی سے مجھ سے علیحدہ ہو جاتا اور لوگوں کے مجمع میں میری نظر سے غائب ہو جاتا تھا۔

میں اکثر دل ہی دل میں اس کو مخاطب کر کے کہتی۔ "تھوڑی دیر ٹھہرو۔ اس وقت تک صبر کرو کہ ہم گھر واپس چلیں۔ تم کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ کس کی خاطر سے میں حسین و خوش وضع بننے کی کوشش کرتی ہوں۔ اور ان لوگوں میں سے جو آج شام کو مجھے ہر چہار طرف سے گھیرے ہوتے تھے۔ کس سے محبت کرتی ہوں۔"

دراصل مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنی کامیابی پر محض اس لئے خوش ہوں کہ اپنی تمام کامیابی اس پر نثار کر سکتی ہوں۔

میں خیال کرتی کہ ایک طریقہ سے یہ سوسائٹی میرے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ یعنی میں ان لوگوں میں سے جو مجھے سوسائٹی میں ملتے تھے کسی کو اپنا گرویدہ بنالوں اور اپنے شوہر کے لئے رشک و حسد کا آتشکدہ تیار کر دوں لیکن اُس کو میرے اُوپر اس قدر بھروسہ تھا وہ ایسا خاموش اور مطمئن حالت میں رہتا تھا کہ یہ تمام نوجوان اس کے مقابلہ میں ذلیل معلوم ہوتے تھے اور جہانتک میں خیال کر سکتی تھی ان صحبتوں میں میرے لئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ مگر پھر بھی سوسائٹی کے ان نوعمر لوگوں میں سے اکثر اشخاص کی توجہ نے میرے غرور میں اضافہ کر دیا میری خودغرضی کو بڑھا دیا۔ اور مجھے سمجھا دیا کہ میرے لئے اپنے شوہر ہی سے محبت کرنا بہتر ہے۔ اور مجھے اس کی طرف سے ایک حد تک آزاد اور شاید کچھ بے پروا بنا دیا تھا۔

ایک دن جب ہم محفل رقص سے واپس آ رہے تھے میں نے اس سے کہا۔ "اوہو! تم ایبن ایبن سے کسقدر انہماک کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے"۔ اور پیٹرسبرگ کی ایک مشہور عورت کا نام لیتے ہوئے جس کے ساتھ وہ اس شام کو دراصل ہمکلام تھا۔ اپنی اُنگلی کے اشارے سے اس کو دھمکایا۔ میں نے صرف اس کو جوش دلانے کے لئے یہ کہا تھا کیونکہ وہ غیر معمولی طور پر خاموش اور افسردہ تھا۔

مگر اُس کے ماتھے پر شکن پڑ گئی۔ گویا وہ کسی اندرونی تکلیف میں مبتلا تھا۔ اور اُس نے غصّہ کے ساتھ کہا "آہ! تم ایسی بات کیوں کہتی ہو۔ دلربا! تمہارے لئے ایسی بات کہنا کہاں تک مناسب ہے؟ تم کو اور مجھ کو ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں یہ باتیں دوسروں کے لئے چھوڑ دو۔ یہ جھوٹے تعلقات ہمارے سکونِ قلب کو برباد کر دینگے۔ یاد رکھو کہ اصلیّت کبھی ضائع نہیں ہو سکتی"۔

میں محجوب ہو گئی اور میں نے کچھ نہیں کہا۔

اُس نے پوچھا "دلربا! تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے جواب دیا "لاریب، حقیقت کبھی برباد نہیں ہوتی۔ اور نہ کبھی ہو گی"۔ اور اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ واقعی یہی بات ہے۔

اُس نے کہا "خدا کرے وہ برباد نہ ہو ورنہ ہم کو دیہات واپس جانا پڑیگا"۔

مگر صرف اسی مرتبہ اُس نے مجھ سے ایسا کہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح خوش و خرّم ہے جس طرح میں خود مسرور ہوں۔ اور اس احساس کے بعد مجھے بیحد خوشی حاصل ہوتی۔ اگر وہ کبھی پریشان ہوتا تو میں یہ سوچ کر کہ اُس کی وجہ سے میں دیہات میں پریشان رہ چکی ہوں۔ اپنے دل کو تسکین دیتی اور سوچتی کہ موسم گرما کے آتے ہی پھر وہی اگلی سی حالت ہو جائیگی۔ اور ہم پھر نکولسکوئی میں تاتیانا کے ساتھ ہونگے۔

اس طرح موسم سرما ایک عالم بے خبری میں گزر گیا۔

اور اپنی تجویز کے خلاف ہم نے ایسٹر بھی پیٹرسبرگ میں گزار دیا۔ دوسرے ہفتہ میں جب ہم روانگی کے واسطے تیار تھے اسباب باندھ لیا گیا تھا۔ اور میرا شوہر مختلف تحائف پھول اور دوسری چیزیں دیہات میں خانگی استعمال کے لئے خرید چکا۔ اور وہ بہت مسرور تھا' اس کی چچازاد بہن شہزادی ڈی ہم سے ملنے آئی اور شنبہ تک قیام کرنے کے لئے ہم سے اصرار کیا۔ تاکہ ہم کاؤنٹیس آر۔ کے استقبالیہ جلسہ میں شریک ہوسکیں۔ اُس نے کہا۔ "کاؤنٹیس آر تمہاری موجودگی کی بہت متمنی ہے۔ اور شہزادہ ایم جو اس وقت پیٹرسبرگ میں موجود ہے گزشتہ محفل رقص سے تم سے متعارف ہونے کا خواہشمند ہے اور صرف اسی وجہ سے استقبالیہ جماعت کے ساتھ جانے پر آمادہ ہے۔" اور کہنے لگی کہ "تم روس میں بہترین حسین عورت ہو۔ تمام شہر استقبال میں حصہ لیگا اور مختصر یہ کہ اگر تم اس میں شریک نہ ہوئیں تو کوئی لطف نہ آئے گا۔"

میرا شوہر کمرہ کے دوسرے حصہ میں کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔

ہماری عموزاد بہن نے پوچھا۔ "ماریا! کیا تم استقبالیہ جلسہ میں شریک ہوگی؟" میں نے مشکوک نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ "ہم تو پرسوں دیہات جانے والے ہیں۔" ہماری نگاہیں ملیں اور وہ جلدی سے دوسری طرف چلا گیا۔

ہماری چچازاد بہن نے کہا۔ "میں اس سے ٹھہرنے کے لئے کہونگی۔ پھر ہم شہر چلینگے اور تمام باتیں طے ہوجائیں گیا ـــــ؟"

میں نے کسی قدر رضامندی کے ساتھ جواب دیا۔ "لیکن اس صورت میں ہماری تجاویز بدل جائیں گی ... اس کے علاوہ ہمارا سامان بندھ چکا ہے۔"

میرے شوہر نے کمرہ کے دوسرے حصہ میں سے غصّہ اور حقارت کے لہجہ میں جس کو میں نے کبھی پہلے نہ سنا تھا کہا۔ "ہاں ان کے لئے مناسب ہے کہ یہ آج شام شہزادہ کو سلام کر آئیں۔"

ہماری چچازاد بہن نے کہا۔ "اوہو! مجھے آج پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ بدگمانی میں مبتلا ہے۔" اور پھر اس نے اس سے مخاطب ہوکر کہا۔ "لیکن سرجیائی! تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں شہزادہ کی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہی بلکہ سب لوگوں کی طرف سے کہہ رہی ہوں۔ کاؤنٹیس آر ان کی شرکت کی بہت آرزومند ہے۔"

میرے شوہر نے بے دلی سے جواب دیا۔ "یہ صرف ان ہی پر منحصر ہے۔" اور یہ کہکر وہ کمرہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ معمول سے زیادہ برافروختہ ہو رہا ہے۔ اور اس لئے میں نے اپنی بہن کو کوئی فیصلہ کن جواب

نہیں دیا۔

جیسے ہی وہ چلی گئی میں اپنے شوہر کے پاس گئی۔ وہ متفکرانہ انداز سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اور جب میں دبے پاؤں کمرہ میں پہنچی تو اس نے نہ میرے قدموں کی آہٹ سُنی اور نہ میری طرف دیکھا۔

جب میری نظر اُس کے چہرہ پر پڑی تو میں نے اپنے دل میں کہا۔ "وہ نکولسکوئی کی یاد میں محو ہے۔" اور میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کیا کہ نہ صرف آراستہ استقبالیہ کمرہ میں شام کا قہوہ، کھیت، مزارعین، نشستگاہ میں شام کی نشست اور ہمارا پوشیدہ طور پر رات کا کھانا بلکہ دنیا بھر کی محافل رقص و سرود اور شہزادوں کی دل خوش کن باتیں اس کی مسرت آمیز حالت کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

میں اُس سے کہنا ہی چاہتی تھی کہ میں استقبالیہ جلوس میں شریک نہ ہونگی۔ اور مجھے اس میں شامل ہونیکی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اُس نے یکایک میری طرف دیکھا۔ اور اُس کے چہرہ سے تردد و فکر کے آثار دُور ہو گئے۔ ایک بار پھر تیز فہمی دانشمندی اور مربیانہ خاموشی کے نشانات اُس کے چہرہ پر رونما ہوئے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کو صرف ایک انسان کی حیثیت سے دیکھوں۔ بلکہ وہ ہمیشہ میرے سامنے ایک دیوتا کی حیثیت سے رونما ہونا پسند کرتا تھا۔

اُس نے میری طرف مخاطب ہوکر بے پروائی سے کہا۔ "میری پیاری! تم کیا چاہتی ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے اس تجاہل عارفانہ اور ظاہرداری سے میری روح کو صدمہ پہنچا۔ کیونکہ سب سے زیادہ مجھے اُس سے محبّت تھی۔

اُس نے پوچھا۔ "تو تم استقبال کے جلوس میں شرکت کرنا پسند کرتی ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں میں پسند تو کرتی ہوں مگر میں جانتی ہوں کہ تم کو میری شرکت پسند نہیں ہے۔ مزید برآں ہمارا سامان بھی بندھ چکا ہے۔"

اس نے کبھی پہلے ایسی بے پروائی سے میری طرف نہ دیکھا تھا۔ اور نہ کبھی ایسی بے اعتنائی سے مجھ سے گفتگو کی تھی۔

اُس نے کہا۔ "اچھا میں سہ شنبہ تک نہ جاؤنگا۔ اور تمام اسباب بھی کھول دیا جائیگا۔ اگر تم استقبال میں شریک ہونا چاہتی ہو تو وہاں جاسکتی ہو۔ مہربانی کرکے تم جاؤ مگر میں شہر سے باہر نہ جاؤں گا۔"

حسب معمول اس نے کمرہ میں اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا۔ (غصّہ کی حالت میں ہمیشہ اس کی یہی کیفیت ہوا کرتی

تھی) اور میری طرف نظر نہ کی۔

میں جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔ اور اپنی جگہ سے نہ ہلی اور صرف نگاہوں سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے کہا "در اصل میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکتی۔ تم کہتے ہو کہ تم ہمیشہ ایسے ہی مطمئن رہتے ہو (مگر اس نے مجھ سے کبھی ایسا نہ کہا تھا) تم مجھ سے ایسی عجیب باتیں کیوں کرتے ہو؟ تمہاری خاطر میں اس مسرت سے محروم رہنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر تم مجھ سے ایسے طعن آمیز لہجہ میں اور ایسے طریقہ سے گفتگو کر رہے ہو کہ اب سے پہلے کبھی تم نے ایسا برتاؤ نہ کیا تھا اور لطف یہ ہے کہ مجھے جلوس استقبال میں شریک ہونے کے لئے مجبور بھی کرتے ہو۔"

"اچھا تو تم گویا قربانی کر رہی ہو (اس نے "قربانی" کے لفظ پر زور دیا) خیر میں اپنی قربانی کرتا ہوں۔ اور یہی بہتر ہے۔ یہ عالی دماغی کی جنگ ہے، یہ خاندانی مسرتوں کی حقیقت ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے ایسے سخت طنزیہ الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ اس کے طعن و تشنیع سے میرے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ مجھے غصہ آ گیا۔ اور اس تلخی سے بجائے خوف کے میرے دل میں اور سختی پیدا ہو گئی۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اس نے جو ہمیشہ ظاہرداری برتنے سے خوف کھاتا تھا۔ اور جو ہمیشہ سچائی اور سادگی کا دلدادہ تھا۔ ایسی باتیں کہیں تھیں؟

میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں اس کی خاطر سے اس خوشی سے محروم رہنا چاہتی تھی جس میں کوئی نقصان نہ تھا اور یا یہ کہ ایک لحہ پیشتر میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ اور میں اس سے محبت کرتی تھی۔ ہماری تجاویز بدل گئیں۔ اس نے میرے سچے اور سادہ الفاظ کو نہ سنا۔ اور مجھے اس کا ملال ہوا۔

میں نے ایک گہری سانس لیکر کہا۔ "تمہارا مزاج بہت کچھ بدل گیا ہے۔ تمہاری نگاہ میں میں کس گناہ کی مرتکب ہوئی ہوں؟ —— اس کی وجہ صرف جلوس استقبال کی شرکت ہی نہیں ہو سکتی بلکہ کوئی دیرینہ کینہ میری طرف سے تمہارے دل میں موجود ہے۔ آج تم سچائی سے کیوں گریز کرتے ہو۔ حالانکہ پیشتر ایک بار بھی تم نے راستبازی سے منہ نہیں موڑا۔ ایمانداری سے بتاؤ کہ تم نے میرا کیا قصور دیکھا ہے؟" اور اس بات کو یاد کرکے کہ موسم سرما میں کبھی اس نے میری کوئی خطا نہیں دیکھی اپنے دل کو مطمئن بنا کر میں خیال کرنے لگی کہ اس کا جواب اس کے پاس کیا ہوگا؟

میں کمرہ کے درمیان میں جا کھڑی ہوئی تاکہ وہ میرے نزدیک ہو کر گزرے۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگی میں نے خیال کیا۔ کہ وہ میرے پاس آئیگا۔ مجھے گلے لگائیگا۔ اور

اس شکر رنجی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور مجھے افسوس ہوا۔ کہ مجھے اسکی غلطی ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن وہ کمرہ کے دوسرے کنارہ ہی پر ٹھہر گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

اُس نے پوچھا "تو تم ابھی تک میرا مطلب نہیں سمجھیں؟"

"نہیں"

"اچھا، میں تم کو سمجھاؤنگا وہ جذبہ، جو میرے دل میں موجزن ہے اور جس سے متاثر ہونے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے میں بہت زیادہ مضطرب ہوں۔" وہ ٹھہر گیا اور دراصل اپنی آواز کی تیزی سے اُس کو خود حیرت ہوئی۔

میری آنکھوں میں غصّہ اور حقارت کی وجہ سے آنسو بھر آتے۔ اور میں نے پوچھا "تو وہ کیا بات ہے؟"

"میرے لئے یہ امر موجب پریشانی ہے کہ یہ شہزادہ خیال کرتا ہے کہ تم حسین ہو وہ تم سے تعارف حاصل کرنے کا خواہشمند ہے۔ اور تمہارے شوہر اور خود تمہارے مرتبہ کو، جو بحیثیت ایک عورت ہونے کے ہے۔ ملحوظ نہیں رکھتا اور تم اُس جذبہ کو جو تمہارے شوہر کے دل میں ہے سمجھنا نہیں چاہتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عورت ہونے کی حیثیت سے جو تمہارا رتبہ ہے تم کو اس کا مطلق خیال نہیں اور اس کے برخلاف تم اپنے شوہر سے کہتی ہو کہ میں اپنے آپ کو قربان کر رہی ہوں یا بالفاظ دیگر یہ کہ شہزادہ کے حضور میں پہنچکر میری عزت افزائی ہوتی۔ مگر میں تمہارے لئے اس سے محروم رہنے پر آمادہ ہوں"

جسقدر اُس نے گفتگو کو طول دیا۔ اُسی قدر اسکا جوش بڑھتا گیا۔ اور اس کی آواز سے سختی ترشی اور وحشت برسنے لگی۔ میں نے اس کو کبھی اس حالت میں نہ دیکھا تھا اور نہ مجھے کبھی ایسی امید تھی۔ میرا خون کھولنے لگا۔ اور میں خوفزدہ ہوگئی لیکن اس کے ساتھ ہی ناروا نقصان برداشت کرنے اور اپنی اہانت کے احساس سے میرا دل قوی ہوگیا۔ اور مجھے اس کا بدلہ لینا ضروری معلوم ہوا۔

میں نے کہا "مجھے عرصہ سے اس کی امید تھی اور جو کچھ کہنا چاہو کہہ لو"

اُس نے کہا "میں نہیں سمجھ سکتا۔ کہ تم کو کس بات کی امید تھی۔ بدگمان ہونے کے لئے میرے پاس کافی وجوہ ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس بیوقوف سوسائٹی کے سبب سے تم دن بدن نکمّی، کاہل اور عیش پسند ہوتی جاتی ہو۔ اور مجھے روز اوّل ہی سے اس کی امید تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے ایسی پریشانی اور تکلیف ہے کہ کبھی پہلے نہ ہوئی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری سہیلی اپنے بھدّے ہاتھوں سے میرے دل میں جگہ کرنا چاہتی ہے۔ اور میری بدگمانی کا ذکر کرتی ہے۔ ہاں میری بدگمانی کا اور پھر کس کے مقابلہ میں؟ اس شخص کے مقابلہ میں جس سے ہم دونوں میں سے کوئی بھی واقف

نہیں ہیں۔ اور تم گویا عمداً میرا مطلب سمجھنا نہیں چاہتیں۔ اور میرے لئے قربانی کرنے کا ذکر کرتی ہو۔ کس بات کی قربانی؟ ——— تم کو شرم آنی چاہئے۔ اور پشیمان ہونا چاہئے۔ اپنے اخلاقی تنزل پر ——— بیشک قربانی ———"

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اوہو! آج مجھے ایک شوہر کی طاقت معلوم ہوئی۔ کہ وہ عورت کو جس سے کوئی قصور سرزد نہ ہوا ہو۔ کس طرح حقیر و ذلیل کرسکتا ہے۔ یہی بات شوہر کے حقوق میں داخل ہے۔ مگر میں اس کو کب مانتی ہوں"

یہ احساس کرکے کہ میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ اور میرا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ میں نے کہا۔ "نہیں میں تمہارے لئے کوئی قربانی نہ کرونگی۔ میں شنبہ کو ضرور استقبالیہ جلوس میں شریک ہونگی۔ اور کوئی طاقت مجھے اس سے نہیں روک سکتی"

اُس نے غصہ سے بے اختیار ہوکر کہا۔ "بہتر ہے خدا تم کو خوش و خرم رکھے لیکن آج سے ہمارے تعلقات منقطع ہوگئے آج سے مجھے تمہاری وجہ سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میں نے بڑی بیوقوفی کی۔ جب میں نے ———" اُس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ اور جملہ کو پورا کرنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ نہ کرسکا۔

مجھے اُس سے خوف معلوم ہونے لگا۔ اور میں اس سے نفرت کرنے لگی۔ میرے دل میں بہت سی باتیں تھیں جو میں اپنی توہین کے جواب میں اُس سے کہنا چاہتی تھی لیکن اگر میں کچھ بھی کہتی تو میرے آنسو نکل پڑتے اور میں اسکی نگاہوں سے گر جاتی، اس لئے میں بغیر کچھ کہے ہوئے کمرہ سے نکل گئی لیکن جیسے ہی اس کے قدموں کی آواز آنا بند ہوئی۔ میں اپنی موجودہ حالت کا اندازہ کرکے کانپ اٹھی میں نے محسوس کیا کہ وہ تعلق جس پر میری مسرت کا انحصار تھا ہمیشہ کے واسطے منقطع ہوگیا۔ اور مجھے خواہش ہوئی کہ میں اس کے پاس پھر واپس جاؤں۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اگر میں رحمدل نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر اس کو سینے سے لگانے کے لئے ہاتھ پھیلاؤں تو کیا وہ میرا مطلب سمجھنے میں بے اعتنائی سے کام نہ لیگا؟ کیا وہ میری عالی ہمتی کی داد دیگا؟ اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے۔ اور اپنی خاموشی پر مغرور ہے۔ کیا وہ میرے اظہار تاسف کو قبول کرکے مجھے معاف کردیگا؟ آخر اُس نے جو میری محبت کا دعویدار ہے۔ کیوں ایسے نفرت آمیز طریقہ سے میری توہین کی؟"

میں اس کے پاس نہ گئی۔ بلکہ اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ جہاں عرصہ تک میں عالم تنہائی میں اس گفتگو کو جو ہمارے درمیان ہوچکی تھی۔ یاد کرکے خوفزدہ ہوکر روتی رہی اور ان الفاظ کے مقابلہ میں دوسرے دوستانہ الفاظ کا خیال کرتی رہی اور پھر خوف و توہین کے احساس نے پورا منظر میرے

پیش نظر کر دیا۔

جب میں شام کو چائے پینے کے لئے گئی اور ایس سنٹ سامنے جو ہمارے یہاں مقیم تھی اپنے شوہر سے ملی تو مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے درمیان اختلاف کی ایک خلیج حائل ہو گئی ہے۔ ایس نے مجھ سے پوچھا کہ تم بولٹن جاؤ گی؟ مگر قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں میرے شوہر نے کہا ”آئندہ شنبہ کو۔ ہم کاؤنٹیس آر کے استقبال میں شریک ہونگے“ پھر اس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ”کیا تم استقبالیہ جلوس میں شرکت کرو گی؟“

میں اس سادگی کے ساتھ اس کو سوال کرتے ہوئے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ اور بزدلانہ طریقہ سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظر میرے اوپر جمی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہوں سے غصہ اور حقارت ٹپک رہی تھی۔ اور اس کی آواز پر استقلال اور افسردہ تھی۔

میں نے جواب دیا ”ہاں میں استقبال میں شریک ہونگی۔“

شام کو جب میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی وہ میرے پاس آیا اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا ”میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے براہِ عنایت اس کو بھول جاؤ۔“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے لبوں پر تبسم کی لہریں دوڑ گئیں اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ گویا وہ ان جذبات سے جو اس منظر سے پیدا ہونے والے تھے۔ خائف تھا۔ اور مجھ سے دور ایک آرام کرسی پر جا بیٹھا۔

میں نے خیال کیا ”کس قدر جرات ہے کہ وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے“ اور میں اس سے صلح کرنے کے لئے آمادہ ہوئی اور استقبالیہ جلوس میں شریک نہ ہونے کی درخواست کرنے ہی کو تھی کہ اس نے کہا ”مجھے اپنی والدہ کو اطلاع دے دینی چاہئے۔ کہ ہم نے واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ ورنہ وہ پریشان ہونگی۔“

میں نے پوچھا۔ ”تو ہم یہاں سے کب تک روانہ ہونگے؟“

اس نے جواب دیا ”سہ شنبہ کو، استقبال کے بعد“

میں نے اس سے نگاہ ملا کر کہا ”مجھے امید ہے کہ تم میری خاطر سے ایسا نہیں کر رہے ہو“ مگر اس نے میری طرف صرف دیکھا۔ اور زبان سے کچھ نہ کہا۔ میرے اور اس کے درمیان مغائرت کا پردہ حائل تھا اور یکایک مجھے اس کے چہرہ پر ضعیفی اور افسردگی کی علامتیں نظر آنے لگیں۔

ہم استقبال میں شریک ہوئے اور بظاہر ہمارے تعلقات میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔ مگر حقیقت میں اب یہ تعلقات پہلے سے نہ رہے تھے۔

میں محفل میں دوسری خواتین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی کہ شہزادہ میرے پاس آیا اور اس سے گفتگو کرنے کے لئے

مجبوراً مجھے کھڑا ہونا پڑا۔ کھڑے ہوتے ہوئے میں نے بلاقصد اپنے شوہر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور اس کو اتفاقی کمرہ کے دوسرے کنارہ پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ اُس نے میری طرف دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا۔ یکایک میں ندامت اور غصہ کے احساس سے پریشان ہو گئی۔ اور شہزادہ کو اپنے بالوں پر نگاہ جمائے ہوئے دیکھ کر مجھے حجاب معلوم ہوا لیکن میں کھڑے ہونے اور اس سے ہمکلام ہونے کے لئے مجبور تھی۔ جب میں کھڑی ہوئی تو اس نے میرے سراپا پر نظر ڈالی

ہماری گفتگو بہت مختصر تھی۔ کیونکہ میرے نزدیک اس کے بیٹھنے کیلئے کوئی جگہ نہ تھی اور اس کو معلوم ہو رہا تھا کہ میرے لئے اُس سے ہمکلام ہونا شاق ہے۔ ہم نے گزشتہ محفلِ رقص کے متعلق گفتگو کی۔ اور اس جگہ کے متعلق جہاں ہم موسم گرما میں رہے تھے۔ چند الفاظ کہے۔ اور چند فقرے دوسری باتوں کے متعلق ہوئے۔ اس کے بعد وہ میرے پاس سے چلا گیا۔ اور اُس نے میرے شوہر سے تعارف پیدا کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کمرہ کے دوسرے سرے پر ان دونوں کو ملتے ہوئے اور آپس میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ شہزادہ دراصل میرے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ کیونکہ دورانِ گفتگو میں وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا جاتا تھا۔

میرے شوہر کا چہرہ یکایک سُرخ ہو گیا۔ اُس نے باادب سلام کیا اور شہزادہ کے پاس سے علیحدہ ہو گیا۔ مجھے بھی ندامت ہوئی۔ کیونکہ میں شہزادہ کی اس گفتگو سے جو اُسنے میرے متعلق میرے شوہر سے کی تھی پریشان تھی اور خصوصیت سے اپنے شوہر کے متعلق اسکی رائے سُنکر مضطرب تھی، ایسا معلوم ہوا کہ اس وقت جبکہ میں شہزادہ سے ہمکلام تھی۔ سب لوگوں نے میرے حیا آمیز اضطراب کو ضرور دیکھا ہوگا۔ اور میرے شوہر کی بے اعتنائی بھی اُنسے پوشیدہ نہ رہی ہوگی۔ خدا ہی جانے ان لوگوں نے اسکے کیا معنی لئے ہونگے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ لوگوں کو اس شکر رنجی سے آگاہی ہو گئی تھی۔ جو میرے اور میرے شوہر کے درمیان ہو گئی تھی؟

میری چچازاد بہن مجھے گھر لے آئی۔ اور راستہ میں میرے شوہر کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اُس سے وہ تمام باتیں بیان کیں جو اس ناخوشگوار استقبال کی بدولت پیدا ہو گئی تھیں۔ اور اُس نے مجھے یہ کہکر تسلّی دی کہ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ اور ازدواجی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ مگر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ اُس نے میرے شوہر کے متعلق اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی کہ وہ خاموش اور مغرور ہے۔ میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اب میں خود بھی اس کی طبیعت کا بہتر اندازہ کر سکتی ہوں۔

لیکن جب مجھے اپنے شوہر کے ساتھ پھر تنہائی کا موقع ملا۔ تو اسکے متعلق میرا یہ فیصلہ میرے ضمیر کے خلاف معلوم ہوا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے درمیان جو اختلاف رونما ہو چکا تھا اب اس میں اور بھی ترقی ہو گئی ہے۔ (رباقی باقی)

محسوسات

ستم بھی اس ادا فہم محبت کے کرم نکلے
یہ نکتہ دیکھنے والے مگر محفل میں کم نکلے

ریاضِ خلد میں واعظ نگاہیں ہم نے دوڑائیں
تو لاکھوں بندۂ پیرِ مغاں تیری قسم نکلے

نگاہیں پاک نقشِ صورت پرستانِ مجازی کی
یہی صورت کے بندے واقفِ لوح و قلم نکلے

نہ اُن کی آستیں ہیں جذب ہوں آنسو تو کیا رونا
نکلنے کو تو اے دِل آرزوئے چشم نم نکلے

الٰہی اس جگہ ہم مشربوں کو دِل ترستا ہے
کوئی تو بے نیازِ فتنۂ دیر و حرم نکلے

نہایت غور سے ہم نے کتاب زندگی دیکھی
بہت افسانہائے بیکسی زیبِ رقم نکلے

تری چشم خمار آلود سے دُوری بہت اچھی
کہیں ایسا نہ ہو اس بادۂ رنگیں میں سم نکلے

کشاکشہائے فرقت نے ہمیں بے حال کر ڈالا
خُدایا! کیا مصیبت ہے نہ غم جائے نہ دم نکلے

ہمیں ہستی پہ اپنی اعتمادِ کامرانی ہے
مزا آئے جو یہ بھی پردۂ روئے صنم نکلے

جہاں سارا اسیرِ شیوۂ فرزانگی نکلا
فدائے راحتِ دیوانگی نکلے تو ہم نکلے

جنونِ عشق تھا جن کو انہیں آزادِ غم پایا
غرورِ عیش تھا جن کو وہی پابندِ غم نکلے

نہ کر اصرار جام پے بہ پے یہ اس طرح عابد
کہ آنکھیں پھیر لے ساقی تو محفل میں بھرم نکلے

عابد

ضبطِ خواب

ایک مشہور انگریز مصنّف کا مقولہ ہے کہ "اگر اس عالمِ امکان میں ہم خواب کے متعلق قطعی اختیارات کے مالک ہو سکتے۔ تو ہماری متخیلہ عجیب جانفزا واقعات و ممکنات کی آماجگاہ بن جاتی - ذرا غور تو کرو - کہ جہان بھر کی وہ کونسی چیز ہے جس کے متعلق خواب دیکھنے کی خواہش پیدا نہ ہوتی۔ محو شدہ چہرے، خوشگوار احساسات غرضیکہ ہر گذشتہ یاد کا ایک معائنہ ثانی کس قدر تعجب خیز اور مسرور ہوتا۔"

حقیقت میں پچھلے دس پندرہ سالوں سے ماہرینِ نفسیات اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ کہ کوئی ایسا طریقہ دریافت ہو جائے جس کی مدد سے ہم خواب کے متعلق اور نہیں تو چند معمولی اختیارات کے مالک ہو سکیں ہر چند کہ یہ مسلّمہ ہے کہ خواب نہایت نازک رگ و ریشے سے تخلیق پاتے ہیں۔ اور اس لئے ہماری قوتِ مدرکہ ان کی یاد کو برقرار رکھنے میں کبھی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے اس حقیقت کے اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ کہ کوشش سے چند ایسے طریقے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ جن کی مدد سے ہم خواب کے متعلق معمولی اختیارات حاصل کر سکیں۔ اور بلا شبہ انہی وسائل کی مدد سے مشق بہم پہنچا کر خوابوں پر اچھا خاصہ ضبط حاصل کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اسی صورت میں ہم خواب کی تمام خوشگوار کیفیات سے لذت اندوز ہو سکتے ہیں جب ہمیں خوشگوار خواب دیکھنے کی قوت حاصل ہو جائے۔ اور جزوی طور پر تمام خوابوں کے متعلق ان کے موضوع کو انتخاب کرنے میں کوئی حصّہ حاصل ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اس ذریعے کے اثرات دیرپا ہونگے لیکن اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ خواب کی خصوصیات میں کوئی نمایاں تغیر پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور اسی لئے ہم کبھی ناخوشگوار اور خوفناک خواب نہ دیکھنے کی قوت حاصل ہی نہیں کر سکتے عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ حالتِ خواب میں دماغ تمام بیداری کی کیفیات سے بے نیاز ہو کر کام کرتا ہے۔ یہاں تک کہ برگسان جیسا مشہور فلسفی اور ماہرِ نفسیات اپنے نظریہ ہائے خواب کو اس قسم کے تصوراتِ اساسی پر قائم کرتا ہے۔ اور اس بات کو پہلے ہی فرض کئے لیتا ہے کہ دماغ کے خصائصِ نیم شعوری خصائصِ شعوری سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں لیکن تازہ ترین تحقیقات اس بات کی مظہر ہے کہ ارادہ دماغ کے خصائصِ نیم شعوری کو بھی متاثر کرتا ہے اور اسی لئے

لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ارادہ اس طرح متاثر کر سکتا ہے تو کوشش کرنے سے ہمارے خواب سراسر ارادی ہو سکتے ہیں مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ناخوشگوار اور خوفناک خواب نہ دیکھنا ایک ارادی فعل ہو سکتا ہے۔ اور مشق سے ہم ایک خاص حد تک ہم خواب میں اپنے ارادے سے اسی طرح ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں جس طرح ہم عالم بیداری میں اپنے خیالات و احساسات میں کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی مشق کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہم خوشگوار خوابوں کو اپنے ارادے سے دہرا سکتے ہیں۔ اور یہ کہ ہم ان میں اپنے مذاق کے مطابق ایزاد بھی کر سکتے ہیں۔ اس قوت کا حاصل کر لینا کوئی ایسا تعجب خیز امر نہیں۔ کیونکہ سائنس کی تحقیقات سے بھی اسی طرح کے اشارے ثابت ہوتے ہیں۔

اگر ہم فرض کر لیں کہ یہ نظریہ جس کی بنا پر انسانی فطرت دو ممتیز شخصیتوں سے مرکب ہے۔ ایک وہ جو عام طور پر کام کرتی رہتی ہے۔ دوسری وہ جو خواب میں یا مسمریزم اور ہپناٹزم کے زیر اثر کام کرنے لگتی ہے۔ تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس نظریے کو مان لینے کے بعد ہماری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود پیش نظر ہو جاتا ہے مستند شہادتوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ہپناٹزم کے زیر اثر معمول کے دماغ اور اعصاب پر ضبط کلی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ حواس اور حافظہ بھی زیر اثر لائے جا سکتے ہیں۔ اگر اثر پذیری کے اس عمل سے ممکن ہے کہ ایک دماغ دوسرے دماغ کو اس طرح مطیع و منقاد کر لے۔ تو کیا یہ ناممکن ہے کہ ہماری شعوری حالت جزوی طور پر ہماری غیر شعوری حالت کو اثر پذیر کر سکے۔ اسی کے ساتھ ہی ہمیں اس بات کا احساس کرنا چاہئے۔ کہ ہم اپنے ارادے سے اپنے اعصاب کو بھی وقتاً فوقتاً متاثر کرتے رہتے ہیں۔ جن اشخاص نے اپنے جسم اور دماغ کو ایک باقاعدہ نظام ارادی کے ماتحت رکھا ہے۔ ان کے لئے اس بات کو مان لینے میں کوئی دقت نہیں۔ کہ ہم دماغ کی نیم شعوری حالت کو اپنے ارادے سے متاثر کر سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہم یہ قوت حاصل کس طرح کر سکتے ہیں وہ کس قسم کی مشق ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارا دماغ اپنی نیم شعوری حالت میں ہمارے ارادی احکام کو ماننے کے لئے تیار رہا کرے۔ مسٹر فریڈرک میئرز ایسے تجربات کی بنا پر چند وسائل پیش کرتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ایسے وسائل خواہ انفرادی حیثیت سے کیسے ہی نفع رساں کیوں نہ ہوں۔ اجتماعی طور پر تقریباً بے سود ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ہر دماغ اپنی خصوصیات امتیازی کے لحاظ سے متاثر ہوتا ہے۔

ہم جو طریقہ پیش کرنے والے ہیں وہ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اوّل تو یہ۔ کہ اس طریقے سے ہولناک اور ناخوشگوار خوابوں کا اعادہ روک دیا جائے۔

حقیقت میں اس قسم کے خواب نہایت کاہش خیز ہوتے ہیں۔ کئی بچّوں اور پختہ عمر اشخاص کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص خوفناک خواب دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے تمام عمر خواب نہ دیکھنا پسند کریں گے۔

ایک مشہور مصنّف اپنے بچپن کے احساسات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "مجھے ذہنی خطرات سے بہت سخت خوف آیا کرتا تھا۔ رات کا وقت، تنہائی اور گھُپ اندھیرا میرے لئے دوزخ کا نمونہ تھے۔ چار سال سے لے کر آٹھ سال کی عمر تک میں نے کبھی اپنے تکیے پر سونے کے لئے سر نہیں رکھا۔ جب مجھے خیال نہ آیا ہو۔ کہ میں کوئی خوفناک خواب دیکھونگا۔ اور اکثر و بیشتر میری یہ پیشینگوئیاں دردناک طور پر صحیح ثابت ہوتی تھیں"۔ اسی طرح بہت کم اشخاص ہونگے۔ جو بچپن میں اس قسم کے خوابوں سے مامون رہ سکے ہوں۔ جن لوگوں کو اس قسم کے خواب آتے ہوں۔ اُنہیں ناصحانہ انداز میں یہ سُنا دینا کہ سب کچھ ہاضمے کی خرابی کا فتور ہے۔ حقیقت کے ایک جزو کی تشریح ہے۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کے خواب عام طور پر معدے کی خرابی وغیرہ سے جس کے اثرات دماغ پر مترتب ہو چکتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں یا پھر ان کا مخزن کوئی خاص خیال یا جذبہ ہوتا ہے جو شعوری حالت میں اور ہنگامی کیفیات میں دبا رہتا ہے۔ لیکن آپ اس بات کی بھی کوئی تاویل نہیں کر سکتے کہ کئی ایک خواب جو مذکورہ بالا اسباب کے باہم ہو جانے پر پیدا ہوتے ہیں۔ ان اسباب کے مٹ جانے کے بعد بھی برسوں اپنے اعادے سے دماغ کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ عین اسی طرح جس طرح کوئی آواز کسی وادی میں پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر بار بار گونجتی رہے۔ یا اُن ہزاروں روشنیوں کی طرح جو ایک شیشے کا عکس دوسرے شیشے پر ڈالنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ خواب بھی اپنے مخزن کے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے۔ کہ ہم اس قسم کے خوابوں کے اعادے کو ناممکن بنا دیں، یا کم از کم ان پر ایسا ضبط حاصل کر لیں، کہ ہمارے ایک ارادی حکم پر خواب کا سلسلہ فوراً منقطع ہو جائے۔ یہ طریقہ بالکل عام تجربوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ قارئینِ کرام میں سے اکثر نے محسوس کیا ہوگا۔ کہ خواب میں ہم کئی دفعہ اپنے آپ کو یہ یقین دلاتے ہیں۔ کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اسی عام تجربے میں وہ طریقہ پنہاں ہے جس کی وجہ سے ہم اس قسم کے ناخوشگوار اعادے کو منقطع کر سکتے ہیں۔ اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ ناخوشگوار خواب کے شروع ہوتے ہی ہمارا دماغ فوراً یہ خیال کر لے۔ کہ یہ ایک خواب ہے۔ جس وقت مشق سے یہ بات پیدا ہو جائیگی

تو ہمارے ڈرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے گی۔ کیونکہ ہم محسوس کرینگے کہ یہ تمام ایک خواب ہے۔ اور ہم جب چاہیں جاگ کر اس سلسلے کو منقطع کر سکتے ہیں۔ اس راز کو سمجھ لینے کے بعد کوشش کرنی چاہیے۔ کہ آدمی وقتاً فوقتاً اس قسم کے فقرات دہراتا رہے۔ " یہ ایک خواب ہے۔ مجھے اب جاگنا چاہیے۔" حتےٰ کہ بار بار دہرانے سے یہ فقرہ ہماری غیر شعوری کیفیات پر اسقدر حاوی ہو جائے کہ کسی خواب کا نقش اُسے مٹا نہ سکے۔" اس کے بعد ہر ناخوشگوار خواب کے شروع میں خود بخود دماغ یہ فقرہ دُہرانے لگے گا۔ " کہ یہ ایک خواب ہے۔ مجھے اب جاگنا چاہیے۔" شروع میں آپ کی نیند فوراً کھُل جائیگی۔ لیکن بعدازاں جب آپ کو اچھی طرح مشق ہو جائیگی۔ تو آپ کی نیند نہیں کھُلے گی۔ اور خواب بھی جاری رہیگا۔ لیکن خواب کے خوفناک عناصر فنا ہو جائینگے۔ اس سادہ طریقے میں کوئی ایسی بات نہیں۔ جسے ہر شخص آسانی سے نہ کر سکے۔ دماغ کی تمام کیفیات کو ان الفاظ پر مجتمع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو شروع میں دُہرائے جا چکے ہیں۔ تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو بار بار دُہرانا وقتاً فوقتاً اونچی آواز میں کہنا اور ہمیشہ انہی الفاظ کا استعمال کرنا بہت سود مند ثابت ہوتا ہے۔ سونے سے پیشتر ان الفاظ کو دُہرا لینا اشد ضروری ہے اور یہ مشق اس وقت تک جاری رکھنی چاہیے۔ جب تک یہ فقرہ اور نہ صرف یہ فقرہ بلکہ وہ نفسیاتی نکتہ جو اس فقرے میں مضمر ہے۔ دماغ پر پوری طرح مستولی ہو جائے۔ اسقدر مشق کرنے کے بعد شروع شروع میں ناخوشگوار خواب کی ابتدا ہی میں دماغ ایک قطعی حکم دے گا کہ یہ سلسلہ منقطع کر دیگا۔ لیکن مشق کے انتہائی مدارج طے کرنے کے بعد آپکو محسوس ہوگا۔ کہ دماغ کے حکم دینے کے بعد خواب جاری رہتا ہے مگر جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ خواب میں سے خوف کا عنصر جاتا رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل خواب جو راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے۔ اس نظریے کو زیادہ واضح کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

ایک طویل خواب کے دوران میں مجھے محسوس ہُوا گویا میرے مُلک کے خلاف ایک نہایت عظیم سازش کیجا رہی ہے۔ سازش میں حصّہ لینے والوں کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا۔ کہ مَیں ان کے راز سے واقف ہوں۔ اب مجھ پر خوف طاری ہونے لگا۔ مَیں نے بے تحاشہ بھاگنا شروع کیا۔ اور سازشی اشخاص کا قافلہ میرے پیچھے پیچھے بھاگا۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرات نمودار ہو گئے۔ اور مَیں نے خوف سے تھر تھر کانپنا شروع کیا۔ عین اسی وقت میرے دماغ میں ردعمل کی ایک رو دوڑ گئی۔ اور مجھے فوراً وہ فقرہ سوجھ گیا جس کو کہنے کے بعد خواب کا سلسلہ منقطع کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مَیں نے خواب میں ہی نیم شعوری غور

پر یہ خیال کرنا شروع کیا۔ کہ میرا جاگنا وطن کے لئے خطرناک ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے سازش کی تمام جزئیات کا علم حاصل نہ ہوگا۔ عجیب مخمصہ تھا۔ ایک طرف میری طبیعت یہ چاہتی تھی کہ میں فوراً خواب سے جاگ اٹھوں۔ دوسری طرف خواب ہی میں مجھے اس فرض کا احساس ہوتا تھا کہ مجھے تمام جزئیات کا پتہ لگانا چاہئے۔ ازبس میری مشق تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ اور خواب میں بھی میرا دماغ جزوی طور پر ارادے کے ماتحت کام کر سکتا تھا۔ میں نے یہ سوچ لیا کہ یہ محض ایک خواب ہے۔ اور میرے لئے ہر وقت جاگنا ممکن ہے لیکن ساتھ ہی میری طبیعت کا اقتضا تھا کہ میں اس واقعات سے لبریز فضا کو تھوڑا عرصہ اور قائم رکھوں۔ کیونکہ واقعات بہت عجیب تھے۔ اور مجھے ان میں لطف محسوس ہو رہا تھا۔ خواب ہی خواب میں یہ سوچ کر میں نے اپنی بھاگ دوڑ جاری رکھی۔ اب مجھے اطمینان تھا۔ کیونکہ اپنی خواہش کے مطابق خواب کا سلسلہ توڑ دیا جا سکتا تھا۔ مجھے تمام سازش کی جزئیات کا علم ہوگیا۔ اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے میری جاگ کھل گئی۔ اور میرا دماغ غالب کے اس مصرع پر غور کرنے لگا کہ ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اس مشق کو بہم پہنچانے کا سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے جب ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ اس قسم کے خواب بچوں کی صحت اور تندرستی پر بہت برا اثر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ وہ حالت جس کی طرف اوپر ایک مصنف کے الفاظ میں اشارہ کیا جا چکا ہے عام طور پر بچوں پر طاری ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کی دماغی کاہش ان کے ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لئے سم قاتل کا کام کرتی ہے۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی اگر ہم کوشش سے اپنے نونہالوں کو ان کی مشکلات کا حل بتا سکیں۔ اور انہیں ایسے طریقوں سے آشنا کر سکیں۔ جو سادہ عام فہم اور سودمند ہوں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوشش کرنے سے بچوں کو ایسی فضا سے دور رکھا جا سکتا ہے۔ جہاں ان کے ذہن پر اس قسم کے خوابوں کے خیالات مترتب ہو سکیں۔ لیکن اس کوشش کو کامیاب مان لینے کے بعد بھی اعتراضاً کہا جا سکتا ہے۔ کہ بچے کی تخیلہ ایک نہایت ہی بے ضرر شے مثلاً کسی جانور کی تصویر سے اس طرح متاثر ہو گی کہ قانون ایتلاف افکار کے ماتحت کبھی نہ کبھی وہ اسی بے ضرر شے کو اپنے لئے دماغی پریشانی کا موجب بنا لیگا۔ چارلس لیمب کے بچپن کا مشہور واقعہ ہے۔ کہ وہ ایک خوبصورت تصویر دیکھ کر سویا۔ مگر رات کو اس کی متخیلہ نے اسی تصویر کو ایسے رنگوں میں رنگ کر پیش کیا کہ اسی کے الفاظ میں "میں نے کبھی ایسا خوفناک خواب نہیں دیکھا جیسا اس رات" اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ایک نہایت تعجب خیز بات ہے کہ بچوں کے لئے ہر ایک بے معنی چیز

جو عام حالتِ بیداری میں کبھی خوف کا موجب نہیں بن سکتی نیم شعوری حالت میں تخیّل کے ہوّا سے بھی زیادہ مرعوب کن اور خوفناک ہو جاتی ہے۔ پھر اس پر مستزاد ان کے وہ امتیازی خصائل ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ اس قسم کے خوابوں کو کسی اور سے بیان نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے ذہن پر ایک ناقابل برداشت بوجھ کی طرح حملہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اچھے خوابوں کو بیان کرنے سے کبھی نہیں چوکتا لیکن بُرے خوابوں کے متعلق کسی کو رازدار بنالینا اس کی فطرت میں داخل نہیں۔ اس بات کا امکان کہ اس کا بیان مضحکہ خیز سمجھا جائیگا۔ اسے خاموش رہنے پر مجبور کرتا ہے اسی لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسے اس بات کا یقین دلایا جائے۔ کہ اس کا کوئی خواب مضحکہ خیز تصور نہیں کیا جائیگا۔ اور یہ کہ ہر طرح اس کی دلدہی اور دلجوئی کی جائیگی۔ اگر بچہ اس قسم کے خوابوں کو اپنی ماں کے آگے بیان کر دیتا ہے۔ تو یہ اس بات کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ کہ اسے اپنی والدہ پر پورا اعتماد ہے۔ اور ہمدردی کا یقین۔

ہم نے فرض کر لیا کہ اسے اس قسم کے یقین دلا دئے گئے ہیں۔ اب آگے کیا کرنا چاہئے۔ بعض لوگ جواب دینگے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں اس بات پر مصر ہوں کہ اوائلِ عمر میں مندرجہ بالا طریقے سے اسے وہ آسان اور عام فہم اصول بتائے جا سکتے ہیں۔ جن کی بناء پر وہ ضبطِ خواب کی طاقت حاصل کر سکے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے حقیقت میں اگر بچے کو بتا دیا جائے کہ ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور خود اس کے پاس ایسے وسائل موجود ہیں جن سے کام لیکر وہ اپنی تکالیف کا ازالہ کر سکتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان سے کام نہ لے۔ یہ ضروری ہے کہ جو الفاظ اس طریق پر عمل کرنے کے لئے بچے کو سمجھائے جائیں۔ وہ عام فہم اور مختصر ہوں۔ مثلاً یہ کہ یہ ایک خواب ہے۔ اب مجھے جاگنا چاہئے۔ اور اسی طرح کے ہزاروں فقرے تراشے جا سکتے ہیں بچوں کے معاملے میں ان ہدایات پر جو اوپر مذکور ہو چکی ہیں بہت احتیاط سے عمل کرنا چاہئے۔ کیونکہ بچے کی تخیلہ پختہ عمر اشخاص کی تخیلہ سے اس خاص معاملے میں جزوی اختلاف رکھتی ہے۔ ذاتی تجربات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اسّی فیصدی اس طریقے میں کامیابی ہوگی۔ تھوڑا عرصہ ہوا۔ کہ انگلستان کی ایک نمائش میں توہماتِ پیشین کے چند نمونے پیش کئے گئے تھے۔ انہی میں دو ایک پتھر تھے۔ جن میں سوراخ کئے گئے تھے۔ اور جن کی نسبت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان کو پہن کر سونے والا ہمیشہ خوشگوار خواب دیکھیگا ان پتھروں پر بچوں کی تصویریں بھی ثبت تھیں۔ اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مقصود یہ تھا۔ کہ زمانۂ پیشین ہی سے لوگ کوشش کرتے آئے ہیں کہ بچوں کو بُرے خوابوں سے نجات دلائی جائے۔ کیونکہ ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ

بچّوں کی تصویریں اس بات کی مظہر تھیں - کہ وہ بچّوں کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ میں نے گزشتہ سطور میں یہ فرض کر لیا ہے - کہ آپ عام طور پر بُرے خوابوں سے نجات حاصل کرنا پسند کرینگے لیکن میرے خیال میں ستّر فیصدی اشخاص میرے ہم خیال ہونگے - بلاشبہ فرائڈ کے مقلدین اس قوت ضبط پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ حقیقت میں اس قسم کے بُرے خواب مقصود ذہنی کی حیثیت رکھتے ہیں - اور ان کے بین السطور میں کتنی مافوق الفطرت قوتوں کی طرف سے انسان کو آنے والے خطروں سے مطلع کیا جاتا ہے اور ان خطروں کی پرواہ نہ کرنا بالکل اس بات کے مشابہ ہے - کہ ہم کسی خطرناک بیماری کے ابتدائی علامات سے بے نیاز ہو کر بیٹھ رہیں - ظاہر ہے کہ اس صورت میں بیماری کا دفعیہ بہت مشکل اور کبھی دفعہ ناممکن ہو جاتا ہے! اسی استدلال کی بنا پر وہ کہتا ہے - "ثابت ہوا کہ اس قسم کے خوابوں پر ایسا اختیار کلی حاصل کر لینا کہ ہم انکے اعادے کو حسب خواہش رد کر سکیں، خطرناک ہوگا - کیونکہ اس صورت میں ہم انکی حقیقی علت غائی کی پردہ پوشی کر رہے ہونگے - ضروری ہے کہ ہم بُرے اور خطرناک خوابوں کو ذہنی یا جسمانی خطرے کی علامت تصور کریں اور اس کے بعد مناسب تدابیر اختیار کریں - نہ کہ اس کے برعکس ہو اس قسم کے خوابوں کو روک دینے کی لاحاصل کوشش میں مصروف رہیں - جسکا نتیجہ یقیناً بُری صورت اختیار کر سکتا ہے"

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ بُرے خوابوںکو علامت تصور کرنا اسی وقت ممکن ہے کہ ہم ان مافوق الفطرت قوتوں پر پورا اعتماد رکھیں جنکو فرائڈ انسانی فطرت کے لئے ایک نعمت تصور کرتا ہے اور جبتک ہم ان قوتوں کی ماہیت سے پورے طور پر واقف ہو لیں اور علاوہ ازیں واقف ہو کر ان سے استفادہ حاصل کرنا نہ سیکھ لیں ان بُرے خوابوںکے متعلق مذکورہ بالا نظریہ سے متاثر ہونا اور اس پر عمل کرنا بے سود ہوگا۔

خورشید بیگم تنویر

رموزِ رندانہ

خود ہی میخوار، خود ہی میخانہ — خود ہی ساقی ہوں، خود ہی پیمانہ
میں ہوں اور جامہائے بادۂ حسن — میں ہوں اور نغمہائے مستانہ
میں ہوں اور نعرہ ہائے نوشا نوش — میں ہوں اور ہاؤ ہوئے دیوانہ
بے نیازِ سبو و ساقی ہوں، — محفلِ دل ہے رشکِ میخانہ
اے اثر اہلِ خرقہ و تسبیح — خاک سمجھیں رموزِ رندانہ

اثر صہبائی

تاروں بھری رات

کیا دلکشا ہے تاروں بھری رات کا سماں — تنویر کہکشاں سے ہے معمور آسماں
یوں مرتعش ہیں قافلہ ہائے سیارگاں — جیسے کسی حسین کی آنکھوں کی پتلیاں
ہیں پھول طشت چرخ میں بکھرے پڑے ہوئے
یا دامنِ افق میں ہیں موتی جڑے ہوئے

طاری ہے گو جہاں پہ فسونِ ردائے شب — یاقوت و لعل سے ہے مزین قبائے شب
ہے رشکِ نور ظلمتِ رنگیں ادائے شب — تاروں بھرا ہے گیسوئے لیلا نمائے شب
آنچل ہے سطحِ چرخ کسی گلعذار کا
اور وہ بھی پارہ ہائے جواہر نگار کا

طاری ہے کائنات پہ عالم سکون کا — گویا کہ خواب میں ہے ہر اک چیز مبتلا
کیفیتِ سرور میں ڈوبی ہوئی ہوا — دامانِ آبشار سے آتی ہے یوں صدا
جیسے کوئی رباب بجائے فراق میں
رو رو کے دوسروں کو رلائے فراق میں

وہ کیف کا ہجوم وہ انوار کا وفور — وہ روشنی کا فرش سرِ عرش دور دور
وہ تابشیں کہ ماند ہو رنگِ ضیائے طور — تارے چمک رہے تھے مثالِ نگاہِ حور
یکسر سفید پوش گلستاں بنے ہوئے
سب لالہ زار یاسمنستاں بنے ہوئے

تارے ہیں آسماں پہ زمیں پہ بہارِ گل — اللہ رے یہ جلوۂ رنگیں عذارِ گل
آخر نسیم آکے ہوئی ہم کنارِ گل — عنبر فشاں ہوا نفسِ مشکبارِ گل
برپا ہے باغ و راغ میں طوفانِ رنگ و بو
شیرازۂ نظر ہے پریشان رنگ و بو

عابدؔ

خود فراموش

(۱)

"نوروز مبارکباد" کی آواز بازگشت ہنوز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ کبھی یہ آواز کانوں کو بھلی معلوم ہُوا کرتی تھی۔ اور اس کے سازِ طرب پر دل کے اندر سینکڑوں نغمہ ہائے مسرت چھڑ جایا کرتے تھے لیکن آج کیفیت دگرگوں ہے۔ اس آواز سے طبیعت گھبراتی اور دل پریشان ہُوا جاتا ہے۔ عجیب انقلابِ زمانہ ہے تعجب تو یہ ہے کہ آج شام سے اس وقت تک جتنی بار یہ آواز کانوں میں آئی، میرے منہ سے بھی بے اختیار عادۃً یہی کلمہ نکلا۔ لیکن فوراً ہی ایسا معلوم ہُوا کہ کسی نے اندر ہی اندر کلیجہ مسل دیا۔ "کیا حقیقت میں آنیوالا سال میرے لئے خیر و برکت کا پیش خیمہ بنیگا؟" حیف صد حیف اب اس خیال سے بھی تسکین نہیں ہوتی۔

ان خیالات میں مستغرق نوجوان جولین اپنے مکان کے دروازہ پر پہنچ گیا۔ جہاں اس کا پرانا خادم والٹر اُس کے انتظار ہی میں کھڑا تھا۔ والٹر نے جھک کر سلام کیا۔ اور اپنے مالک کے ہاتھ سے کوٹ۔ ٹوپی اور بید لیکر مودّبانہ عرض کی۔ آج شام سے جو لوگ حضور کو بذریعہ ٹیلیفون نوروز کی مبارکباد دیتے رہے ہیں اُن کے ناموں کی فہرست کتب خانہ کی میز پر موجود ہے"

جولین کے سینہ سے بے اختیار ایک آہ نکلی۔ اور وہ والٹر کو پانی لانے کا حکم دیکر اپنے مطالعہ کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ والٹر پانی لیکر آیا۔ تو اپنے مالک کو سر جھکائے خاموش اور متفکر دیکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ گزر جانے کے بعد جولین نے سر اُٹھایا۔ والٹر کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیکر میز پر رکھ دیا۔ اور والٹر سے یوں کہنے لگا۔ "والٹر تم میرے بلکہ میرے خاندان کے پرانے معتمد ہو تم کو معلوم ہے کہ والدہ کی طرف سے جو ورثہ مجھے ملا تھا۔ پچھلے سال کے اندر اندر میں وہ سب صرف کر چکا۔ اور اس وقت سوائے اس مکان کے اور اس کے سامان کے میں دُنیا میں کسی اور چیز کا مالک نہیں۔ میں نے سخت ترین محنت برداشت کی۔ اور تین ڈرامے تصنیف کئے۔ لیکن افسوس ان میں سے ایک بھی مقبولِ عام نہ ہُوا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہ تم کو اور دوسرے ملازمین کو رخصت کر دوں۔ اور خود بھی اس مکان کو خیر باد کہکر کسی گمنامی کے گوشہ میں اسی مکان کے

کرایہ پر بسر کروں۔ اور اسی نامرادی کے عالم میں زندگی کے باقی دن گزار دوں۔ والٹر تمہاری کتنی تنخواہ واجب ہے؟"

والٹر۔ "صرف پندرہ روپے۔"

جولین نے اپنی جیبیں ٹٹول کر نہایت مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ "افسوس والٹر میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں۔ کہ تمہاری تنخواہ ہی دے سکوں۔ چودہ سال تم نے میری خدمت کی۔ اب تم سے جدا ہونے سے دلی رنج ہے۔"

والٹر۔ "جی ہاں۔ جدائی مجبوری ہے۔ کل صبح سے چلا جاؤنگا۔ اور جس وقت آپ کا مکان کرایہ پر اٹھ گیا آ کر تنخواہ لیجاؤنگا۔"

جولین۔ والٹر اگر اس وقت بھی میں تمہاری تنخواہ نہ دیسکا؟"

والٹر۔ "پھر مجبور ہو کر نالش کرنی پڑیگی۔"

یہ کہکر والٹر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور جولین اس بڈھے خادم کی بیوفائی دیکھ کر متحیّر رہ گیا۔ چند لمحوں کے لئے جملہ حسیات ظاہری و باطنی معطل ہو گئیں۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ خشکی سے دم حلق میں گھٹا جاتا ہے۔ ہاتھ بڑھا کر میز سے پانی کا گلاس اٹھایا۔ اور ایک سانس میں خالی کر دیا۔ پھر گلاس میز پر پٹخ دیا۔ اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"سال گزشتہ میری عمر میں کیسا کمبخت سال تھا۔ کہ میری تمام آرزوئیں ظالم نے خاک میں ملا دیں۔"

گرم و خشک دماغ پر ٹھنڈے پانی نے اپنا اثر دکھایا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دماغ میں دھواں بھر گیا۔ اس نے اپنا سر آرام کرسی کی پشت پر رکھ دیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کمرہ کی برقی روشنی یکایک گل ہو گئی۔ اور اس تاریکی میں کمرہ کے دوسرے سرے پر ایک نہایت لاغر شخص کی شبیہ حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ جولین نے پوچھا "کون؟"

شبیہ نے جواب دیا۔ "میں سال گزشتہ کی روح ہوں ابھی چند لمحے گزرے کہ تم مجھ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ افسوس میں تمہارے لئے کامرانی و مسرت کا مژدہ لایا تھا۔ میں نے حسن عمل کے بہترین موقعے تمہارے سامنے پیش کئے۔ لیکن آج تم اپنی بھدّی تدابیر کا الزام میرے سر لگاتے ہو۔ وقت گزشتہ کو برا کہنا ایک سنگین جرم ہے جس کی پاداش تم کو بھگتنی پڑیگی۔ لو سنو میں تم کو بد دعا دیتا ہوں۔ کہ سال نو مولود تمہارے لئے مسعود ہوگا لیکن سال کے اختتام پر اس کی یاد تمہارے صفحۂ دل سے قطعی محو ہو جائے گی۔"

جولین اپنی کرسی سے کود کر کھڑا ہو گیا۔ شبیہ غائب ہو چکی تھی اور کمرہ پھر برقی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

(۲)

ایک سال اور گزر چکا۔ گھڑی نے ٹن ٹن رات کے بارہ بجا دیئے۔ نیا سال شروع ہو گیا۔ جولین نے جوانتوت

ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ حیران تھا کہ یہ کیا منظر پیش نظر ہے۔ وسیع کمرہ۔ بیش بہا سامانِ آرائش۔ متعدد مردوں عورتوں کا مجمع جو اپنی وضع ولباس، تراش خراش، چال ڈھال کے لحاظ سے طبقۂ اعلےٰ کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ یہ تمام چیزیں ایک سے زیادہ حیرت زا و ہوش ربا تھیں۔

وہ خواب دیکھ رہا ہے یا کسی سنیما کے پردہ پہ متحرک صورتیں اور خوشنما مناظر نظر آرہے ہیں؟ جسقدر غور کرتا تھا اُس کا استعجاب بڑھتا جاتا تھا۔ اور ایک ایک چیز سے حقیقت کا ثبوت ملتا تھا۔ پھر کیا وہ آج کسی دوسرے کا مہمان ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ صاحب خانہ کی حیثیت رکھتا ہے غرض جسقدر غور کرتا تھا۔ اس راز کا عقدہ لاینحل معلوم ہوتا تھا۔

ایک عورت آگے بڑھی اور مسکراکر بولی "جولین! نوروز مبارک" اس کا جواب جولین کے مُنہ سے محض عادۃً نکلا لیکن وہ حیران تھا کہ مَیں اس عورت کے نام سے بھی واقف نہیں پھر اسقدر بے تکلفی کے کیا معنی؟"

قریب کے کسی کمرہ سے پیانو کے بجنے کی آواز کانوں میں آئی۔ اور جملہ حاضرین اس کمرہ سے باہر چلے گئے اب خلوت میں پھر جولین نے ایک بار محو شدہ ماضی کو یاد کرنے کی سخت کوشش کی۔ اُسے خوب یاد تھا کہ وہ نہایت درجہ مایوسی کے عالم میں گھر لوٹ کر آیا۔ اُسکا بیوفا ملازم ڈاکٹر اُسکو تنہا چھوڑکر چلا گیا۔ اسکو یہ بھی یاد تھا کہ دفور یاس میں اُسنے سال گزشتہ کو بُرا بھلا کہا۔ اور سال گزشتہ کی شبیہ نے ظاہر ہو کر اس کو بددعا دی کہ سال نومولود اس کے لئے مسعود ہوگا لیکن اختتام پر اس کی یاد اس کے دل سے محو ہو جائیگی۔ بس یہ خیال آتے ہی اُس نے فوراً اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ یہ وہی جیب تھی جس میں سے ڈاکٹر کی تنخواہ دینے کے لئے پندرہ روپیہ نہ نکلے تھے۔ اب اسی جیب سے ایک نوٹ بک برآمد ہوئی، جو بینک کے نوٹوں سے پُر تھی۔

اب تو جولین خوشی سے اُچھل پڑا۔ اس میں ذرا بھی شبہہ کی گنجائش نہ تھی۔ کہ وہ اب ایک دولتمند رئیس ہے اور آج نوروز کی خوشی میں اپنے نئے دوستوں کو دعوت دے رہا ہے۔ یہ عالیشان مکان اُسی کی ملکیت ہے۔ اس جمودِ حسّی و ذہنی اور سال گزشتہ کی خود فراموشی کے باعث جو مشکلات اس کی راہ میں حائل ہوگئی تھیں۔ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے کا اُس نے عزم بالجزم کر لیا۔ رقص وسرود کے کمرہ سے واپس آنے والوں میں سب سے پہلا ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا جس کو لوگ ہنری کہتے تھے۔ یہ مُسکراتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا۔ اور جولین کے قریب ایک کُرسی پر آبیٹھا۔ جولین نے سگار کیس اس کی طرف بڑھایا۔ جو اس نے شکریہ کے ساتھ لے لیا۔

اور پوچھنے لگا۔ "جولین آج تم کسی قدر پژمردہ خاطر ہو رہے ہو معلوم ہوتا ہے۔ اس دوران میں بہت زیادہ محنت کرتے رہے ..... شادی کے بعد سے ابتک تم سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔"

جولین۔ "جی ہاں اُس روز کے بعد آج ہی ملنے کا موقعہ ملا۔"

ہنری۔ "اُس روز تو تمہارا چہرہ خوشی سے اسقدر دمک رہا تھا کہ آج مقابلۃً اُترا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

جولین۔ "نہیں یہ تو آپ کا خیال ہے۔ میرا دل اب بھی نوروز کی خوشی اور دوستوں کی محبت میں ویسا ہی مسرّت سے لبریز ہے .... شادی کا منظر تو آپ کو خوب یاد ہوگا۔"

ہنری۔ "خوب"

جولین۔ "دلہن کے حسن کا کیا خوب عالم تھا؟"

ہنری۔ "کیا کہنا ہے! جنّت کی حور تھی یا پریوں کی شہزادی۔ اُس کی سنہری زلفوں اور سفید لباس کی یاد سے اب بھی رُوح کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔ اور دل پر ایک کیفیّت طاری ہوجاتی ہے۔"

جولین۔ "خیر غنیمت ہے۔"

ہنری۔ "اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

جولین (گھبرا کر) "جی ہاں۔ نہیں کچھ نہیں۔ میرا یہ مطلب ہے کہ اگر ایک شخص شادی کرلے۔ یعنی ایک شخص اتنا احمق ہو کہ وہ اس بیوقوفی کا ارتکاب کر بیٹھے .. اچھا فرض کیجئے آپ شادی کرلیں تو کم از کم اس نقصان کی تلافی ایک حدتک اسی خیال سے ہوجاتی ہے کہ بیوی تو خوبصورت ہے۔"

ہنری (اس لایعنی گفتگو سے پریشان خیال ہوکر) "جولین یہ کیا بہکی بہکی باتیں ہیں۔"

اسی وقت جولین کے اور دوست بھی اس کمرے میں داخل ہوئے۔ لڑکیوں میں سے ایک جس کو لوگ فلورا کہتے ہیں ہنری کے قریب آبیٹھی۔ جولین نے دیکھا کہ اس کا حُسن دلاویز تھا۔ پھر اس کی نگاہ دو اور عورتوں پر پڑی۔ جو اس وقت کمرہ میں موجود تھیں۔ ان میں سے صوفیا کا حسنِ نوخیز زہدشکن و ملائک فریب تھا۔ اور بہت ممکن تھا کہ جس عروسِ نو کا ذکر ہنری نے ابھی کیا تھا وہ یہی ہو۔

دوسری چہل سالہ فربہ اندام اور ملیح میری تھی۔

کیا یہ تینوں شادی شدہ تھیں؟ اور تھیں تو ان کے شوہر کون تھے؟

جولین نے غور سے دیکھا کہ میری اور فلورا کی انگلیوں میں شادی کی انگوٹھیاں موجود تھیں۔ لیکن صوفیا کا ہاتھ کچھ اس انداز سے رکھا ہوا تھا۔ کہ اس کی دوشیزگی یا منکوحہ ہونے کا ثبوت پوشیدہ تھا۔ اس وقت خدام نے ہر مہمان کے سامنے میز پر خالی گلاس برف۔ شربت اور کیک لاکر رکھے۔ سن رسیدہ ہنری نے جولین کو مخاطب کرکے یوں تقریر کی۔

"میرے عزیز دوست جولین! میں ان تمام دوستوں کی طرف سے جو آج یہاں جمع ہیں۔ تم کو مبارکباد دیتے ہوئے نوروز کی خوشی میں تمہاری "نئی نویلی دُلہن" کا جام صحت تجویز کرتا ہوں۔"

تمام حاضرین نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ اور اپنے اپنے گلاس ایک گھونٹ میں خالی کر دئے لیکن جولین کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر چور چور ہو گیا۔ ہنری نے دوسرا گلاس ہاتھ میں لیا۔ اور یہ کہتے ہوئے خالی کر دیا "میں اپنی بیوی کا جام صحت پیتا ہوں۔"

یہ سُنکر دوستوں نے چاروں طرف سے قہقہہ لگایا۔

ایک بار پھر رقص و سرود کے کمرہ سے پیانو کی مسحور کن آواز بلند ہوئی۔ اور لوگ مست ہو کر پھر ادھر متوجہ ہوئے صوفیا جولین کے قریب سے گذری اور اس دفعہ اس نے خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔ کہ اس کی انگلی شادی کی انگشتری سے خالی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھوڑی دیر میں کمرہ پھر خالی ہو گیا اور غریب جولین حیران و پریشان کھڑا رہ گیا۔ اب یہ امر یقینی ہو چکا تھا۔ کہ اس کی شادی ہو چکی۔ اور ان عورتوں میں سے جو یہاں موجود تھیں کوئی نہ کوئی اس کی بیوی تھی۔ ان سب میں صرف ایک لڑکی صوفیا ہی ایسی تھی جس کی طرف اس کا دل کھنچا جاتا تھا۔ اور جس کے شوہر بننے کی اس کو تمنا تھی صوفیا ابتک کسی دوسرے کی نہ تھی لیکن اگر کسی دوسرے کی نہ تھی۔ تو جولین کی بھی نہ ہو سکتی تھی کیونکہ جولین کی شادی تو ہو چکی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ فلورا خوبصورت عورت تھی۔ لیکن اُس کی طرف جولین کی طبیعت ہی مائل نہ ہوتی تھی۔ دوسرے ہنری کے ساتھ اُس کے تعلقات کچھ زن و شوہر کے سے معلوم ہوتے تھے۔

غریبطہ جس کو لوگ "چچی غریبطہ" کہتے تھے اتنی بوڑھی اور لاغر تھی کہ اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ اب رہی فربہ اندام چہل سالہ ہیری تو اس کی نسبت بھی کم ہی گمان ہوتا تھا۔

. . . . یکایک جولین کے دماغ میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا۔ جس سے اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"میں اسقدر جلد یعنی صرف ایک سال کے عرصہ میں اتنا متمول کیونکر ہو گیا۔ اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔ کہ میں نے دولت کی خاطر شادی کی ہے۔ اور بجائے گلرو معشوقہ کے زرد رو دولت میری زندگی کی شریک ہے۔ اُف اُف میرے تمام جذبات فاضلہ تباہ ہو گئے۔ اور اب یہ ایک کُھلی ہوئی بات ہے کہ ہیری میری بیوی ہے۔ یا غریبطہ۔"

اس نے مضطرب ہو کر گھنٹی بجائی۔ جس کے جواب میں ایک نوجوان خادم حاضر ہوا۔

جولین ۔ "دیکھو کل صبح سُورج نکلتے ہی کسی اخبار کے دفتر میں جاؤ اور سال گزشتہ کے تمام پرچے لاکر ہماری میز پر رکھ دو۔"

"بہت خوب۔ سر جولین" یہ کہکر خادم کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد جولین پر پھر حیرت کا عالم طاری تھا۔

"یہ اس نے کیا کہا۔ سر جولین۔ نہیں نہیں میں نے غلط سنا۔ خالی "جولین" کہا ہوگا۔ لیکن ایک نوکر اسقدر گستاخ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آدھا نام لے۔ نہیں نہیں میں نے خوب سنا۔ ضرور اس نے سر جولین ہی کہا۔ اوہو تو کیا مجھے نائٹ کا خطاب بھی مل گیا۔ کیا عجیب معاملہ ہے۔ آ "سر جولین" میرے نام کے ساتھ یہ خطاب سجتا تو خوب ہے" اس خیال سے اس کے چہرہ پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور قدآدم آئینہ کے قریب جو دیوار میں نصب تھا آکھڑا ہوا۔ ہنوز یہ استعجاب دور نہ ہوا تھا کہ کسی نے پیچھے سے شانہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "کون؟" جواب ملا "تمہاری جولیا"

جولین کے سامنے ایک کمسن شوخ چشم حوروش نظر سے نظر ملائے کھڑی تھی۔ جولین نے دیکھا کہ اس کی انگلی میں شادی کی انگشتری بھی چمک رہی تھی۔ بس بس بہت دیر سے جس کی تلاش تھی وہ آگئی۔ جولین نے خیال کیا کہ ضرور میری بیوی جولیا ہی ہے۔ جو ابتک ادھر ادھر مہمان نوازی و انتظام خانہ داری میں مشغول تھی۔ اس کے حسن گلوسوز و غمزۂ جگر دوز کی تیز کرنیں اس کے دل تک پہنچکر گدگدی پیدا کرنے لگیں۔

جولیا۔ "پیارے جولین! ابتو آپ بالکل مطمئن ہیں؟"

جولین۔ "پیاری جولیا! تمہارا شکریہ ..... "

جولیا۔ "پیاری! آ یہ لفظ تمہارے منہ سے سنکر میرا دل خوشی سے اچھل پڑتا ہے۔

جولین۔ "تو کیا اکثر یہ لفظ میں تمہارے لئے استعمال نہیں کرتا۔"

جولیا۔ "ہاں کیا کرتے تھے .... لیکن کچھ دنوں سے چھوڑ دیا ہے"

جولین۔ "مجھے کچھ شرم سی آتی ہے۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں ہروقت پیاری پیاری کرتا رہوں تو لوگ تم پر چوٹ ہی شاید پسند اور مجھ پر چھچھورپن کا الزام لگا دینگے"

جولیا۔ "اور اگر مجھے یہی پسند ہو تو؟"

جولین۔ "تو پھر میں بھی اپنی عادت بدل ڈالونگا" یہ کہکر اس نے اپنا ہاتھ نہایت بےتکلفی سے اس عورت کی کمر میں ڈال دیا۔ اور غایت درجہ سادگی سے بوسہ لے لیا۔ پھر غور سے اس کی سحر آگیں سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر دل میں خوش ہونے لگا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ خواہ کسی طرح اس سے شادی ہوئی ہو۔ لیکن انتخاب کچھ برا نہیں رہا ------

مہ جبین جولیا نے پھر اپنے مخملیں رخسار اس کے لبوں سے قریب تر کر دئے۔ اور اس نے پھر ایک بار بے جھجکے

ہو کر کہا۔

جولیا۔ "مجھے خبر نہ تھی کہ تم ایک بیوہ پر ایسی مہربانی کروگے"

یہ کہکر ظالم نے نازآفریں تبسم سے بیچارے جولین کے ازخودرفتہ دل پر سینکڑوں بجلیاں گرادیں۔

جولین (بیوہ کے نام سے چونک کر) "تو کیا تم بیوہ تھیں؟"

جولیا۔ "تو کیا آپ کو اس بات کے علم سے انکار ہے؟ کیا ابتدا ہی سے میں نے اس معاملہ میں صاف گوئی سے کام نہیں لیا؟"

جولین۔ "نہیں نہیں میری پیاری جولیا میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ مجھے معاف کرو۔ میں اس وقت کچھ اور سوچ رہا تھا حقیقت میں آج میری طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے اور سر چکرا رہا ہے"

جولیا۔ "اس وقت آپ کی طبیعت کا خراب ہونا نہایت بے موقع اور ازحد قابلِ افسوس ہے کل تو آپ کو دیوان میں بہت کچھ کام کرنا ہے"

جولین۔ "مجھے دیوانخانہ میں کام کرنا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں میں آجکل کوئی کام کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے آرام کی سخت ضرورت ہے"

جولیا۔ دیکھو جولین۔ اگر تم نے ایسی باتیں کیں تو پھر ہم تم سے ملنا چھوڑ دینگے۔

جولین۔ "تو پھر آخر میں کیا کروں؟ فرش بچھاؤں؟ تصویریں لٹکاؤں؟ میز سجاؤں؟ کرسیاں جھاڑوں؟ وہ کونسا ایسا کام ہے۔ جس کے نہ کرنے سے آپ مجھ سے ناراض ہو جائینگی؟"

جولیا (مسکراکر) "ابھی تو آپ فرماتے تھے کہ طبیعت اچھی نہیں۔ لیکن باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نہایت زوروں پر ہے۔ اللہ ری آپ کی ستم ظریفی اور تجاہل عارفانہ۔ میں نے غلطی کی کہ بجائے" دیوانِ عام "کے محض" دیوان "کہہ دیا۔ جس کو آپ نے پہلے تو دیوانخانہ بنایا۔ اور پھر لگے اس کے لوازم گنوانے۔"

جولین۔ "کیسا دیوانِ عام؟"

جولیا (پھر مسکراکر) وزیر اعظم اس وقت اگر آپ کی گفتگو سن پائیں تو کس درجہ ہراساں ہوں۔"

جولین۔ نے دل میں سوچا۔ "اوہو تو میں پارلیمنٹ کے دیوانِ عام[ف۵] کا بھی ممبر ہو گیا۔ العجب! العجب!!"

جولیا۔ "دیکھو جولین! دیوانِ عام میں تمہاری روزانہ حاضری ضروری ہے۔ اور تم کو میری خاطر پابندی کرنی پڑیگی۔"

جولین۔ "تمہاری خاطر؟"

جولیا۔ "ہاں ہاں میری خاطر۔ سیاسیات میری روح ہے۔ میری زندگی ہے۔ اور میں اپنی پارلیمنٹ کی ممبری پر ناز کرتی ہوں۔"

جولین۔ "تم؟"

ف۵ "ہاؤس آف کامنز" کے لئے عام طور پر "دارالعوام" کا لفظ رائج ہے لیکن ذومعنیں کا جو پہلو "دیوانِ عام" سے نکلتا ہے اس سے نہ نکلتا۔ ایڈیٹر

جولیا۔" ہاں ہاں ہیں —— اور اگر تم کو میرے ساتھ محبت ہے۔ تو تم کو بھی میرا اور میری پارٹی (فریق) کا ساتھ دینا پڑیگا۔

جولین۔" مجھے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ یہ امر میری طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ کہ میں حق و ناحق کسی پارٹی کا ساتھ دیتا رہوں۔"

جولیا یہ سُنکر آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ اور رومال سے پونچھ کر کہنے لگی۔ "ہائے افسوس مجھے یہ خبر نہ تھی کہ تم اِس ہمدردی سے انکار کر دو گے مجھے اس کا خوف ضرور تھا میں خوب سمجھتی تھی کہ اس کا باعث صرف تمہاری "نئی نویلی دُلہن" ہے۔"

جولیا یہ کہتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

جولین، حیران و پریشان جولین، دماغی کشمکش سے تھک کر کرسی پر آ بیٹھا۔ اور پھر سوچنے لگا۔ "یہ بیوی کا مسئلہ بھی کیسا عذاب جان ہو گیا۔ کسی طرح طے ہی نہیں ہوتا۔ جولیا بھی بیوی نہ نکلی۔ توبہ! توبہ!! اس مغالطہ نے مجھے کسقدر ذلیل کیا۔ خیر میں تو ایک حد تک معذور بھی ہوں لیکن اس کمبخت کو دیکھو جان بوجھ کر ایک غیر مرد سے جس کی شادی بھی ہو چکی ہو۔ اس درجہ اختلاط کی گفتگو۔ ایسی ہی عورتوں نے فرقہ اناث کو بدنام کیا ہے۔ یعنی اگر میں سیاسیات میں اُس کی رائے سے اتفاق کر لیتا تو گویا وہ میرے آغوش گناہ میں لطف زندگی سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے بالکل تیار تھی۔ خیریت ہوئی بچ گیا۔"

بس اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر چند لمحے اور اسی بیخبری میں گزرے۔ اور بیوی کا پتہ نہ چلا تو یقیناً ہوش و حواس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ جس کے جواب میں فوراً ایک خادم حاضر ہوا

جولین۔" لیڈی صاحبہ سے عرض کرو۔ کہ کیا چند منٹ کے لئے وہ یہاں تشریف لا سکتی ہیں؟"

خادم۔" بہت خوب۔ سر جولین"

اس وقت جولین کا دماغ متضاد جذبات کے بار بار اور جلد جلد پیدا ہونے اور مٹنے سے تقریباً مختل ہو چکا تھا پسینہ کے بڑے بڑے قطرے اسکی پیشانی پر بار بار نمودار ہو جاتے تھے۔ جن کو وہ رومال سے پونچھتا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں دباتا تھا۔ آخر اس نے اپنا سر آرام کرسی کے گدے دار تکیوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک آواز کانوں میں آئی۔

جھان! تان!!

آواز پہچانتے ہی جولین کا دل بیٹھنے اور کلیجہ پھٹنے لگا سر اٹھا کر دیکھا۔ تو گمان صحیح نکلا۔ فربہ اندام چہل سالہ بیوی اس کے نہایت قریب ایک کرسی پر بیٹھی۔ نہایت بھدے

طریقے سے مُسکرا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دل کباب ہو گیا۔

میری۔ "جولین جولین۔ اکیلے سو رہے ہو۔ لاؤ ہم اپنے جولین جولین کا سر دبا دیں۔"

یہ کہکر میری اپنے گداز ہاتھ بڑھا کر جولین کے خوبصورت سیاہ بالوں پر آہستہ آہستہ پھیرنے لگی۔ اور جولین ہے کہ ناکامی اور نامرادی کی زندہ تصویر بنا ہُوا لیٹا سوچ رہا ہے۔ "لو آخر وہی ہُوا جس کا خیال پہلے سے سوہان رُوح تھا۔ بس میں نے "محبت کی دیوی" کے بجائے "دولت کی دیوی" کی قربانگاہ پر اپنی جوانی نثار کر دی۔ اسی دولت کی دیوی کے یہ سارے کرشمے ہیں۔ اسی کی بدولت مجھے ثروت ملی۔ خطاب ملا۔ پارلیمنٹ کی ممبری ملی۔ اُف مجھ سے زیادہ احمق دُنیا میں کون ہوگا کہ بیش بہا عزّت اور نہ آنے والی جوانی کے بدلے میں نے یہ کھلونے خرید لئے۔ میرا ضمیر مجھ پر لعنت کرتا ہے۔"

میری اپنے کام میں نہایت ذوق شوق سے مشغول تھی۔ اور برابر جولین کے سر پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

جولین نے میری کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ کر دیا۔ اور بولا "میری یہ کیا کرتی ہو۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔ نہ مَیں نے کبھی ایسی باتوں کی خواہش کی ہے۔"

میری (کمال غرور سے تن کر) "اور اس سے پہلے مَیں نے ہی ایسا کب کیا۔"

جولین۔ "نہیں نہیں۔ لیکن دوسری عورتیں۔۔۔"

میری۔ "دوسری عورتیں؟"

جولین۔ "دیکھو دیکھو میری حسد بُری چیز ہے۔ میرے اُوپر بھروسہ کرو۔ اور میرے الفاظ سے مشتبہ معنی پیدا نہ کرو۔"

میری۔ نہیں جولین جولین مجھے تم پر اعتبار ہے۔

جولین۔ "تم میرا نام دو دو دفعہ کیوں لیتی ہو۔ کیا میں تم کو بجائے ایک کے دو نظر آتا ہوں؟"

میری کھڑی ہو گئی اور اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ "آج تو تم نہایت ناشائستہ گفتگو کر رہے ہو۔"

جولین۔ "یہ تو ایک نہ ایک دن پیش آنی ہی تھی۔ خدا معلوم میری آنکھیں پھوٹ گئی تھیں یا میں پاگل ہو گیا تھا۔ بس کل ہمارا تمہارا فیصلہ ہو جائیگا۔"

میری نے ایک اُنگلی ہونٹوں پر رکھ کر جولین کو بولنے سے منع کیا اور دوسرے ہاتھ سے کھُلتے ہُوئے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ جولین نے نظر اُٹھا کر دیکھا کہ دروازہ کھُلتے ہی لاغر اندام پنجاہ سالہ حچی غریطہ کمرہ میں داخل ہوتیں ان کے باسی چہرہ پر ایک وحشت خیز تبسّم نمودار ہُوا۔ اور فرمانے لگیں۔ "جولین کیا آپ نے مجھے ابھی یاد کیا تھا۔"

یہ سُنتے ہی غریب جولین کے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور وہ بیہوش ہو گیا۔

تمام مہمان جولین کی اچانک علالت سے سخت پریشان تھے۔ فوراً ہوش میں لانے کی تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے آنکھ کھولی، تو تمام مہمان اس کے گرد جمع تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ انہوں نے گزشتہ ایام میں دماغی محنت ضرورت سے زیادہ کی۔ کوئی تجویز کرتا تھا۔ کہ تبدیل آب و ہوا کی اشد ضرورت ہے۔ غرض ہر شخص اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ اور جولین لیٹے لیٹے خاموشی سے سب کی باتیں سُن رہا تھا آخر کار بولا۔

جولین۔ "میں آپ لوگوں کی ہمدردی پر شکریہ عرض کرتا ہوں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ کہ مجھ کو تبدیلی آب و ہوا کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے متعلق میں غربیطہ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اور ارادہ یہ ہے کہ آج ہی شب کو یہاں سے چلا جاؤں۔

لوگ یہ اشارہ پاکر کچھ دُور جا بیٹھے۔ اور غربیطہ نے جولین سے کہا۔

غربیطہ۔ "لیکن اب تو رات زیادہ جا چکی ۔ ۔ ۔ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟"

جولین۔ "تم میرے چلے جانے سے کچھ ناراض تو نہ ہوگی؟"

غربیطہ (کچھ سوچ کر) "نہیں"

جولین۔ "تمہاری عنایت کا شکریہ۔ لیکن تم مجھے پرلے درجہ کا احسان فراموش خیال کرو گی۔"

غربیطہ۔ "توبہ! توبہ!! احسان تو تمہارے ہی میرے اوپر ہیں۔"

جولین۔ "نہیں نہیں۔ یہ دولت۔ نائٹ کا خطاب۔ پارلیمنٹ کی ممبری یہ چیزیں کچھ معمولی تو نہیں۔ کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور رکھتی ہیں۔"

غربیطہ۔ "میرے عزیز جولین۔ میرے لئے فخر اور خوشی کا باعث ہے۔ کہ میں کسی طرح تمہارے کام آسکی۔ اور مدد کر سکی۔ لیکن یہ باتیں دوہرانے کے قابل نہیں۔ یہ محض تمہاری سعادتمندی ہے۔ کہ تم میری جانب سے ایسے خیالات رکھتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ہیں! یہ آواز کیسی آئی؟"

سب لوگ اس آواز کی جانب متوجہ ہوتے جو اُوپر کی منزل پر کسی کمرے سے آئی تھی۔ غربیطہ زینہ کی طرف دوڑی اتنے میں ایک دایہ ایک بچے کو گود میں لئے کمرہ میں آئی۔ بچہ سوتے سوتے بچھونے سے زمین پر گر کر رو پڑا تھا۔ چونکہ اتفاقاً چوٹ بالکل نہ لگی تھی۔ اس لئے عورتوں میں سے ہر ایک نے یکے بعد دیگرے اس کو گود میں لے لیکر پیار کیا۔ آخر میں صوفیا اس کو گود میں لیکر جولین کے پاس لائی اور بچے کو پیار کرنے کی خواہش اُس نے بھی ظاہر کی

جولین (مُنہ بنا کر) مجھے یہ عادت نہیں۔

اسی مجمع میں کسی نے کہا "دیکھو بچہ اپنے باپ سے کس قدر مشابہ ہے۔"

صوفیا:۔ "جولین تمہارے خیال میں کس کی شکل ہے؟"
جولین: "ملکہ وکٹوریہ کی"

یہ سنکر سب ہنس پڑے۔ اس کے بعد غریطہ نے تجویز کیا۔ کہ اب رات زیادہ جاچکی ہے۔ بس اب سب آرام کریں ..... سب ایک دوسرے سے رخصت ہوکر سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد خادم کسی ضرورت سے کمرہ میں آیا۔ تو جولین نے حکم دیا کہ "صبح بہت سویرے سے باہر جانے کا ارادہ ہے۔ میرے کمرہ میں جاکر اسباب سفر تیار کردو۔"

خادم آگے آگے گیا۔ اور آپ پیچھے پیچھے چلا۔ خادم زینہ پر چڑھا اور اوپر پہنچکر داہنی جانب مڑا۔ اور سب سے آخر کے کمرے میں داخل ہوا۔ جولین بھی وہیں پہنچا۔ راستہ میں جس چیز کو دیکھتا ہے نگاہیں اس سے نا آشنا ہیں۔ یہ خیال ہی نہیں آتا کہ کبھی یہ مکان پہلے دیکھا بھی ہے یا نہیں۔ کمرہ کے اندر پہنچا اور خادم کو یہ کہکر رخصت کردیا کہ "میں نے ارادہ تبدیل کردیا ہے۔ اس وقت اسباب باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صبح دیکھا جائیگا۔"

خادم کے باہر جاتے ہی اس نے دروازہ بند کیا۔ کپڑے اتارے اور قریب تھا کہ روشنی گل کرکے سو رہے کہ یکایک اس کی نگاہ ایک تصویر پر پڑی۔ جو اسکے پلنگ کے بالکل سامنے دیوار پر آویزاں تھی۔ غور سے دیکھا تو بھولی بھالی صوفیا کی مسکراتی ہوئی شبیہ تھی۔ جو جولین کے صفحہ دل پر بھی ایسی ہی صاف منقش تھی جیسی صفحہ قرطاس پر۔

(۳)

جولین جب صبح کے وقت نیچے اترا۔ تو تقریباً سب مہمان ناشتہ کرچکے تھے۔ اور رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سب سے پہلے غریطہ جانے کو تیار ہوئیں۔ اور کہنے لگیں "جولین! میں شاید تم سے کئی روز نہ مل سکوں میرے خیال میں تم کو تبدیل آب و ہوا کی سخت ضرورت ہے۔ جو صحت افزا مقام تم اپنے لئے پسند کرو۔ وہاں پہنچکر مجھے اطلاع ضرور دینا۔"

جولین:۔ "ضرور خدا حافظ" "خدا حافظ"

تھوڑی دیر میں تقریباً تمام مہمان رخصت ہو گئے سب سے آخر میں ایک پرائیویٹ گاڑی آئی۔ اور ہنری اور فلورا جو پہلے سے باہر سیڑھیوں پر انتظار کر رہے تھے۔ اس میں جا بیٹھے۔ جولین بھی گاڑی کے دروازے کے قریب کھڑے ہوکر ان سے باتیں کرنے لگا۔ جب انکا تمام اسباب رکھا جاچکا۔ تو جولین نے اپنے ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ لیکن ہنری نے مسکراکر پھر کھول دیا اور کہنے لگا "ابھی تو میں نے تمہارا شکریہ بھی نہیں ادا کیا۔ تمہاری صحبت میں گزشتہ ہفتہ بڑے لطف کے ساتھ گزرا"

جولین:۔ "یہ تو خانہ بے تکلف ہے جس وقت جی چاہے

تشریف لائیے۔"

یہ کہکر جولین نے خدا حافظ کہتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا۔ اور باتیں سے پھر گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

فلورا نے مسکراکر پھر دروازہ کھول دیا اور کہنے لگی

"جولین تم کو دروازہ بند کرنے کا بڑا شوق ہے۔"

جولین (شرمندہ ہوکر) کیوں کیا تم جانے کے لئے تیار نہیں۔ کیا کوئی چیز رہ گئی۔"

فلورا۔" ہاں ایک چیز ابھی باقی ہے۔" یہ کہہ کر فلورا اور ہنری دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اتنی دیر میں ایک انّا رات؟ الا بچّہ گود میں لئے آئی۔ اور مع بچّہ کے گاڑی کے اندر بیٹھ گئی اور گاڑی چل دی۔ ان کو رخصت کرنے کے بعد جولین پھر ملاقات کے کمرہ میں آیا۔ اور خانساماں سے دریافت کیا۔

"کیا سب مہمان رخصت ہوگئے۔

خادم۔" حضور صرف مس میرلین باقی ہیں۔"

مس صوفیا میرلین کمرے کے دوسرے سرے پر ایک زینہ سے اترتی ہوئی نظر آئیں۔ اور جولین انکے استقبال کے لئے آگے بڑھے

جولین (مسکراکر) آہا صوفیا تم نے ناشتہ سونے ہی کے کمرے میں کیا۔"

صوفیا۔" جی ہاں "

جولین۔" رات شاید کچھ تکان زیادہ ہو رات سونے بھی تو بہت دیر سے۔"

صوفیا۔" نہیں۔ میرے خیال میں تو رات سویرے سو گئے تھے۔"

یہ الفاظ کچھ اس لہجہ سے ادا کئے گئے تھے جس سے جولین کے دل کو تکلیف پہنچی۔ وہ سمجھ گیا کہ صوفیا کسی وجہ سے اُس سے ناراض ہے۔

جولین۔" تم مجھ سے کچھ ناخوش معلوم ہوتی ہو۔"

صوفیا۔" مجھے کیا ضرورت ہے (نوکر سے) جاؤ۔ جی گاڑی لاؤ۔"

خادم۔" حضور۔ گاڑی حاضر ہے۔ آپ کا اسباب بھی رکھ دیا گیا۔"

یہ سُنکر صوفیا نے سیدھا دروازے کی طرف رُخ کیا۔

جولین نے پھر آگے بڑھ کر سوال کیا۔" لیکن صوفیا آخر میں نے کیا کیا؟"

صوفیا۔ بس اپنے دل سے پوچھئے۔"

جولین۔" میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے کوئی بات ارادۃً ایسی نہیں کی جو تمہاری ناخوشی کا باعث ہو۔"

صوفیا حسین صوفیا نے ایک عجیب دلکش انداز سے جولین کی طرف دیکھا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر بغیر خدا حافظ کہے گاڑی والے کو روانگی کا حکم دیدیا۔ غریب جولین کا دل صوفیا کے

تیر نظر کا شکار ہو چکا تھا۔ اُسے خیال ہوا کہ جس وقت نظر سے نظر ملی۔ تو صوفیا کی آنکھیں اشکباری سے سُرخ تھیں صوفیا گاڑی جب نظر سے اوجھل ہوگئی تو جولین با دلِ ناخواستہ کیا۔ کہ مطالعہ کے کمرہ میں گیا۔ میز پر اخباروں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ جو ملازم نے اس کی ہدایت کے مطابق صبح سویرے ہی لا رکھے تھے۔ نہایت دلچسپی کے ساتھ ان کی ورق گردانی اور مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔ ان میں جو بات اور جو واقعہ پڑھتا تھا بالکل نیا معلوم ہوتا تھا۔ بہت سے ایسے نام مذکور تھے جن سے اس کے کان آشنا معلوم ہوتے تھے۔ کچھ سوچنے کے بعد سامنے کی الماری سے ڈھونڈھ کر ایک کتاب نکالی جس کے سرورق پر جلی قلم سے زریں حروف میں یہ نام لکھا ہوا تھا۔ " اسماء الرجال دورِ حاضرہ " پہلے جولین کا خیال تھا کہ اور لوگوں کے نام اس میں تلاش کرے۔ پھر اُس نے سوچا کہ وہ خود بھی کافی ذی رتبہ آدمی ہے۔ پہلے اپنا ہی نام کیوں نہ دیکھے تھوڑی سی تلاش کے بعد اس کی نظر اپنے نام پر پڑی۔ تو خوشی سے اچھل پڑا۔ کتاب کی تحریر حسب ذیل تھی۔

"مسٹر جولین مائلز۔ آپ سر فلپ مائلز آنجہانی کے چھوٹے بھائی مسٹر گاڈون کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ اسی سال ماہ جنوری میں سر فلپ نے انتقال کیا۔ اور اسی ماہ میں اخبار ٹائمز نے شائع کیا۔ کہ سر فلپ کے دونوں بیٹے امریکہ سے سولن نامی جہاز میں انگلینڈ واپس آتے ہوئے جہاز کے غرق ہو جانے کے باعث فوت ہو گئے۔ سرکاری اطلاع سے اس خبر کی تصدیق ہوتے ہی سر جولین سر فلپ کی تمام جائداد کے وارثِ قانونی قرار پائے۔ گورنمنٹ نے ان کو "بیرونٹ" کا خطاب بھی عطا فرمایا۔ اور وزیر اعظم نے ان کو اسی سال علاقہ ...... کی جانب سے دیوانِ عام کی ممبری سے مفتخر فرمایا آپ .... یونیورسٹی کے ممتاز گریجوایٹ اور نہایت عمدہ ذوقِ علمی رکھتے ہیں۔ آپ مصنف بھی ہیں۔ حال ہی میں آپ نے ایک ڈراما " بطلان " نامی تصنیف کیا ہے جس کو ..... کمپنی ..... تھیٹر میں دو ہفتہ سے برابر اسٹیج کر رہی ہے۔ ہر روز تماشائیوں کا اتنا ہجوم ہوتا ہے۔ اور مختلف روزانہ اخباروں میں اس قدر ریویو اس کے محاسن پر نکل رہے ہیں کہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عرصہ سے کوئی ڈرامہ اسقدر کامیاب نہ ہوا تھا۔"

جولین اپنی تعریفیں پڑھ پڑھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ یہ سارا کرشمہ دولت کا ہے۔ وہی جولین ہے اور وہی اسکی قابلیت وہی ڈرامہ ہے (صرف نام بدلا ہوا ہے) جو ایک سال پہلے ناکامی کا داغ کھا چکا تھا۔ کل بغیر دولت و اقتدار کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ آج ہر طرف سے تعریفوں کی بوچھاڑ ہے۔ اب سوچنے لگا کہ شادی کا تو کہیں اس میں ذکر ہی نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ کتاب شائع ہونے کے بعد شادی ہوئی ہو۔ لیکن کتاب کے دیباچہ کے آخر میں تاریخ اشاعت ۱۰۔ دسمبر تھی۔

یعنی صرف بیس دن کا عرصہ درمیان تھا۔ تقریباً ناممکن تھا کہ اس زمانے میں شادی ہو جاتی۔ تو پھر یہ کیا مذاق تھا کہ دوست بار بار بیوی کا ذکر کرتے تھے .... اس نے پھر یکم جنوری کا اخبار نکالکر پڑھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے اخبار کے آخری صفحہ پر نظر پڑی تو ایک اشتہار ایک تھیٹریکل کمپنی کی جانب سے نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا موجود تھا۔

"آج مسٹر جولین کا بالکل نیا ڈرامہ المعروف بہ "نئی نویلی دلہن" پہلی دفعہ اسٹیج کیا جائیگا۔ تمام ملک کے بہترین ممتاز اور نامور ایکٹروں اور ایکٹرسوں نے اس میں حصہ لیکر اس کو پوری طرح کامیاب بنانے کا قصد کیا ہے۔ مشہور مس صوفیا ہیرین ہیروئن کا پارٹ کریگی۔ اور لیڈی غریبہ مذاقیہ پارٹ دکھائینگی پلاٹ کی عمدگی۔ زبان کی خوبی اور جذبات نگاری محتاج تعریف نہیں صرف مصنف کا نام ہی کافی ہے ...."

بس اب تمام راز منکشف ہو چکے۔ ناظرین سمجھ گئے ہونگے۔ کہ جولین کی شادی نہیں ہوئی تھی جس "نئی نویلی دلہن" کی اس کو مبارکباد دی گئی تھی وہ اس کی نئی تصنیف کا نام تھا اس نے ارادہ کیا کہ اسی شب اپنے ڈرامے کو اسٹیج ہوتے دیکھے۔ چنانچہ اسی وقت اپنے ارادہ سے تھیٹر کے منیجر کو ٹیلیفون کے ذریعے سے مطلع کیا۔ جس نے غایت درجہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو مدعو کیا۔

تماشہ ختم ہونے کے بعد جولین صوفیا کے پرائیویٹ کمرہ میں پہنچا صوفیا نے بڑی بے توجہی سے اسکا استقبال کیا۔ آخر جولین کی سخت خوشامد پر اس نے بتایا "رات تم نے ہم سے ایک وعدہ فراموشی کی"

جولین: "خدا کے لئے یہ تو بتاؤ کہ وہ وعدہ کیا تھا"

صوفیا۔ "یہ تو میں ہرگز نہ بتاؤنگی۔"

جولین صوفیا کے پیروں کے قریب گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اُسنے صوفیا کے نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر نہایت لجاجت کے ساتھ کہا "میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے قطعی یاد نہیں کہ میں نے تم سے کیا وعدہ کیا تھا۔ رات کی غشی کے بعد سے میرا دماغ کچھ اس درجہ کمزور ہو گیا ہے کہ مجھے اپنی یاد پر بھروسہ باقی نہیں رہا۔ خدا کیلئے میرے حال پر رحم کرو۔ اور بتا دو کہ میرا وعدہ کیا تھا۔"

صوفیا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اس نے اپنی آنکھیں رومال سے ڈھک لیں۔ اور منہ پھیر کر کہنے لگی۔

"جولین مجھے کہتے ہوتے شرم آتی ہے اور تم کو میری اس پریشانی سے خوشی ہوتی ہے ..... تم نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ نوروز کی رات کو ..... مہمانوں کی موجودگی میں منگنی کی انگوٹھی کس کی انگلی میں پہناؤ گے۔"

جولین کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اُس نے اپنی جیب سے ایک بیش قیمت انگوٹھی نکالی۔ اور صوفیا کے بائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں پہنا دی۔ اور صوفیا نے شرما کر اپنا منہ جولین کی آغوش میں چھپا لیا۔

تنویر میرٹھی

زُلیخا

(عالم یاس میں)

وہ زلیخا، وہ پرستارِ جمالِ یوسفیؑ — مسند زرّیں پہ ہے بیٹھی ہُوئی اندوہگیں
چشم پُرنم، زرد چہرہ، ہونٹ سوکھے دل اُداس — بن رہی ہے دردِ دل کا آئینہ اس کی جبیں
سر بزانو اس طرح محوِ خیالِ یار ہے — فکر اپنی جان و تن کی مطلقاً اُس کو نہیں
ڈھل گیا ہے سر سے آنچل، بال ہیں بکھرے ہُوئے — دوش پر لہرا رہی ہے اُس کی زلفِ عنبریں
گوشۂ خلوت میں تنہا ہے وہ وقفِ اضطراب — غمگسار اس وقت ہے کوئی، نہ کوئی ہمنشیں
دیکھتی ہے جب کبھی حسرت سے سوئے آسماں — کھنچ کے آ جاتی ہے لب تک دل سے آہِ آتشیں
دل کو ہاتھوں سے دبائے، غرقِ بحرِ فکر ہے — کہہ رہی ہے اپنے دل سے خود بخود وہ نازنیں

وائے محرومی! رہی محروم وصلِ یار سے — وائے قسمت! اب کوئی تدبیر بن پڑتی نہیں
ہائے کیسی میں زمانے بھر میں رُسوا ہو گئی — اب عزیزِ مصر کی بھی وہ نظر مجھ پر نہیں
اقربا دیتے ہیں طعنے، خندہ زن ہے اِک جہاں — اپنے بیگانے ہُوئے، کوئی بھی اب میرا نہیں
کون سُنتا ہے حدیثِ خونفشانیہائے چشم — کس کو یا رب! میں دکھاؤں یہ بہارِ آستیں
حیف! میں بیٹھی رہوں عشرتکدے میں اس طرح — اور جائے قید خانے میں نگارِ مہ جبیں
خاک ایسی زندگی پر، جی کے اب میں کیا کروں؟ — سیر ہوں میں زندگی سے لطف جینے کا نہیں
زندگی ہے اِک عذابِ جاں، الٰہی رحم کر! — اب اٹھا لے آسماں ہی یا نگل جائے زمیں

میں وہی ہوں ملکۂ آفاق تھا جس کا لقب — سامنے میرے جھکا کرتی تھی ہر اک کی جبیں
میں وُہی ہوں حُسن کی دیوی جسے کہتے تھے سب — سر بسجدہ روبرو میرے تھے دُنیا کے حسیں

میں وہی تو ہوں کہ جس پر جان دیتا تھا عزیز — میری ہی صورت تو تھی ہر وقت اس کے دلنشیں
ہاں وہی میں ہوں کہ جس کی اک نگاہِ لطف کے — رات دن رہتے تھے خواہاں مصر کے سارے حسیں
اب وہی میں ہوں کہ ہوں اک پیکرِ جوشِ جنوں — اب وہی میں ہوں کہ ہوں افسردہ و اندوہگیں
اب وہی میں ہوں کہ ہوں منت پذیرِ بیکسی — اب وہی میں ہوں کہ مجھ کو پوچھتا کوئی نہیں
ہائے میں نظروں سے گر کر خلق میں زندہ رہوں — پھٹ پڑے اے کاش! میرے سر پہ چرخِ چنبریں

خیر آ ہی جائے گی قضا جس دم مری، مر جاؤں گی — سخت حیرت ہے مجھے، یہ بھید کیوں کھلتا نہیں
کس لئے ہنستی ہے دنیا میرے حالِ زار پر؟ — حسن کی تاثیر سے شاید کہ وہ واقف نہیں!
کیا انوکھی ایک میں ہی ہوں پرستارِ جمال! — کیا کوئی صورت نہیں دل میں کسی کے جاگزیں؟
کیا اکیلی میں ہی دنیا میں ہوں پابندِ جنوں؟ — کیا کوئی دیوانۂ الفت زمانے میں نہیں؟
آج جو دیتی ہیں مجھ کو طعنہ ہائے دلخراش — اُن کے دل میں کچھ خدا کا خوف بھی مطلق نہیں
کل انہیں نے کاٹ لی تھیں اپنی اپنی انگلیاں — آج یہ اُن کی ڈھٹائی! آفریں صد آفریں!!
میری حالت پر زنانِ مصر ہنستی ہیں، ہنسیں — میں گرفتارِ محبت ہوں، مجھے پروا نہیں

ہاں ٹھہر اے ناامیدی! کیوں ستاتی ہے مجھے؟ — تا کجے رکھے گی مجھ کو اس طرح اندوہگیں؟
آ مری امیدِ رفتہ، دے مجھے پیغامِ عیش — بس کرم اے یاس! اب تجھ سے مجھے مطلب نہیں
اے خیالِ یار، اے چشم و چراغِ زندگی! — آ، کہ تیرا منتظر ہے یہ دلِ اندوہگیں
آ، کہ تو ہے ناخدائے آرزو، اے یادِ دوست! — ڈوبتی ہے بحرِ غم میں کشتیِ جانِ حزیں

یہ ہجومِ نامرادی اور یہ انبوہِ غم!! — کس مصیبت میں ہے میری جان، او جاں آفریں!
ہو کسی صورت تو قلبِ مضطرب کو کچھ سکوں — موت ہی آجائے یا رب! وصل اگر ممکن نہیں

راز

جنسِ ایمان

(۱)

ہم پچیس محرروں نے "بندے ماترم" کہکر انگریزی سوداگر "سینڈ کمپنی" کی ملازمت سے کنارہ کشی کی۔ ملک میں شہرت ہوگئی۔ ہندوستانی اخبارات کے کالم ہماری تعریفوں میں سیاہ ہونے لگے۔ لیڈروں نے ملک و قوم سے ہماری پُرزور سفارشیں کیں، اور ہموطن حسب توفیق امداد دینے لگے۔

لیکن جس جوش نے مجھے مصیبت کا بوجھ سر پر اُٹھانے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اُس کے فرو ہوجانے پر بھی میں اپنی قوم کے آگے ہاتھ نہ پھیلا سکا۔ ملازمت کی ہر چند جستجو کی۔ لیکن کہیں روزی کی صورت نہ ہوئی۔ ضعیف العمر ماں نے کہا۔ "بیٹا! تم نے کیا سوچ کر ملازمت چھوڑ دی۔ کیوں گھر آئی ہوئی لکشمی کو ٹھکرا دیا۔"

میں کیا جواب دیتا، کیا کہتا، سرلا ہنستی ہوئی ہمیں کھانا کھلاتی۔ لیکن آپ دن بھر میں ایک مرتبہ کھایا کرتی۔ میرا دل مغموم رہنے لگا۔ اُس کا پھول سا چہرہ کملانے لگا ہائے ہائے کیا سوچ کر میں نے ایسا کیا تھا۔

سرلا کے بھائی متمول تھے۔ اس لئے جہانتک ممکن ہوتا میں اُن کے گھر نہ جاتا تھا۔ اُنہوں نے مجھ سے ناخوش ہوکر ایک طرح سے تعلق ترک کر رکھا تھا لیکن سرلا تو اُن کی بہن ہی تھی۔ میرے دل میں قسم قسم کے خیالات پیدا ہوتے تھے۔ میں اپنے آپ سے بیحد ناراض تھا۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "سُنتی ہو! تم مجھ کو اور مایوس کئے دیتی ہو، تم کچھ روز کے لئے اپنے بھائیوں کے گھر چلی جاؤ۔ اپنی حالت درست ہوتے ہی تم کو فوراً بُلا لونگا۔"

اُس نے ہنس کر جواب دیا۔ "کیوں تمہیں عزت دار ہو، میں بھائیوں کی روٹی کس طرح کھاؤں؟"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے میں نے کہا "کیوں؟ اس لئے کہ تمہارا نالائق خاوند تمہیں روٹی کھلانے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

اُس نے مسکرا کر کہا "کیا آپ کے انہیں خیالات نے دھرم کے لئے ہڑتال کی ہے؟"

سرلا نے اُس روز سے دونوں وقت کھانا شروع کر دیا۔ لیکن جو کچھ گھر میں تھا وہ دو ماہ کے اندر صرف ہوگیا ہر آنے والی گھڑی کا خوف لگا رہتا تھا کہ کیا کریں گے،

کہاں سے لائینگے ؟ بعدہٗ جب سرلا کو اس سے آگاہی ہو گئی تو میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا کرتا تھا وہ میرے جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھتی تھی۔ بدن پر بہت سی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ اور آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو روزانہ میرے جسم پر گرا کرتے تھے میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے دل میں کیا کیا خیال گذرتے تھے۔ میرے تن بدن میں ایک آگ سی لگ رہی تھی۔

(۲)

آج خدا نے روزی کا باب نہ کھولا تو کل فاقہ کرنا ہوگا اپنی تو کچھ فکر نہ تھی۔ فکر تھی دراصل اُن بدنصیبوں کی جو میرے آسرے پر جیتے تھے۔ بُوا ہمیں ہمت دلاتی تھیں۔ مگر دل میں وہ جس تکلیف کو محسوس کر رہی تھیں اس سے میں آگاہ تھا۔ جس کے ساتھ میں نے شادی کی تھی۔ اُس کے مُنہ میں ایک لقمہ تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ افسوس اسے پر ماتما!

شام کے بعد مکان سے نکلا۔ بوندیں پڑ رہی تھیں آسمان ابر آلود تھا۔ راستہ میں کیچڑ اور پھسلن تھی۔ باہر جاتے وقت سرلا نے پوچھا۔ "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا۔ کہ "ایک شخص نے اسی وقت ملاقات کا وعدہ کیا ہے ممکن ہے کہ کچھ کام مِل جائے۔" دراصل میں نے جھوٹ بولا تھا سرلا نے میری بات سُنکر کچھ شبہ نہ کیا۔ میں برآمدہ میں جوتا پہن رہا تھا۔ گھر کے اندر بُوا نے آہستہ سے کہا۔

"بہو! تو نے اُسے کیوں جانے دیا! مصیبت کی وجہ سے کہیں کچھ ...." سرلا نے جواب دیا۔ بُوا جی! پاگل ہوگئی ہیں۔ وہ کیا ہم دونوں کو چھوڑ کر کہیں جا سکتے ہیں۔ کہیں نوکری کی تلاش میں گئے ہیں! ادگا دیوی کرپا کریگی۔"

میں اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہُوا باہر نکلا۔ دن کے وقت مزدوری کرتے ہُوئے شرم آتی تھی، آج رات میں نے عزت اور بیعزتی کا کچھ خیال نہ کیا۔ رات میں کسی کا بوجھ ہی اُٹھا کر شکم سیری کی فکر کرونگا۔ اس وقت کون دیکھنے والا ہوگا؟ ہاتھ پیر کے ہوتے بھوکوں مرنا یہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ سرلا نے درست کہا تھا اُن دونوں کو کس کے سپرد کرونگا۔"

بارش میں بھیگتا ہُوا کوچہ و بازار میں مارا مارا پھرنے لگا۔ لیکن مزدوری ہاتھ نہ آئی۔ ایک دُکان سے ایک مالدار آدمی بہت سے کپڑے خرید کر باہر نکلا۔ میں اُس کے قریب پہنچا لیکن مُنہ سے کوئی بات نہ نکلتی تھی کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھ کر میں اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اُس نے شک کی نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں صاحب"

میں نے خوب کھانس کر لرزتی ہُوئی آواز سے کہا۔

"مزدور چاہیئے ؟" وہ بولا "کیا لوگے ؟"

مَیں نے کہا۔ "صاحب! میرے گھر میں اناج نہیں۔ آپ کا بوجھ اُٹھا کر دو پیسے مل جائینگے، تو کچھ چنے وغیرہ . . . ."

اُس نے کہا۔ "کیوں مذاق کرتے ہو؟ تم نے بھیک منگوں کی آواز کی تو خوب نقل اُتاری ہے۔ لیکن پوشاک ٹھیک نہ کر سکے!"

مَیں نے اپنی پوشاک کی طرف دیکھا۔ بیشک مَیں نے غلطی کی تھی۔ اس بھیس میں بوجھ کا کام نہیں چل سکتا ہے۔ اُس شخص کے چلے جانے کے بعد مَیں بہت دیر تک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اب بارش بھی خوب زور سے ہونے لگی تھی۔ مَیں راستہ ہی میں ایک برآمدے میں کھڑا ہوگیا۔ سڑک پر کوئی آدمی نہ تھا۔ ایک کُتّا میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرہ پر بھی پژمُردگی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی میری طرح مصیبت زدہ ہے۔

مَیں اُس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ محبت کی وجہ سے زمین پر لوٹنے لگا۔ میرے پاؤں چاٹنے لگا۔ اور دم ہلانے لگا۔

بارش تھم گئی۔ مَیں گھر کی طرف چلا۔ کچھ دُور آگے بڑھ کر دیکھا کہ کُتّا پیچھے چلا آرہا ہے۔ مَیں اُسے دیکھ کر بھاگا۔ وہ دُم ہلانے لگا۔ مَیں نے قدم اُٹھایا تو وہ بھی میرے پیچھے چلا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ میرے گھر آکر فاقہ کشی کرنا ہوگی؟ مَیں کچھ دُور آگے گیا۔ مگر اُس نے اب بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہُوا۔ کُتّے کے مَیں نے ایک ٹھوکر ماری۔ وہ پھر زمین پر لوٹ کر دم ہلانے لگا۔ مجھ سے ناراض نہ ہُوا۔ اُس نے مخلصانہ نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

کُتّا میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میں پھر کھڑا ہوگیا۔ وہ میرے پاؤں پر گر کر خوشامد کرنے لگا۔ مَیں بھی اس پر ناراض نہ ہُوا۔ بلکہ چمکار کر کہا۔ "اچھا چل! جہاں تین بھوکے مرتے ہیں وہاں چوتھا اور سہی!"

وہ بیحد مسرور معلوم ہوتا تھا۔ اس مرتبہ وہ چور کی طرح پیچھے نہیں چل رہا تھا۔ بلکہ کبھی وہ آگے کی طرف دوڑتا تھا۔ اور کبھی میرے دائیں بائیں، درمیان وہ کبھی کبھی بھونکتا بھی تھا۔ اُسے بڑی خوشی تھی کہ مَیں نے اُسے ساتھ چلنے کا حکم دیدیا۔

وہ ایک طرف سے ایک پوٹلی لیکر آیا۔ میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ پوٹلی میں کچھ ہو۔ شاید خدا نے اسی لئے اس کو میرے پاس بھیجا ہو۔"

(۳)

ہاں! دولت تھی، دس روپیہ کے چھ نوٹ، مَیں خوشی کی وجہ سے تالیاں بجا کر ناچنے لگا۔ کُتّے کو پیار سے

گود میں اٹھا لیا۔ کیسی خوشی کا عالم تھا۔ لیکن اسی وقت طمع دُور ہو گئی۔ یہ روپیہ کس کا ہے؟ کون اس کا مالک ہے؟

اُن نوٹوں کے ساتھ ایک دستاویز بھی تھی گیس کی کی روشنی میں مَیں نے مالک کا نام پڑھا۔ اور پتہ بھی دیکھا۔ راستہ میں جاتے ہوئے اُس سے پوٹلی گر گئی ہے تھوڑی کوشش کرنے سے یہ پوٹلی اُس کے مالک کو دی جا سکتی ہے۔

پھر خیال کیا۔ بھگوان نے جب بھوکے کے سامنے اناج رکھا ہے۔ تو کیا اُس اناج کا منظور نہ کرنا گناہ نہیں ساتھ ہی دونوں غریب عورتوں کا خیال آیا۔ اس روپیہ کے واپس کرنے سے اُنہیں اور مجھے فاقہ کرنا ہوگا۔

لیکن یہ ایمانداری نہیں۔ اس سے تو بھیک مانگنا اچھا ہے۔ اس روپیہ کے حاصل کرنے میں ہمیں کوئی محنت نہیں اٹھانا پڑی۔ مگر جن کا یہ مال ہے۔ وہ نہایت مالدار ہیں۔ دستاویز سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ مَیں اُن کو بعد میں یہ روپیہ واپس کر سکتا ہوں۔ اُن کے اس ساٹھ روپیہ سے میرا تین ماہ کا کام چل سکتا ہے۔ اس درمیان میں نوکری مل جانے پر اُن کا روپیہ واپس کر دونگا۔ اب اس وقت ہاتھ آئی ہوئی چیز کو نہ چھوڑنا چاہیئے۔ اچھا روپیہ کو اپنے پاس رکھونگا۔

گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ جس ہاتھ میں پوٹلی تھی وہ ہاتھ گویا جلا جاتا تھا۔ اگرچہ برابر مینہ سے بھیگ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل سردی کی وجہ سے میں کانپ رہا تھا۔ لیکن اس وقت تمام جسم سے آگ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں مَیں نے دل کو مضبوط کر لیا تھا۔ ڈوب کر مرنا ہوگا تو مرونگا مگر اس روپیہ کو ہرگز نہ چھوڑونگا۔ عورتوں کو فاقوں سے ہلاک نہ ہونے دونگا۔ بعد کو چاہے دوزخ میں جانا پڑے۔ اس دنیا میں تو لوگ یہ نہ کہیں گے کہ مَیں نے اپنی بیوی اور بڈھی ماں کو بھوکوں مار ڈالا۔

گلی کے موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ کتا اچھلتا کودتا ہوا جا رہا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ رگوں میں خون تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ زبان خشک ہوئی جاتی تھی۔ سر میں چکر آ رہے تھے۔ اتنے میں محلہ کے چوکیدار نے میرے جوتے کی آہٹ پا کر آواز دی۔ "کون ہے؟"

اگر مَیں گیس کے کھمبے کو نہ پکڑ لیتا تو یقیناً گر پڑتا۔ میری حالت کو دیکھ کر کتا میرے قدموں میں لوٹنے لگا۔

پہرہ والے نے دوبارہ دریافت کیا۔

"کون ہے؟"

مَیں نے فوراً اُس پوٹلی کو جیب میں رکھ لیا۔ مَیں ڈر رہا تھا کہ کہیں جیب سے نوٹ نہ گر پڑیں۔

چوکیدار نے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "بابو آپ ہیں؟"

اتنی رات ؟"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہنسنے لگا۔

پہرہ والے نے کہا " بابو! سلام۔ آپ بیمار ہو جائینگے۔ گھر جائیے "

(۴)

سرلا نے کہا " کیا کرتے ہو ؟ کیا دیوانے ہو گئے ہو۔ کپڑے کیوں نہیں بدلتے "

میں نے اُس کے سامنے نوٹ رکھ دئے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔

سرلا نے کہا " دیکھئے نا ' محنت کرنے سے ہی بھگوان مہربانی کرتے ہیں۔ اچھا کپڑے تو بدلو "

کُتا ابتک پیچھے تھا ' سرلا نے اُسے نہ دیکھا تھا۔ وہ میرے پاس آرہا تھا۔ سرلا نے ڈرتے ہُوئے کہا " ارے یہ کیا ؟"

میں نے خوب کوشش کر کے زبان کو تر کیا۔ اس کے بعد بولا۔ " سرلا آج سے یہ ہمارے ہاں رہیگا۔ اگر آج یہ نہ ملتا تو کل ہم سب کو فاقہ کرنا پڑتا "

سرلا نے کہا " کیوں ؟ "

میں نے اُس سے تمام باتیں کہہ دیں۔ اس کے چہرہ کو دیکھکر مجھے ہمت نہ ہوئی کہ میں اس روپیہ کو ہضم کرسکوں۔ میں نے اس سے کہا۔ کہ جس وقت ہمارے پاس روپیہ آجائیگا۔ ہم انہیں واپس کر دینگے۔ بھگوان نے ہمیں دُکھ سے بچانے کے واسطے یہ روپے بھیجے ہیں "

سرلا نے کہا۔ " افسوس ! افسوس !! "

اُس کی ایک ہی بات سے میں بدحواس ہوگیا۔ اور مجھے معلوم ہُوا کہ میرے سامنے ایک دیوی کھڑی ہے۔ میں چلنے لگا۔ اُس نے ہاتھ پکڑکر کہا " کہاں جاتے ہو ؟ "

میں نے کہا " نوٹ واپس کرنے کو "

اُس نے کہا۔ " کل صبح دے آنا۔ اس وقت کپڑے بدل ڈالو "

میں نے کہا " سرلا! جل مروں! نہیں میں ابھی جاؤنگا۔ تمہارے لئے گناہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوگیا کہ تم فاقوں میں خوش ہو " اُس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور میں چلدیا۔

(۵)

چوکیدار ' بھوت ' پریت آدمی اب کسی کا خوف نہ تھا۔ اس وقت بھی پہلے کی طرح ہاتھ پاؤں اور بدن سے آگ نکل رہی تھی۔ حرارت کا امتحان ختم ہوچکا تھا۔ کُتا بھی ساتھ چل رہا تھا۔ اس وقت شاید اُسے خوشی تھی۔

آدھی رات کے وقت ایک رئیس آدمی کو جگانے میں میں نے کچھ تامّل نہ کیا۔ وہ بہت خوش ہُوئے۔ نوٹ ملنے پر نہیں۔ بلکہ دستاویز پاکر۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ مجھے چالیس روپیہ انعام میں دینے لگے۔ مَیں نے اُن سے کہا۔

"مَیں سینڈر کمپنی کی ہڑتال کا ایک آدمی ہوں مجھے اس وقت تک کوئی ملازمت نہیں ملی۔ گھر میں اناج تک نہیں۔ اس پر بھی مَیں نے بھیک مانگنا گوارا نہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کل .... جانے دیجئے۔ اب چلتا ہوں۔"

وہ شرمندہ ہو گئے۔ اور مجھ سے معافی مانگنے لگے۔ اُنھوں نے کہا۔ مجھے اپنے ایک لڑکے کے لئے ایک اُستاد کی ضرورت ہے۔ آپ دس روپیہ پیشگی لئے جائیے اور کل سے پڑھانا شروع کر دیجئے۔ ایک ہفتہ ہی میں ہمارے دفتر میں کوئی جگہ آپ کو مل جائیگی۔"

(۶)

سرلا نے کہا۔ "انعام!"

مَیں نے کہا۔ "نہیں پیشگی تنخواہ۔ کل سے اُن کے لڑکے کو تعلیم دینی ہوگی۔ جس نے اتنے دنوں کی مصیبت برداشت کی۔ اور ذرا مغموم نہ ہوئی۔ وہ آج رونے لگی۔ آنسو پونچھتے ہوئے اُس نے کہا۔

"بھگوان کی کرپا آپ نے دیکھی! اُس نے اس کُتّے کے ذریعہ سے خوراک بھیجی ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "اور تم جیسی دیوی کے لئے مجھے چور نہ بننا پڑا۔"

اُف! مَیں لرز اُٹھا۔

(ترجمہ) ہُشام

غزل

مردہ دل بھی دِل شگفتہ ہو میانِ کوئے دوست
زندگی اُن کی ہے جو ہیں ساکنانِ کوئے دوست

کیا کریں واعظ بیاں ہم عزّ و شانِ کوئے دوست
کہتے ہیں رضواں جسے ہے پاسبانِ کوئے دوست

ایک سنگِ آستاں سے کام کِس کِس کا چلے
مجھ سے دیوانے بہت ہیں ساکنانِ کوئے دوست

غیر ممکن ہے جگا دے فتنۂ محشر اُنہیں
سوئے ہیں کچھ اس طرح خوابیدگانِ کوئے دوست

خاک اُڑائی اتنی لوگوں نے کہ آخر بن گیا
اور زیرِ آسماں اِک آسمانِ کوئے دوست

شامی

فغانِ مہجور

یہ بھیانک شب کا سناٹا یہ شدت درد کی
یہ تپش یہ بیکلی یہ آگ سی بھڑکی ہوئی

میری ہی مانند شاید چاند بھی غم کوش ہے
پردۂ افسردگی میں ورنہ کیوں روپوش ہے

بے سبب کب ہے تمہارا بھی یہ رنگِ اضطراب
کچھ نہ کچھ تارو! تمہاری جان کو بھی ہے عذاب

غم تو ہے میرے لئے اُس سے تمہیں کیا واسطا
سب مری قسمت میں قسّامِ ازل نے لکھ دیا

ہو بھی کچھ باقی تو اُس کو بھی مجھی کو بھیج دو
شاد کامِ مدعا ہو کر فلک پر تم رہو

چاند آ۔ تجھ کو دکھاؤں میں بھی اپنے دل کا داغ
میرے آگے جل نہیں سکتا کبھی تیرا چراغ

داغ تیرا رائیگاں، میرا بھرا الذات سے
امن میں ہوں میں تجھے فرصت نہیں آفات سے

ہر مہینے بدر سے ہوتا ہے تو گھٹ کر ہلال
میرے داغِ دل کا یہ ہوتا نہیں لیکن مآل

جوف سے جس دم کواڑوں کے گزرتی ہے ہوا
صاف میرے ہی نوائے غم کی آتی ہے صدا

نغمۂ مطرب سے نالے میرے ہرگز کم نہیں
کون کہتا ہے کہ ان میں کیفِ زیر و بم نہیں

میری ہستی اک عجب رنج و محن کا ساز ہے
جس کے سُننے کو مصیبت گوش بر آواز ہے

آہ اب باقی نہیں ہے نالۂ غم کی بھی تاب
ہو گیا سوزِ دروں سے جل کے دل مثلِ کباب

بسترِ غم پر نہیں ملتا کسی پہلو قرار
کروٹیں بدلا کروں اس طرح کب تک بار بار

بیکسی کی ہو گئی اب تو الٰہی انتہا
چشمِ تر سے نیند بھی رہنے لگی نا آشنا

راز بھی بیچارگی کا میری کچھ کھلتا نہیں
دل دھڑکتا ہے مگر مفہومِ دل پیدا نہیں

ہو گئی لبریز مایوسی زمانے کی فضا
ہر طرف مجھ کو نظر آتا ہے نقشہ یاس کا

چشمِ تر تو بھی نہیں دھوتی مرے دل کا غبار
فایدہ کیا اس طرح رہنے سے ہر دم اشکبار

اے خیالِ شوق تیری چارہ سازی کیا ہوئی
ایک مایوس تمنا کی بچا لے زندگی

کیا پرِ پرواز تیرے جل گئے اے آہِ غم
دل ہی میں گھٹ گھٹ کے مجھ پر ڈھائیگی کب تک ستم

اے خدا کب تک رہیگی سوز کی حالت یہی — اشک حسرت کی روانی کیا نہ کم ہوگی کبھی
دل ذرا صبر و سکوں سے آشنا ہوتا نہیں — ہاتھ سینے سے کوئی دم کو جدا ہوتا نہیں
میں جو ہم آہنگ ہر دم نالۂ پیہم سے ہوں — غم مری قسمت سے وابستہ ہے، اب غم سے ہو
جب کوئی تسکین کا باقی نہیں ہے آسرا — صبر کی حد سے دل بیتاب باہر ہو چکا

کیوں نہ اس کی بیوفائی پر فدا ہو جاؤں میں
جان دے کر قرض الفت سے ادا ہو جاؤں میں

ہادی مچھلی شہری

غزل

پچھتانے سے کیا حاصل، پچھتانے سے کیا ہوگا؟ — کچھ تو نے کیا ہوگا، کچھ تجھ سے ہوا ہوگا
دیوانۂ الفت نے سودائے محبت میں — جو کام کیا ہوگا، بے مثل کیا ہوگا
تنہائی کی یہ راتیں، مرجانے کے یہ ساماں! — اللہ کوئی کیونکر فرقت میں جیا ہوگا!
جینے کا مزہ جب ہے، جینے سے ہو کچھ حاصل — یوں لاکھ جئے کوئی، اس جینے سے کیا ہوگا؟
آغاز محبت میں انجام کا کیا کھٹکا! — یہ درد جگر شاید کچھ اور سوا ہوگا
پرسش کی نہیں حاجت، پرسش کی ضرورت کیا؟ — معلوم ہے سب تجھ کو جو کچھ کہ ہوا ہوگا
جب تک ہے خودی دل میں ہوگی نہ پذیرائی — بیکار ہیں یہ سجدے، ان سجدوں سے کیا ہوگا

جیسی بھی گزرتی ہے، اے رازؔ گزرتی ہے
انجام کو روتا ہوں، انجام میں کیا ہوگا؟

رازؔ چاندپوری

آخری ارمان

مارس لیبلانک کے افسانے جیوش لیمپ کا ترجمہ

(بسلسلۂ گزشتہ)

" اس کا نام ؟ "

" مَیں اُس کو خوب پہچانتا ہوں۔"

" آخر کوئی ثبوت "

" یہی ثبوت جو میرے پاس ہے ملزم کو ہراساں کر دینے کے لئے بہت کافی ہے۔"

" ملزم کا گھبرا جانا کافی دلیل نہیں ... یقیناً رہائی ... "

" جیوش لیمپ اس وقت میرے پاس ہے۔"

" اور وہ موتیوں کا ہار۔ مرصع صندوقچہ ... "

" موتیوں کا ہار اور مرصع صندوقچہ بھی۔ غرضکہ ہر ایک چیز جو دوسری مرتبہ چوری گئی۔ میرے قبضہ میں ہے۔" شیرز نے ہی سادہ و سنجیدہ طریقہ سے اپنی کامیابی کے اظہار کو مناسب سمجھا واقعی بیرن اور اس کی بیوی ہکے بکے سے معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کی نظریں خاموش استعجاب و اشتیاق کے ساتھ شیرز پر پڑ رہی تھیں۔ اور یہ صورت حال انتہائی تعریف کے برابر تھی۔

اس کے بعد مفصل حالات سے جو اس کو گزشتہ تین یوم میں پیش آئے تھے۔ آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اس نے تصویروں کی کتاب حاصل کی۔ اور ایک کاغذ کے ٹکڑے پر وہ جملہ جو کٹے ہوئے الفاظ سے بنتا تھا۔ لکھا۔ بعدہٗ برسین کے دریائے سین تک جانے اور خودکشی، اور آخر میں اُس کشمکش کا جو اُس نے ذرا دیر پہلے لوپن کے ساتھ کی تھی۔ کشتی کی تباہی اور لوپن کے غائب ہوجانے کا تمام ماجرا معہ کل تفصیلی واقعات کے بیان کیا۔

جب وہ ختم کر چکا تو بیرن نے دبی آواز میں کہا۔

" بس اب صرف ایک بات باقی رہ گئی۔ وہ یہ کہ آپ چور کا نام بتلائیں۔ آپ کس کو مجرم قرار دیتے ہیں۔"

" مَیں اُس شخص کو ملزم گردانتا ہوں جس نے ان حروف کو کاٹا۔ اور ان کے ذریعہ آرسین لوپن سے خط و کتابت کی۔"

" یہ آپ نے کیونکر جانا کہ اس شخص کی خط و کتابت آرسین لوپن سے تھی۔"

" خود لوپن سے "

اس نے ایک نم آلود اور بوسیدہ پرزہ نکالا۔

یہ وہی ورق تھا جس کو کشتی میں لوپن نے اپنی نوٹ بک سے پھاڑکر اور وہ جملہ لکھکر اس کے حوالہ کیا تھا۔

"لیجیے۔ ملاحظہ فرمایئے۔" شیرزر نے باطمینان اسے اس کی طرف بڑھاکر کہا" دیکھیے۔ اس موقع پر کوئی بھی بات ایسی نہ تھی کہ وہ یہ پرچہ دینے یا اپنی ہستی ظاہر کرنے پر مجبور ہوتا۔ مگر اس کی نظروں میں ایسی باتیں بازیچۂ اطفال ہیں۔ لیکن مجھے اسکے ذریعہ ایک ایسی زبردست اطلاع مل گئی جسکو میں تلاش کر رہا تھا۔"

"وہ کونسی اطلاع" بیرتن نے دریافت کیا۔" میں تو کچھ بھی نہیں دیکھتا۔ کہ ... ."

شیرزر نے پنسل سے اُن حروف اور ہندسوں کو نقل کیا۔

ک۔ ر۔ ج۔ ب۔ ا۔ د۔ و۔ ۶۔ ی۔ ج ۔۔۔ ۲۳۷

"بہت خوب" ایم۔ ڈی ایمبلولی نے کہا" یہی وہ معما ہے۔ جو ابھی آپ نے ہم کو بتایا تھا۔"

"جی نہیں۔ اگر آپ بھی میری طرح اس کو بار بار الٹیں پلٹیں گے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ اس میں دو حروف ا۔ ک زائد ہیں۔"

"اوہو، میں نے خیال نہیں کیا۔"

"اب ان دو حروف کو ی اور و کے قریب رکھیے۔ آپ دیکھینگے کہ اس سے جو ممکن لفظ بن سکتا ہے۔ وہ 'ایکو' ہے۔"

"جس کے معنی"

"جس کے معنی اخبار ایکو ڈی فرانس' یعنے لوپن کا اخبار اس کا خاص اخبار۔ اور کیسا خاص جسکے لئے اسکے سرکاری حقوق تک محفوظ ہیں۔ اب اس کل جملہ کا مطلب ملاحظہ ہو" جواب ایکو ڈی فرانس کے آخری کالم ۲۳۷ میں بھیجو" یہی کلید تھی جس کے لئے میں نے اتنے عرصہ تک دماغ سوزی کی۔ اور جسکو ازراہِ عنایت لوپن نے خود ہی بتا دیا۔ میں ابھی ابھی سیدھا ایکو ڈی فرانس کے دفتر ہی سے آیا ہوں"

"اچھا تو آپ نے وہاں کیا پایا"

"مجھے آرسین لوپن اور اُسکے رفیق ..... کا سارا حال معلوم ہو گیا"

شیرزر نے اخبار کے سات پرچے نکالے اور ہر ایک کا آخری صفحہ کھولکر میز پر پھیلایا۔ اور حسب ذیل سطور کا انتخاب پیش کیا۔

۱۔ آرس۔ لوپ۔ خاتون۔ التج۔ بچالو ۵۴۰ یعنے (آرسین لوپن سے خاتون التجا کرتی ہے کہ اُسے بچالے۔ ۵۴۰)

۲۔ ۵۴۰۔ تشر۔ کا۔۔ منتظر۔ ا۔۔ ل (۵۴۰ تشریح کا منتظر آرسین لوپن)

۳۔ ا۔۔ ل۔ دشمن۔۔ کے۔۔ حلق۔۔ میں۔۔ مجبور (اے آرسین لوپن میں دشمن کے حلقہ میں مجبور ہوں)

۴۔ ۵۴۰۔۔ پتہ۔۔ میں۔۔ کرلونگا۔ تحق (۵۴۰ کا پتہ لکھو میں تحقیق کرلونگا)

۵۔ ا۔۔ ل۔ موریلو (اے آرسین لوپن محلہ موریلو)

۶۔ ۵۴۰۔ باغیچہ میں۔۔۔ ۳ بجے۔ بنفش (۵۴۰ باغیچہ میں ۳ بجے

درخت بنفشہ کے نیچے انتظار کریگا)

۷- ۲۲/۷ طے شدہ شنب ... باغ... ضرور... صبح یکشنب

ر۲۳/۷ تو بس شنبہ کو طے ہو گیا باغ میں ضرور ملنا یعنے صبح یکشنبہ کو)

"واہ حضرت، خوب۔ آپ اس کو مشرح نقشہ بناتے ہیں"

ایم ڈی امیلولی نے کہا۔

"یقیناً۔ بلاشک اور اگر آپ بھی غور سے کام لینگے۔ تو آپ کو بھی معلوم ہو جائیگا کہ سب سے پہلے ایک خاتون جسکے دستخط کا اشارہ ہندسہ ۵،۴۰ ہے۔ آرسین لوپن سے حفاظت کی درخواست کرتی ہے۔ اس پر لوپن تفصیل کے لئے لکھتا ہے خاتون جواب دیتی ہے۔ کہ وہ دشمن کے حلقہ میں مجبور ہے اور وہ دشمن کون۔ وہی بریسن، اور اب اگر اس کی (خاتون کی) کسی نے ، ، دنہ کی۔ تو وہ یقیناً برباد ہو جائیگی لیکن لوپن کو ہنوز شک ہے۔ اور وہ یکدم کسی اجنبی سے ملاقات کرتے ہوئے جھجکتا ہے۔ اس لئے وہ پتہ دریافت کرتا ہے۔ تاکہ اس کی تحقیقات کرسے۔ خاتون چار دن تک پس و پیش کرتی ہے۔ تاریخ ملاحظہ کیجئے۔ اخبار کی تاریخوں میں ۴ دن کا فرق ہے۔ آخرکار پریشان کن واقعات اور بریسن کے دباؤ کے زیر اثر مجبور ہو کر وہ اپنے کوچہ کا پتہ دیتی ہے۔ رومریلو۔ دوسرے آرسین لوپن جواب دیتا ہے۔ کہ وہ ۳ بجے باغیچہ مانشو میں ہوگا۔ اب اجنبی کاتب کا جواب ہے۔ کہ وہ حسب تحریر باغیچہ میں موجود ہوگی اور نشان کے طور پر گلہائے بنفشہ سینے پر لگائیگی۔ یا درخت کے نیچے کھڑی ہوگی۔ یہانتک خط و کتابت ہونے کے بعد آٹھ روز کا وقفہ ہے۔ اب آرسین لوپن یا خاتون کو اخبار کے ذریعہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ براہ راست ملاقات اور رقعوں سے گفتگو ہونے لگی۔

اب سازش شروع ہوگئی۔ کہ بریسن کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے خاتون جیوش لیمپ چرا لے جائیگی۔ دن مقرر کرنا رہ گیا۔ وہ خاتون جو الفاظ کو کاٹ اور جوڑ کر خط و کتابت کرتی ہے شنبہ کا دن مقرر کرتی ہے۔ اور لکھتی ہے کہ جواب ۲۳/۷ پر بھیجو۔ لوپن جواب دیتا ہے۔ کہ شنبہ کا دن طے شدہ ہے اور وہ اتوار کی صبح کو پارک میں ہوگا۔ چنانچہ اتوار کی صبح کو چوری واقع ہوئی۔"

"ہاں پھر تو ہر ایک بات درست معلوم ہوتی ہے۔" بیرن نے تصدیق کے طور پر کہا۔" اور نقشہ بھی مکمل معلوم ہوتا ہے۔"

شیرز نے اپنا سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

" چوری اس طرح ہوئی کہ خاتون اتوار کی صبح کو مع جیوش لیمپ کے باہر جاتی ہے۔ اور لوپن سے کل حال بیان کرتی ہے کہ اس نے کیا کیا۔ وہی خود لیمپ کو بریسن کے پاس لے جاتی ہے۔ اس کے بعد جس طرح لوپن نے پیش بینی کے طور پر چند نشانات چوری کے بنا دیئے تھے۔ پولیس کھلی کھڑکی پا کر فوراً دھوکا کھا گئی۔ چار سوراخ زمین پر اور دو نشانات پیل پاتے پر۔ لیجئے نقب زنی کی واردات تسلیم ہوگئی اور خاتون کے پریشان دل کو اطمینان

حاصل ہو گیا۔"

"بہت خوب" بیرن نے کہا۔ "میں اس تفصیل کو بعینہٖ درست صحیح تسلیم کئے لیتا ہوں۔ لیکن پھر اس کے بعد وہ دوسری چوری۔"

"دوسری چوری پہلی کا نتیجہ تھی۔ اخباروں کے بیانات شائع ہونے پر کہ جیوش لیمپ کس طرح چوری گیا۔ کسی نے خیال کیا۔ کہ چلو جو کچھ رہ گیا ہے۔ اس پر بھی ہاتھ صاف کر لو چنانچہ یہ مصنوعی نہیں۔ بلکہ اصلی چوری تھی۔ کھلی نقب زنی سیڑھی وغیرہ سب۔"

"مگر کیا وہی لوپن"

"جی نہیں، لوپن کبھی ایسے بیوقوفی کے کام نہیں کرتا اور نہ کسی پر کافی وجوہ کے بغیر فیر کرتا ہے۔"

"پھر یہ کون تھا۔"

"بلا شک و شبہ وہی برٹین جو اس خاتون کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ خود برٹین تھا۔ جو یہاں اندر گھسا۔ جس کا میں نے اور میرے دوست ولسن نے تعاقب کیا۔ اور جس نے بعد ازاں ولسن کو زخمی کر دیا۔"

"کیا آپ کو کامل یقین ہے۔"

"پورے طور پر۔ برٹین کے ساتھیوں میں سے ایک نے اس کو قبل خودکشی کے ایک خط لکھا ہے۔ جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ لوپن اور اس کا ایک رفیق آپ کے مکان کی کل گمشدہ اشیا اس کے (برٹین کے) پاس سے واپس لینے کی تدابیر کر رہے ہیں۔ لوپن نے ہر چیز کا تقاضا کیا تھا۔ یعنے جیوش لیمپ اور وہ تمام چیزیں جو دوسری مرتبہ چوری گئیں۔ برٹین کی طرف سے لیت و لعل ہونے پر لوپن نے اس کی نگرانی شروع کر دی گزشتہ شام کو جب برٹین دریائے سین کے کنارے گیا۔ تو لوپن کا ایک ہمراہی بھی ہم لوگوں کی طرح اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔"

"دریائے سین کے کنارے برٹین کا کیا کام"

"میری کامیاب تفتیش کی اطلاع پا کر۔"

"اطلاع کس نے دی؟"

"اسی خاتون نے جس کا یہ خیال بالکل صحیح تھا۔ کہ اگر جیوش لیمپ اس صورت سے مل گیا تو اس کے بھی تمام مخفی حالات ظاہر ہو جائینگے۔ اس لئے برٹین نے اطلاع پاتے ہی ان تمام اشیاء کو جو اس کی گرفتاری کا باعث ہو سکتی تھیں ایک پارسل میں باندھ کر دریا میں ایسی جگہ ڈال دیا۔ جہاں سے وہ خطرہ گزر جانے کے بعد بآسانی نکال سکے۔ اس کے واپس ہونے پر جب میں اور گینمارڈ اس کے مکان تک پہنچ گئے۔ تو اس نے اپنے گزشتہ افعال کی سزا کا خیال کر کے خود ہی خودکشی کر لی۔"

"لیکن اس پارسل میں کیا تھا۔"

"جیوش لیمپ اور آپکی دیگر اشیاء مسروقہ۔"

"اچھا۔ تو کیا وہ پارسل آپ کے قبضہ میں نہیں ہے؟"

تو پین کے غائب ہونے کے بعد ہی میں نے غسل کرنے کا اچھا موقعہ پایا۔ چنانچہ ٹھیک اُسی مقام پر جس کو برین نے منتخب کیا تھا۔ میں نے اپنا بدن دھویا اور وہیں پانی کے اندر آپ کی تمام گمشدہ چیزیں ایک موم جامے میں لپٹی ہوئی مل گئیں۔ دیکھئے وہ پلندہ میز پر رکھا ہے۔"

اس کا کوئی جواب دیئے بغیر ہیرن نے پارسل کے تاگے کو کاٹا۔ ریشمی نم کپڑے کو چاک کیا۔ لیمپ کو باہر نکالا۔ اور ایک کھٹکے کو دبا کر لیمپ کو پیر سے پکڑ کر دونوں ہاتھوں پر زور دیا۔ لیمپ فوراً دو برابر حصوں میں درمیان سے علیحدہ ہوگیا اور ہیرن کیا دیکھتا ہے کہ وہ جواہرات سے مرصع زیور بجنسہٖ بحفاظت تمام موجود ہے۔

(۴)

اس تمام منظر میں جو ظاہرا بالکل قدرتی اور معمولی واقعات پر مبنی تھا۔ کوئی ایسی بات بھی تھی جس نے اس کو ایک دردناک صورت بھی دے رکھی تھی۔ ایک طرف تو شیرزے کے وہ مدلل باضابطہ اور ناقابل تردید دعاوی کی بھرمار۔ جن کا مقصد میڈموازل کو ملزم بنانا تھا۔ اور دوسری طرف الائس ڈیبن کی ناقابل شکست خاموشی۔

ان لانبے چوڑے اور شدید الزامات کو سنکر بھی اس کے چہرہ پر ایک شکن تک نہ آئی۔ اور نہ اس کے خوبصورت چہرہ پر کسی قسم کے خوف و پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ خدا معلوم وہ کیا غور کر رہی تھی؟ سوال تو یہ تھا کہ وہ اس وقت کیا کرےگی۔ جب اُس کے لئے جواب دینا ضروری ہوتا۔ تا وہ اپنے آپ کو بچاتے۔ اور اُس آہنی حلقہ کو توڑنے کی کوشش کرے۔ جس کو انگریز جاسوس نے اُس کے گرد ایسی برجستگی سے آویزاں کر دیا تھا۔

وہ وقت بھی آگیا۔ مگر دوشیزہ خوش تھی۔

"بولو۔ بولو" ایم ڈی ایمبلولی نے چلا کر کہا۔

وہ بدستور خاموش رہی۔

ہیرن نے پھر اصرار کیا۔

"محض ایک لفظ سے تمہاری صفائی ہوجائیگی بس انکار کا ایک لفظ اور میں تم پر اعتبار کر لونگا"

مگر دوشیزہ نے وہ لفظ نہیں کہا۔

ہیرن تیزی سے کمرہ کے اندر ٹہلنے لگا۔ دو تین مرتبہ اِدھر سے اُدھر چکر لگا کر وہ شیرزے سے یوں مخاطب ہوا۔

"نہیں نہیں۔۔۔۔ اچھا جناب میں اس الزام کو سچ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو سراسر غیر ممکن ہے اور اس سے میری معلومات اور اس پر جو میں نے ایک سال کے عرصہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک مخالفانہ اثر پڑتا ہے" اور یکدم اُس نے اپنا ہاتھ انگریز جاسوس کے شانہ پر رکھ دیا۔ "لیکن کیا جناب آپ کو اپنی ذات پر پورا

اعتماد ہے کہ آپ غلطی نہیں کر رہے ہیں۔"

"شش اُن اشخاص کے جن پر بے خبری کے عالم میں حملہ کیا جائے۔ اور وہ یکدم اپنے کو اُس حملہ سے محفوظ نہ رکھ سکیں"

شیرز نے پس و پیش کیا۔ بہر حال وہ مسکرایا اور یوں کہنے لگا

"میں ضمنی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ جس کو میں نے ملزم قرار دیا ہے۔ اور جو آپ کے مکان میں ایک خاص جگہ پر مقرر ہے سوائے اس کے اور کسی کو ہرگز اس کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ جیوش لیمپ کے اندر جو اہرات ہیں۔"

"میں اس پر یقین کرنے سے انکار کرتا ہوں۔" بیرن نے کہا۔

"اُس سے خود دریافت کیجئے۔"

بس ایک یہی بات رہ گئی تھی۔ جس کو اُس نے دوشیزہ پر اعتبار کرنے کی وجہ سے نہیں پوچھا تھا لیکن اب مزید شہادت کی موجودگی میں انکار کرنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔

وہ دوشیزہ کے پاس گیا اور اس سے نگاہیں چار ہوتے ہی دریافت کیا۔

"میڈموازل۔ کیا واقعی تم ہی تھیں۔ کیا تم ہی نے جیوش لیمپ چرایا۔ تم ہی نے آرسین لوپن سے خط و کتابت کر کے اس چوری کا ارتکاب کیا۔"

اس نے جواب دیا۔

"جی ہاں حضور"

اور معاً اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اُس کے چہرہ پر نہ شرم کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور نہ پریشان نظر آتی۔

"اوہو کیا۔ یہ ممکنات سے ہے۔" ایم ڈی ایمبلولی نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "میں حشر تک یقین نہ کرتا۔ تم آخری شخص ہوتیں۔ جس پر میں شبہ کر سکتا۔ اف۔ بدقسمت لڑکی۔ . . تم نے اس کو کس طرح انجام تک پہنچایا۔"

اُس نے کہا۔

میں نے اُس کو مسٹر شیرز کے بیان کے مطابق انجام دیا۔ شنبہ کی شب کو میں خاص کمرہ میں داخل ہوئی لیمپ چرایا اور صبح . . . اس آدمی کے پاس لے گئی۔

"ہرگز نہیں۔" بیرن نے تعریض کے طور پر کہا۔ "جو کچھ تم کہتی ہو۔ غیر ممکن ہے۔"

"غیر ممکن! . . . یہ کیوں۔"

"اس لئے کہ میں نے صبح کو خاص کمرہ کا دروازہ مقفل پایا تھا۔"

دوشیزہ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اُس نے شیرز کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھا۔ گویا وہ اس سے کسی مشورہ کی خواستگار ہے۔ انگریز جاسوس بیرن کے اعتراض سے زیادہ الاتس کی اس گھبراہٹ سے متوحش ہو گیا۔ کیا اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں . . . . . . ہاں کیا اس اقرار میں غلط بیانی پوشیدہ ہے۔ جس سے شیرز کے ظاہر کردہ بیانات کو جو اُس

نے جیوش لیمپ کی چوری کی بابت دِئے تھے کسی قدر صدمہ پہنچا تھا۔ مگر اب غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ضرور کوئی بات ہے۔

ہیرن نے یوں سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"مَیں پھر کہتا ہوں کہ دروازہ مقفل تھا۔ مَیں کامل وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ اُس کی چٹخنیاں مجھے بالکل اُسی حالت میں ملیں۔ جس طرح میں نے شب کو نہیں بند کیا تھا۔ اب اگر تم اپنے اقرار کے مطابق اسی راستہ سے آئیں۔ تو ضرور کسی نے اندر سے تمہارے لئے دروازہ کھولا۔ یعنے یا تو کمرہ حمّام سے یا ہماری خوابگاہ سے۔ اور ان دونوں کمروں میں سوائے میرے اور میری بیوی کے اور کوئی غیر شخص نہیں تھا۔"

شیرزنے فوراً اپنی گردن نیچی کرکے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپالیا۔ وہ شرط ندامت سے سرخ ہوگیا تھا کسی ایسے اثر نے جو آناً فاناً آنے والی روشنی کے مشابہ ہو اسے بوکھلا دیا۔ اور یہی نہیں بلکہ ایسے راحت افزا موقعہ پر جبکہ وہ اپنے خیال کے مطابق ملزم کو دریافت کر چکا تھا۔ اُسے پژمردہ و پریشان بنا دیا۔ اب اس معاملہ کا ہر پہلو ایسا نظر آرہا تھا جس سے حسرت و ناامیدی کی جھلک عیاں ہونے لگی ہو۔

الاتس ڈیمن بیگناہ تھی۔

الاتس ڈیمن بے قصور تھی۔ یہ ایک لاریب و یقینی واقعہ تھا۔ اس خیال نے آتے ہی اُن تمام پریشانیوں کو آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا۔ جو اسے اس دوشیزہ کے خلاف الزام لگانے میں روزِ اول ہی سے محسوس ہوئی تھیں اُسے اب صاف نظر آرہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بس صرف ایک ذراسی کسر باقی تھی۔ وہ بھی عمل میں آگئی۔ اور اصل ملزم کا حال کُھل گیا۔

اُس نے اپنا سر اُٹھایا۔ اور چند سکنڈ تک حتی الامکان اپنے فطری انداز سے اُس نے میڈم ڈی ایسپولی کی طرف دیکھا۔ وہ زردی جو ہر فانی انسان کے چہرہ پر شمع حیات گل ہونے کی آخری ساعتوں میں چھا جاتی ہے۔ اس وقت میڈم ڈی ایسپولی کے خوبصورت چہرہ پر عیاں تھی۔ اس کے ہاتھ جن کو وہ بہت کچھ قابو میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نمایاں طور پر کانپ رہے تھے۔

"بس ایک دو سکنڈ اور" شیرز نے اپنے دل میں کہا "وہ خود حقیقت کا اعتراف کر دیگی"۔

شیرز یکایک اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان حائل ہوکر کھڑا ہوگیا۔ تاکہ اس خوفناک خطرہ کو جو محض اُس کی غلطی و ضد کی وجہ سے ان میاں بیوی میں پیدا ہوگیا تھا۔ خوش اسلوبی سے ٹال دے۔ لیکن ہیرن پر نظر پڑتے ہی وہ مارے ہیبت کے کانپنے لگا۔

وہی فوری اثر جس نے اس کو اپنی نوعیت سے محوِ حیرت

کردیا۔ اب ایم ڈی ایسلولی پر حاوی تھا۔ وہی خیال اس وقت شوہر کے دماغ میں چکّر لگا رہا تھا۔ آہ۔ اب اس نے سمجھا اور دیکھ لیا۔

نہایت دلیری اور بیباکی سے الائس ڈیمن نے اس ہولناک حقیقت کی مخالفت کرنے کی کوشش کی۔

"حضور آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ میں نے ذرا غلط بیانی سے کام لیا۔ اب اگر آپ امر واقعہ دریافت کرتے ہیں تو میں اس راستے سے نہیں آئی۔ ملکہ میں بڑے کمرہ اور باغیچہ سے ہوتی ہوئی ایک سیڑھی کی مدد سے اندر داخل ہوئی تھی۔"

یہ صداقت بیانی کی ایک مثال تھی لیکن محض بیکار۔ الفاظ صحت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے۔ آواز سے استقلال رخصت ہو چکا۔ افسوس۔ حسین و وفادار دوشیزہ اس سے زیادہ متانت و سنجیدگی برقرار نہ رکھ سکی۔ اس نے اپنا سر وفور حسرت کے ساتھ جھکا لیا۔

خوفناک خاموشی چھا گئی۔ میڈم ڈی ایسلولی منتظر کھڑی رہی۔ اُس کے چہرہ کا رنگ غم و غصّہ سے دگرگوں ہو گیا۔ بیرن اب بھی غلطاں و پیچاں نظر آ رہا تھا۔ وہ ان شہادتوں کی موجودگی میں بھی یقین کرنے سے احتراز کرنا چاہتا تھا۔

آخر کار اُس نے کہا۔

"بولو۔ بولو۔ تم خود بیان کرو!"

"میرے حقیقی ہمدرد مجھے کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔" میڈم نے بہت ہی آہستگی کے ساتھ چہرہ پر انتہائی حزن و ملال کے آثار ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"پھر میڈ موازل"

"میڈ موازل نے محض محبت و وفاداری کے زیر اثر مجھے بچانے کی کوشش کی۔ اور خود ملزم ہونے کا اعتراف کرلیا۔"

"تم کو بچایا... کس چیز سے۔ کس شخص سے۔"

"اُسی کمبخت شخص سے"

"بریسن سے"

"ہاں اس نے مجھ کو اپنی دھمکیوں سے مرعوب کرلیا۔ محض اتفاق سے میری اور اُس کی ملاقات ایک دوست کے مکان پر ہوگئی۔ اب میں کس طرح اپنی اس دیوانگی کا اعتراف کروں کہ میں نے اُس کی باتیں سننا گوارا کیا۔ گو ایسی کوئی بات نہیں جسے تم معاف نہ کرسکو۔ لیکن کسی زمانے میں میں نے اس کو دو خطوط لکھے تھے۔ وہ میں ابھی آپ کو دکھاؤنگی۔ بس یہی دھمکی تھی۔ جو وہ مجھ کو بدنام کرنے کے لئے دیتا تھا۔ میں نے اس کو دوبارہ خرید لیا۔ مگر کس طرح۔ آپ جانتے ہیں مجھ پر رحم کیجئے گا۔ میں سخت مصیبت میں تھی۔"

"تم آہ۔ تم۔ پیاری سوزینی۔"

اُس کو مارنے اور جان سے مار ڈالنے کے لئے اُس نے اپنی بند مٹھیوں کو حرکت دی۔ مگر یک بہ یک اُس کے

بازو بھینچے ہو گئے۔ اور اُس نے چیخ کر کہا۔

"آہ... سوزینی... تم..... ارے تم......

کیا یہ ممکن ہے۔"

مختصر اور ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اُس نے اپنی الم انگیز اور گزری ہوئی داستان بیان کی۔ اس بدمعاش شخص کی ذلت آفریں کوششوں کے مقابلہ میں اپنا خوفناک انجام اپنی ندامت، اپنی دیوانگی اور الالس ڈیین کے قابل تعریف سلوک کا حال بھی سن وعن بیان کیا۔ کہ کس طرح اس دوشیزہ نے اپنی مالکہ کو مایوسی کا شکار دیکھ کر مجھ سے کل حالات معلوم کئے۔ لوپن کو لکھا۔ جس نے اس معاملہ کو ایک چوری کی واردات کا رنگ دیدیا۔ تاکہ میں برین کے پنجوں سے محفوظ ہو جاؤں۔

"افسوس... صد افسوس... تم سوزینی... تم"

ایم ڈی ایبلولی نے دوبارہ اور زیادہ زور دیکر کہا۔ "آہ تم نے کس طرح..... کیونکہ یہ......"

(۵)

اسی دن شام کو کیلے سے ڈوور جانے والا جہاز ول ڈی لانڈرس آہستگی کے ساتھ ساکت پانی پر جنباں تھا۔ رات تاریک و پُرسکون تھی۔ جہاز کے اوپر تو کیا ہر چہار طرف ہلکے بادل سایہ فگن معلوم ہوتے تھے۔ کہر کی ہلکی اور باریک چادریں جہاز اور اُس حد نظر تک پھیلنے والے منظر کے درمیان حائل تھیں۔ جس کو ماہتاب اور ستاروں کی خنک و فرحت بخش مگر ناقابل محسوس روشنی تابناک بنائے ہوئے تھی۔

مسافروں کی ایک خاص تعداد اپنے اپنے کمروں یا آرامگاہوں کو جا چکی تھی۔ مگر ان میں سے چند جو نسبتاً زیادہ بے فکرے تھے۔ یا تو ادھر اُدھر ڈک پر تفریح میں مشغول تھے یا آرام کرسیوں پر کمبل اوڑھے اُونگھ رہے تھے کبھی اِس طرف کبھی اُس طرف سلگتے ہوئے سگار کی چمک نظر آجاتی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ آوازوں کی بھنبھناہٹ رات کی پرسکون خاموشی میں اس طرح سُنائی دیتی تھی۔ گویا بولنے والے خود ہی زور سے بولنا گناہ سمجھتے ہوں۔

انہیں مسافروں میں سے ایک جو ادھر اُدھر لانبے قدموں سے ٹہل رہا تھا۔ ایک بنچ پر لیٹے ہوئے شخص کے پہلو میں آکر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر تک اُس کی طرف غور سے دیکھا اور جونہی اُس نے حرکت کی تو کہنے لگا۔

"مس الالس۔ میں نے تو یہ خیال کیا تھا کہ تم میٹھی نیند کے مزے لے رہی ہوگی۔"

"نہیں۔ مسٹر شیرز۔ میری آنکھوں میں قطعی نیند نہیں کسی خیال میں غرق لیٹی ہوئی تھی۔"

"خیال.... کس بات کا خیال۔ کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں۔"

"جی ہاں.... میں میڈم ڈی ایبلولی کا خیال کر رہی تھی۔ وہ کیسی کچھ رنجیدہ و مغموم ہوگی۔ اس کی زندگی تباہ ہو گئی۔"

"ذرّہ برابر بھی نہیں۔۔ قطعی نہیں۔" شیرزے نے اشتیاق آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ اس کا قصور ایسا سنگین نہیں کہ کبھی معاف ہی نہ کیا جا سکے۔ ایم ڈی ایمبلولی اس غلطی کو بہت جلد فراموش کر دینگے۔ جس وقت میں روانہ ہوا ہوں۔ اُسی وقت وہ اُس کو زیادہ تیز نگاہوں سے نہیں گھور رہے تھے"

"شاید۔۔۔ بہرحال فراموش کرنے کے لئے بھی ایک عرصہ دراز چاہئے۔ میڈم کی پریشانی تو جان گھلانی رہیگی"

"کیا تم کو اس سے اتنی زیادہ محبت ہے۔"

"بہت زیادہ۔ جب میں آپ کے چہرہ پر نظر کر کے مارے خوف کے کانپ رہی تھی۔ اور میں حتی الامکان آپ کی نظر بچانا چاہتی تھی۔ تو یہ اُسی دفورِ محبت کا نتیجہ تھا۔ کہ مجھ میں مسکرانے کی قوت پیدا ہو گئی تھی"

"اچھا تو کیا تم اُس سے جدا ہونے پر رنجیدہ ہو؟"

"رنجیدہ اور بغایت رنجیدہ۔ میرا کوئی عزیز دوست نہیں۔ مجھے صرف اسی سے ۔۔۔۔"

"تمہیں بہت سے دوست مل جائینگے" انگریز جاسوس نے کہا۔ جو خود اپنے دل میں اپنی حماقت پر غمگین تھا۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے تعلقات معمولی نہیں۔ میں بہت ہی زیادہ اثر و رسوخ رکھتا ہوں، اور میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ تم اپنی یہ آسامی کھونے پر کبھی افسوس نہ کرو گی"

"ہاں، شاید۔۔۔۔ لیکن وہاں میڈم ڈی ایمبلولی تو نہ ہوگی"

اس سے زیادہ کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔ ہملاک شیرز نے دو باتیں چکر اور لگائے۔ اور پھر لوٹ کر اپنے ہمراہی کے قریب آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ کہر کا پردہ چاک ہو گیا۔ بادل آسمان سے ہٹتے ہوئے نظر آئے۔ ستارے یکے بعد دیگرے رونما ہونے لگے۔ چاند کی روشنی فرحت پہنچانے لگی۔

(۲)

شیرز نے اپنی جیب سے پائپ نکالکر بھرا۔۔۔۔ اور یکے بعد دیگرے چار دیاسلائیاں جلائیں۔ مگر پھر بھی اُسے سلگانے میں ناکامیاب رہا۔ جب اسکے پاس ایک بھی دیاسلائی نہ رہی۔ تو وہ اُٹھا۔ اور اپنے قریب چند قدم کے فاصلہ پر بیٹھے ہوئے ایک معزز شخص سے کہا۔

"حضرت۔ کیا آپ براہ عنایت ایک دیاسلائی مرحمت فرمائیں گے؟"

اس شخص نے فوراً ڈبیا کھولکر ایک دیاسلائی جلائی۔ ایک شعلہ اُٹھا۔ اور روشنی میں شیرز کیا دیکھتا ہے کہ آرسین لوپن بیٹھا ہوا ہے۔

اگر انگریز جاسوس ایک ناقابل محسوس طریق پر نہ چونک پڑتا تو شاید لوپن یہی خیال کرتا کہ جہاز پر اُس کی موجودگی کا علم شیرز کو ہے۔ مگر شیرز نے اس موقع پر انتہائی ضبط و خودداری سے کام لیا۔ اور کسی استعجاب و حیرت کا اظہار کئے بغیر

اس کی طرف بڑھ کر ہاتھ بلایا۔

"آہا کہیئے لوپن صاحب۔ مزاج شریف"

"مرحبا" لوپن اپنے جذبہ تعریف کو نہ روک سکا۔ اور چلا کر کہا۔

"ایں ... یہ مرحبا... کس بات پر۔"

"کس بات پر ... حضرت دریائے سین میں بیری غرقابی کا مشاہدہ کرنے کے بعد آپ مجھ کو دوبارہ اپنے روبرو موجود پاتے ہیں لیکن واہ ری آپ کا بھونما ضبط نفس جو واقعی انگریزی باشندوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ آپ ذرا بھی متعجب نہیں ہوئے۔ آپ کی زبان سے ایک بھی کلمہ حیرت نہ نکلا میں پھر ایک بار اعادہ کرتا ہوں۔ مرحبا صد آفرین ... واللہ قابل تحسین ...."

"یہ تحسین و آفرین سب فضول ہے۔ جب تم کشتی سے گرے ہو۔ تو میں نے دیکھ لیا تھا۔ کہ عمداً گرے ہو۔ سارجنٹ کی گولی تمہارے نہیں لگی تھی۔"

"اور کیا آپ بلا اس کی جانچ کئے۔ کہ آخر میرا کیا حشر ہوا۔ چلے گئے تھے۔"

"تمہارا کیا حشر ہوا..... میں سمجھتا تھا کہ تقریباً پانچ سو آدمی ساحل پر پون میل تک پھیلے ہوتے دونوں کناروں کی حفاظت کر رہے تھے۔ اگر تم موت کے پنجہ سے نجات پا جاتے تو تمہاری گرفتاری لابدی تھی۔"

"تاہم میں یہاں موجود ہوں۔"

"ایم لوپن اس دنیا میں صرف دو ہستیاں ایسی ہیں۔ جن کے کسی فعل پر مجھے حیرت نہیں ہو سکتی... اول تو اینجانب دوسرے آنجناب" دونوں حریفوں میں مصالحت ہو گئی۔

(۷)

اگر شیر زآر سین لوپن کے خلاف کارروائیوں میں ناکامیاب رہا۔ یا لوپن اس کا خاص دشمن جس کی گرفتاری کے لئے اس نے اسقدر کوشش کی، ہنوز آزاد رہا۔ یہ سب باتیں بالکل اہم نہ تھیں۔ اگر اس تمام معرکہ میں سہرا لوپن کے سر رہا۔ پھر بھی انگریز جاسوس اپنی اہم ترین کوششوں کا معترف تھا جن کے زیر اثر اس نے جیوش لیمپ کو بھی بالکل اسی طرح پالیا۔ جس طرح نیلگوں ہیرے کو حاصل کیا تھا۔... ہاں اس مرتبہ نتیجہ زیادہ شاندار نہ تھا۔ خاصکر عوام کے نقطہ نگاہ سے کیونکہ معاملہ کا انکشاف ہوتے ہی شیر ز اس راز کو پوشیدہ رکھنے کا کوشاں تھا۔ کہ جیوش لیمپ کس نے چرایا۔ اور وہ کس طرح حاصل ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ اصل ملزم کا نام بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن لوپن اور شیر ز یعنی چور اور جاسوس کے درمیان یہ معمولی باتیں تھیں۔ نہ وہاں کامیابی کا خیال نہ شکست کا۔ ان میں سے ہر ایک مساوی کامیابی کے لئے اظہار خوشی کر سکتا تھا۔

چنانچہ یہ دونوں با اخلاق دشمنوں کی طرح جنہوں نے

اپنے ہتھیاروں کو علیحدہ رکھ دیا ہو۔ اور جو ایک دوسرے کو سچّی قابلیت کی داد دے رہے ہوں۔ باہم گفتگو کر رہے تھے۔

شیرز کی التجا پر لوپن نے اپنے بچنے کی داستان بیان کی ۔ ۔ ۔

اُس نے کہا۔ "اگر در حقیقت" آپ اس کو کچھ اہم سمجھتے ہوں۔ تو میں کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ محض بچوں کا کھیل تھا۔ میرے رفقا اسی وقت سے جبکہ ہم نے جیوش لیمپ کو تلاش کرنے کا تہیّہ کیا تھا۔ میری نگہبانی پر تھے۔ چنانچہ کشتی کے اُلٹنے کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ تک میں اس کے اُلٹے ہوئے پیندے کے نیچے پڑا رہا۔ اسی اثنا میں فالنفانٹ اور اُس کے ہمراہی کنارے پر میری لاش کی جستجو میں تھے۔ میں دوبارہ کشتی پر چڑھ آیا۔ اور میرے دوستوں نے سب کے سامنے پھرتی سے مجھے اپنی تیز روکشتی میں سوار کر لیا اور پانچسو آدمیوں گینمارڈ اور فالنفانٹ کی حیران آنکھوں میں خاک جھونک کر لے گئے۔

"سبحان اللہ" شیرز بولا۔ "بہترین کامیابی۔ ۔ ۔ اچھا تو کیا اب انگلستان کا عزم ہے۔"

"ہاں چند حسابات طے کرنا ہیں۔ لیکن میں بھولا جاتا ہوں۔ ایم ڈی ایمبلولی "

"اُسے سب معلوم ہوگیا۔"

"افسوس میرے پیارے دوست۔ میں نے آپ سے کیا کہا تھا؟ اب نقصان ہوگیا۔ جس کی تلافی غیر ممکن ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ آپ مجھ کو میری مرضی کے مطابق کام کرنے دیتے۔ ایک یا دو دن کے بعد میں خود جیوش لیمپ اور دیگر اشیاء برین سے حاصل کر لیتا اور اُنہیں ڈی ایمبلولی کے پاس روانہ کر دیتا۔ اور وہ دونوں میاں بیوی اطمینان سے باہمی زندگی بسر کرتے رہتے۔ جس کی بجائے ۔ ۔ ۔"

"جس کی بجائے" شیرز نے کہا۔ "میں نے ہر چیز غتر بود کر دی اور ایک خاندان میں جس کی آپ حفاظت کر رہے تھے۔ ناموافقت پھیلا دی۔"

"خوب، ہاں، کیا آپ ہی حفاظت کرنا جانتے ہیں؟ کیا یہ نا ممکن ہے کہ مجھ سا شخص ہمیشہ چوری کرے فریب دے۔ اور نقصان پہنچائے؟"

"اچھا تو کیا تم نیکی بھی کرتے ہو؟"

"ہاں جب مجھے وقت ملتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے مجھے خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ میں اس کو نہایت اچھا مذاق سمجھتا ہوں کہ ہر معرکہ آرائی میں بہتر شخص ثابت ہوں۔ چنانچہ اس معاملہ میں میں نیکی و حفاظت کر رہا تھا۔ اور آپ وہ شخص ہیں جس نے دو ہستیوں میں بدمزگی و ناموافقت پھیلا دی۔"

"بدمزگی! بدمزگی!" انگریزی جاسوس نے کہا۔

"بیشک! ڈی ایبلولی کے گھر میں ماتم برپا کر دیا اور الائس ڈیمن رو رہی ہے۔"

"وہ بچ نہیں سکتی تھی۔ گینمارڈ اس کو تلاش کر کے چھوڑتا..... اور اس کے ذریعہ سے انہیں بھی بیڈم ڈی ایبلولی کا راز معلوم ہو جاتا۔"

"عزیز دوست اس پر میرا بھی صاد ہے۔ لیکن یہ قصور کس کا تھا؟"

اُن کے سامنے سے دو آدمی گزرے۔ شیرزنے لوپن سے ایک ایسی آواز میں جس کا لہجہ کچھ بدلا سا معلوم ہوتا تھا کہا!

"کیا آپ جانتے ہیں۔ کہ وہ دونوں اصحاب کون ہیں؟"

"میں خیال کرتا ہوں کہ یہ کسی جہاز کا کپتان تھا۔"

"اور دوسرا"

"میں نہیں جانتا"

"یہ مسٹر آسٹین گلٹ ہیں۔ جو انگلستان میں ایک ایسے عہدے پر فائز ہیں۔ جو آپ کے ایم ڈوڈوائیس کے مقابلہ کا ہے۔"

"اہا۔ کیسا خوش قسمت ہے! کیا آپ مہربانی کر کے اس سے میرا تعارف کرا دینگے؟ ایم ڈوائیس میرا بہت بڑا دوست ہے۔ اور مجھے غایت درجہ خوشی حاصل ہوگی کہ میں مسٹر آسٹین گلٹ کو بھی انہیں الفاظ سے یاد کروں۔"

وہ دونوں اصحاب پھر دکھائی دئے۔

"اور فرض کیجئے کہ میں ذرا دیر کے لئے آپ کو اسی وقت گرفتار کر لوں.....؟ شیرزنے اٹھتے ہوئے کہا۔

اُس نے آرسین لوپن کی کلائی نہایت مضبوطی سے پکڑ لی۔

"آپ اسقدر سختی سے کیوں پکڑتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے بالکل تیار ہوں۔"

اُس نے بلا کسی مزاحمت کے ساتھ چلنا منظور کر لیا۔ وہ دونوں اصحاب اُن کے سامنے سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔

شیرزنے اپنا قدم بڑھایا۔ اس کے ناخن لوپن کے گوشت میں گھس رہے تھے۔

"آئیے، آئیے، اُس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ گویا ہر چیز کو جسقدر جلد ممکن ہو سکتا تھا طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "تشریف لائیے! جلدی کیجئے!"

لیکن وہ رُک گیا۔ الائس ڈیمن اُن کے پیچھے آرہی تھی۔

"تم کیا کر رہی ہو۔ میڈموازل، تم کو اس تکلیف گوارا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!"

یہ لوپن تھا جس نے جواب دیا۔

"میں آپ سے غور کرنے کی التجا کرتا ہوں۔ کہ میڈموازل

اپنی خواہش سے نہیں آرہی ہے۔ میں اس کی کلائی اتنی ہی سختی سے پکڑے ہوں جتنی کہ آپ میری "

" یہ کیوں ؟ "

" کیوں ؟ جناب میں اس کو بھی لیجانا چاہتا ہوں اس لئے کہ جیوش لیمپ کے معاملہ میں اس کا عمل مجھ سے بھی زیادہ اہم ہے ..... آرسین لوپن کی شریک اور بیرین سے ملی ہوئی وہ خود بھی ضرور بیرن ڈی ایمبلولی کے واقعات بیان کریگی۔ جو یقین ہے کہ پولیس کے لئے بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور اس طرح سے آپ اپنی مداخلت کا اظہار کردینگے۔ میرے مہربان شیرز! "

چند سکنڈ تک وہ بلا حرکت کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ اس کے بعد شیرز واپس جاکر اپنی بینچ پر بیٹھ گیا لوپن اور دوشیزہ اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے ....

(۸)

ایک طویل خاموشی دیر تک حائل رہی۔ اس کے بعد لوپن کہنے لگا۔

میرے دوست ... آپ نے دیکھ لیا۔ کہ ہم خواہ کچھ بھی کریں۔ بہرحال ہمارے راستے ہمیشہ جداگانہ رہیں گے۔ آپ اگر غار کے اس جانب ہونگے، تو بندہ اس جانب .... ہم خم ہوکر ہاتھ ملالیں .... دو چار لمحوں کی گفتگو بھی کرلیں۔ مگر وہ خلیج بدستور قائم رہیگی۔ آپ ہمیشہ ہ سلاک شیرز مشہور جاسوس رہیں گے۔ اور بندہ وہی شریف چور آرسین لوپن آپ بلاشک شیرز ہمیشہ اسی قابلیت ...... کم وبیش مستعدی کے ساتھ اپنی جاسوسانہ روش کی تقلید میں اس چور کو پکڑ لینے اور گرفتار کرنے کی کوشش کرینگے .... اور آرسین لوپن ایک چور کی حیثیت میں نہایت سرگرمی کے ساتھ یہ کوشش کرے کہ وار خالی جائے۔ اور وہ مشہور جاسوس کا بحدِ امکان مضحکہ اُڑائے ..... چنانچہ آج بھی موقع ہے ... ہا ... ہا ..... ہا ... آہا ... "

اس نے عیارانہ طریق پر بیحد سخت اور فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد یکدم سنجیدگی اختیار کرکے وہ دوشیزہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

" میڈموازل .. یقین کرو ...... کہ انتہا تک میں نے تمہارے معاملہ کو ظاہر نہیں کیا۔ آرسین لوپن کبھی دغابازی نہیں کرتا ...... اور خصوصاً ان کے ساتھ جن سے اُسے محبت اور ہمدردی ہے۔ اور مجھے اجازت دو۔ کہ میں صاف الفاظ میں تم پر واضح کردوں۔ کہ میں تمہاری غمزدہ ..... دلکش ہستی کی قدر کرتا ہوں --- "

اُس نے ایک ملاقاتی کارڈ اپنی جیب سے نکالا اور اُس کے وسط سے دو ٹکڑے کرکے آدھا دوشیزہ کے حوالے کرکے نہایت ہی متوثر و بااخلاق لہجہ میں کہنے لگا۔

"میڈم مانل .... اگر مسٹر شیرزا اپنی کارروائیوں میں ناکامیاب رہیں تو براہِ عنایت تم سیدھی میڈم اسٹرانگ بارو کے پاس چلی جانا اُس کا پتہ تم کو باسانی معلوم ہو سکتا ہے تم اُس کو میری یہ حقیقی یادگار دکھا دینا۔ .... وہ خاتون تمہارے ساتھ بہن کا برتاؤ کرے گی۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔" دوشیزہ نے جواب دیا۔ "میں کل اُن کے پاس جاؤنگی۔"

"اچھا اب مشفق من" لوپن نے ایک ایسے شخص کے لہجہ میں جو اپنا فرض ادا کر چکا ہو.... باطمینان کہا "رخصتی آداب بجالانا چاہیئے۔ کہر کی وجہ سے بہت رات معلوم ہوئے بغیر گزر گئی تاہم ابھی تھوڑی دیر پلک جھپکانے کا موقعہ ہے۔" انشاء اللہ پھر کبھی نیاز حاصل ہوگا" وہ بازوؤں کا تکیہ بنا کر ایک بنچ پر دراز ہو گیا۔

(۹)

سارا آسمان ماہتاب کی روشنی سے تاباں نظر آ رہا تھا اور اُس کی مصفا روشنی ستاروں کے گرد اور سمندر پر پوری تیزی سے پڑ رہی تھی۔ اُس کا سطح آب پر جھلملا جھلملا کر پڑنا خصوصاً اُس جگہ پر جہاں کہ کہر کی آخری لکیریں ایک ایک کر کے جذب ہوتی جاتی تھیں۔ ایک ایسا سماں تھا جس کا لطف اسی وقت کے لئے مخصوص ہے۔

دائرۂ افق سے ساحل کا حاشیہ علیحدہ نظر آ رہا تھا۔ مسافروں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور ذرا ہی دیر میں جہاز مسافروں سے بھر گیا۔ ....مسٹر آسٹین گلٹ بھی دو ہمراہیوں کی معیت میں سامنے سے گزرا... جس کو دیکھ کر مسٹر شیرز تاڑ گیا .... کہ یہ لوگ انگریزی خُفیہ پولیس کے ممبر ہیں۔

دوسری طرف بنچ پر لوپن مزے سے سو رہا تھا۔

اختلافِ جذبات باتحادِ قوافی

لے دے کے اِک تمہیں تو ہو سرمایۂ حیات — پوچھو تمہیں نہ بات تو پھر کیا کرے کوئی

ہادی

مانا کہ بزم حسن کے آداب ہیں بہت — جب دل پہ اختیار نہ ہو کیا کرے کوئی

عزیز

قیمت سالانہ چھ روپے　　رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴　　قیمت ششماہی ؏ فی پرچہ ۱۰/

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹرز:

سیّد عابد علی عابد بی۔ اے　　محمد اسمٰعیل نعیم　　محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۵　اشاعت ماہ دسمبر ۱۹۲۴ء　نمبر ۶

فہرست مضامین

[illegible]

دریا بہ حباب اندر

صفحۂ ادارت

ہزار داستان اپنے سفرِ اشاعت کے پانچ مرحلے طے کر چکا ہے، اور ابھی افق کی فریب انگیز رنگینیوں کی طرح منزلِ مقصود اسے دور سے جادہ پیمائی کی دعوت دے رہی ہے۔ اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا کہ "ہزار داستان" نے جس مقصد کو دلیلِ راہ بنایا، اس کے حصول میں کامیابی کہاں تک ممکن ہے۔ فی الحال ہم اس کے گزشتہ دور پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جو راہ اس نے اختیار کی تھی۔ اس پر ثبات و استقلال سے گامزن رہا یا نہیں ہزار داستان کا مقصد ادبِ لطیف کی خدمت کرنا تھا۔ اور اہل الرائے سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ان دنوں ہماری زبان میں اس صنفِ ادب کے ذوق کو جو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے اسباب کی جستجو کی جائے۔ تو ان میں ایک قابلِ قدر حصہ اس کی ناچیز کوششوں کا پایا جائے گا۔

ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے دائرۂ عمل کو تمام متفرقاتِ ادب پر حاوی کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک صنف کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ لیکن جیسا کہ بعض قدر شناسوں کی منصفانہ رائے ہے۔ اس محدود حلقے میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اس کے لئے کافی سرمایۂ فخر و مباہات ہیں۔ ہماری مراد افسانے سے ہے۔ یہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کا تقاضائے امتیاز صرف یہی نہیں کہ قدیم الایّام سے انسانی فطرت کی [illegible] میں اس کا رجحان موجود رہا ہے۔ بلکہ اس عروجِ تہذیب کے زمانے میں بھی وہ اقوامِ عالم کے ادب کا عنصرِ غالب ہے۔ افسانہ، ڈرامے کے بعد ادب کا معراجِ کمال ہے۔ ڈرامے کا عنصر ہزار داستان میں مفقود تو نہیں رہا مگر افسانے کی بہ نسبت کمزور۔ واقعات کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے۔ کہ ہنوز اُردو کی ادبی فضا ڈرامے کی نشو و نما کے مناسبِ حال نہیں۔ ڈرامہ انسانی جذبات کی شدّتِ تلاطم کا سب سے زیادہ پُرزور اظہار ہے۔ جمہورِ اردو نے اس کا مفہوم سراسر غلط سمجھا ہے۔ وہ محض مقفّٰی مکالموں کا ایک مجموعہ اور مصنوعی جذبات کی غیر فطری نمائش نہیں

جناب اثر صہبائی نے جمشید میں اپنی پرستش حسن کا جس حسین انداز میں اظہار کیا ہے۔ وہ اس افسانے کی اور خوبیوں سے کہیں زیادہ قابل تعریف ہے فطری مناظر کی دلکشی اور افسانے کا حسرتناک انجام دونوں مل کر تاثر کے تمام عناصر کو تحریک دینے کا باعث بن گئے ہیں اور اس تقابل کی وجہ سے افسانہ ایک بہترین افسانے کی تمام خوبیوں سے مزین ہو گیا ہے

"نفسیات اور مومن" ایک نہایت قابل قدر مضمون ہے۔ اور مضمون نگار کی روشن دماغی اور اصابت رائے کا ایک مکمل ثبوت۔ غالب تو اب اچھی طرح جمہور سے متعارف ہو چکا۔ لیکن ضروری ہے کہ کوئی ہمت کر کے مومن کے کلام پر ایک مکمل اور مفصل تبصرہ سپرد قلم کرے۔ غالب کے بعد مومن کا جدید انداز بیان۔ شوکت الفاظ اور عمق تخیل کچھ کم رتبہ نہیں رکھتا مجھے امید ہے کہ یہ نقش اول کئی اور انشا پردازوں کے لئے محرک عمل ثابت ہوگا۔

سراغرسانی کے متعلق عام افسانوں میں یہ نقص بالعموم پایا جاتا ہے کہ "حل طلب عنصر" جسقدر پیچیدہ اور اسی لئے ضروری طور پر جاذب نظر اور دلچسپ ہوتا ہے۔ اسی قدر "انکشاف راز" کی ترتیب و تکمیل میں ناکامیابی ہوتی ہے۔ کیونکہ خوارق عادات واقعات کے حل کو قطعاً فطری اور قابل یقین بنا دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسے افسانوں کا انتہائی نقطۂ عروج یہ ہے کہ واقعات جسقدر حیرت خیز ہوں۔ حل اسی قدر فطری اور سادہ ہو۔

ناظر کا ذہن خوارق عادات واقعات کے حل کے لئے عام پہلوؤں کی طرف ہی متوجہ نہیں ہوتا۔ اور مصنف کی کوشش بھی یہی ہوتی ہے۔ کہ ناظر کا ذہن صحیح حل کی طرف منتقل نہ ہونے پاتے۔ آرسین لوپن کے افسانے اس بات کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ برق بلا انہیں افسانوں میں سے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔

عشرت باقی محض ایک تخیلی افسانہ ہے۔ روپ متی اور باز بہادر کے رومان کا ذکر محض اسلئے کیا گیا ہے تاکہ رجال قصہ کے امتیازی خصائص کو واضح کیا جا سکے۔ معز الدین اور صلابت یار جنگ اس رومان کے متعلق اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے "محبت" کے موضوع پر خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اور انہیں خیالات کے تقابل سے عشرت باقی کے معانی بین السطور کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایڈیٹر

ہیگل کے فلسفۂ فنون لطیفہ

کا

مقدمہ

گزشتہ سے پیوستہ

اور اس قسم کے اور اعتراض جو فنونِ لطیفہ سے ایک خالص علمی بحث کرنے کی نسبت وارد کئے جاتے ہیں۔ ان کا ماخذ جمہور کے افکارِ متداولہ، مختلف زاویہ ہائے نگاہ اور مختلف آرائے عمومیہ ہیں۔ جن کا باضابطہ بیان تسلی بخش طور پر قدماء کے ادب میں، بالخصوص ان فرانسیسی مصنفین کی تحریروں میں جنہوں نے فنونِ لطیفہ کو اپنا موضوعِ کلام بنایا ہے۔ پڑھا جا سکتا ہے۔ ان تحریروں میں آپ کو بعض ایسی باتیں ملینگی جن میں کسی حد تک صداقت کا عنصر موجود ہے۔ اور جن میں آپ ایسے دلائل کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ جو کم از کم بادی النظر میں قابلِ قبول ہیں۔ مثال کے طور پر اس امر کو لے لیجئے۔ کہ حسن جتنا عام اور عالمگیر ہے۔ اتنی ہی متفرق صورتوں میں شکل پذیر ہوتا ہے۔ اب اگر ہم چاہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عام انسانوں کی طبیعت میں حسن کی طرف ایک جبلی رجحان و میلان ودیعت کیا گیا ہے۔ اور پھر اس سے ہم ایک اور نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ چونکہ مختلف لوگوں کے ذہن میں حسن کے متعلق اس قدر مختلف تصوّر ہیں۔ جن کا کچھ حد و حساب نہیں۔ اس لئے لازم آتا ہے کہ حسن اور حسن شناسی کے متعلق کوئی جامع اور کلّی قوانین وضع نہ کئے جا سکیں۔

اس سے بیشتر کہ ہم ان مباحث سے توجہ ہٹا کر حقیقت الامر کے متعلق اپنی ذاتی رائے کا اظہار کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمہیداً ان سوالات پر روشنی ڈالی جائے۔ جو صنعت سے علمی بحث کرنے پر اٹھائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ مسئلہ ہمیں دعوتِ حل دیتا ہے۔ کہ صنعت علمی تحقیق و تدقیق کا موضوع بننے کا استحقاق رکھتی ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں سنئے۔ یہ بیشک درست ہے کہ صنعت دِل بہلاؤ کے طور پر استعمال

کیجا سکتی ہے۔ اس سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ کہ اپنے گردوپیش کی چیزوں کو آراستہ کیا جائے۔ اور زندگی کے ظاہری حالات کو دلخوش کن بنایا جائے۔ جب صنعت اس مصرف میں لائی جائے تو بلاشبہ اس کی حیثیت بجائے خود کچھ نہیں رہتی۔ بلکہ وہ دوسرے مقاصد کے زیر فرمان ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن جاننا چاہئے کہ جس قسم کی صنعت سے ہم بحث کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسی صنعت ہے۔ جو بلاوساطت غیرے آپ اپنی مقصود ہے۔

رہی یہ بات کہ صنعت غیر مقاصد کی تابع فرمان ہو سکتی ہے۔ اور گزر اوقات کا ایک دلچسپ مشغلہ بھی بن سکتی ہے، سو یہ وصف فکر اور صنعت کے درمیان مابہ الاشتراک ہے۔ کیونکہ خود فکر بھی جب ایسے علوم کی صورت اختیار کرلے۔ جو منافع عملی کو اپنا مطمح نظر بناتے ہیں۔ تو وہ ایک ادنےٰ حیثیت قبول کرلیتی ہے۔ اور محدود مقاصد کی تابع اور اُن کے حصول کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس صورت میں علم کے مفید اوصاف از خود پیدا نہیں ہوتے بلکہ کسی غیر کے مرہونِ منت ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی علم میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ محدود مقاصد کی غلامی سے آزاد ہو کر حقیقت الحقائق کی جستجو میں مصروف ہو جائے۔ اور جب وہ اس درجۂ ترقی پر پہنچ جائے تو کسی قسم کی مداخلت کے بغیر اپنے اعلےٰ مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہو جاتا ہے۔

فنونِ لطیفہ اگر عملی مقاصد سے بے نیاز نہ ہو جائیں تو صحیح معنیٰ میں صنعت کے نام کے مستحق نہیں۔ اور وہ اُس وقت تک اپنے اصلی فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوتے جب تک وہ مذہب اور فلسفے کے دائرے میں قدم نہ رکھ لیں، یعنی ضمیر کائنات، نوعِ بشر کے وسیع ترین مقاصد اور نفس کے عمیق ترین معارفِ روحانی کے اظہار، اور شعور کے سامنے لانے کا ذریعہ نہ بن جائیں۔

یہ صنعت اور صرف صنعت کا طغرائے امتیاز ہے کہ قوموں نے اُسے اپنے قلبی جذبات کی آئینہ داری سونپی ہے۔ اُس میں اپنی روح معانی نکال کر رکھ دی ہے۔ اور اُس میں اپنے دل و دماغ کے سب سے گراں بہا خزانے مخفی کر دیتے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر فنونِ لطیفہ قوموں کے صحیفۂ حکمت کی تفسیر بلکہ واحد تفسیر ہوتے ہیں۔

یہ ایک ایسی صفت ہے جو مذہب و فلسفہ اور صنعت کو ایک رشتۂ یگانگت میں مربوط کئے ہوتے ہے صنعت میں یہ خصوصیت مستزاد ہے کہ وہ بلند سے لیکر پست تک ہر قسم کے افکار کو حواس کا خلعت پہناتی ہے اور پیکرِ محسوس میں متشکل کرتی ہے۔ اور اس طرح انکو قدرت اور اُس کے طریق ظہور کے قریب تر کر دیتی ہے۔ یعنی ہماری محسوسات کی دنیا سے اُن کے ڈانڈے ملا دیتی

ہے۔ وہ دُنیا جس کی گہرائیوں میں قوّتِ متفکرہ سرگرمِ جولاں رہتی ہے۔ ایک ایسی دُنیا ہے۔ جو حواس سے بالاتر اور ہمارے شعور کی سرحد سے پرے ہے۔ یوں کہئے کہ ہمارا نفس کائناتِ محسوس کی رشتہ بپائی سے اپنے کو آزاد کر کے غیر محدود اور دور و دراز فضاؤں میں مصروفِ پرواز ہو جاتا ہے۔ لیکن نفس میں یہ قابلیت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ عالمِ محسوسات اور عالمِ معقولات کے درمیان ربط و ضبط کا سلسلہ قائم رکھے۔ اور اُن میں کوئی فاصلہ حائل نہ ہونے دے۔ وہ محض اپنے لامتناہی قوائے تخلیق کی بنا پر۔ ایسے بدائعِ صنعت خلق کرتی ہے۔ جو خارجی اور ذہنی دُنیا میں قرب و انصال پیدا کرتے ہیں۔ اور مظاہرِ موجودات اور عقل کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

یہ اعتراض، جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں، اکثر کیا جاتا ہے کہ اگر ہم صنعت پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیں، تو وہ اس بات کی اہل نہیں ثابت ہوتی کہ اُس کے متعلق کدّ و کاوش کی جائے۔ کیونکہ فریب آفرینی اور ظاہر آرائی اُس کے لوازم میں سے ہے۔ ہم اس اعتراض کو قاطع اور ناقابلِ تردید مان لیتے، اگر یہ تفرض کر لینا حق بجانب ہوتا کہ ظاہر کو موجود ہونے کا کوئی استحقاق نہیں، کیونکہ اُس کا ہونا بالکل غیر ضروری ہے۔ بہر کیف اثباتِ حقیقت کے لئے ظہور کا ہونا ضروریاتِ اوّلیہ میں سے ہے اگر حقیقت منصّۂ ظہور پر نہ آتی تو معدوم ہوتی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ خواہ بجائے خود کیوں نہ موجود ہو، تاہم جبتک وہ کسی ذی عقل ہستی کے نزدیک متحقق نہ ہو جائے۔ اُس وقت تک معدوم ہے۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا اعتراض ظہور پر بحیثیت مجموعی وارد نہیں ہوتا، بلکہ کسی مخصوص اسلوبِ اظہار پر جس سے صنعت کسی ذہنی و باطنی حقیقت کو منظرِ عام پر لاتی ہے۔ اگر صنعت کے اس اسلوبِ اظہار پر جس کے ذریعے وہ اپنی اختراعات کو ایک وجودِ محقق دے کر حقائقِ ثابتہ کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ اعتراض عاید کیا جائے کہ وہ سراسر فریب آفرینی پر مبنی ہے۔ تو اِس اعتراض کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ ہم اس کا مقابلہ مظاہرِ قدرتی کی خارجی دُنیا سے، اور اس دُنیا کو ہم سے بحیثیت وجودِ مادی کے جو علاقہ براہِ راست اور بلا واسطہ ہے کریں، یا اپنی باطنی دُنیا سے اُس کا موازنہ کریں، بالفاظِ دیگر اپنے محسوسات کے معیار پر اُسے جانچیں۔

(باقی)

محمد ہادی حسین

گنگا اشنان

گنگا کے کنارے تم اشنان کیے جاؤ
مشتاق نگاہوں پر احسان کیے جاؤ

مذہب کی یہ پابندی اور اپنا یہ سن دیکھو
یہ وقت سحر دیکھو جاڑے کے یہ دن دیکھو

ادھر حسن سے بے پروا او دھرم کی متوالی
مٹ جائے نہ سردی سے رُخسار کی یہ لالی

منظر لب دریا کا بھٹا یوں ہی بہت پیارا
سونے پہ سُہاگہ ہے یہ صبح کا نظارا

مشتاقِ تماشا ہے ہر اک رُخِ تاباں کا
سُورج نے بھی چپکے سے دیکھو وہ تمہیں جھانکا

مستغنی از آرایش کیا وضع نکالی ہے
ٹیکہ ہے نہ جھومر ہے چٹّے ہیں نہ بالی ہے

یہ سادگی بہتر ہے ہر ایک بناوٹ سے
اچھا ہے یہ بھولاپن ہر ایک لگاوٹ سے

ستّارِ تنِ نازک گو ہلکی سی ساری ہے
ہے قولِ نزاکت کا پھر بھی کہ یہ بھاری ہے

بھیگے ہُوئے کپڑوں سے ہے رنگِ بدن پیدا
یا ہلکے سے بادل سے سُورج کی کرن پیدا

گو شانِ تقدّس بھی چہرے سے نمایاں ہے
شوخیِ ادا لیکن غارت گرِ ایماں ہے

اُس کو بھی پسند آئی یہ شکل ہی پیاری ہے
تصویر جو یوں دل میں دریا نے اُتاری ہے

جب پانی چڑھائیگی یہ صورتِ نورانی
ڈر ہے کہ نہ سُورج پر پڑ جائے گھڑوں پانی

یہ فتنۂ محشر ہے یا بانکی ادائیں ہیں
یہ گیسوئے پُر خم ہیں یا کالی بلائیں ہیں

اُوپر کو اُٹھاؤ تو تم بہرِ خدا آنکھیں
یہ سحر بھری آنکھیں تصویرِ حیا آنکھیں

تم یُونہی نہانے کو آن پر بھی کھڑی ہوتیں
اے کاش مری آنکھیں پتھر میں جڑی ہوتیں

گنگا میں تمہیں پیاری اشنان مُبارک ہو
اس دِل کو محبت کا ارمان مُبارک ہو

(ڈاکٹر) سعید احمد سعید

وجدانیات

کہتے نہ تھے کہ عشق بھی ہے راہ راہ کا
اب دل اُٹھائے لطف ذرا آہ آہ کا

برسوں رہا ستم پہ تمہارے گمانِ لطف
برسوں کھُلا نہ راز فریبِ نگاہ کا

ایسا غرور ہے مجھے بن کر فقیرِ عشق
گویا ہے آسمان پہ گوشہ کلاہ کا

برباد گو کیا مجھے بختِ سیاہ نے
کچھ دخل تھا حضور کی چشمِ سیاہ کا

عرضِ کرم کروں تو گنہ گار جانیے
افسانہ سُن تو لیں مرے حالِ تباہ کا

تم اور یوں نوازشِ پیہم کی بارشیں
تم خود کہو مقام نہیں اشتباہ کا

ہم صدقِ دل سے شکرِ جفا بھی تو کر چکے
اب تم بتاؤ کوئی طریقہ نباہ کا

بگڑینگے وہ جو گرم نظر پائینگے مجھے
پھر کیا جو اعتراف کیا بھی گناہ کا

آئینۂ خیال پہ ہو جائیے فدا
اُترا ہے جس میں عکس تری جلوہ گاہ کا

تعریف سے حضور کو چڑ ہے یوں ہی سہی
لو ذکر چھیڑتا ہوں مَیں خورشید و ماہ کا

عابدؔ خلوصِ شوق نے اُن پر کیا اثر
پھر سلسلہ ہُوا کرمِ گاہ گاہ کا

عابدؔ

عشرت باقی

(۱)

نواب صلابت یار خاں جنگ پنج ہزاری نے خود ان نفیس جواہرات سے مزین شمع دانوں کو جو کمرے کی وسعت میں صرف ایک محدود دائرہ نور پیدا کر رہے تھے۔ اپنے قریب کے تخت پوش پر رکھ لیا۔ آج وہ خلاف معمول دارالمطالعہ میں آکر بھی افسردگی کے اس مبہم احساس کو جو اسے اپنے دل پر صبح سے طاری ہوتا معلوم ہو رہا تھا۔ کم نہ کر سکا تھا دارالمطالعہ کے چاروں طرف بلند و وسیع المایوں میں مجلد کتابوں کی ہزارہا جلدیں جن کی صوفیانہ ابریق اسکی سلیم الطبعی کی دلیل تھی۔ نفاست سے چنی ہوئی تھیں محراب دار دروازے اور کھڑکیاں جو مغلیہ صنعت تعمیر کی خصوصیات امتیازی ہیں زردوزی اور ریشمی گراں بار پردے خوبصورت کنول اور جھاڑ کاشانی مخمل کا فرش ہر طرف دولت کی فراوانی اس ہجوم نقش و نگار کی ہر شے سے نمایاں تھی۔

دو مخملی گدیلوں کا سہارا لیتے ہوئے وہ تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ شمع کی زرد و لطیف روشنی اس کے زرد مگر تابناک آلود چہرے کو اور بھی جلا دے رہی تھی۔ وہ اپنی عمر کا بہترین حصہ طے کر چکا تھا۔ اس کے سفید بال، روشن، بڑی بڑی آنکھیں سفید ہاتھ جن کو جھریوں نے تقدیس عمر کا رنگ دیدیا تھا۔ یہ تمام چیزیں ایسی تھیں۔ کہ بیک نظر دیکھنے سے یہ شبہ ہوتا تھا۔ گویا کسی صناع مصور کے موقلم نے تقدیس اور تجربے کی روح کو مادی لباس پہنا دیا ہو۔ وہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد اس کی طبیعت اکتا گئی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور ہوا کی فرحت کے ساتھ ہی اسے اس ناقابل بیان خوشبو کا احساس ہوا۔ جو پرانی کتابوں کے اوراق سے پیدا ہوتی ہے۔ کتابیں ہی کتابیں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں۔ آج وہ اس جگ بیتی کو چھوڑ کر اپنی کتاب حیات میں سے آپ بیتی کے کئی واقعات کا خیال کر رہا تھا۔ انہیں پڑھ رہا تھا۔ کیونکہ اب اس کیلئے ہر ایک چیز پڑھی جاتی تھی۔ پڑھنا اس کی زندگی کا مقصد رہا تھا۔ بچپن سے لیکر جوانی تک اور جوانی سے لیکر ادھیڑ عمر تک وہ پڑھتا رہا تھا۔ وہ ایک پنج ہزاری امیر تھا لیکن یہ یہ خطاب اسے ورثے میں ملا تھا۔ اور اس کی اپنی دلیری اور بہادری اس خطاب سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھی اسے یاد تھا کہ ابتدا ہی سے وہ کسی فقرے کی بے ساختہ تراش کو دیکھ کر

یا کسی خیال کو مناسب الفاظ کے طلسم میں قید دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا تڑپ جایا کرتا تھا۔ اس کے ہم عمر اس کا کسقدر مذاق اڑاتے تھے۔ وہ زرق ۔ ق کپڑے پہنے ہوتے ہتھیار سجائے اور چست شعلہ مزاج گھوڑوں پر سوار اسکے سامنے سے گذرتے تھے۔ تو اس کے دل میں انہی کی طرح بن جانے کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ کوئی خیال نہ آتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ اور تفاخرانہ انداز میں اپنی مونچھوں کو بل دیکر عشق و محبت کی داستانیں بیان کرنے لگتے تھے ان داستانوں میں ان کا اپنا ذکر ہوتا تھا۔ دلیری کے کارناموں کا ذکر ہوتا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے۔ اس کے مطالعہ میں ترقی ہوتی جاتی تھی۔ یہ اپنے وقت سے کئی سو سال بعد پیدا ہونے والا انسان عشق اور محبت۔ جنگ اور جدال کی پُرفریب فضا سے دُور کوسوں دُور جی رہا تھا۔ کتابوں کے ان مسائل سے جو حیات و ممات مسرت و غم اور اسی طرح کے نازک رشتوں کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ وہ مانوس تھا یوں مانوس تھا۔ گویا وہ بھی انہی کتابوں کا ایک صفحہ ہے۔ دن بھر اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھ کر فطرت کے معموں کو سلجھتے ہوئے دیکھنا اسے عشق و محبت کی اُلجھنوں سے زیادہ مرغوب تھا۔ اس تمام تسلسل میں صرف ایک واقعہ تھا۔ جو اسکی زندگی میں پُرسکون زندگی میں خلل انداز ہوا تھا۔ آہ۔ وہ واقعہ لیکن

اب تو اس واقعہ کو گزرے کئی سال ہو چکے تھے۔ وہ اسے تقریباً فراموش کر چکا تھا۔ پھر آج کیا وجہ تھی۔ کہ اس کے خیالات حافظے کے شفاف پروں پر سوار ہو کر اسی سرزمین میں جا پہنچے تھے۔ جس کا ایک فرزند چند لمحوں کے لئے اسے مضطرب کر گیا تھا۔ محبت کی سرزمین وہ سرزمین جسکی معمولی باتیں اس کے لئے رازِ سربستہ کی حیثیت رکھتی تھیں کتنی دُور تھی۔ پھر بھی آج وہ محسوس کرتا تھا۔ گویا وہ خود بھی اس سرزمین میں پیدا ہوا ہے۔ شاید اس لئے کہ آج کی رات عین اسی رات کے مشابہ تھی۔ جب ایک مجنونِ عشق ستارے کی طرح اس کی ظلمتِ دل پر چمکتا ہوا نکل گیا تھا۔ وہ بہت آہستہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور ایک کھڑکی کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا۔ نہایت سکون سے اس نے بھاری بھاری پردوں کو ایک طرف ہٹا کر کھڑکی کھولی۔ سرد ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی داخل ہوئی۔ مینہ کے بڑے بڑے موٹے قطرے بوچھاڑ کے ہمراہ اندر آنے لگے۔ کمرے کا سکون یکایک مختلف آوازوں سے گونجنے لگا۔ باہر اولے پڑ رہے تھے۔ لیکن اسے کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ سفید بال بکھر کر ماتھے پر آپڑے تھے وہ دلچسپی سے عناصر کی اس کشمکش کو دیکھ رہا تھا۔ اس طرح دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ کوئی تماشائی ہو۔ اور اس کے سامنے کوئی دلچسپ تماشا دکھایا جا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں اب تاریکی

سے مانوس ہوکر درختوں کی طویل ہیئت کا امتیاز کر سکتی تھیں۔ یکایک بجلی چمکی۔ اور ایک لمحے کے لئے درخت سڑک اور سامنے کا کھلا ہوا میدان گویا سرخی آمیز چاندنی میں دھوئے گئے۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا۔ کہ اسی طرح ایک رات اس کے دل کی ظلمتوں پر کئی نئے جذبات کی بجلیاں چمکی تھیں یکایک اُس نے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ دور بہت دور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آرہی تھی آوازوں کے اس ہجوم میں بھی اس کا تمیز کرنا مشکل نہ تھا۔ پہلے پہل اُس نے سمجھا کہ شاید اس کے کان بج رہے ہیں۔ شاید وہ اس رات کے واقعات میں اسقدر محو تھا۔ کہ اسے وہی واقعات پیش آنے کی توقع تھی۔ لیکن آواز نزدیک تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ اب اسے کوئی شبہ نہ رہا۔ کہ یہ آواز اس کے واہمے کی تخلیق نہیں، حقیقت ہے۔ اب اس نے بہت ہی نزدیک ایک گھوڑے اور سوار کی مبہم سی ہیئتیں دیکھیں۔ بجلی پھر چمکی اور اُس نے "وقفۂ نور" میں دیکھا کہ گھوڑا بیدم ہوکر گر پڑا۔ سوار خون میں لت پت تھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ سوار کی عمر یا کسی اور بات کا اندازہ کرے۔ تاریکی مسلط ہو چکی تھی۔ شاید وہ ایک ثانیہ کھڑا رہا۔ یا شاید ایک عمر کھڑا رہا لیکن اب اس کے لئے وقت کا تعین ناممکن تھا۔ اسی حالت میں یکایک کھڑکی کے پٹ تھامے ہوئے سوار اوپر چڑھ آیا۔ خدا جانے کس طرح۔ کیا معلوم وہ کونسا مافوق الفطرت جذبہ تھا۔ جس کی مدد سے وہ دیوار پر چڑھ سکا۔ سوار صلابت یار جنگ کو دیکھ کر ذرا نہیں ہچکچایا۔

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں زخمی ہوں کیا آپ مجھے دو تین گھنٹے کے لئے آرام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟"

وہ حقیقت میں زخمی تھا۔ انتہا کا زخمی۔ اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ کپڑوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ بال خون سے چپک گئے تھے۔

یار جنگ نے بغیر کچھ جواب دئے اپنے ضعیف بازوؤں کے سہارے سے جن میں انسانی ہمدردی کی قوت موجزن تھی۔ اسے اندر آنے میں مدد دی۔ اور نہایت سکون سے کہا۔ "خوش آمدید۔ آپ یہاں ہر طرح سے محفوظ ہیں۔"

وہ اسے سہارا دئے ہوئے ایک پلنگ کیطرف لیکر بڑھا

(۲)

نووارد نے کہا "میرا نام معزالدین ہے اور میں ——— کے صوبیدار کا لڑکا ہوں۔ مجھے معاف کیجئے گا"

اور یہ کہکر وہ تکان کے مارے پلنگ پر گر پڑا۔

"مجھے صلابت یار جنگ کہتے ہیں"

یہ کہتے ہوئے اُس نے کھڑکی بند کی اور قریب کی ایک الماری سے مشک بو مفرح شربت کا ایک گلاس بھر کر

معزالدین کے لبوں کے ساتھ لگا دیا۔ وہ تکان کی اس انتہاء گہرائی تک پہنچ چکا تھا۔ جب گرد و پیش کی ہر ایک چیز دھندلی سی نظر آتی ہے۔ اور تعجب خیز سے تعجب خیز واقعہ معمولی حادثات کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے۔ وہ شربت کے گلاس کو ایک ہی گھونٹ میں خالی کر گیا۔ اسے اپنے بدن میں گرمی اور توانائی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اب اس نے احساس کیا کہ اس کی ظاہری حالت بوسیدہ کپڑوں خاک و خون میں لتھڑے ہوئے بدن اور صلابت یار جنگ کی حالت میں کیسا نمایاں تفاوت ہے۔ صلابت یار جنگ ایک پدرانہ شفقت سے اس پر جھکا ہوا اس کے زخموں کا معائنہ کر رہا تھا۔ معزالدین دل ہی دل میں اس کشادہ پیشانی میزبان کی فراخدلی پر غور کر رہا تھا۔ اس نے کس بیباکی سے معزالدین کو اندر بلا لیا تھا۔ ممکن تھا کہ معزالدین کوئی چور ہوتا۔ کوئی قاتل ہوتا۔ جو سپاہیوں کی حراست سے بھاگ نکلا ہو اس نے ان تمام خیالات سے بے نیاز ہو کر معزالدین کو خوش آمدید کہا تھا۔ معزالدین کا دل اس شرافت نفس و ایثار سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اس عرصے میں صلابت یار جنگ زخموں کے معائنے سے فارغ ہو چکا تھا۔

اس نے اطمینان افزا لہجے میں کہا "زخم بہت ہیں مگر گہرا کوئی بھی نہیں۔ تم نام خدا ابھی جوان ہو۔ انشاء اللہ ہفتے بھر میں مکمل صحت ہو جائیگی۔"

معزالدین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "خلاف توقع میرا اس رات کے وقت بغیر دروازہ کھٹکھٹائے کھڑکی کی راہ سے کود آنا اور آپ کے مطالعہ میں حارج ہونا یقیناً آپ کو بہت ناگوار ہوگا لیکن میں سچ کہتا ہوں۔ کہ مجھے کوسوں تک کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی تھی جہاں میں رات بھر کے لئے ٹھہر سکتا۔ اور دشمن برابر میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔ کہ دروازہ نہیں کھٹکھٹایا کیونکہ اس وقت نوکر تمام سوئے ہوئے ہونگے۔ اور دروازے کی آواز میرے کمرے تک نہیں پہنچتی۔"

نواب معزالدین کے پاس بیٹھ گیا۔

معزالدین نے ایک ایسے لہجے میں جس میں شکریئے پر ندامت کا رنگ زیادہ غالب تھا۔ کہا "ممکن ہے میں کوئی ڈاکو ہوتا۔ یا قاتل ہوتا۔"

صلابت یار جنگ مسکرایا

"تمہارا آنا بے مثال نہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ تیس سال ہوئے گزر چکا ہے۔ عین اسی وقت ایک رات کو تمہاری عمر کا ایک نوجوان شخص بالکل تمہاری سی حالت میں اس کھڑکی کی راہ سے اندر آیا تھا۔ اپنی عمر کے اس خوشگوار حصے میں بھی میں مطالعۂ کتب میں مصروف تھا۔ وہ مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتا رہا۔ لیکن اس کی باتیں ایسی چیزوں کے متعلق

نفسیں جنہیں میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ اُس نے حسن اور عشق ـــــ عشق اور حسن کے متعلق لاکھوں باتیں کیں۔ مجھے وہ باتیں خواب کی طرح یاد ہیں۔ اور بعض وقت میرا تخیل ان کو قوسِ قزح کے رنگین مجموعے کی طرح دلچسپ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے۔ گویا میں نے اپنی تمام عمر کتابوں کی بے حس و حرکت فلسفیانہ زندگی کی قربانگاہ پر نذر کر دی ہے۔ دُنیا اس شخص کے انجام کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ دُنیا سمجھتی ہے۔ کہ وہ کامرانِ محبت تھا لیکن میں بہتر جانتا ہوں۔ شروع میں اسے محبوب کی ملاقات میسر تھی لیکن صرف ایک سال کے بعد دربار کے سازشی امراء نے اسے مروا ڈالا۔ اور لوگ یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو لیکر کسی اور مُلک میں جا رہا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی آخری رات اسی کمرے میں گذار کر گیا تھا۔ دوسرے دن اس کی لاش کے ٹکڑے اڑا دئے گئے۔ وہ باز بہادر[۱] تھا۔

معز الدین چونک پڑا۔ اس کی متخیلہ روپ متی اور باز بہادر کے تمام واقعہ کو اس کے سامنے پیش کر رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا وہ خود اس واقعہ میں شریک تھا۔ وہ اس وقت کا تصوّر کر رہا تھا۔ جب روپ متی اور باز بہادر اپنے وطن کو خیر باد کہنے پر تیار ہو کر کسی اندھیری رات کی پردہ دار آغوش میں چھپ کر دُنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ باز بہادر کا انجام ایسا خوفناک ہوا۔ روپ متی اور اس کی محبت کا غوغا ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکا تھا۔ مگر کسی شخص کو اس حسرتناک فسانے کے آخری باب کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ آخر کار اس نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔ کہ باز بہادر کی طرح میں محبت کے تیروں سے گھائل ہو کر یہاں نہیں آیا۔"

"باز بہادر بھی تمہاری طرح خاموش الطبع تھا۔ اس نے بھی مجھے اپنے افسانے کا ایک جزوی حصہ سُنایا تھا۔ وہ تمہاری طرح یہاں زخمی بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کے زخم اور اس کی تکان خوبصورتی کے ان نشانات کو نہ مٹا سکے تھے جو اس کی ہر بات سے پیدا تھی۔ اس کے انداز ایسے جاذبِ نظر اور مہذب تھے کہ شکستہ حالی کے ہجوم میں بھی ان کی لطافت نہ چھپ سکتی تھی۔"

یہ کہکر نواب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر یکایک اس طرح گویا اسے اچانک کسی چیز کا خیال آیا ہو۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور مُسکرا کر کہنے لگا۔ "میں اپنی میزبانی کے فرائض بھول گیا تھا۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ اس وقت میرے خیال میں نوکروں کو جگانا تو آپ کے مفاد کے ۔ ۔ ۔ ۔"

"بیشک۔ بیشک انہیں کل بہت سا کام کرنا ہوگا۔"

اور معز الدین بھی اپنے میزبان کی خوش طبعی اور ذہانت پر

[۱] باز بہادر اور روپ متی کا واقعہ عہدِ مغلیہ کے ارمان بھرے دور کی ایک مشہور یادگار ہے اور کئی مصوّر اس واقعے کو قرطاس پر منتقل کر چکے ہیں۔

دلی اطمینان سے مسکرایا۔

صلابت یار جنگ نے شمع اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

معز الدین اکیلا رہ گیا لیکن اسے یوں محسوس ہوتا تھا گویا اس کے علاوہ کمرے میں کوئی شخصیت موجود ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پچھلے چند دنوں کی تکان بے خوابی اور ذہنی کلفت میں احساس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق رکھتی تھی لیکن ان دنوں لوگ نفسیات کے ماہر نہیں تھے۔ اور وہ دماغ کی نیم شعوری کیفیات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ معز الدین کو یہ خیال ہو رہا تھا۔ گویا باز بہادر اس کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھا ہوا اس کی طرف غمگین نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسکی خوشنما سریلی آواز کو تقریباً سن سکتا تھا۔ یہ آواز بہت دور سے آرہی تھی جس طرح کوئی شخص دریا کے ایک کنارے کھڑا ہو کر دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہوئے شخص سے باتیں کرے معز الدین کو یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا باز بہادر کی آواز کسی دریا کے پہنائے وسیع کو طے کر کے اس تک پہنچ رہی ہو۔

"تمہاری طرح ایک عورت کی محبت میں مجھے بھی لڑائیاں کرنا پڑی تھیں۔ میں بھی زخمی ہو گیا تھا۔ تنہا کا زخمی بلا کا زخمی۔ میں بھی اسی طرح اندھیری رات میں اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے پناہ گزیں ہوا تھا۔"

معز الدین نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ گویا ابھی باز بہادر بنفسہ کسی پردے کے پیچھے سے نکلکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھدیگا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا۔ کیونکہ وہ ان خطرات کا کوئی تصور نہ کر سکتا تھا۔ جو اس کے واہمے نے اسکے دل میں پیدا کر دیتے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ کہ اس کا دماغ واقعات کے پے در پے ہجوم سے شل ہو گیا ہے۔ اور اسی لئے وہ سایوں سے بھی خوف کھاتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے۔ کل صبح سورج کی روشنی میں؛ تاریک خیالات شبنم کے قطروں کی طرح جذب ہو جائیں گے لیکن اس قسم کی تاویلوں سے اسے کوئی تسلی نہ ہوئی۔ باز بہادر اس کے دماغ میں اس کے جسم میں اس کی روح میں حلول کر گیا تھا۔ اور لمحہ بہ لمحہ باز بہادر کی آواز اس کے کانوں میں بہت صاف طریقے سے گونج رہی تھی۔

صلابت یار جنگ نے دروازہ کھولا۔ اور شمع لئے اندر داخل ہوا۔ اس ناکافی روشنی میں بھی معز الدین کی روح کی تاریکی کچھ کم ہونے لگی۔ نواب اپنے ساتھ مختلف سامان خوردنی لایا تھا۔ چیزوں کو تخت پوش پر رکھتے ہوئے اس نے کہا

"تکلف کو کام میں نہ لائیے گا۔"

"میں تکلف والا آدمی ہوتا تو کھڑکی کی راہ سے اندر"

اور وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

صلابت یار جنگ نے کہا۔

"تمہیں غالباً تعجب ہوگا۔ کہ میں نے اس بیباکی سے تمہیں اندر آنے کی کیوں اجازت دیدی۔ حقیقت یہ۔

کہ مَیں نے تمہیں باز بہادر سمجھا۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ پھر اپنی کتابوں کی طرف ایک عجیب انداز سے دیکھ کر بولا" باز بہادر۔ ہاں باز بہادر جو میرے عقیدے کے مطابق پھر ایک روحانی صورت میں آگیا ہو۔ کہولت خمیدہ پشت۔ سفید مو۔ لرزہ بر اندام کہولت باز بہادر کے لئے خلق نہیں کی گئی۔ میرے لئے اس کا تصور اسی طرح روشن اور شاداب ہے جس طرح اس رات تھا۔ سچ پوچھو تو مَیں اس کے علاوہ باز بہادر کا اور کسی طرح تصور ہی نہیں کر سکتا"

معزالدین سوچ رہا تھا۔ کہ وہ اسے اپنی رام کہانی کے کونسے حصے سُناتے۔ اس کے لئے ابتدا سے لیکر انتہا تک ہر ایک شے دلچسپ تھی۔ مرغوب تھی۔ آخر اس نے اہم اور غماز حصّوں کو حذف کر کے اپنا قصّہ سنانے کا قصد کیا۔

"یہاں سے پچاس کوس پر ـــــ کا قلعہ ہے قلعے دار کی لڑکی ـــــ سے مجھے محبت ہے۔ ہاں دیوانہ وار محبت ہے۔ اس نے میرے خلوص سے متاثر ہو کر مجھے ایک خط لکھا تھا۔ معصوم آرزوؤں سے لبریز مخلص جذبات سے پُر۔ وہ ہوس کے معنی سے بھی ناآشنا ہے۔ قلعے دار ان دنوں کہیں باہر تھا۔ قائم مقام کے ہاتھ میں کسی طرح وہ خط پڑ گیا۔ اس کی ابتذال آشنا طبیعت اس کے مفہوم کو کیا سمجھ سکتی تھی۔ خط ایک عورت کی طرف سے تھا۔ اور عورت کی طرف سے ایسے خط ہمیشہ عاشقانہ ہوتے ہیں اس خیال پر اعتقاد رکھتے ہوئے اس نے قلعے دار کو واقعہ کی اطلاع دی۔ ضروری تھا کہ قلعے دار کے وہاں پیشتر پہنچنے سے پہلے مَیں اس خط کو اپنے قبضے میں لے آؤں۔ لیکن میرے ارادے کی بھنک دشمنوں کے کانوں تک پہنچ چکی تھی انہوں نے میرا تعاقب کیا۔ اور اب خدا جانے وہ کہاں بھٹک رہے ہونگے۔ قریب ہی میرے والد کا قلعہ ہے۔ وہیں جاکر مَیں اپنے بندوبست کو مکمل کرونگا"

صلابت یار جنگ معزالدین کے الفاظ کو انتہائی انہماک سے سُن رہا تھا۔ گویا خود اس کی اپنی ہستی اپنی رُوح کے تار اس تمام واقعہ سے لرزاں ہیں۔

اس نے جوش سے بھری ہوئی آواز میں کہا" رگوں میں تازہ اور گرم خون کو محسوس کرنا کسی جذبے سے متاثر ہو کر مصیبت کے پہلو بہ پہلو راہ طے کرنا کیسا خوشگوار ہوگا"

اس نے قریب کی دیوار سے نہایت تیزی سے ایک تلوار اُتار لی۔ اور اُسے بے نیام کر دیا۔ شمع کی روشنی میں اس کا دستہ اس طرح چمکنے لگا۔ جس طرح رات کے وقت آسمان کی نیلگوں سطح پر کہکشاں نمودار ہوتا ہے۔

"مَیں ایک پنج ہزاری ہوں۔ میرے پاس بھی ایک تلوار ہے۔ لیکن محض کھلونا۔ روز صبح کو میرے نوکر کمرے کو صاف کرتے وقت اس کو بھی حسب خواہش صاف کر دیتے ہیں۔ یہ کمرے کی زینت ہو سکتی ہے۔ طبیعت کیلئے خیال آفرین

ہو سکتی ہے۔ لیکن میرے لئے کام کی نہیں۔"

معزالدین نے جواب دیا۔ "ایک اصیل گھوڑا اور ایک تابدار شمشیر میرے لئے یہ دونوں چیزیں سرمایۂ دو عالم ہیں"

صلابت یار جنگ نے ندامت سے لبریز آواز میں پوچھا "اور یہ سب چھوڑ کر تم نے ایک عورت کے لئے لیا۔"

"ہاں عورت۔ مگر آہ کیسی عورت"

صلابت یار جنگ نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں پر تھام لیا۔ "عورت میرے لئے ایک عجیب پیچیدہ معما ہے۔ ان کے الفاظ ان کی نگاہیں ان کے خوبصورت تناسب خوش انداز و خوشنما بدن ان کے انداز کی لطافت اور لوچ وہ جذبات جو انہیں متاثر کرتے ہیں۔ وہ خیالات جو انکی زبان پر رواں ہوتے ہیں۔ مگر جن کو ان کی آنکھیں جادو طراز سرگیں آنکھیں جھٹلاتی ہیں۔ یہ تمام اشیاء مجھے وہمی دُنیا کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے ان آدمیوں پر کسقدر رشک آتا ہے۔ جو ان سے باتیں کرتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔ ان کو سمجھتے ہیں"

معزالدین نے کہا "کیا دُنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں، جو عورتوں کو سمجھتے ہیں۔"

"ہاں باز بہادر اور تم جیسے آدمی"

معزالدین چونک پڑا اس کے ذہن میں خواہ مخواہ باز بہادر کا خیال آ رہا تھا۔ صلابت یار جنگ بھی اپنے خیالات میں محو تھا۔ وہ خواب جیسے مبہم اور خوشگوار جذبات میں غرق تھا۔ ان جذبات میں جو تنہائی کی لمبی راتوں اور کتابوں کی دائمی صحبت نے اس کے دل میں ایک آتشیں رو کی طرح بھڑکا دیے تھے۔ یکایک اس نے گویا چونک کر کہا "باز بہادر صرف ایک گھنٹہ میرے پاس بیٹھا رہا۔ اُس نے مجھے اپنا افسانہ سُنایا۔ میری تمام عمر کا مجموعہ اس قلیل وقت کی برابری نہیں کر سکتا۔

اس کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا گویا اس کی زندگی کا ایک لمحہ بہشت ہے۔ اور دوسرا دوزخ۔ ایک لمحے میں اسے اپنی محبوبہ کی وفا سرشتی پر اعتماد کامل تھا۔ دم بھر میں اس کا خیال بدل جاتا۔ ایک لمحے میں اسے یہ خیال آتا کہ ایک عورت جیسی مقدس تخلیق کا اس کی طرف نوازشانہ نگاہوں سے دیکھنا دُنیا بھر کی مسرت کا حاصل تھا۔ دوسرے لمحے میں اسے خیال آتا کہ وہ انسان کسقدر بیوقوف ہے۔ جو عورت کی وفا سرشتی پہ اعتماد رکھ کر اپنی مسرت کو تباہ کرنے کا باعث ہو اس نے مجھ پر ایک ایسی رنگین اور شفاف دُنیا کے دروازے کھول دیئے۔ جس کے ان طلسمی محلوں کو میں نے صرف ایک گھنٹے کے لئے حسن اور عشق کی عالمگیر روشنی میں جگمگ جگمگ کرتے ہوئے دیکھا۔ جہاں آرزو کی شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ جہاں کامرانی کے دیئے جل رہے تھے۔

آج مجھے یہ شبہ پیدا ہو رہا ہے۔ کہ میرے اس وسیع مطالعے کی تمام مسرت جذبات کی حقیقی عشرت کے سامنے

کوئی پایہ نہیں رکھتی۔ جذبات۔ آہ جذبات۔ معزالدین میں نے اس لفظ کے معنی سُن رکھے ہیں۔ صرف سُن ہی رکھے ہیں۔ لیکن اب تمہیں جانے کی جلدی ہوگی۔"

اس نے شمع اُٹھائی۔

معزالدین نے کہا "میرا خیال ہے۔ کہ ابھی مجھے اور بھی زیر بارِ احسان ہونا ہے۔ میری تلوار راہ میں گر گئی۔"

صلابت یار جنگ نے اپنی تلوار معزالدین کے ہاتھ میں دے دی۔

"میں نے اسے کھلونا کہا تھا۔ لیکن تمہارے مضبوط ہاتھوں میں یہ کھلونا نہیں رہے گی۔"

معزالدین نے پھر کہا "سرمایۂ دو عالم میں سے میں ایک چیز پا گیا۔ دوسری باقی ہے۔"

"ایک اصیل گھوڑا کیوں ہے نا؟"

"آپ نے درست اندازہ کیا ہے۔"

صلابت یار جنگ نے شمع اُٹھا کر معزالدین کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اصطبل میں جا پہنچے معزالدین نے خود ایک گھوڑے پر زین کسی۔ اور چلنے کے لئے تیار ہوا۔

صلابت یار جنگ نے مسکرا کر کہا "خدا حافظ اب ہمارے راستے جُدا ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کل رات اپنی کتابوں میں غرق میں اسی کو عشرت باقی تصوّر کرونگا اور آج کی باتوں کو ایک بوڑھے شخص کی سٹھیائی ہوئی باتوں سے تعبیر کرونگا۔ لیکن اس وقت میرا جی یہی چاہتا ہے کہ میں اپنی کتابوں کو دیا سلائی دکھاؤں۔ اور تمہارے ساتھ چل نکلوں۔ اس طرح کہ ایک تلوار زیب کمر ہو۔ ایک اصیل گھوڑے پر سوار ہوں۔ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر میں بھی تمہاری فتح کو اپنی فتح اور تمہاری شکست کو اپنی شکست سمجھوں۔"

معزالدین بہت متاثر ہوا۔

آخر کار اس نے کہا "آپ میرے ساتھ چلئے۔ اور جو کچھ آپ نے کہا ہے۔ کر کے دکھائیے۔ آپ میرے جذبات کو اپنے جذبات تصوّر کیجئے۔ اور دیکھئے۔ کہ کتابِ حیات کے یہ افسانے ایک اہل نظر کے لئے مطالعہ سے بھی زیادہ دانش آموز ہوتے ہیں۔"

صلابت یار جنگ بغیر کچھ کہے سُنے کے اندر سے ایک تلوار اُٹھا لایا۔ اس نے زرہ پہنی۔ سر پر خود رکھا۔ خود اپنے گھوڑے کو سامان سے آراستہ کیا۔ اور بولا "مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ گویا بیس سال ہمیشہ کے لئے میری گزشتہ عمر میں سے نکال دئے گئے ہوں۔"

معزالدین نے مسکرا کر جواب دیا "جذبات کی جوانی حیات کی جوانی ہے۔"

وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر چل کھڑے ہوتے۔

(۳)

وہ پانی سے تربتر معزالدین کے قلعے میں جا پہنچے۔

معزالدین کے والد شکار کو گئے ہوئے تھے۔ رات باہر گزارنا پڑی۔ ان کی غیر موجودگی میں معزالدین کا حکم نادر شاہی سطوت رکھتا تھا۔ قلعے کے عملے نے اپنے آقا کو اس حالت میں دیکھ کر چنداں متعجب نہ ہوئے۔ وہ اس کی شعلہ مزاجی سے بخوبی واقف تھے۔ معزالدین نے سمت شناسی سے بہرہ فوج کے سردار اعلیٰ کو طلب کیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ قوی ہیکل مضبوط۔ چوڑے چکلے شانوں والا جس کے چہرے پر بجلے پختہ کاری کے جو اس کی عمر کی مقتضی تھی۔ خود سرانہ شجاعت اور ہٹ دھرمی کے نشان تھے۔

معزالدین نے کہا۔ "قلعے میں کتنی فوج ہے"

"دس ہزار حضور"

"ہوں۔ میں اسے خود دیکھنا چاہتا ہوں۔"

سردار اعلیٰ عسکری پچھلے پاؤں لوٹ گیا۔ اور تھوڑے عرصے میں کرنا پھونکے جانے کی آواز سنائی دی۔ ہتھیاروں کی جھنکار۔ گھوڑوں کی ٹاپیں اور سپاہیوں کے قدموں کی چاپ ہوا میں گونجنے لگی۔ عسکری واپس آیا۔ اور کہا "چلئے۔"

وہ دونوں عسکری کے پیچھے ہوئے۔ قلعے کے صحن میں فوج صفیں جمائے کھڑی تھی۔ افسروں کی ننگی تلواروں پر بجلی کی روشنی پڑتی۔ تو یوں معلوم ہوتا۔ گویا شفاف چمکیلے سانپ پھن اٹھائے کھڑے ہیں۔ مینہ اسی طرح زور و شور سے برس رہا تھا لیکن معزالدین سپاہیانہ انداز سے تمام صفوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے عسکری کے قریب واپس آکر کہا

"ٹھیک ہے۔"

معزالدین کچھ عرصہ خاموش رہا۔ پھر کسی فوری جذبے سے متاثر ہوکر بولا "عسکری"

"حضور"

"بھلا تم اس فوج سے کتنے آدمیوں کا مقابلہ کر سکتے ہو"

عسکری نے اس غیر متوقع سوال پر تعجب کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ سپاہی کے لئے افسر کے سوال قطعی احکام ہوتے ہیں۔ اس نے کہا "حضور قلعے کی جائے وقوع مناسب نہیں۔ لیکن حزم و احتیاط سے اپنی فوج سے دگنی جمعیت کو آسانی سے پسپا کیا جا سکتا ہے۔"

"اور اگر دشمن کی جماعت اس سے زیادہ ہو۔ بہت زیادہ ہو۔"

"تو سپاہی جان دیکر اپنے آقا کا حق نمک ادا کر سکتے ہیں۔"

معزالدین نے احسانمندی کے جذبات سے لبریز ہوکر عسکری کا ہاتھ دبایا۔

"عسکری۔ واقعی آج تمہیں حقِ نمک ادا کرنا ہوگا۔ یاد رکھو۔ آج کی رات کوئی فوج تمہارے قلعہ کے پاس سے گزر کر نہ جانے پائے۔"

"نہیں جانے پائیگی۔"

"اگر فوج کی تعداد تم سے بہت زیادہ ہو تو جس طرح تم مناسب سمجھنا عمل کرنا"

عسکری نے ایسے کامل اطمینان سے گویا وہ کسی معمولی مشورے پر عمل کرنے کی ہدایت لے رہا ہے۔ جواب دیا "اگر کسی فوج کی تعداد ہم سے بہت زیادہ ہوگی تو وہ اسی صورت میں یہاں سے گزرنے پائیگی۔ کہ ہمارے سپاہیوں کی لاشیں ان کے پاؤں کے نیچے روندی جا رہی ہوں"

معزالدین نے مسکرا کر صلابت یار جنگ کی طرف دیکھا "اور عسکری ایک بات تو کہنا میں تم سے بھول ہی گیا۔ بھلا اگر شہنشاہ خود اپنے حکم خاص سے میرے تعاقب میں فوج کو روانہ کر چکا ہو۔"

عسکری نے دلجمعی سے کہا۔ "فوج کے کسی افسر کو شہنشاہ کے حکم محض اپنے سے اعلے افسر کی وساطت سے پہنچ سکتے ہیں مجھے آپکا حکم مل چکا ہے۔ یعنی آپ کی وساطت سے شہنشاہ کا حکم مل چکا ہے۔"

"اچھا میں ایک ہزار آدمیوں کا دستہ لیکر ——— کے قلعے کو سر کرنے جا رہا ہوں۔ نو ہزار آدمی تمہارے پاس رہینگے وقت پر مجھے اطلاع کرنا۔ غالباً مفید ثابت ہو۔"

عسکری نے اپنے بہترین سپاہیانہ انداز میں سلام کیا معز نے مسکرا کے پھر صلابت یار جنگ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آج کی رات ہم باغی ہیں۔"

صلابت یار جنگ نے کہا۔ "لیکن کس کے لئے۔ کیا ہمارا مقصد ایسا پاکیزہ نہیں۔ اس کے لئے ایسی نام نہاد بغاوت کا خطرہ جھیل لیا جائے۔"

صبح کا وقت تھا لیکن افق پر ابھی دو ایک تارے جھلملا رہے تھے۔ میدان میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ صبح کاذب کی مدھم روشنی میں وہ چہرے جن پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ انتہا سے زیادہ ڈراونے معلوم ہوتے تھے۔ صلابت یار جنگ اور معزالدین قلعے سے نکلے۔ معزالدین کی فوج میں سے صرف سو آدمی باقی تھے۔ لیکن معزالدین نو سو آدمی کھو کے بھی مسرور تھا۔ اس نے وہ قلعہ حاصل کر لیا تھا۔ جس کے لئے وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ وہ لاشوں سے گزرتے ہوئے ایک ٹیلے کے قریب جا پہنچے اس ٹیلے کے قریب نائب قلعہ دار نے اپنی جان انتہائی قیمت پر فروخت کی تھی۔ وہ لڑنے والے آدمیوں کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اور لڑتا ہوا مارا گیا۔ وہ دونوں ٹیلے سے ذرا دور کھڑے اس منظر کو حسرت آشنا نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہ قلعے کی طرف سے انہیں چند ایک زخم دار کہار ایک محافہ اٹھائے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ اسی ٹیلے کے قریب آکر ٹھٹک گئے۔ کہاروں نے معزالدین اور اس کے ہمراہیوں کی طرف سر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہ موت بے رحم موت کی موجودگی میں تھے۔ اس وقت تہذیب کے

قواعد بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں۔ معزالدین اور صلابت یار جنگ اپنے گھوڑے سے اتر پڑے۔ انہیں احساس ہو رہا تھا۔ کہ اس وقت انہیں اس زمین سے بلند ہونے کا کوئی حق نہیں۔ جس پر ایک شجاع آدمی ابدی نیند سو رہا ہو۔

معزالدین نے کمہار سے صرف ایک سوال پوچھا۔

"نائب قلعہ دار کی بیوی؟"

کمہار نے بھی اسی بے پروائی۔ سادگی اور اختصار سے جواب دیا۔ "ہاں"

معزالدین چپ چاپ پیچھے کی طرف مڑا اور اپنے گھوڑے کی باگ تھام کر اپنے قلعے کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔

لیکن صلابت یار جنگ بت بنا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ ایک عورت کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے کس قدر عورتوں کے جذبات کو ملیامیٹ کرنا پڑتا ہے۔ معزالدین ایک رات کے لئے باغی ہو گیا تھا اس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی محبوبہ کو خوش کرنا چاہا ایک عورت کو خوش کرنا چاہا۔ اور آہ۔ وہ کس قدر عورتوں کو ناخوش کرنے کا موجب بنا۔ کیا یہی وہ عشرت تھی۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے باز بہادر نے اپنی جان دی تھی۔ اور معزالدین تو سو آدمیوں کی جانیں قربان کر چکا تھا۔ کیا یہی ان جذبات کا مآل تھا۔ جو دور سے اسے اس قدر شفاف اور رنگین معلوم ہوتے تھے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا شاید وہ اسی لئے ان باتوں کی برداشت نہ کر سکا۔ مگر نہیں اس کی کتابوں کی زندگی مرنج مرنجاں زندگی ان تمام جذبوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ یہ عشرت فانی تھی اور اس کے علاوہ دوسری عورتیں سحر طراز۔ جادو نگاہ۔ متناسب الاعضاء عورتوں کے عشرت کے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ عشرت باقی کے راز کو سمجھ گیا تھا۔

عابد

اختلافِ جذبات باتحادِ قوافی

تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل
جہاں میں وا نہ کوئی چشمِ امتیاز کرے
(اقبال)

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے
(حسرت)

غزلیات

(۱)

کیا سحر تھے وہ تیری نگاہوں کے تار میں
بھر دی ہیں بجلیاں جو دلِ بے قرار میں

ہے برقِ حسن باعثِ صد اضطراب دل
لیکن وہی ضیا بھی ہے سہمائے تار میں

دل پر بھی اختیار نہیں ہے جو تم نہیں
تم ہو تو چرخ بھی ہے مرے اختیار میں

ہے برقِ اضطراب کبھی سازِ بے قرار
کیا کیا ہیں اضطراب دلِ بے قرار میں

آخر ابد کی نیند وہ تھک کے سو گیا
جھپکی نہ جس نے آنکھ شبِ انتظار میں

جبکہ خزاں بھی ایک فریبِ نگاہ ہے
بہتر ہے مبتلا ہوں فریبِ بہار میں

آنکھوں کو جستجو ہے تری اور تو نہیں
کیونکر نہ ہو جنوں مجھے فصلِ بہار میں

سمجھاؤں کس طرح سے دلِ بے قرار کو
تم اختیار میں ہو کہ دل اختیار میں؟

پیتے ہیں جھوم جھوم کے رندانِ بادہ نوش
رحمت کو دیکھ دیکھ کے ابرِ بہار میں

اس کی خزاں پہ لاکھ بہاریں نثار ہوں
وہ رشکِ صد بہار ہو جس کے کنار میں

منزل بہت قریب تھی پر کیا کروں اثرؔ
تاریکیوں نے گھیر لیا رہگذار میں

اثرؔ صہبائی

(۲)

ہم کو دماغ سیرِ فضائے چمن کہاں
حسرت زدوں سے ذکر تماشا نہ چاہیے

ممکن ہے مرغِ دل تری پرواز عرش تک
ذوقِ جنون و شوقِ گدایا نہ چاہیے

ہے بے نیازیوں سے تری بے نیاز دل
ورنہ ہمارے شوق کو کیا کیا نہ چاہیے

احسن علوی لودھیانوی

جمشید

(۱)

خدا کی ہستی بھی عجیب معما ہے۔ اگر نظریہ ایسا نہیں جو دلائلِ عقلیہ کے تمول سے جائز ہو سکے سب سے زیادہ معقول اور ہمہ گیر مسئلہ وحدت الوجود کا ہے۔ لیکن اگر اس کا بھی صحیح طور پر تجزیہ کیا جائے تو اغلاط کا مجموعہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ ہستی ایک ہی ہے اور دوسرا کوئی نہیں تو پھر کائنات کا ذرہ ذرہ خدا ہے۔ ہم تم سب خدا ہیں۔ اور اگر انسان اور خدا کی حقیقت ایک ہی ہے تو پھر مسئلہ جبر و اختیار کی بحث ہی فضول ہے۔ اور اگر اختیار قطعاً مفقود ہے تو پھر سزا و جزا، جنت اور دوزخ کا تذکرہ لایعنی ہے۔ اور اگر یہ سب باتیں لایعنی ہیں تو پھر مذہب کی حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ جس طرح خوفناک تاریکی میں ہم خود اپنے ہی خیال سے کئی دہشتناک اشیاء کی تخلیق کرتے ہیں۔ اسی طرح جب قوانین قدرت کو ہم صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اور جب ہماری فطری کمزوری ہم پر غالب آجاتی ہے تو ہم ایک وجود کو خود بخود پیدا کر کے اس کی پرستش اور عبودیت شروع کر دیتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس موہوم ہستی کے متعلق ہزاروں اور کروڑوں ہی نظریے قائم ہوتے ہیں۔ اور سب ایک دوسرے سے مختلف جس کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ افراد کی ہیئت دماغی ہی مختلف ہوتی ہے

پروفیسر جمشید جو آرام کرسی میں لیٹا ہوا ان خیالات میں محو تھا۔ آخری خیال پر پہنچکر نہایت خوش ہوا۔ کیونکہ وہ خالق کل کو مخلوق ثابت کر رہا تھا۔ جو عامۃ الناس کے معتقدات کے سخت مخالف تھا لیکن دفعتاً اس نے کپکپی سی محسوس کی دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی اپنی فطری کمزوری سے مغلوب ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلکر ہاؤس بوٹ کی چھت پر ٹہلنے لگا۔ دریا کا لامتناہی اور وسیع طول و عرض موجوں کا شور تھوڑے ہی فاصلے پر پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں اور ان پر بلند اور پُرشکوہ درختوں کے جھنڈ نیلگوں آسمان کا زرنگار شامیانہ اور اس کا ہیبتناک حسن، جمشید نے خیال کیا کہ اگر دریا کی ایک معمولی سی لہر اٹھکر اس کے ہاؤس بوٹ کو پاش پاش کر دے یا پہاڑ کا ایک معمولی سا ٹکڑا اس پر گر پڑے یا آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ پڑے تو اس کی زندگی کا آخری باب وہیں ختم ہو جائے! اس نے فطرت کی بے پناہ قوتوں کو محسوس کیا۔ اور ایک پجاری کی طرح اس کے حضور میں جھک گیا۔

"لیکن اس سے میرے نظریے پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا" چند لمحوں کے سکوت کے بعد اس نے پھر اپنے سلسلۂ خیال کی ایک ایک کڑی کو جوڑتے ہوئے کہا "مانا کہ دریا کی ایک لہر، پہاڑ کا ایک ٹکڑا، آسمان کا ایک ستارہ مجھے نیست و نابود کر سکتا ہے۔ لیکن کیا میں بھی ان دریاؤں ان پہاڑوں اور لاتعداد اشیا پر حکمرانی نہیں کرتا۔ جب تند اور پُرشور دریا سے چند لہریں نکالتا ہوں۔ تو وہ بھی بچہ کی طرح ضعیف و نزار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے سینے کو ہم کشتیوں اور جہازوں سے نہیں بلکہ خود اپنے پاؤں سے مسل دیتے ہیں۔ ڈائنامیٹ کی تھوڑی سی مقدار ان سربفلک چوٹیوں کو زمین کے برابر کر سکتی ہے۔ فطرت میدانِ کارزار ہے۔ اور کامرانی کا سہرا طاقت کے سر پر ہے۔ جب دریا کسی شہر کو منہدم کر دیتا ہے۔ جب پہاڑ اپنی آتش فشانی سے کسی آبادی کو خاک سیاہ بنا دیتا ہے۔ اور جب کرۂ ارضی کی مخفی طاقتیں سمندر کو خشکی اور خشکی کو سمندر بنا دیتی ہیں تو ہم ان تمام حادثات کو خدا کی موہوم ہستی سے منسوب کرتے ہیں۔ اگر فطرت کی طاقتوں کے مجموعے کا نام خدا ہے تو میں بھی فطرت کی ایک طاقت ہوں۔ ایک زبردست طاقت"

چاند کی طلائی کشتی آسمان کی نیلگوں لہروں میں تیر رہی تھی۔ تمام منظر اس کی رنگین اور پرسکون شعاعوں میں ملبوس تھا۔ جمشید جو فطرت کی قوتوں کی بحث سے تھک کر چور ہو رہا تھا۔ چندرما دیوی کے حسن کی دید میں محو ہو گیا۔ اس کی حرارت جو شدت تخیل سے بہت بڑھ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ تسکین میں تبدیل ہو گئی۔ وہ تفکرات کی سنگین گھاٹیوں سے نکل کر طبیعت محسوسات و جذبات کی پُربہار وادیوں میں خراماں تھا۔ پردۂ زنگاری کی دلفریب حسن آرائیوں میں وہ کسی معصوم دوشیزہ کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ دریا کا منظر بھی کچھ کم دلاویز نہ تھا۔ پانی کی پُرسکون سطح ستاروں کی جھلملاہٹ برقی لیمپوں کی پُرنور لہریں گنگا جمنی منظر پیدا کر رہی تھیں۔ دور سرو و صنوبر کے شاندار درخت اور پہاڑوں کی سبزہ پوش چوٹیاں سنیما کا خوبصورت پردہ معلوم ہوتی تھیں۔ جمشید کا دل فرطِ محبت سے اچھل رہا تھا۔ وہ چاند ستاروں اور لہروں کو لپٹ لپٹ کر چومنا چاہتا تھا۔ تیراک کا لباس پہن کر وہ ہاؤس بوٹ کی چھت سے دریا میں کود پڑا۔

وہ نہایت ہی ازخود رفتہ تھا۔ جہاں جہاں چاند کا عکس پڑتا وہیں اس کو بار بار چومتا، وہ تیرتا نہ تھا۔ وہ لہروں سے لپٹ لپٹ کر ہم آغوش ہوتا تھا۔ وہ اسی بے خودی کے عالم میں دو اڑھائی میل تک چلا گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی نہ سوچا کہ واپس آنا کس قدر مشکل ہے۔

(۲)

اس کے بازو جو پیہم فکر و تخیل کی کاوشوں کے باوجود ابھی تک کافی مضبوط تھے۔ اب تکان محسوس کر رہے تھے

دریا کی لہریں رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی تھیں۔ ہوا کی تیزی بھی ناگوار ہو رہی تھی۔ آسمان ابر آلود ہو گیا۔ اور وہ منظر جو ابھی اسقدر دلآویز تھا۔ اب دہشتناک نظر آتا تھا۔ جمشید نے اپنی تمام قوت کو مجتمع کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ لیکن اب ہر لمحے کے بعد اس کی قوت جواب دیتی جاتی اور موجوں کی تندی بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے مایوس ہو کر اپنے آپکو لہروں کے سپرد کر دیا۔ وہ بیہوش تھا۔ اور ایک تنکے کی طرح بہتا چلا جاتا تھا۔ دفعتاً وہ ایک ہاؤس بوٹ سے ٹکرایا اور ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اتفاقاً ایک رسی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس کی کھوئی ہوئی طاقتیں پھر عود کر آئیں۔ اور وہ چھلانگ مار کر ہاؤس بوٹ کے عقب میں جہاں دروازہ وغیرہ نہیں ہوتا جا پڑا۔ مگر اسقدر طاقت کہاں کہ وہاں کھڑا ہو سکے۔ وہ لڑکھڑا کر دھم سے نیچے گر پڑا۔ بوٹ والوں نے زلزلہ سا محسوس کیا اور نوکر دھم کی آواز کو سنکر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ الیکٹرک لیمپ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک حسین اور رعنا قد انسان بیہوش پڑا ہے۔ اس کا زرد چہرہ جو نیلے ملبوس میں ابر آلودہ آسمان کے چاند کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال اس کی سیاہ اور گداز آنکھیں جو لمبی اور گھنی پلکوں کے بوجھ سے دبی جاتی تھیں۔ وہ سمندر کا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ مگر ملازم کا دل خوف و تعجب سے دھک دھک کر رہا تھا۔

ملازم کی آواز پر شمشاد اور خورشید جو ابھی تک شطرنج کی بازی میں مشغول تھیں باہر نکل آئیں۔ وہ تینوں اس کو اٹھا کر اندر لے گئے۔ بازی قریب الاختتام تھی۔ خورشید کا فرزین مر چکا تھا۔ اور شمشاد کے دو رخ بھی زیادہ تھے۔ شمشاد ملازم کو ہدایات دیکر پھر بازی میں مشغول ہو گئی۔ اس کے خیالات منتشر تھے۔ بساط پر اس کو مہروں کے بجائے عجیب عجیب تصویریں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہر حال میں وہ کوئی نہ کوئی مہرہ ہار جاتی۔ حتّٰی کہ اس نے بے خبری کے عالم میں فرزین کو بھی پیدل کی زد میں رکھ دیا۔ خورشید نے جو نہایت بے بسی کی حالت میں تھی۔ جھپٹ کر فرزین کو اٹھا دیا۔ شمشاد نے ہر چند صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ محض اتفاقی بات تھی۔ لیکن خورشید کے آہنی عزم کو کون توڑ سکتا تھا۔ چند ہی منٹوں میں بازی الٹ گئی۔ اور خورشید نے مات دیدی۔

بارش تھم چکی تھی۔ اور مطلع بھی صاف ہو رہا تھا۔ خورشید نے پانسو روپے کا نوٹ (جو اس بازی کی شرط تھی) اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے شمشاد سے رخصت چاہی۔ کیونکہ وہ بھی برابر کے ہاؤس بوٹ میں مقیم تھی۔

شمشاد پانسو روپے ہار دینے کے باوجود راحت سی محسوس کرتی تھی۔ اس طالب علم کی طرح جو برے پرچے کرنے کے باوجود امتحان کے بعد صرف اس لئے راحت محسوس کرتا ہے۔ کہ وہ دو تین ماہ کی پیہم محنت سے گھبرا چکا تھا۔ وہ

بازی میں صرف اس لئے شریک ہوئی۔ کہ اب ایک دو منٹ کا کام تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہی اس کو ضرور جیتے۔ اور اب جبکہ بازی ختم ہو چکی تھی۔ وہ مہروں کو ویسے ہی بکھرے ہوئے چھوڑ کر جمشید کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی سانس اب بالکل درست تھی۔ نبض بھی اعتدال سے جاری تھی۔ وہ چہرہ جو چند منٹ پیشتر زرد اور دُبلا سا معلوم ہوتا تھا۔ اب پھر شگفتہ و شاداب تھا۔ ملازم اُونگھ رہا تھا۔ شمشاد نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ "دیکھو تمام رات ان کی خبر گیری کرنا۔ جب بھی ضرورت پڑے مجھے جگا لینا۔" شمشاد تمام رات بیخواب ہی رہی۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد وہ جمشید کے کمرے میں جا کر اس کا حال دیکھتی۔ ملازم بھی آج اپنی مالکہ کی انتہائی ہمدردی دیکھ دیکھ کر حیران تھا۔

جمشید اُس گہری نیند کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ جو انتہائی محنت اور مشقت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ خواب میں عموماً وہی خیالات جو عالمِ بیداری میں ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہوتے ہیں۔ مختلف صورتوں میں ہمیں نظر آتے رہتے ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ ایک وسیع خشک تالاب ہے جو مچھلیوں کی بجائے انسانوں سے لبریز ہے۔ درمیان میں ایک میز ہے۔ جس پر ایک سفید گٹھڑی سی پڑی ہوئی ہے۔ لوگ اس گٹھڑی کو نہایت احترام اور تعظیم کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لوگوں کی حالت عجیب ہے۔ بعض اس کو دیکھ دیکھ کر کانپ رہے ہیں۔ اور بعض نہایت فخر اور کامرانی کے عالم میں اس کے دائیں بائیں چاؤش کا کام کر رہے ہیں لیکن جمشید تالاب کے کنارے جو میز کی بلندی سے بہت اونچا ہے۔ کھڑا ہو کر ان تمام لوگوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ ایک شخص نے اس کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ نادان یہ قیامت کا منظر ہے۔ اور وہ درمیان کی میز پر باری تعالےٰ متمکن ہیں۔ جمشید کے لبوں پر اب بھی ایک تبسم تھا۔ لیکن خوف آمیز وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ تمام منظر بدل گیا۔ وہی تالاب ایک وسیع اور خوبصورت باغ میں تبدیل ہو گیا۔ انسانوں کے ہجوم کی بجائے خوشرنگ پھولوں اور خوش الحان پرندوں کی قطاریں تھیں اور وہ سطح جہاں خاک اُڑ رہی تھی۔ اب سبزہ پوش تھی۔ پھولدار درخت اپنی شاخوں کو نہر کے کنارے پر جھکائے ہوئے تھے۔ اور انسانی پھولوں کے گلدستے خوبصورت اور نازک کشتیوں میں سیر سے لطف اندوز ہو رہے تھے یکایک چودھویں رات کا چاند آسمان کی بلندیوں سے نیچے اُترتا دکھائی دینے لگا۔ اور تمام نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ چاند آہستہ آہستہ انسانی صورت اختیار کر رہا تھا۔ اور اب وہ ایک حسین و جمیل نازنین کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ وہ صورت فضا میں تیرتی ہوئی آ رہی تھی۔ اور آخر اسی میز پر جو اب بھی باغ کے وسط میں پڑی

ہوئی تھی۔ آکر بیٹھ گئی۔ صرف اس کے سیاہ بال جو اس کی کمر سے نیچے تک لٹک رہے تھے یا اس کی سیاہ اور گداز آنکھیں جو بادۂ فردوس کی شراب معلوم ہوتی تھیں باقی جسم کے حصے کی عریانی اس کے نورانی بالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جمشید اس منظر کو دیکھ کر دم بخود تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا تصویر اس کے نزدیک آتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ فاصلہ صرف دو تین گز کا رہ گیا۔

"میں پرستار ——" اس نے آنکھوں کو ملکر دیکھا۔ کہ ہاؤس بوٹ کا ایک کمرہ ہے جس میں وہ ایک پُر تکلف بستر پر بیٹھا ہوا ہے اور اس ہاؤس بوٹ کی مالکہ اس کے سامنے کھڑی ہے جمشید حیران تھا اور شرمسار بھی۔ رات کے تمام واقعات کا دھندلا سا نقشہ اسکی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سنبھل کر کہا۔ "میں زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اور آج رات کے بعد کی زندگی کو میں آپ ہی کا عطیہ سمجھونگا ——"

شمشاد نے جو جھکی ہوئی نگاہوں سے سن رہی تھی۔ بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ایک انسانی فرض ادا ہو گیا ہے میں شکریہ کی مستحق نہیں ہوں۔ آپ مجھے شرمسار نہ کیجئے کیونکہ اگر میں اس فرض کو پورا نہ کرتی تو خدا اور مخلوق دونوں کی نگاہوں میں مجرم ٹھہرتی۔ ہاں یہ ضرور خوشی کی بات ہے کہ اس واقعہ سے ہمارے تعلقات ایک گونہ بڑھ جائینگے۔ جو ممکن ہے اس کے بغیر تمام عمر نہ پیدا ہوتے۔ اور اب ہم ایک دوسرے کے کام آسکینگے۔"

غموں کو بھلا دینا ہی اچھا ہے۔ کائنات اپنی صبح کی مسکراہٹوں میں رات کی تمام بدعنوانیوں کو چھپا رہی تھی۔ دریا اس شخص کی طرح جو انتہائی غم و غصے کے لمحوں کے بعد دل کو ہلکا کرنے کے لئے مترنم ہو جاتا ہے نہایت آہستگی سے گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اور پرندے سرخوشی کے عالم میں اس طرح نغمہ سرا تھے۔ گویا رات کو کچھ ہوا ہی نہیں۔

جمشید شمشاد کے جواب کو سنکر عجیب کیف میں تھا۔ "اول تو آپ نے مجھے بچا کر ظلم کیا۔ یعنی مجھ پر احسان کیا۔ اور اب آپ مجھ پر دگنا ظلم کر رہی ہیں۔ کیونکہ آپ اس احسان کو احسان بھی سمجھنا نہیں چاہتیں۔" شمشاد نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ "آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

جمشید نے اپنا پورا پتہ لکھ کر دیدیا۔ اور شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی۔

(۲)

کئی دن گزر گئے اور جمشید ان تمام واقعات کو فراموش کر کے پھر اپنی تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گیا۔ الٰہیات کو وہ بیکار ثابت کر چکا تھا۔ اب دوسری منزل اس کے پیش نظر تھی۔ اور وہ زندگی کا مسئلہ تھا۔ وہ بچپن سے نہایت ہی خود سر واقع ہوا تھا۔ وہ ہر بات کو صرف اسی

وقت مانتا تھا جبکہ دلائل سے اس کو سمجھ لے۔ وہ اس دُنیا کو دوسرے لوگوں کی آنکھوں سے دیکھنا نہیں چاہتا تھا الہیات و اخلاقیات کے قوانین اس کے نزدیک ہمارے ہی وضع کردہ تھے۔ اور اس لئے قابلِ ترمیم شام کے چار بج چکے تھے۔ اور وہ اپنے ہاؤس بوٹ کے ایک کمرے میں بیٹھکر کچھ لکھنا چاہتا تھا۔

"ابتدائے آفرینش سے الہیات کی مملکت پر جو حملے انسانی عقل نے کئے ہیں۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اور ان کا نتیجہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ آج وہ وقت آ پہنچا ہے جبکہ ہمیں ان تمام مباحث کو قلم انداز کر دینا چاہئے۔ اور خود اپنے اور اپنے گردو نواح کے متعلق غور و فکر کرنا چاہئے ہمیں اس سے کیا فایدہ ہے کہ ہم کونسی دُنیا سے آئے ہیں۔ یا کونسی دُنیا میں جائینگے۔ البتہ یہ سوال نہایت اہم ہے کہ ہم کہاں ہیں؟ ہماری تمامتر توجہ صرف اسی کرۂ ارضی پر مرکوز ہونا چاہئے۔ جس پر ہم بستے ہیں، اس مملکت کے قوانین کیا ہیں؟ یہی ہے اب ہماری عقل و دانش کے تیروں کا نشانہ۔ ہندوستان میں بسنے والوں کی کیا غرض ہے امریکہ یا جرمنی کے کیا قوانین ہیں۔ جبتک ہم اپنے مُلک کے قوانین کو اچھی طرح نہ سمجھیں ہماری زندگی خطرے میں ہے"

اس کا قلم میدانِ فصاحت میں نہایت شان سے قدم بڑھا تھا کہ محمود نے اس کے شانوں کو ہلا کر اس کے تمام خیالات کو منتشر کر دیا۔ اگر اس وقت محمود کی بجائے کوئی اور ہوتا تو جمشید اس کو کمرے سے باہر نکال دیتا۔ یہ امتیاز صرف محمود ہی کو حاصل تھا۔ کہ جب چاہے جمشید کو ستائے۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہے تھے۔

محمود۔ "کوئی شیریں آواز سُنے ہوئے مدت گزر گئی ہے روح خُشک صحرا کی طرح بنجر محسوس ہوتی ہے۔

جمشید۔ "خدارا اپنا مدعا کہو۔ تمہاری پیچیدہ باتوں کی مجھے تو سمجھ نہیں آتی"

محمود۔ "کہوں کیا" یار سُنا ہے۔ ہمارے قریب ہی میں ایک رقاصہ رہتی ہے۔ اس کے حسن کی تعریف بھی بہت سن چکا ہوں۔ اور اس کے گانے کی آواز تو خود میں نے اپنے کانوں سے ادھر سے گزرتے ہوئے سُنی ہے۔ سبحان اللہ! جمشید عالمِ بالا میں پُہنچ جاؤ گے"

جمشید۔ "جانے بھی دو۔ بندۂ خدا تمہاری تمام زندگی بس انہیں خرابات ہی میں گزر جائیگی۔ باپ دادا کی جائداد اب کہاں ہے۔ جو یوں گلچھرے اُڑاتے پھرو گے۔ وہ بھی تم نے چند ہی سالوں میں نشاط آباد کی نذر کر دی ہے۔

محمود۔ صوفیانہ مواعظ تو خیر جانے دو۔ تم جو ہر سال کئی کئی سو کی کتابیں منگواتے رہتے ہو بھلا بتاؤ کہ اس سے کیا فایدہ ہوتا ہے۔ تمام دن کڑھتے رہتے ہو۔ صورت تم

سے بگاڑ لی ہے۔ صحت تمہاری درست نہیں ہے چڑچڑے سے ہوگئے ہو۔ یہی سبب ہے کہ تم کوئی کتاب لکھ دو گے۔ تو بھلا اس سے بھی کیا حاصل۔ اب تک کونسی بات نہیں لکھی گئی جو تم لکھو گے۔ پھر اس دردسر کے کیا معنی جس سے زندگی کا لطف بھی اٹھا۔

جمشید جو اس تمام گفتگو کو سنتے ہوتے اس رات کے مناظر دیکھ رہا تھا اب آمادہ تھا۔ وہ بھی غور و فکر کی مہم مجنونانہ سے اکتا چکا تھا اور اب سنانے کے لیے کوئی مشغلہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔

خورشید کا دھکتا ہوا کندنی چہرہ آتشی گلابی ساری میں شعلہ جانسوز کی طرح لپکتا ہوا معلوم ہوتا تھا اس کی مخمور آنکھیں اس کے سرخ لب جن پر ہمیشہ ایک جذبات انگیز تبسم کھیلتا پھرتا تھا۔ اس کا سڈول اور جامہ زیب بدن اور اس کا نکلتا ہوا قد، جب وہ گاتی تو شعلہ جوالہ معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کا تمام سوز اور اضطراب اس کے ساز کے ارتعاش میں سما جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا حسنِ عالم سوز کائنات کو پھونک ڈالے گا۔ شام کے وقت خورشید اپنے مرصع کمرے میں ایک گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی ہوئی اپنے ساز کو درست کر رہی تھی۔ کہ جمشید اور محمود دونوں اندر داخل ہوتے۔ ابتدائی علیک سلیک اور رسمی سوال و جواب کے بعد خورشید نے دونوں صاحبوں کے نام دریافت کیے صرف محمود ہی گفتگو کرتا تھا۔ جمشید کا دل داخل ہوتے ہی دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ وہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ لیکن نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اس فتنۂ حسن کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اسکے کان ان آوازوں کو نہیں سننا چاہتے تھے۔ مگر وہ صرف انہیں آوازوں کو سنتے تھے وہ اپنے دل کو خاموش کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ یکسر اضطراب تھا۔ اس نے ہر چند اپنے فلسفے کی رو سے اسے نہ صرف انسان بلکہ ایک کمزور اور ضعیف ہستی یعنی عورت ثابت کیا۔ مگر وہ اس وقت جھکا جاتا تھا۔ اس تنکے کی طرح جو شعلے کی بھڑک سے خود بخود اس کی طرف کھنچا آتا ہے

محمود کی فرمائش پر خورشید نے یہ رباعی گائی۔

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کاے رندِ خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنند پیمانہ ز مے
زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

اس نے گاتے ہوئے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ جو اس کے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی ———

خمخانۂ کائنات میں صبوحی کا دور ہے ایک نوشگفتہ دوشیزہ ایسے پر تکلف بستر پر انگڑائی لے رہی ہے۔ حسن و شباب کی مستی آنکھوں کا خمار وہ ایک چھلکتا ہوا جام معلوم ہوتا ہے اس کا عاشق ایک کاسۂ زریں جو ارغوانی آتش سیال سے لبریز ہے پیش کر رہا ہے۔ اور نیچے مندرجہ بالا رباعی درج تھی۔

محمود جو لطیف جذبات اور تخیلات سے قریباً بالکل عاری تھا۔ ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر جھوم رہا تھا۔ وہ کبھی خورشید کو اور کبھی اس تصویر کو دیکھتا۔ لیکن جمشید خاموش تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ خورشید جو محمود کے چھچھورپن سے بہت بیزار ہو رہی تھی۔ اب جمشید کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ آنکھیں جو پہلے دہکتے ہوئے انگار سے معلوم ہوتی تھیں۔ اب گلِ لالہ کی طرح شگفتہ تھیں۔ خورشید نے مسکرا کر کہا۔

"جمشید صاحب! کیا یہ تصویر آپ کو پسند نہیں ہے۔"

جمشید کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ محمود بول اٹھا۔

"فلسفی صاحب سے آپ حسن کے متعلق کیا دریافت فرماتی ہیں۔ میں تو اس منظر کو دیکھ کر گھایل ہو گیا ہوں۔ اے کاش میں اس خوش قسمت مرد کی طرح ہوتا ——— خیر آپ کچھ اور سنائیے۔"

خورشید نے پھر ساز کو چھیڑا اور اپنی بلند آواز کی گونج سے فضا کو بیتاب کر دیا۔

بعزمِ توبہ سحر گفتم استخارہ کنم
بہارِ توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم
گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم
بہ تختِ گل بنشانم بتے چو سلطانے
ز سنبل و سمنش سازِ طوق و یارہ کنم

جمشید نے جس کی خورشید کی تلطف آمیز نگاہوں نے اب بہت جرأت بڑھا دی تھی۔ آخری شعر پر کہا۔ "شاعر کا تخیل کس قدر لطیف اور شگفتہ ہے۔ معشوق کو جو پاکبازی اور حسن میں پھول جیسا ہی ہونا چاہیے پھولوں کے تخت پر بٹھاتا ہے اور پھر اس کو سونے چاندی کے زیورات اور جواہرات نہیں بلکہ سنبل اور سمن کے گجرے اور ہار پہناتا ہے۔"

خورشید نے اس فقرے کی داد اپنے پرکیف تبسم سے دی لیکن محمود نے کہا۔ "شکر ہے ہمارے فلسفی صاحب کی مہرِ سکوت بھی ٹوٹی۔"

(۴)

جمشید ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنی والدہ کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے اپنی پہلی بیوی کی وفات کے ایک دو سال بعد ہی دوسری شادی کر لی اور اس سے اولاد بھی پیدا ہو گئی تھی۔ جمشید اپنے گھر میں اتنے بھائیوں اور بہنوں کے باوجود تنہا تھا۔ کیونکہ اس کی سوتیلی ماں کا سلوک اس سے ناگفتہ بہ تھا۔ اس کا باپ بھی اب بے اعتنائی سے پیش آتا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کی باگ ڈور صرف ان کی بیویوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اور موجودہ بیوی جمشید کی ماں نہ تھی۔ ان کا گھرانہ بھی کچھ الگ تھلگ سا تھا۔ اول تو ان کی رشتہ داری ہی بہت کم تھی۔ پھر جو کچھ بھی تھی، وہ بھی نفرت و عداوت کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جمشید تمام

دن یا تو باہر سیر و تفریح کے لئے رہتا یا الگ اپنے کمرے میں بیٹھا کتابوں میں مشغول۔ وہ کافی ذہین تھا۔ اس نے چند ہی سالوں میں کتنی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ فلسفے کی طرف اسے فطرتاً میلان تھا۔ اور یہی وہ حالات ہیں جن میں فلسفہ کی پوری نشو و نما ہو سکتی ہے۔ اس نے فلسفے کی بے شمار کتابیں پڑھیں۔ اس کی قابلیت کو اس چار دیواری کے بسنے والوں کے سوا جس میں وہ رہا کرتا تھا سب محسوس کرتے تھے۔

جس شخص کی تربیت کی رفتار ایسی ہو۔ وہ قدرتاً صنف نازک سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اس صنف کا سب سے پہلا فرد جس سے جمشید کو پالا پڑا، اس کی ماں تھی۔ اور وہ اس کو ایک خونخوار درندہ نظر آتی تھی۔ یہی تھا اس کا پہلا تجربہ اور اس کی بنا پر وہ عورت کی ذات سے متنفر تھا۔ وہ اس کو تمام معصیتوں کا منبع اور اس کی تخلیق کو خدا کی سب سے بڑی غلطی قرار دیتا تھا۔ اس کی خود پرستی، انتقام پسندی کینہ اور ذلیل آرزوئیں اس کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ وہ اسکو جہالت اور خودسری کا مجموعہ سمجھتا تھا۔ جب جنگلوں، اور پہاڑوں اور دریاؤں کے دلکش مناظر کو وہ دیکھ دیکھ کر بیخود سا ہو جاتا، تو چلا کر پکار اٹھتا "اگر عورت صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے تو یہ دنیا کسقدر خوبصورت اور پاکیزہ ہو۔" اب وہ بائیسویں سال میں تھا اور حسن، صحت اور طاقت کے باوجود وہ ابھی تک اپنے فلسفے پر قائم تھا۔

جب شام کو مال روڈ کا دلچسپ مرقع اپنی گوناگوں نظر فریبوں اور متحرک تصویروں کے ساتھ اس کی نظروں سے گزرتا تو اس کا دل نفرت اور حقارت کے جذبات سے پر ہو جاتا۔ وہ معصومیت جو اس کو فطرت کے دیگر مناظر میں بیخود بنا دیتی تھی۔ ہر چہرے میں مفقود تھی۔ وہ زہر آلودہ پھول تھے۔

طوفانی رات کے واقعات کو اگرچہ وہ صرف فراموشی کر چکا تھا لیکن خورشید کی ملاقات کے بعد اب وہ تمام منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ خورشید اس کی نگاہوں میں پسندیدہ نہ تھی لیکن اس کی الوداعی مسکراتی ہوئی نگاہیں اس کے دل کو بے قرار کئے دیتی تھیں۔ وہ اس سے خوفزدہ تھا۔ لیکن پھر بھی نامعلوم طور پر اسی کی جانب کھنچا جاتا تھا۔ اس کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ اور وہ دل جو ایک مدت سے اس جذبہ سے خالی تھا۔ اب سرشے کیلئے مضطرب ہو جاتا۔ اس کو خورشید سے محبت نہ تھی۔ لیکن چونکہ وہ پہلی ہستی تھی جس نے اسکے خوابیدہ محسوسات کو چھیڑا تھا۔ اس لئے وہ اسی کی جانب کشاں کشاں جا رہا تھا۔

شمشاد سے رخصت ہوتے دو ہفتے گزر چکے تھے اور اگرچہ اس دوران میں بھی کبھی کبھی وہ اس سے ملنے کا خیال کرتا لیکن اپنے فلسفیانہ انہماک اور فطری تساہل کی وجہ سے

لیت و لعل کرتا رہا۔ اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا اس کا تغافل ملاقات کو اور بھی التوا میں ڈالتا جاتا۔ آخر ایک روز اس نے جانے کا عزم صمیم کر لیا۔ وہ تیاری میں مشغول ہی تھا کہ اس کے ملازم نے اس کو ایک رقعہ دیا۔

"آج کی دعوت قبول فرمایئے۔ میں پورے آٹھ بجے تک اپنے ہاؤس بوٹ میں آپ کی منتظر رہوں گی۔ نہایت ضروری ہے۔

آپکی خورشید

جمشید پر اس رقعہ کو پڑھ کر چند لمحوں کے لئے سکوت سا طاری ہو گیا۔ وہ حیران تھا کہ کیا کیا جائے۔ ——— "لیکن شمشاد سے میں نے وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ اس لئے اگر وہاں نہ جاؤں۔ تو میں اخلاقی طور پر ہرگز مجرم نہیں ہوں۔ خورشید مجھے بلا رہی ہے۔ اور وہاں نہ جانا تہذیب اور اخلاق کے عین مخالف ہے۔" اس نے اپنی منطق کو کام میں لا کر اپنے دل کو خورشید کی جانب جانے پر راضی کر لیا۔

خورشید سفید باریک ریشم کی ساری میں ملبوس اپنے کمرے کی میز اور کرسیوں کو خود ہی درست کر رہی تھی۔ وہ ہر لمحہ آئینے میں اپنے گیسوؤں کے حلقوں کو دیکھ لیتی۔ اور ہر بار ان کو نئے انداز سے آراستہ کرتی۔ اس کا رنگ آج زیادہ دمک رہا تھا۔ اس کا چہرہ سفید ملبوس میں بجلی کے قمقمے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ وہ زیرِ لب گنگناتے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھی کہ جمشید صاحب اندر داخل ہوئے

خورشید نے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ خوب وقت پر پہنچے۔ آٹھ بجنے میں ابھی نصف گھنٹہ باقی ہے۔"

جمشید نے مسکرا کر کہا "میں یہاں آنے کے لئے تیار ہو ہی رہا تھا کہ آپ کا رقعہ پہنچا۔ اس لئے اس کے فوراً ہی بعد حاضر ہو گیا ہوں۔"

دونوں ادھر ادھر کی گفتگو کرتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ خورشید آج ہر لمحہ اپنے مہمان کو خوش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جمشید پر گھبراہٹ کی کیفیت طاری تھی۔ اس کا دل آج بھی بیقرار تھا۔ لیکن خوف سے نہیں بلکہ محبت سے۔ موسم وغیرہ کی گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کھانا ختم کر لیا۔ اب جام جم کا دور شروع ہوا۔ اور لال پری جو پہلے کسی پردوں میں محجوب ایک کونے میں پڑی ہوئی تھی۔ اب جام و مینا کے شفاف پردوں میں جھلکنے لگی۔ جمشید شراب پینے کا عادی نہ تھا لیکن کبھی کبھی احباب کے اصرار پر نوش کر لیا کرتا تھا خورشید نے اپنے ہاتھ سے دو گلاس بھرے۔ اور پھر خود اپنے ہاتھوں سے اس کو پیش کیا۔ جمشید جو خورشید کی گفتگو اور اس کی تلطف آمیز نگاہوں سے پہلے ہی مخمور ہو رہا تھا۔ غٹ غٹ چڑھا گیا۔ خورشید بھی اپنا گلاس ختم کر چکی تھی۔ جوانی کا حسن اور سنگار خود ہی کچھ کم نہیں ہوتا لیکن آتشِ سیال

سونے پر سہاگہ ہو جاتی ہے۔ خورشید کا رنگ جو پہلے ہی کندن کی طرح دمکتا تھا، اب نہایت شگفتہ اور ملیح ہو رہا تھا۔ اس کی سیاہ اور شوخ آنکھیں اب بہت کشادہ اور روشن ہو رہی تھیں۔ جمشید بھی اب وہ ضعیف القلب جمشید نہ تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور اب وہ بھی نہایت ہی بے تکلف تھا۔ چاند ابر کی باریک چلمن سے اہلِ زمین کی ہنگامہ آرائیوں کو جھانک رہا تھا۔ اور یہ دونوں مستانِ عشق و شباب دُنیا و مافیہا سے بے خبر حافظ اور عمر خیام کی غزلیں اور رباعیاں پڑھتے ہوئے اس آگ کو نگلتے جاتے تھے۔

خورشید۔ "تم کسقدر خوبصورت ہو جمشید جب تم سامنے آتے ہو تو میں اپنی ہستی کو تمہاری خواب آلودہ نگاہوں کے قابو میں پاتی ہوں ——"

جمشید نے بات کاٹتے ہوئے "کیا خورشید اب آسمان سے اُتر کر زمین پر چمکا کریگا آپ دولت حسن کی مملکت کی شہنشاہ ہیں۔ مجھ سے گدائے بے نوا کو آپ کیوں ناحق بناتی ہیں۔"

خورشید۔ تمہاری ایک تبسم آمیز نگاہ میرے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے جب میں تمہیں دیکھتی ہوں۔ تو دُنیا معمول سے زیادہ روشن اور رنگین نظر آتی ہے۔

محبت کے عہد و پیمان ہو رہے تھے۔ خورشید اگر "معشوقِ شوخ" تھی، تو جمشید بھی "عاشقِ دیوانہ" بنا ہوا تھا۔ وہ دونوں غیر محسوس طور سے ایک دوسرے کی جانب کھنچے جاتے تھے۔

خورشید جمشید کے آغوش میں تھی معلوم نہیں کب سے، یہ پہلا موقع تھا جبکہ جمشید نے کسی عورت کی ہم آغوشی کی ولولہ انگیز حرارت کو محسوس کیا۔ وہ بیخود تھا۔ شراب اسکے دماغ کو پہلے ہی معطل کر چکی تھی۔ لیکن اب وہ بالکل ہی بے قابو تھا۔ خورشید کے ارغوانی لب جن سے بادۂ خوشگوار کی لپٹیں آرہی تھیں۔ اب اس کے لبوں کے بہت ہی قریب آگئے تھے۔ اس نے ان کو چوم لیا —— لیکن جس طرح ہم رسّی کی جگہ سانپ کو پکڑ لیتے ہیں۔ اور کسی بے ضرر تار کی جگہ برقی تار کو چھو لیتے ہیں۔ اسی طرح جب اس کے لب خورشید کے لبوں سے مس ہوئے تو اس نے خوف و اضطراب کے عالم میں دفعتاً اس کو اپنے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر فرش پر پٹک دیا۔ اور اس کو وہیں نیم غشی اور نیم بیداری کی حالت میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

(۵)

جمشید کی طبیعت اب اُکھڑ چکی تھی۔ وہ عجیب کشمکش میں تھا۔ فلسفے کی کتابیں اب اس کو ڈراؤنی نظر آتی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خورشید کی ملاقات نے اس کے خیالات کے شیرازے کو بالکل بکھیر دیا۔ معلوم نہیں کس عالم میں وہ اس کو یوں جھٹک کر بھاگ آیا تھا۔ جب خورشید کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آتی تو وہ کانپ اُٹھتا۔ اس کی

تیز اور شعلہ فشاں آنکھوں سے تصویر میں بھی اپنی آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اب اپنی ہلاکت کا منتظر تھا۔

اس ہیجان طبعی کے عالم میں وہ اپنے دارالمطالعہ میں دل بہلانے کے لئے اخبار ٹائمز کے اوراق الٹ رہا تھا ایک صفحہ پر اس کی نگاہیں رُک گئیں۔ اس پُورے صفحہ پر ایک تصویر تھی ـــــ صبح کا سہانا وقت ہے۔ دریا سے حُسن خراماں خراماں بہہ رہا ہے۔ سرسبز ٹیلے کے ارد گرد کئی چشمے طواف میں مشغول ہیں ایک چٹان پر ایک دوشیزہ آسمان کی طرف نظریں گاڑے کھڑی ہے۔ اس کے سیاہ اور دراز بال جو اس کے کندھوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اسکی پرسکون اور گداز آنکھیں، اس کا سفید ملبوس۔ گویا صبح کی تمام رعنائیاں سمٹ کر اس پیکر میں سما گئی تھیں۔

جمشید کئی لمحوں تک اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنی موجودہ زندگی اور اس دوشیزہ کی زندگی کا معائنہ کیا۔ وہ یکسر اضطراب و پریشانی تھا۔ اور وہ امن و سکون کی دیوی اس کی نگاہیں اس تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ اور اس طوفانی رات کے واقعات ایک ایک کرکے اس کے دماغ میں تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اور شمشاد کی تصویر غیر معلوم طور سے اسی صفحہ پر منقوش ہو رہی تھی۔ "کس قدر مشابہت ہے۔" جمشید نے بلند آواز سے کہا۔ اور اب وہ شمشاد ہی کی تصویر تھی۔ وہ ہر چند اپنے دماغ کو سمجھاتا کہ ٹائمز میں اس کی تصویر کا کیا کام لیکن اس کی نگاہیں شمشاد کی تصویر ہی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی خاموش آنکھیں جمشید کو عرق انفعال میں غرق کر رہی تھیں۔ پندرہ بیس دن گزر چکے تھے۔ اور وہ ابھی تک اس کے ہاں ایک دفعہ بھی نہیں گیا تھا۔ آج خورشید کی جانب سے وہ بالکل فارغ ہو چکا تھا۔ اور اب کوئی طاقت اس کو وہاں نہیں لیجا سکتی تھی۔ حقیقت میں وہ وہاں جانے سے ڈرتا تھا۔ وہ انہیں خیالات میں مستغرق تھا کہ پھر محمود نے پیچھے سے آکر اس کے شانوں کو اس طرح جھنجھوڑا کہ اس کے تمام خیالات خزاں رسیدہ درخت کے پتّوں کی طرح منتشر ہو گئے۔

محمود۔ "ہر وقت کی دماغ سوزی بھی اچھی نہیں۔ کتاب کی قیمت تمہیں ممکن نہیں ایک ہزار سے زیادہ مل سکے۔ چلو یار میں تم کو ایک ہزار روپیہ دے دُونگا۔ مگر تمہیں روپے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کافی مالدار ہو۔ مگر جس کی قسمت میں کڑھنا ہی لکھا ہو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے

جمشید۔ کونسی کتاب کا ذکر کرتے ہو۔ یا دش بخیر وہ تو میں پانچ سات صفحوں ہی پر ختم کر چکا ہوں۔

محمود۔ تو چلو نا پھر ذرا خورشید کے ہاں چلیں۔ اس رات تو قیامت ہی ہو گئی۔ معلوم نہیں اس عورت میں کیا سحر ہے۔

جمشید (چونک کر) "خورشید!" کے ہاں، نہیں محمود میں کہیں بھی نہیں جا سکتا۔

آج مجھے ایک نہایت ضروری کام کے لئے باہر جانا ہے۔

محمود نے بہت کوشش کی کہ اپنے دوست کے اس عزم کو توڑ ڈالے اور وہ توڑ بھی ڈالتا لیکن جب جمشید کو گزشتہ واقعات کا خیال آتا تو وہ کانپ اٹھتا اسکو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ اس کو شعلے کی طرح کچھ نہ کچھ ڈالے گی اور اس کی سحر کن آنکھیں اس کی روح کو اس کے بدن سے کھینچ لینگی۔ محمود آخر ناراض ہو کر اکیلا ہی چلا گیا۔

شمشاد بھی نشاط آباد کی ایک حسن فروش تھی لیکن اس کی صورت اس کے طرز و انداز اور اس کے محسوسات اپنے ہم پیشہ سے بالکل مختلف تھے۔ وہ نہایت شرمیلی تھی اور اگرچہ اس کے حسن و نغمے کی بہت دھوم تھی۔ لیکن پھر بھی وہ شوخ نہ تھی۔ محفل برخاست ہو جانے کے بعد وہ مغموم سی ہو جاتی۔ اور پہروں سوچ میں ڈوبی رہتی جس رات اس نے جمشید کی جان بچائی وہ بہت خوش تھی، وہ ایسا محسوس کرتی تھی۔ کہ جس تصویر کو وہ اپنے عالم خیال میں ڈھونڈا کرتی تھی اس کو غیب سے عطا ہو گئی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی اس کی تصویر اس کے دل پر منقوش ہو گئی لیکن وہ خاموش تھی۔ اس نے اگرچہ جمشید کو وداع کرتے ہوئے اس سے اس کا پورا پتہ دریافت کر لیا تھا۔ جس میں کچھ ایما تھے محبت تھا۔ لیکن وہ پھر بھی کنارہ گیر رہتی محبت بھی شراب ہے۔ اور جس طرح شراب انہیں مخصوص جذبات و محسوسات کو زیادہ نمایاں کرتی ہے۔ جن سے اس کا پینے والا متصف ہوتا ہے۔ اسی طرح محبت بھی خاموش کو زیادہ خاموش اور شوریدہ سر کو زیادہ شوریدہ سر بنا دیتی ہے۔

شمشاد فطرتاً خاموش اور خود دار تھی۔ اور محبت نے اس کو زیادہ خاموش اور خود دار بنا دیا۔ وہ جمشید کو رقعات کے ذریعے بلا سکتی تھی اور ممکن نہ تھا کہ جمشید انکار کر دیتا۔ وہ خود اس کے ہاں جا سکتی تھی۔ اور ممکن نہ تھا کہ جمشید اسکو وہاں سے باہر نکال دیتا۔ لیکن وہ خاموش تھی۔ اور اپنے مقدس جذبات سے یوں کھیلنا پسند نہ کرتی تھی۔

وہ ہر شام ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھ کر دریا کا منظر دیکھتی اور رات کو کچھ گنگناتے گنگناتے سو جاتی اور ہر صبح اس کا آغوش جمشید کی محبت میں وا ہو جاتا، اس کو معلوم تھا۔ کہ جمشید کا خورشید کے ہاں آنا جانا ہے اس کو معلوم تھا کہ خورشید کن زبردست طاقتوں کی مالک ہے وہ خود اپنے آپ کو خورشید کے سامنے ایک بے ارادہ ہستی محسوس کیا کرتی تھی۔ اور اس لئے اس کے خطرات ان گنت تھے۔ لیکن وہ پھر بھی خاموش تھی۔ وہ جمشید کو ایسی جنگوں سے جیتنا نہ چاہتی تھی۔ اگر جمشید خورشید کی بغل میں تھا۔ تو کیا ممکن تھا کہ اس طرح جمشید کی تصویر اس کے دل کے آئینے سے جدا ہو سکے۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے یاس و نا امیدی اس کی زندگی پر چھا جاتی اور اب جبکہ

پورے بیس روز گذر چکے تھے۔ وہ نہایت مضمحل اور اداس تھی حسب معمول وہ اپنے ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھی کچھ گنگنا رہی اور اپنے دل کو بہلانے کے لئے ایک تصویر کو دیکھ رہی تھی ——

شام کا منظر ہے اور ایک سوگوار نازنین مایوس نگاہوں کو آسمان کی طرف گاڑے ہوئے اپنے ساز کو چھیڑ رہی ہے نیچے "ایام گزشتہ کی یاد" لکھا ہوا تھا۔ یہ تصویر اس کے حسب حال تھی۔ اور جس طرح ایک مصیبت زدہ دوسرے مصیبت زدہ کو دیکھ کر کچھ تسکین حاصل کرتا ہے اس طرح وہ بھی کچھ سکون محسوس کر رہی تھی۔

جمشید ہاؤس بوٹ کے اندر داخل ہوا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ ملازم سے گفتگو کر رہا تھا کہ شمشاد اس کی آواز سنکر لپکتی ہوئی نیچے آگئی۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ لیکن ایک کی آنکھوں میں فرط مسرت اور دوسرے کی آنکھوں میں احساسِ ندامت ۔ وہ چند لمحوں کے لئے بالکل خاموش تھے۔ شمشاد کا رنگ اس مریض کی طرح نکھر رہا تھا جو غسل صحت کرتا ہے مگر جمشید گردن جھکائے خاموش تھا۔ دل اس کا بھی بھرا ہوا تھا۔ لیکن ندامت آمیز محبت سے آخر جمشید نے اس سلسلۂ سکوت کو توڑنا چاہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ——" اس کی زبان رک گئی —— اس نے اس فقرے کو پورا کرنے کی بیکار کوششیں کیں۔ جو الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے، وہی ٹوٹ پھوٹ کر آنسوؤں میں بہہ جاتے۔

شمشاد اس منظر کو دیکھ دیکھ کر نہایت متاثر ہو رہی تھی۔ اور اگرچہ وہ بھی بہت رونا چاہتی تھی۔ لیکن اس مایوس شخص کی طرح جس کو اچانک اس کا گم شدہ یا مفقود الخبر دوست مل جاتا ہے۔ وہ خورشید کی شکست اور اپنی فتح کی خوشی میں آنسو بہانا چاہتی تھی محبت کا ماتم اور محبت کی خوشیاں دونوں آنسوؤں ہی سے کی جاتی ہیں۔ لیکن ان دونو آنسوؤں میں کتنا فرق ہے؟ ایک زہرِ ہلاہل کا قطرہ ہے اور دوسرا فردوس بریں کی نہروں کا۔

شام ہو رہی تھی اور ہاؤس بوٹ کے اندر وہ حبس سا محسوس کر رہے تھے۔

شمشاد نے کہا۔ "چلئے ذرا کشتی پر سیر کریں۔ یہاں تو دم گھٹا جاتا ہے۔"

جمشید نے صرف اپنی خاموشی سے اس کی تائید کی اور وہ دونوں کشتی میں سوار ہو کر دریا کی سیر میں مشغول ہو گئے۔ چودھویں رات کا چاند پہاڑیوں کے عقب سے بلند ہو رہا تھا۔ اور کائنات کو جو دن بھر میدان کارزار بنی ہوئی تھی۔ پھر فردوسِ تسکین بنا رہا تھا۔ لیکن اگر آج تاریک رات ہوتی اور ستاروں کے قمقمے بھی تاریک بادلوں کے پردوں میں درخشاں ہوتے تو کیا یہ دونوں ایسے ہی

چمن اور پرسکون نہ ہوتے۔ چاند سکون کا شاہد ہوتا ہے لیکن اس رات جبکہ جمشید خورشید کو جنت کی واپس آ رہا تھا۔ جمشید کا دل ایک شدید اضطراب بنا ہوا تھا۔ پانی اور اور آگ گرم، لیکن غضب کے وقت یہی گھونٹ کیوں گرم محسوس ہوتے ہیں۔ اور جب ہمیں کوئی دوسری جانب سے خود ہی پکار پکار کر بلاتا ہے تو پھر درمیان کی آگ ہمیں کیوں پھولوں کا ڈھیر نظر آتی ہے۔

فطرت خود ہی نہایت بے تکلف ہے۔ اور جب دو نا آشنا فطرت کے آغوش میں ہوتے ہیں۔ تو وہ بھی غیر معلوم طور پر بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں گفتگو کا سلسلہ چھڑ گیا۔ ہوا کے خوشگوار جھونکے اور چاند کی رنگین اور پرسکون فضاؤں میں "افسانہ از افسانہ می خیزد" کا سلسلہ بڑھتا جاتا تھا۔ جمشید نے طوفانی رات کا خواب سنایا۔ اور پھر اخبار ٹائمز کی تصویر کا واقعہ۔ شمشاد کی گردن نسوانی فخر و غرور سے خود بخود بلند ہو رہی تھی۔ اور وہ سفید و سرخ ہنس کی طرح پانی میں تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے خورشید کی ملاقاتوں کو دہرایا۔ اور شمشاد سُن سُن کر کبھی تو خوشی سے اور کبھی خوف سے کانپ اُٹھتی دونوں نے اپنی اپنی بیس روزہ زندگی کی داستانیں سنائیں اور اب وہ محبت سے ہم آغوش تھے۔ "کس قدر فرق ہے اس آغوش محبت اور اُس آغوش محبت میں؟" جمشید اپنے سر کو شمشاد کے بازوؤں پر رکھے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "کس قدر فرق ہے خورشید اور شمشاد کے حسن میں! ایک شراب آتشیں ہے اور دوسری پوتر دودھ، ایک گُل لالہ اور دوسری یاسمن، ایک آفتاب ہے اور دوسری چودھویں رات کا چاند، ایک آگ ہے اور دوسری نور" انہیں خیالات میں اس کی آنکھ جھپک گئی۔

شمشاد محبت اور عقیدت سے کبھی اپنے محبوب کے چہرے کو اور کبھی ماہ کامل کو دیکھتی اور پھر اپنے ہی خیال میں دونوں کا مقابلہ کرتی اور جب وہ اپنی منطق سے جمشید کے حسن کو بہت بالاتر ثابت کرتی تو حیا آمیز محبت سے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔

جمشید نے خواب میں دیکھا وہ شمشاد کے ہمراہ ایک بلند سرسبز ٹیلے پر محو خرام ہے۔ پہاڑ کے دامن میں دریا بہہ رہا ہے۔ اور اس کی لہریں اس کے پتھروں سے مچل مچل کر کھیل رہی ہیں۔ دریا کے دونوں کنارے سرو و صنوبر کے بلند قامت اور شاہانہ درختوں سے مرصع ہیں۔ اس کی سطح پر بھی کنول کے پھول ہی کھلے ہوتے ہیں۔ وہ دونوں بازوؤں میں بازو ڈالے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کہ یکایک کسی نے پیچھے سے آ کر جمشید کو نیچے دھکیل دیا۔ جمشید نے دریا میں گرتے ہی مڑ کر دیکھا کہ خورشید شمشاد کو بھی نیچے دھکیلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جمشید

نے لجاجت سے چلاکر کہا۔" خورشید! خور ـــــ

شمشاد جو جمشید کے چہرے کی حالت غور سے دیکھ رہی تھی۔ خورشید کا نام سُنکر چونک اُٹھی جس طرح لاجونتی انسانی جسم کے مس سے مرجھا جاتی ہے۔ اسی طرح شمشاد بھی اس آواز کو سُنکر مرجھا گئی اور اس کے بازو بے اختیار جمشید کے سر کے نیچے سے سرک گئے۔

(۶)

محمود اور جمشید بچپن میں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی محلے کے رہنے والے تھے۔ اور دونوں کے باپ بھی آپس میں دوست تھے۔ محمود کا باپ ایک متمول سوداگر تھا۔ اور چونکہ محمود اپنے والدین کا ایک ہی بیٹا تھا اس لئے اس کی ہر خواہش ایک حکم تھی۔ اور اس کی ہر آرزو کا پورا ہونا اس کے والدین کا فرض۔ اسی وجہ سے وہ نہایت ضدی اور خودسر تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس کے احباب بھی اس کے احکام سے سرتابی نہ کریں۔ اگرچہ دونوں کی دماغی اور قلبی کیفیات بہت ہی مختلف تھیں لیکن پھر بھی وہ دوست تھے۔ اور ان کو ایک دوسرے سے نہایت گہری محبت تھی۔

جمشید ایم۔ اے کرنے کے بعد پروفیسر ہو گیا اور محمود جو انٹرنس پاس کرنے کے بعد آوارہ سا ہو گیا تھا اب بھی آوارہ ہی تھا۔ باپ کی موت کے بعد اسکے حصے میں کشمیر جائداد آئی۔ اور اب برائے نام اپنے باپ کی دکان بھی چلاتا تھا دونوں کشمیر میں بھی ایک ساتھ ہی آئے ہوئے تھے۔ ایک فلسفے کی کتاب لکھنے اور دوسرا قالینوں کی خرید و فروخت کے پردے میں شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے۔ چونکہ دونوں کے مقاصد بالکل مختلف تھے اس لئے محمود نے جمشید کے ساتھ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور کچھ بہانہ تراش کے علیحدہ بوٹ لے لیا۔

محمود اور جمشید خورشید کے ہاں سے مختلف اثرات لیکر لوٹے۔ ایک اس شمع کا پروانہ تھا اور دوسرا اس دہکتے ہوئے جہنم سے خائف۔ محمود کا وہاں ہر روز کا آنا جانا ہو گیا۔ لیکن جب بھی وہ وہاں جاتا تو خورشید جمشید کے بارے میں سوالات کرتی۔ اور جب وہ سوالات ختم ہو جاتے تو پھر بھی محمود کی طرف ملتفت نہ ہوتی۔ اس کا اوچھا پن اور اس کی دماغی سطح کی پستی خورشید جیسی روشن دماغ اور ذہین عورت کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ محمود اس کے لئے دیوانہ ہو رہا ہے لیکن وہ اس ہستی کے تودے کو کیا کرتی۔ ایسے کئی ناتراشیدہ نوجوان اس سے محبت کر چکے تھے۔ اور اب وہ سیر ہو چکی تھی۔ اس کو روپوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس کو محبت بھرے الفاظ سُننے کی خواہش نہ تھی۔ وہ اپنی تعریف سُنتے سُنتے اُکتا چکی تھی۔ اب وہ خود مستفید ہونا چاہتی تھی۔ وہ ایسی ہستی کی متلاشی تھی جس کے پاؤں میں وہ سر پٹک پٹک کر جان دیدے۔ وہ حکمرانی کرتے کرتے تھک گئی تھی اور اب وہ ان احکام کی متنفر تھی۔

جن سے آ کے وہ بے بس ہو جائے۔ اس کو اب اپنی پرستش کرانے میں لطف نہ ملتا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ ایک عقیدت مند پجاری کی طرح باقی کی تمام زندگی صرف کر دے۔ اس لئے محمود کی والہانہ محبت اس کی بے جا خوشامد اور اس کی اوچھی اور بے معنی تعریفیں خورشید پر الٹا اثر کیا کرتی تھیں۔ جوں جوں محمود اس کے پاؤں میں گرتا جاتا تھا وہ اس کو حقارت سے ٹھکراتی جاتی تھی محمود کی آگ ان بے التفاتیوں سے اور زیادہ بھڑک اٹھتی۔ وہ دیوانہ تھا۔ لیکن خورشید اب خود دیوانہ بننا چاہتی تھی۔

آخر محمود نے جمشید کو ساتھ لے جانا چاہا۔ لیکن جب جمشید نے انکار کر دیا۔ تو وہ مایوسی کے اس انتہائی درجہ پر تھا۔ جہاں خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ محمود نے کہا کہ اگر مرونگا بھی تو خورشید کے سر چڑھ کر اس لئے وہ جھلاتے ہوئے درندے کی طرح خورشید کی طرف چلا گیا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران تھا کہ خورشید نہایت تپاک سے مل رہی ہے (محبت بدگمانیوں اور اندیشوں کے لئے زہر ہلاہل ہے) اور اس لئے محمود نے اس کو اپنے ہی جذب دل کا نتیجہ سمجھا۔ خورشید نے نہایت گرمجوشی سے کہا" آپ اپنے دعووں میں بالکل سچے نکلے۔ میں تو اتنی مدت صرف آپ کو آزما رہی تھی۔"

محمود کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ فرطِ محبت سے بےخود اس کے پاؤں پر گر پڑا۔ خورشید نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے آغوش میں لے لیا۔

خورشید نے مزاج پرسی کے بعد کھانا منگوایا لیکن کون کھا سکتا تھا۔ دو چار لقمے توڑ کر محمود سیر ہو گیا۔ خورشید نے ایک بوتل کا کارک اڑایا اور دو گلاسوں کو ارغوانی بنا دیا محمود آج بیخود تھا۔ اور کبھی کبھی اس کو وہم ہونے لگتا کہ کہیں یہ خواب ہی نہ ہو۔ وہ پرانا بادہ خوار تھا اُس نے ایک ہی سانس میں تمام گلاس کو خالی کر دیا۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ تھا اور اس کی آنکھیں نہایت چمکیلی، وہ دونوں بہت مدت تک پیتے اور پلاتے رہے۔ آخر خورشید نے کہا۔" محمود کیا واقعی تم کو مجھ سے محبت ہے؟

محمود نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔" کیا ابھی تک شک کی گنجائش باقی ہے؟"

خورشید۔ "مجھے خود اقرار ہے۔ اور میرے دل کی گہرائیوں سے یقین کی صدا اٹھتی ہے لیکن ——"

محمود (بات کاٹتے ہوئے) " خدارا یہ لیکن اب کہاں سے پیدا ہو گیا۔

خورشید (بات کو جاری رکھتے ہوئے) " لیکن اگر آپ میری ایک بات پر عمل کریں تو میں بلا تاخیر آپ کی ہو جاؤنگی۔"

محمود (جوش محبت سے) " کہو خدارا جلدی کہو۔ تمہارے لئے میں طوفانی سمندر اور دہکتے ہوئے شعلوں میں کود سکتا ہوں۔"

خورشید کی آنکھیں کامرانی سے چمک اٹھیں " تو کیا تم وعدہ کرتے ہو

محمود - " ہاں اپنی عزت کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں ۔"

" تو کیا جمشید کو ہلاک کر سکتے ہو ؟ " خورشید نے جھٹ پٹ پوچھا ۔

محمود یہ سنکر چونک اٹھا ۔ اور عین اس وقت شمشاد چونک اٹھی تھی جبکہ جمشید خواب میں خورشید ـــــ غور کہ رہا تھا ۔ شراب کا تمام نشہ کافور ہوگیا ۔ اور اب وہ ہوش سنبھال رہا تھا ۔ وہ مذبذب نگاہوں سے خورشید کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اور اس وقت کا منتظر تھا ۔ جبکہ خورشید کہدے کہ یہ سب مذاق تھا لیکن خورشید کی بھڑکتی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں ۔

" تو کیا محبت کے تمام دعوے ختم ہو گئے ۔ او کمینے اور ذلیل شخص نکل جا میری بارگاہ میں تجھے ہرگز رسائی نہیں ہو سکیگی ۔"

محمود خاموش تھا اور نہیں سمجھتا تھا کہ کیا جواب دے یکایک اس کو جمشید کا انکار یاد آگیا ۔ اور اس انکار کو اس نے ایسلئے باندھا کہ اب وہ بھی جمشید سے انتقام لینے کے لئے آمادہ ہو رہا تھا ۔

جب خورشید نے کہا ۔ " کہ تمہیں اس بارگاہ میں ہرگز رسائی نہیں ہو سکتی " تو محمود خورشید کے احکام کی تعمیل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا ۔

" ہاں ! تمہارے لئے میں یہ بھی کر گزرونگا " محمود اور خورشید اس گفتگو میں مشغول تھے ۔ اور جمشید کانپتی ہوئی آواز میں شمشاد کو خواب کا تمام ماجرا سنا رہا تھا ۔

(۷)

اب جمشید اور شمشاد ہر روز سیر کے لئے اکٹھے ہی جاتے ۔ وہ بہت خوش تھے ۔ جیسے کہ دو محبت کرنیوالوں کو ہونا چاہیئے ۔ جب وہ آپس میں ملتے ہیں ۔ سرینگر کے تو تمام مقام دیکھ چکے تھے ۔ نشاط باغ ، شاہی چشمہ اور شالا مار باغ کی سیریں کرتے کرتے وہ اکتا چکے تھے ۔ شمشاد نے ایک دن کہا ۔ کہیں باہر چلیں ۔ یہاں کے لیل و نہار میں اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ۔ " جمشید اور شمشاد دونوں نے مضافات میں جانے کا فیصلہ کر لیا اور اس لئے دوسرے ہی روز وہ اسلام آباد ، مٹن اور اچھابل کے دورے کے لئے تیار ہو گئے ۔ انہوں نے تمام ضروری سامان مہیا کر لیا ۔ اور خیمے وغیرہ بھی لے لئے ۔ کیونکہ ان مقامات کے آس پاس نہ تو کوئی ہوٹل ہیں ۔ اور نہ اچھی سرائیں اور سیر کا لطف اسی میں ہے ۔ کہ وہاں کم از کم دو دو تین تین روز تک قیام کیا جائے ۔ راستے میں عجیب عجیب منظر تھے ۔ دور پہاڑوں پر برف پگھل رہی تھی ۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اپنے سنہری بال

بھیگے ہوئے دھوپ میں خشک کر رہا ہے۔ چپے چپے پر چشموں اور آبشاروں کی تعداد بہت تھی۔ ہر طرف پانی کی چھوٹی چھوٹی نالیاں بہہ رہی تھیں۔ وہ وادی شاداب کے ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسلام آباد پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا اندرونی حصہ غلاظت اور تعفن میں سر بلند ہے۔ اندرونی حصے سے کچھ کم ہی لیکن ان انسانی آبادیوں کو چھوڑ کر وہ بھی آب و سبزہ کا مرقع ہے۔ اس کے ایک سرے پر ہندوؤں کا ایک مندر ہے جس کے اردگرد پانی ہی بہتا ہے۔ اور جس کے سامنے وسیع اور خوبصورت تالاب ہے۔ وہاں دو دن کے قیام کے بعد وہ مٹن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں کورو پانڈو کے وقت کے غار اور ایک پتھر کے مندر کو جو عین پہاڑ کے پہلو میں تراشا ہوا ہے دیکھتے ہوئے وہ ہندوؤں کے اس متبرک مقام پر پہنچے [illegible] پجاری نصف میل پیشتر ہی تانگے کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ جب تانگہ وہاں پہنچا تو ایک جم غفیر ان کے گرد تھا یہ سب پجاری تھے۔ اور اپنی سندیں اور مختلف سربرآوردہ اشخاص کے تصدیقی پرچے دکھا رہے تھے۔ وہاں بھی پانی اور سبزے کی کثرت تھی۔ مندر کے اندر ایک تالاب ہے۔ جس میں گوناگوں الوان کی مچھلیاں پلی ہوئی ہیں۔ پجاری گندم کی چپاتیاں لئے ہوئے آجاتے ہیں۔ اور زائرین کے ہاتھوں بیچتے ہیں۔ یا ان کی اجازت سے خود ہی تالاب میں پھینک دیتے ہیں۔ اور پھر ان سے قیمت یا انعام وصول کر لیتے ہیں۔ جب چپاتی پانی میں پھینکتے ہیں تو تمام مچھلیاں اس پر جھپٹ پڑتی ہیں۔ ایک لمحے کے لئے تالاب میں طوفان سا برپا ہو جاتا ہے۔ وہ آپس میں لڑتی ہیں۔ اور چونکہ ایک ہی چپاتی ہوتی ہے۔ سب ایک ہی جگہ اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ شمشاد نے کہا۔ یہ پجاری بھی اپنی مچھلیوں کی طرح مسافروں پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ جمشید نے جو اس منظر کو دیکھ دیکھ کر پھر اپنے فلسفیانہ عالم میں چلا گیا تھا۔ کہا "دنیا کی تمام کشمکش انفرادی، قومی یا ملکی بھی اسی اصول پر ہے۔ وہاں چپاتی کی بجائے کوئی اور چیز رکھ دی جاتی ہے اور جس طرح ہم ان مچھلیوں کی کشمکش کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ اسی طرح وہ ہستیاں جو ہم انسانوں سے بالاتر ہیں، ہماری لڑائیوں اور خونریزیوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہیں۔" مندر کے عقب میں چند سرسبز ٹیلے تھے۔ تالاب کا تماشہ دیکھنے کے بعد وہ وہاں چلے گئے۔ اور آفتاب کو وہیں وداع کیا۔ اس مقام کی ہوا اسقدر خوشگوار تھی کہ وہ دونوں وہاں تین چار روز کے لئے ٹھہرے۔ وہاں سے انہوں نے اچھابل کا عزم کیا۔ اور چند ہی گھنٹوں میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ ان تینوں مقامات میں زیادہ خوبصورت اور دلفریب مقام ہے۔ اس کا راستہ بھی چشموں اور آبشاروں سے معمور ہے اس مقام کے بالکل قریب ایک خوبصورت باغ ہے مسافر

صرف اس باغ کو اچھابل کہہ دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کے علاوہ تمام قصبہ اسلام آباد کے اندرونی حصّہ کی طرح ہی ہے۔ یہ باغ زائرین کا استقبال اپنی پُر شور آبشار سے کرتا ہے اور یہ آبشار اس تالاب میں گرتی ہے۔ جو اس باغ کے سامنے واقع ہے۔ باغ میں کئی تالاب ہیں۔ جن پر چنار کے گھنے سایہ دار درخت جھکے رہتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے پھول پرندوں کے نغمے جو آبشاروں کی صداؤں میں مل جل جاتے ہیں۔ چنار کے گھنے اور بے شمار درخت، مچھلیوں کی آنکھ مچولی سبزے کی فراوانی اور شادابی اور پھر اس کے عقب میں چیر کے خوبصورت درختوں سے لدا ہوا ٹیلا نہایت خوشگوار منظر ہے۔ باغ کا ایک حصّہ مچھلیوں کی بقا و حفاظت کے لئے مخصوص ہے۔ وہاں بھی پانیوں کا شور اور سبزے کی فراوانی ہے۔ جب ٹیلے پر چڑھتے ہیں تو ہوا چیر کے درختوں سے مس کرتی ہوئی نہایت ولولہ انگیز محسوس ہوتی ہے۔ رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ اور چہرے پر سرخی پھیل جاتی ہے۔ اسی ٹیلے کے پانیوں سے تمام باغ سیراب ہوتا ہے۔ اس کا پانی نہایت ہی خنک اور شیریں ہے۔

جمشید نے کہا کہ یہاں کم از کم ایک ہفتے کے لئے قیام ہونا چاہئے۔ انہوں نے باغ کے عین سامنے اپنے خیمے نصب کر لئے وہ ہر صبح اور ہر شام اس ٹیلے پر بیٹھ کر آفتاب کا استقبال اور اس کو وداع کرتے کئی کئی گھنٹوں تک وہیں بیٹھے گزشتہ اور آئندہ زندگی کے متعلق گفتگو کرتے رہتے۔ شمشاد کو اب جمشید کی محبت کا پورا یقین تھا۔ اس لئے اُس نے ایک روز کہا: "محبت کی بارگاہ میں ظلمت و نور شاہی و گدائی اور شرافت و رذالت ایک ہی ہیں۔ جمشید مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ لیکن اب تک تم مجھے ایک حسن فروش ہی تصوّر کرتے رہے ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے لیکن اگر میری داستان سُنو تو تم شاید خوشی اور افسوس کے آنسو بہاؤ۔ میرا باپ ایک مشہور بیرسٹر تھا جس کا نام لیکر اب میں اس کی روح کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ وہ پچیس برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔ اس کی بیوی جو حسین جمیل اور صحت مند تھی۔ سولہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی اور اب تم سُنکر حیران ہو گے کہ میرا باپ اور میری ماں دونوں برہمن تھے اور اگرچہ میرا باپ تو نہایت روشن خیال تھا لیکن اس کے سسرال والے پرانی لکیر کے فقیر تھے اس لئے اُنہوں نے اپنی لڑکی کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ دی۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو لیکن جو حال بیواؤں کا ہندوؤں کی سوسائٹی میں ہوتا ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ گھر کے تمام ادنےٰ اور رذیل کام انہیں کے سپرد ہوتے ہیں۔ اور پھر کھانے کو سب سے بُری خوراک اور پہننے کو پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑے دئے جاتے ہیں۔ فطرت ان زنجیروں میں کب تک جکڑی جا سکتی ہے۔ شاید تم میری داستان

سنے اسے اپنے کو خود ہی سمجھ گئے ہو گے۔ شمشاد یہ باتیں کر رہی تھی اور اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ جمشید حیرت اور استعجاب سے منہ کھولے ہوئے سن رہا تھا۔

جمشید نے سنبھل کر کہا۔ "ہاں دنیا کے انقلابات ایسے ہی ہیں۔ جب ابراہیم آزر کے ہاں پیدا ہو سکتا ہے جب نوح کا بیٹا کافر ہی رہ سکتا ہے۔ جب لنکن سا گڈریا امریکہ کا صدر بن سکتا ہے۔ جب شہنشاہ نپولین ایک معمولی سپاہی کی حیثیت میں اس زندگی کو خیرباد کہتا ہے تو کوئی تعجب نہیں اگر تمہاری خاندانی زندگی میں ایسے انقلابات پیدا ہوتے۔ لوگ حسن فروشوں کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اگر انہیں زہد و تقویٰ کے مجسموں کی ایسے ہی حالات میں تربیت کی جائے تو وہ دنیا میں کیا کچھ گل نہ کھلائیں۔ اگر غریب کو اس لئے حقیر سمجھا جائے کہ وہ غریب کے ہاں پیدا ہوا ہے۔ یا جاہل کو اسلئے ٹھکرا دیا جاتے کہ وہ جاہل کے ہاں پیدا ہوا ہے تو اس سے زیادہ غلطی کونسی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ اس غریب یا جاہل شخص کے اختیار کی بات ہوتی تو وہ کبھی اپنے موجودہ والدین کے ہاں پیدا نہ ہوتا۔ پیدائش بچپن اور جوانی کے حالات ہی ایسے ہوتے ہیں۔ کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اور جو ہماری زندگیوں کو مخصوص سانچوں میں ڈھال دیتے ہیں کیا ہم اس عورت سے زہد و تقویٰ کی توقع کر سکتے ہیں۔ جو ایک فاحشہ عورت کے ہاں پیدا ہوتی ہے۔ جس کے کان سب سے پہلے ساز اور سارنگی کی صدائیں سنتے ہیں اور جس کی آنکھیں سب سے پہلے جام و مینا اور بوس و کنار کے مناظر دیکھتی ہیں۔ پھر اس کا بچپن بھی انہیں رنگ رلیوں کو دیکھتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ اور جب شباب حسن و کشش کے تمام خزانوں کو اس کی ہر ادا پر نثار کر دیتا ہے۔ تو پھر کیا تعجب ہے اگر وہ عفت و عصمت کو چند لمحوں کی لذت کے لئے فروخت کر دیتی ہے۔ کیا وہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی کر سکتی ہے۔ تو پھر اس مجبور و لاچار ہستی کو کیوں ہدف ملامت بنایا جائے۔"

اس کی آواز بہت بلند ہو رہی تھی اور وہ ابھی اس مضمون پر بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شمشاد نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "شام ہو چکی ہے۔ اور اب ہمیں واپس لوٹنا چاہیے۔ شام کے وقت میں تو ان درختوں کو دیکھ دیکھ سہمی سی محسوس کرتی ہوں۔ صبح کے وقت یہی درخت آغوش محبت کھولے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت کسقدر ہیبتناک ہیں۔"

(۸)

"اگرچہ آسمانی قوانین کے ماتحت ہماری زندگیاں صحیح طور پر وابستہ ہیں۔ لیکن اب ان کو انسانی قوانین کے تحت میں لے آنا چاہیے۔"

جمشید اور شمشاد اچھابل باغ کے اس ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ جمشید نے خاموشی کے سلسلے کو توڑتے ہوئے کہا۔

شمشاد (فرطِ مسرت سے) تو دیر کس بات کی ہے کل صبح ہی یہ بات بھی طے ہو جاتے۔ اُف میرا دل ان رسومات سے کس قدر گریز کرتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں اپنے تعلقات کو دشوار کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ صرف اس لئے کہ ہمارے تعلقات جو آسمانی بادشاہت کے نزدیک مستحکم اور مقدس ہیں۔ ابھی تک ان ارضی دائم التغیر اور فانی قوانین کے منت کش ہیں "

جمشید، تو پھر کل ٹھیک ہے تاکہ پھر ہماری زندگیاں مادی اور روحانی نگاہ میں بالکل ایک ہی ہو جائیں۔

وہ دونوں چند لمحوں کے لئے خاموش تھے شمشاد چشمے کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کا خیال مستقبل کے تاریک پردوں کو زرنگار بنا رہا تھا۔ اس کی انگلیاں پتھر سے کھیل رہی تھیں۔ اور وہ اپنی پنسل سے ان پر مختلف نقوش بناتی جاتی تھی۔ حتےٰ کہ اس نے دیکھا کہ تمام دھواں بلکہ ایک جگہ فضا میں معلق ہو گیا ہے۔ اس نے وہاں ایک خیالی محل تعمیر کیا۔ جہاں وہ اور شمشاد دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک وہ تمام دھواں ایک بلبلے کی طرح پھوٹ کر ادھر اُدھر بکھر گیا۔

وہ دونوں انہیں موہوم محلات کی تعمیر میں مشغول تھے کہ یکایک کسی نے پیچھے سے جمشید کو نیچے دھکیل دیا وہ لڑھکتا لڑھکتا چشمے کے پانی میں آ گرا۔ ابھی وہ ہوش میں تھا کہ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ خورشید اور محمود شمشاد کو نیچے دھکیل رہے ہیں۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی خورشید خور ـــــ وہ یہ کہتا کہتا بیہوش ہو کر ایک بلبلے کی طرح پانی میں فنا ہو گیا۔ شمشاد پتھر کا بُت بنی ہوئی تھی۔ وہ خورشید اور محمود کے زور لگانے کے بغیر ہی نیچے لڑھک رہی تھی۔

محمود نے دیوانہ وار قہقہہ لگا کر کہا "بس شرط پوری ہو گئی"

خورشید صرف شمشاد کو ہلاک کرنا چاہتی تھی لیکن جب اُسنے جمشید کو فنا ہوتے دیکھا اور خود اسکے لبوں سے اپنا نام سنا تو اس کی محبت پھر دو چند ہو کر عود کر آئی۔ محمود کو وہ نہایت ہی مبغض تھی۔ اور بالخصوص اب جبکہ اُس نے اپنے عزیز ترین دوست بھی کھو دئیے۔ خورشید نے پستول کا ایک فائر کرتے ہوئے کہا "ہاں تمام شرطیں پوری ہو گئیں۔ اور اب تمہارا کام بھی تمام ہونا چاہئے" اور محمود بھی لڑھکتا لڑھکتا اپنے دوست جمشید سے جا ملا۔ تاریکی پھیل رہی تھی اور خورشید ان تینوں کو دیر تک دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ صرف بلبلے دکھائی دینے لگے۔ چند ہی لمحوں میں وہ بلبلے بھی غائب ہو گئے اور اب تاریکی، دہشت اور سنسناہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ بھی اسی تاریکی میں درختوں کے جھنڈ میں کہیں غائب ہو گئی۔

اثر صہبائی

تخیّلات

تو جو ہو پاس ملائیں نہ پری سے بھی آنکھ — تیرے ہوتے نہ کریں بات کسی حور سے ہم
یہی عالم ہے تو ہو جائیگا پیدا اک حشر — اپنے نالوں کو ملا دینگے کبھی صور سے ہم
رکھتے ہیں اپنے مقدر سے تمنا اتنی — دیکھ لیں جلوۂ دیدار کبھی دُور سے ہم
بادہ و جام کی ساقی ہے تمنا کس کو — مست و بیخود ہیں تری نرگس مخمور سے ہم
سہل تھی عشق کی ہر منزلِ دشوار مگر — پھر گئی تیری نگہ ہو گئے مجبور سے ہم
سرفروشی کے لئے شرط ہے ایمائے حبیب — ورنہ بیگانہ نہیں شیوۂ منصور سے ہم

اختلافِ جذبات باتحادِ قوافی

میرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
ناسخ

ازل سے سلسلہ ہے اس جنونِ فتنہ ساماں کا — شگافِ خامۂ کن چاک ہے میرے گریباں کا
اسیر

جنوں سے دیکھو رتبہ مرے حالِ پریشاں کا — قدم بوسی کو آیا چاک تا دامن گریباں کا
جُرأت

خُدا جانے یہ دل کشتہ ہے کس اندازِ داماں کا — کہ ہے چاکِ کفن کی شکل چاک اُس کے گریباں کا
مصحفی

رواں رکھتا ہے خون آنکھوں سے ہجر اک مہِ تاباں کا — شفق آلودہ رہتا ہے ہلال اپنے گریباں کا
آتش

شامی

نفسیات اور مومن

انسان کی حیات شاعرہ میں جسقدر افعال ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ان میں سے مفرداتِ جذبات یعنی لذت والم کا رتبہ سب سے اہم ہے۔اس حقیقت کی تہ میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ انسان کی حیاتِ شاعرہ کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے چند ایسے احساسات کی ضرورت ہے۔جو مفردہ طور پر اس کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہوں۔ اور جو اس کے اعصاب میں اس طرح جاگزیں ہو چکے ہوں کہ وہ آسانی سے ان کے ذریعے انتشار اور اجتماع کی ان قوتوں میں تمیز کر سکے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی زندگی کے لئے تخریبی یا تعمیری عنصر رکھتی ہوں۔اس کام کو پورا کرنے کے لئے لذت والم کے احساسات خلق کئے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے ہم ہر وقت ان افعال میں تمیز کر سکتے ہیں۔ جو ہمارے لئے مضرت رساں ہوں۔ جو چیزیں کسی حیثیت سے اذیت و انقباض پیدا کرنے کی محرک ہوتی ہیں یا جن سے ہمیں کسی صورت میں کوئی جسمانی یا ذہنی کرب پہنچتا ہے۔ بالعموم وہی ہماری حیات کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں۔اور از بسکہ انسان ہمیشہ انہی احساسات کی پیروی کرتا ہے۔جن کی وجہ سے اسے انبساط میسر ہو۔فطرت نے لذت والم کو ہمارا رہبر مقرر کر دیا ہے۔کہ ہم ان کے ذریعے معاونِ حیات افعال سے مدد لے سکیں۔اور مضرِ حیات افعال کو ترک کر سکیں۔۔یہی احساسات جب جذبات بن جاتے ہیں۔تو غم و مسرت کہلاتے ہیں۔اس سے ثابت ہوا کہ غم و مسرت ہی ایسے جذبات ہیں جو حیاتِ شاعرہ کی تکوین کے ساتھ ہی وجود میں آتے ہیں

یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غم و مسرت کے جذبات میں سے کونسا جذبہ انسانی فطرت میں سب سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ماہرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ غم کو مسرت پر تقدم حاصل ہے۔ وہ اپنے نظریے پر یہ دلیل قطعی لاتے ہیں۔کہ بچہ دنیا میں آتے ہی روتا ہے دوسرا گروہ اس کے مقابلے میں یہ کہتا ہے۔کہ بچہ اس وجہ سے نہیں روتا۔کہ غم کو مسرت پر تقدم حاصل ہے۔بلکہ ماحول کی اجنبیت کی وجہ سے مجبور ہو کر۔بہرصورت کوئی بھی نظریہ درست ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غم انسان کی حیاتِ شاعرہ میں روحِ رواں کی طرح جاری و ساری ہے۔ غالب کا یہ شعر آپ نے سُن ہی رکھا ہوگا۔ ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لیکن مومن کا مندرجہ ذیل شعر نفسیاتی عنصر کی زیادہ مفصل تشریح کرتا ہے۔ لکھتا ہے ؎

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

غم کی تمام کیفیات کے متعلق ایک اور شعر بھی ہے ہر چند کہ اس کی کوئی مکمل نفسیاتی تحلیل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بن کہے رہ نہیں سکتا۔ کیونکہ غم کے ارتقا کے متعلق اس میں بھی کافی مواد موجود ہے۔ کہتے ہیں ؎

وت کی آس پہ جیتا شب ہجراں ہوگا
آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا

جذبات کے ارتقا کا سب سے اہم قانون شاید یہ نکتہ ہے۔ کہ جذبہ کے طاری ہونے کے بعد انسان اپنے تمام تجربات کو جذبے کے رنگ میں محسوس کرتا ہے۔ جس وقت انسان ایک قوی جذبے سے متاثر ہو چکتا ہے۔ تو پھر وہ دُنیا کی ہر ایک شے کو اپنے جذبے کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ شگفتگی کا دور طاری ہو تو کائنات مسکراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور غم طاری ہو۔ تو وہ جہان آنکھوں میں تاریک معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر چونکہ عام آدمیوں سے زیادہ حسّاس ہوتا ہے اس لئے اس کی یہ حالت بہت سریع اور تیز ہوتی ہے دورۂ غم میں شفق پھولے۔ تو اسے اپنی آرزوؤں کا خون چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ مینہ برسے تو اسے اپنے آنسوؤں کی جھڑی یاد آتی ہے۔ پھول مسکرائیں، تو اسے زہر خند معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں حقیقت میں انسان انتہائے غم میں اسی طرح محسوس کرتا ہے مومن کے چند ایک شعر سنئے ؎

یہ گلستاں سرائے تماشا نہیں رہا
وہ نوبہارِ گلشنِ دُنیا نہیں رہا
افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں
وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا
حیف اپنی تلخ کامی و شوریدہ طالعی
جس سے کہ زندگی کا مزا تھا نہیں رہا
اے چرخ چاہنے سے رہے روزگار کو
کیا چاہیں روزگار تمنا نہیں رہا
اپنی خرابیوں کو کہاں جا کے روئیے
وہ شمع روتے انجمن آرا نہیں رہا
دل میں جگہ نہ ہونے کا کس سے گلہ کروں
وہ قدر دانِ شکوۂ بے جا نہیں رہا
کس کو گلے لگائیے اے شوق ہم کنار
وہ خوش گلو کے سینہ مصفا نہیں رہا

کس سے نبھا ہے کہ سوائے دنا ت کے

دنیا میں ہاے نام وفا کا نہیں رہا
اب کس کو دیکھئے کہ کسی کو نہ دیکھئے

وہ پردہ سوز چشم تماشا نہیں رہا
اس نور چشم حسن کو کیونکر نہ روئیے
آنکھوں میں آئے اب کوئی ایسا نہیں رہا

مندرجہ بالا نکتے کے ضمن میں ایک اور لطیف حقیقت پنہاں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جذبہ اور وقوف میں نسبت معکوس پائی جاتی ہے۔ ہر چند کہ جذبات اور وقوف کو قطعاً ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ ایک باطل نما حقیقت ہے۔ کہ انسان کے جذبات جسقدر تیز و تند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی قدر تفکر کے قوے معطل ہوتے جاتے ہیں۔ اس حالت میں انسان کئی ایسی باتیں کہہ بیٹھتا ہے۔ کئی ایسے افعال کر بیٹھتا ہے۔ جو اسے وقوف کی حالت میں یقیناً مضحک معلوم ہوتے ہیں۔ حالی کا مندرجہ ذیل شعر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ کہ اکثر اوقات جذبات وقوف سے اس قدر دور جا پڑتے ہیں۔ کہ ضمناً کئی دوسرے جذبات پر بھی حاوی ہو جاتے ہیں۔ شاعر میں اور محبوب میں رنجش ہو گئی ہے۔ کسی خاص جذبے کے زیرِ اثر آدابِ محبت فراموش ہو جاتے ہیں۔ اور شاعر کئی ایسی باتیں کہہ بیٹھتا ہے۔ جن کے متعلق حالتِ وقوف میں اسے پچھتانا پڑتا ہے ؎

رات ان کو بات بات پہ سو سو دئے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات پہ ایسا گماں نہ تھا

غالبؔ کا ایک شعر اس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ محبوب ان سے اندازِ طنز میں باتیں کر رہا ہے اور وہ جذبۂ عشق کے ماتحت اس کی باتوں میں بغیر امتیاز کئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں۔ اور چونکتے ہیں، اس وقت جب موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے فرماتے ہیں ؎

نہ کہو طعن سے پھر تو کہ ہم ستمگر ہیں
ہمیں تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

ایک اس سے بھی زیادہ لطیف شعر تو مشہورِ عام ہو گیا ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مومنؔ کے ہاں بھی شاذ شاذ ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ نفسیاتی نکتہ نگاہ سے ایسی دلچسپ اور جاذب نظر نہیں۔ دو ایک شعر لکھے دیتا ہوں ؎

ٹکٹکی لگائی ہے اب تو گو ہو رسوائی
تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھ کو دیکھنا دیکھیں

دونوں کا ایک حال ہی یہ مدعا ہو کاش
میرا خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

دیا اس بد گماں کو طعنہ غیبت
غضب ہے کیا کہوں اپنی زباں کو

جذبات کی تکوین کے لئے ضروری ہے کہ نفس انسانی کسی جذبے سے متاثر ہونے کے لئے تاثر سے پیشتر کسی اور قوی تر جذبے سے متاثر نہ ہو ورنہ ظاہر ہے کہ جس جذبے کو تاخر حاصل ہے۔ وہ بالعموم قوی تر جذبے کے ماتحت رہ کر کام کرے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ اسی قانون کی تشریح ہے جس کی وجہ سے انسان کوئی جذبہ طاری ہونے کے بعد تمام چیزوں کو اپنے جذبات کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس حقیقت کا بیان اس شعر میں کیا گیا ہے۔ کہ

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

انسان کی فطرت میں انانیت کا جذبہ ایک ایسا جذبہ ہے۔ کہ اگر انسانی مجموعہ اعمال کا تجزیہ کیا جائے تو آخر کار معلوم ہوگا کہ بہت سے افعال کے لئے محرک عمل اسی جذبے کی ایک صنف ہوتی ہے۔ یعنی خود نمائی۔ انانیت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایجابی اور سلبی۔ انانیت ایجابی بنفسہٖ دو اصناف میں منقسم ہے۔ ایک صنف غرور کہلاتی ہے۔ دوسری خود نمائی۔ جس وقت انسان دوسروں کی تعریف سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات پر اعتماد رکھے تو اس کیفیت کو غرور کہا جاتا ہے۔ لیکن جب انسان اپنے ذاتی محاسن کے متعلق دوسروں سے داد طلب ہو تو یہی جذبہ خود نمائی کہلاتا ہے۔ اوّل الذکر جذبہ بالعموم مردوں میں اور آخر الذکر بالعموم عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ صنف نازک کی اسی کمزوری سے کئی بار فایدہ اُٹھایا جا چکا ہے۔ مومن بھی ایک جگہ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے ؎

غیر کو سینہ کے سے سیمبر دکھلا دیا
تم نے کیا کچھ کس کو اپنی بات پر کھلا دیا

"خورشید"

برقِ بلا

کیسا عجیب سفر تھا۔ خاصکر آغاز نہایت دلفریب تھا۔ اپنی طرف سے مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مَیں نے کوئی بحری سفر ایسے مبارک تاثرات کے ساتھ اس وقت تک نہ کیا تھا۔ پراونس بہت تیز، آرام دہ اور بحر اوقیانوس میں سفر کرنے والا جہاز ہے۔ اور اُس کے ملاح اور کپتان نہایت خوش مزاج، اور شگفتہ طبیعت ہیں۔ اس موقع پر مسافروں کی تعداد مختصر تھی۔ باہمی تعارف کے مراسم ادا ہونے شروع ہوئے جس طرح کوئی شخص کسی غیر معلوم جزیرہ میں پہنچکر وہاں کے باشندوں سے دوستی پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ بھی تمام دُنیا سے علیحدہ ہو کر ایک دوسرے سے متعارف ہونے کیلئے مجبور تھے چنانچہ رفتہ رفتہ ہماری ملاقاتیں بے تکلفانہ ہوتی گئیں۔ کیا آپ نے کبھی اس نکتہ کی محیر العقول ندرت پر غور کیا ہے۔ کہ ایک مختصر جماعت جس کا ہر فرد ایک روز قبل ایک دوسرے کی صورت سے ناآشنا تھا۔ یک بیک چند روز کے لئے بحرِ ناپیدا کنار اور فلک دوّار کے درمیان سمندر کے طوفان خیز تلاطم، موجوں کے مہیب حملوں، باد مخالف کے پُر غیظ جھونکوں یا سکونِ آب کی پریشان کن خاموشی سے مقابلہ کرنے کے لئے اکٹھی ہو جائے؟

فی الحقیقت ہستی، بذات خود اپنی نوعیت، طوفان خیز تلاطم، اہمیت، یکسانی اور گوناگونی کے اجتماع میں ایک مختصر غم افزا افسانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی مختصر چند روزہ زندگی کے لمحاتِ طرب کو انتہائی تنوع سے استعمال کرتے ہیں۔

حال ہی میں ایک ایسی ایجاد ہوئی ہے جس نے بحری سفر میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہانتک کہ یہ چھوٹا سا متحرک اور تیرنے والا جزیرہ جسے ہم اسوقت تک دُنیا سے علیحدہ خیال کرتے تھے۔ اب دُنیا سے وابستہ رہتا ہے۔ وہ کیا؟ "لاسلکی پیغام رسانی کا آلہ" ہم کو اس کا پیغام ایسے پُراسرار طریق سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُسے بجا طور پر دوسری دُنیا کا پیغام کہہ سکتے ہیں۔ قوت متخیلہ بھی ان تاروں کا تصوّر کرنے سے لاچار ہے۔ جس کے بازوؤں پر یہ نادیدہ حقیقت پرواز کرتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے۔ یہ راز نہایت ناقابلِ فہم اور شاعرانہ انداز لئے ہوتے ہے۔ اور سوائے اس کے کہ ہم اسے ہوائی تاروں سے تشبیہ دیکر دل بہلالیں اور کوئی صورت اس معجزہ کی تفصیل بیان کرنے کی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہمیں روانگی کے بعد ہی ایسا معلوم ہونے لگا

کہ کا ہے کہ ہے ہمارے عقب میں کسی کی یاد کرنے والی آواز آرہی ہے۔ اور کبھی کبھی کسی دوست کی آواز اس بحر اعظم سے ہمارے پاس پہنچ جاتی جس کو ہم چھوڑ آئے تھے۔ دو دوستوں نے توجہ سے گفتگو کی۔ اور دس بیس نے مبارکباد یا جدائی پر رنج و افسوس کے پیغامات ارسال کئے۔

دوسرے دن ایک طوفان خیز شام کو جب ہم لوگ ساحل فرانس سے پانچ سو میل کے فاصلہ پر تھے۔ لاسلکی پیام نے ہم لوگوں کو حسب ذیل اطلاع دی۔

"آرسین لوپن آپ کے جہاز کے درجہ اوّل میں سفر کر رہا ہے۔ اُس کے بال سنہرے اور داہنے بازو پر ایک زخم ہے اُس کے نام کا آغاز ر سے" عین اسی وقت ایک دہشت خیز چمک سواد فلک میں نمودار ہوئی۔ برقی لہریں بند ہوگئیں۔ اور بقیہ پیغام ہم لوگوں تک پہنچنے سے قاصر رہا۔ ہم لوگونکو صرف آرسین لوپن کے اختیار کردہ نام کا صرف پہلا حرف جس کے پردہ میں وہ اپنی حقیقت کو پوشیدہ رکھتے ہوئے سفر کر رہا تھا معلوم ہوسکا۔

اگر خبر اس کے علاوہ کچھ اور ہوتی تو اس میں ذرا کلام نہیں کہ یہ راز محرر تار برقی کپتان اور اس کے ماتحت افسروں کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہ ہوسکتا لیکن بعض ایسے واقعات ہیں جو سخت سے سخت فیصلہ کو بھی تذبذب میں ڈالدیتے ہیں اس سے پیشتر کہ خورشید خاور اپنے رُخ تاباں کو نقاب پوش کرے کوئی بھی نہ بتا سکتا تھا کہ آخر یہ خبر کس طرح اور کیونکر ہمارے جہاز میں پھیل گئی۔ مگر امر واقعہ یہ تھا کہ شام سے پیشتر ہم سب لوگونکو علم ہوگیا کہ مشہور و معروف آرسین لوپن ہمارے درمیان موجود ہے۔

آرسین لوپن اور ہمارے درمیان! وہ پُراسرار نقب زن جس کے کارنامے مہینوں سے تمام اخبارات میں شائع ہورہے تھے۔ وہ محیر العقول ہستی جس کے مقابل ضعیف گینمارڈ، ہمارا بہترین سراغرساں تازیست دشمنی کا پیغام لیکر میدان میں اترا تھا۔ اور جس کے افسانے آجتک ایسے دلفریب انداز سے بیان کئے جاتے ہیں۔ آرسین لوپن وہ نکتہ سنج شریف انسان، جو اپنی دست درازیاں شہر کے مشہور و معروف محلات۔ مکلّف و مزیّن باوضع نشستگاہوں تک محدود رکھتا ہے۔ اور جو ایک شب بیرن اسکارسینس کے محل میں نقب لگانے کے بعد اپنا ملاقاتی کارڈ چھوڑ کر خالی ہاتھ چلتا بنا تھا۔

آرسین لوپن
شریف بدمعاش

اس کے نیچے یہ الفاظ پنسل سے اضافہ کر دئے گئے تھے۔

"جب آپ نادر اشیاء رکھنا پسند کرینگے میں حاضر ہوجاؤنگا"

آرسین لوپن، وہ ہزاروں بہروپ میں ظاہر ہونے والی ہستی، کبھی موٹر کا ڈرائیور، کبھی مارسیلز کا قلی، تو کبھی روسی ڈاکٹر،

اور کبھی اسپین کا مشہور معرکہ آرا تیر انداز!

ذرا اُس وقت کے منظر کا تصور کیجئے:- آرسین لوپن بحر اوقیانوس میں رواں جہاز کے مَدود رقبہ کے اندر چل پھر رہا ہے یہی نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ محدود اور مختصر احاطہ کے اندر جو صرف درجہ اوّل کے مسافروں کے لئے مخصوص تھا۔ جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی اس سے مل سکتا ہے یعنی جہاز کا کوئی کمرہ یا نشستگاہ یا مباکونوشی کا کمرہ! کیا وہ شریف آدمی جو اس جگہ تفریح میں مشغول ہے۔ آرسین لوپن نہیں۔ یا یہی قریب والا شخص، یا میرے پاس میز کے قریب بیٹھا ہوا آدمی میرے کمرہ ہی کا دوسرا ساتھی مسافر۔

اور ذرا خیال فرمایئے کہ تذبذب پانچ روز تک قائم رہنے والا ہے۔ دوسرے دن مس نیلی نے کہا۔ "اُف یہ نہایت پریشان کن ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اُسکو گرفتار کر لینگے!" پھر میری طرف مُڑ کر کہا۔ "موسیو رڈی اینڈریز کچھ فرمایئے۔ آپ تو کپتان کے نہایت گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ کیا آپ نے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سُنا؟"

اگر صرف مس نیلی انڈرڈاون کو خوش ہی کرنا منظور ہوتا تو میری عین خواہش تھی کہ مَیں اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہوں وُہ اُن بے بہا ہستیوں میں سے ایک تھی۔ جس کے حُسن جہاں سوز پر تمام آنکھیں خواہ ان کا مرکز نگاہ دوسرا ہی ہو۔ فطرتاً اُٹھنے لگتی ہیں۔ اُس کی چشم سیہ گوں کی خوبصورتی ایسی ہی درخشاں اور تاباں تھی جس طرح اُس کی قسمت کا ستارہ۔ جذبات سے پُر اور تعریفی نگاہیں ڈالنے والوں کا ایک مجمع ہر وقت اُس کے حُسن کی مدح سرائی کرتا تھا۔

اُس نے اپنی فرانسیسی مادر مہربان کے سایۂ عاطفت میں شہر پیرس میں تربیت پائی تھی۔ اور اب وہ اپنے والد بزرگوار انڈرڈاون امریکن کروڑپتی سے ملنے کیلئے شیکاگو جا رہی تھی۔ اور اُس کی ایک سہیلی خاتون گیرلینڈ اُس کے ہمراہ بطور ہمسفر ساتھ تھی۔

مجھے شروع ہی سے اُس کے ساتھ ایک گونہ رغبت ہوگئی تھی۔ لیکن بحری سفر کی عجلت آفرین بے تکلفی و دوستی سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ اور اس کی کشش نے میرے دل پر سکّہ جما لیا۔ جب کبھی اس سے میری آنکھیں دو چار ہوتیں تو اس کی ہر معمولی ادا میرے جذبات کو برانگیختہ اور دلی جوش کو بے چین کرنے کے لئے کافی ہوتی۔ وہ میرے اظہار محبت کو خندہ پیشانی اور دلربایانہ انداز دوشیزگی سے قبول کرتی۔ وہ میری مزاح آفرین باتوں پر قہقہے لگاتی۔ اور میرے افسانوں کو بڑے اشتیاق سے بغور سنتی اور میری ہر بات کا جواب بڑی ہمدردی اور فیاضی سے دیتی۔

صرف ایک رقیب تھا جسے دیکھ کر مجھے ایک فکر سی پیدا ہو جاتی۔ ایک حسین خوشرو جوان۔ موجودہ تہذیب اور وضع کے مطابق بہترین پوشاک میں ملبوس۔ خوش اطوار اور

با اخلاق جن کی سادہ لوحی اور اندازِ خاموشی اکثر اوقات میرے عجیب و غریب دلفریب مناظر سے بھی زیادہ جاذبِ نظر ثابت ہوتے۔

جس وقت مس انڈرڈاون نے مجھ سے یہ بات کہی تو وہ بھی اس کے لئے دو "تفریحی گروہ" میں شامل تھا ہم لوگ نہایت آرام سے اپنی اپنی کرسیوں پر جہاز کے تختے پر بیٹھے تھے۔ گزشتہ دن کے طوفان کے بعد مطلع صاف ہو چکا تھا اور اس وقت شام کا سماں بہت ہی دلفریب تھا۔

میں نے جواب دیا۔ "میں نے تفصیل سے کوئی بات نہیں سنی۔" "لیکن ہم اپنی ذاتی تحقیقات ٹھیک اسی طریقہ سے جس طرح سے پرانا تجربہ کار گینارڈ۔ لوپن کا جانی دشمن کرتا ہے۔ کیوں نہ شروع کر دیں؟"

"میں کہتی ہوں، میرا خیال ہے کہ آپ بہت عجلت سے کام لے رہے ہیں!"

"یہ کیوں؟ کیا یہ مسئلہ اسقدر پیچیدہ ہے؟"

"نہایت پیچیدہ"

"یہ غالباً آپ صرف اس وجہ سے کہتی ہیں کہ وہ تمام ضروری باتیں جو اس کے حل کے لئے ہمارے پاس موجود ہیں آپ فراموش کر دی ہیں۔"

"اول یہ کہ لوپن ایسا نام اختیار کر کے سفر کر رہا ہے جس کا حرف اوّل "ر" ہے۔"

"یہ تو بیکار سی بات ہے۔"

"پھر وہ تنہا سفر کر رہا ہے۔"

"ہاں! اگر آپ اس کو کافی تفصیل تصوّر فرماتے ہیں!"

"تیسرے یہ کہ وہ خوبصورت ہے۔"

"اچھا پھر؟"

"یہ کہ ہم کو صرف درجہ اوّل کے مسافروں کی فہرست دیکھ کر اُسی سے پتہ لگانا شروع کرنا چاہیے۔"

فہرست میری جیب میں تھی۔ میں نے اُسے نکالا اور اُس پر سرسری نگاہ ڈالی۔

"اچھا سب سے پہلے میں دیکھتا ہوں کہ صرف تیرہ آدمی ایسے ہیں۔ جن کا نام "ر" سے شروع ہوتا ہے۔"

"صرف تیرہ؟"

"ہاں درجہ اوّل میں ان تیرہ "ر" سے شروع ہونے والوں میں جیسا کہ آپ خود ملاحظہ فرما سکتی ہیں۔ نو تو ایسے ہیں جو اپنی بیوی بچّوں اور ملازمین کے ہمراہ ہیں۔ اب صرف چار مسافر ایسے باقی بچتے ہیں جو تن تنہا سفر کر رہے ہیں.... مارکوئیس ڈی ریوڈن"

"سفارتخانہ کا سکرٹری" مس انڈرڈاون نے کہا "میں اُس سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"میجر راسن"

کسی نے کہا۔ "یہ میرا چچا ہے۔"

" سانٹز ریوولٹا "

" واہ جناب! " ہم میں سے کسی نے چلا کر کہا۔ وہ کوئی اطالوی تھا جس کی لانبی سیاہ داڑھی سارے چہرہ کو چھپائے ہوئے تھی۔

مس انڈرڈاون ہنسی نہ ضبط کر سکی۔

" یہ معزز شخص تو قطعی طور پر خوبصورت نہیں! "

میں نے کہنا شروع کیا " پھر ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجرم فہرست کا آخری آدمی ہے۔ "

" وہ کون ہے؟ "

" موسیو روزاین کیا کوئی صاحب موسیو روزاین سے واقف ہیں؟ "

کسی نے جواب نہیں دیا۔ لیکن مس انڈر ڈاون اس سادہ لوح، خاموش مزاج شخص کی طرف مڑی جس کی فوری موجودگی نے عارضی طور پر میرے دل میں ایک اضطراب سا پیدا کر دیا۔ اور کہنے لگی:

" جناب موسیو روزاین کیا آپ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتے؟ "

سب لوگوں کی نظریں اس پر جم گئیں۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔

میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ ایک برقی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ اور مجھے اس گہرے سکوت میں ایسا محسوس ہوا کہ کم و بیش ہر شخص پر اس کا اثر تھا۔ لیکن بات کچھ بھی نہ تھی کیونکہ اس کی کوئی حرکت ایسی نہ تھی جس پر ہمیں شک تک کی گنجائش ہوتی۔

" کیا میرے منہ میں زبان نہیں " اس نے جواب دیا۔ " اچھا آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ انہیں باتوں کے زیر اثر کہ میرا نام کیا ہے۔ میرے چہرہ اور بالوں کی رنگت کیسی ہے اور نیز یہ کہ میں تنہا خود ہی سفر کر رہا ہوں۔ میں نے بذات خود اسی طرح کی تفتیش کی اور اسی نتیجہ پر پہنچا۔ اس لئے میرا ذاتی خیال ہے کہ مجھ کو ضرور گرفتار ہونا چاہئے۔ "

ان الفاظ کو ادا کرتے وقت اس کے چہرہ کی رنگت عجیب تھی۔ اس کے زرد پتلے ہونٹ اور بھی زیادہ زرد اور پتلے ہو گئے تھے۔ اور اس کی آنکھوں سے خون جھلک رہا تھا اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ وہ ہم لوگوں سے مذاق کر رہا تھا تاہم اس کے ظاہری انداز و وضع نے ہم لوگوں پر کافی اثر کیا۔

مس انڈر ڈاون نے معصومانہ انداز سے دریافت کیا۔

" لیکن کیا آپ کے کوئی زخم ہے؟ "

اس نے کہا۔ " یہی تو بات ہے۔ زخم ہی غائب ہے " سنجیدگی کے ساتھ اس نے آستین چڑھا لی لیکن ایک فوری خیال میرے دماغ میں آیا۔ میری نگاہیں مس انڈر ڈاون سے دوچار ہوئیں۔ اس نے اپنا بایاں بازو دکھایا تھا۔

میں خود ہی اس امر پر غور کرنے والا تھا۔ کہ اتنے میں ایک نیا واقعہ پیش آگیا۔ جس نے ہم لوگوں کا خیال اپنی طرف

مبدل کر لیا۔ لیڈی گرلینڈ۔ مس انڈرڈاؤن کی ہمسفر دوڑتی ہوئی سامنے آئی۔

وہ نہایت پریشانی کی حالت میں تھی۔ اس کے ہمسفر مسافر اس کے گرد جمع تھے۔ بڑی بار کوشش کرنے کے بعد وہ اتنا کہہ سکی۔

”میرے جواہرات! میرے بیش بہا موتی! میرے قیمتی زیورات ہائے! وہ سب چوری ہو گئے!“

نہیں وہ سب چوری نہیں گئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں ہم لوگوں کو معلوم ہوا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات رونما تھی۔ وہ یہ کہ چور نے انتخاب سے کام لیا تھا

الماس کے نگوں، ناتراشیدہ لعل و یاقوت کے آویزوں ہاروں اور کڑوں میں سے اس نے سب سے وزنی چیزوں کو نہیں چرایا تھا۔ بلکہ سب سے نادر اور قیمتی جواہرات کو جو حقیقت میں نہایت قیمتی مگر سب سے کم جگہ لینے والے تھے۔ اُن کے خانے خالی پڑے تھے۔ ہم سب لوگوں نے جواہرات چوری جانے کے بعد اُن کو خالی پڑا ہوا دیکھا۔ اُن کی مثال اس وقت بعینہٖ اُس پھول کے مانند تھی جس کی بہترین پنکھڑیاں بیرحمی سے نوچ لی گئی ہوں۔

مزہ یہ کہ اس کام کی انجام دہی اس نے دن دہاڑے کی۔ جب خاتون گرلینڈ چاء نوشی میں مشغول تھی۔ وہ کمرہ میں داخل ہوا اور جواہرات کا بکس کھولکر باطمینان انتخاب کرکے چلتا بنا۔

ہم سب لوگوں نے یہی شور مچایا لیکن سرقہ کے معلوم ہو جانے پر سب کی یہی متفقہ رائے تھی کہ یہ کام آرسین لوپن کا تھا۔ اور درحقیقت یہ سرقہ اس کے معمول کے مطابق پُر اسرار واقعات کے زیر اثر نہایت منطقی طور پر عمل میں آیا تھا۔ کیونکہ ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ کل زیورات اور جواہرات وغیرہ کے بار کو پوشیدہ کرنا ایک اہم کام تھا۔ اس لئے اس نے چیدہ چیدہ موتیوں لعل و یاقوت وغیرہ کا انتخاب کرکے اپنی تکلیف میں کافی کمی کر لی تھی۔ کھانے کے وقت ایسا ہوا کہ روز اُن کے دونوں طرف ایک ایک کرسی خالی پڑی رہی۔ اور شام کے وقت ہم لوگوں کو اطلاع ملی کہ کپتان نے اس کو طلب کیا تھا

اُس کی گرفتاری سے جس کے بارے میں کسی کو ذرا بھی کلام نہ تھا۔ لوگوں کو حقیقی مسرت حاصل ہوئی۔ آخر ہم لوگوں نے خیال کیا کہ اب سب مسافر چین کی نیند سو سکتے ہیں۔ ہم لوگ کمرہ نشستگاہ میں پہیلیاں اور معمے بوجھتے رہے۔ خاصکر مس انڈرڈاون کی طرز گفتگو نہایت خوش کن اور مسرت آمیز تھی جس سے مجھے صاف طور پر واضح ہو گیا۔ کہ خواہ سٹروزاین کے رویہ نے اس کو پہلے متاثر کیا ہو۔ مگر اب وہ اسکا خیال نہیں کرتی۔ اس کے سحر آفرین حسن نے مجھے مکمل طور پر مسخر کر لیا رات کو جب چاند کی نزہت بخش ضیا باری تمام عالم کو بقعۂ نور بناتے ہوئے تھی میں نے اس کو اپنے جوش دل اور وارفتگی کی داستان عشق سُنا کر اپنے آپکو اس کا جان نثار والہ و شیدا

ظاہر کیا۔ دوسرے دن اس خبر نے کہ روزاتن کے خلاف جو الزامات عاید کئے گئے تھے۔ وہ ناکافی ثابت ہوتے اور وہ آزاد کر دیا گیا۔ عوام میں ایک عجیب کھلبلی اور سنسنی پھیلا دی۔

یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت ہی مالدار تاجر کا لڑکا تھا اُس نے کاغذات، جو بالکل صحیح حالت میں تھے پیش کئے علاوہ ازیں اُس کے بازو پر زخم کے نشان کا پتہ تک نہ تھا۔

"شاید بلکہ یقیناً!" روزاتن کے مخالفین نے چلّا کر کہا، "ولایت کا سارٹیفکیت!" اجی نہیں! توبہ کرو۔ آرسین لوپن اس قسم کے درجنوں پیش کر سکتا ہے۔ اب رہا زخم جس کا ذرا بھی نشان اُس کے بازو پر نہیں پایا جاتا۔ اُس نے اسکے نشانات بھی ضائع کر دئے ہونگے۔"

کسی نے کہا۔ یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ سرقہ کے وقت روزاتن ڈک پر تفریح میں مشغول تھا۔ اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ آرسین لوپن جیسی شخصیت کے آدمی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ خود بھی ارتکاب جرم کے وقت موجود رہے۔ اور آخر کار تمام دیگر خیالات کے علاوہ ایک بات ایسی تھی جس پر وہمی سے وہمی آدمی کو بھی حرف گیری کا موقع نہ تھا۔ وہ کیا؛ بجز روزاتن کے اور کون شخص ایسا تھا۔ جو تنہا سفر کر رہا تھا جس کے بال سنہرے اور جس کا نام ر سے شروع ہوتا تھا، سوائے روزاتن کے اور کس کا حلیہ تلغراف کے بیان کردہ حلیہ کے مطابق تھا۔

اور جب روزاتن ناشتہ کے چند منٹ قبل نہایت آزادی سے ہمارے مجمع میں داخل ہوا۔ تو خاتون گرلینڈ اور مس انڈرڈاون خاموشی سے اُٹھ کر چلتی بنیں۔

ایک گھنٹہ بعد ایک قلمی نوشتہ جہاز کے ہر فرد ملاح، کپتان وغیرہ اور ہر درجہ کے مسافروں کو ملا۔ جس میں حسب ذیل اعلان شائع تھا:- "ایم لوئیس روزاتن اُس شخص کو جو آرسین لوپن کا یا گم شدہ جواہرات کے سارق کا پتہ بتائیگا دس ہزار فرانک انعام دینے کا اعلان کرتا ہے۔"

"اگر کوئی شخص اس بدمعاش کے خلاف میری مدد نہیں کریگا" روزاتن نے کپتان سے کہا "تو پھر میں خود اُس سے نپٹونگا۔"

روزاتن اور آرسین لوپن کے درمیان مقابلہ یا بھریہ بات تھوڑے عرصے کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ بذات خود آرسین لوپن اور آرسین لوپن کا مقابلہ تھا۔

دو دن تک برابر یہ سلسلہ جاری رہا۔ روزاتن اِدھر اُدھر داہنے بائیں ملاحوں سے گفتگو کرتا۔ لوگوں سے سوال کرتا ہوا۔ اور خفیہ طریق سے ہر شخص کی ٹن گن لگاتا ہوا دیکھا گیا۔ اُس کا سایہ شب کی خاموشی میں بھی اپنے شکار کی جستجو میں دیکھا گیا

اپنی جانب سے کپتان نے ہر ممکن بیدار مغزی، اور محنت و کوشش سے کام لیا۔ جہاز پر اوّل تا آخر چپہ چپہ ہر گوشہ اور مقام چھان ڈالا گیا۔ ہر نشست کے کمرہ کی بلا کسی تخصیص کے

تلاشی لی گئی۔ اور ہر اُس چیز اور جگہ کی جہاں ذرا بھی گم شدہ اشیاء کی پوشیدگی کا گمان ہو سکتا تھا۔ حتٰے کہ لیڈی گرلینڈ کے کمرہ کی بھی نہایت عرق ریزی اور احتیاط کے ساتھ دیکھ بھال کی گئی۔

مس اندرڈاون نے کہا۔ "یقیناً وہ لوگ کچھ نہ کچھ پا کے رہیں گے۔ خواہ وہ ساحر ہی کیوں نہ ہو مگر وہ جواہرات اور موتیوں کو فضا میں غائب نہیں کر سکتا"۔

مَیں نے جواب دیا۔ "بیشک اُن لوگوں کو کامیاب ہونا چاہیئے۔ ورنہ لوگ چلکر ہماری ٹوپیوں، کپڑوں اور اُن چیزوں کی جو ہر وقت ہمارے ساتھ وابستہ رہتی ہیں تلاشی لینا شروع کر دینگے" اور اس کو اپنی ۵ × ۴ انچ طویل و عریض نوٹو کا کوڈک کمرہ جس سے مَیں نے اُس کی ہر حالت اور صورت کی تصویر اُتاری تھی۔ دکھلاتے ہُوئے کہا۔ "کیوں! اتنے چھوٹے کیمرہ میں بھی خاتون گرلینڈ کے کل جواہرات پوشیدہ رکھے جا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ادھر آپ نے تصویر لینے کا بہانہ کیا اور وہاں کل تلاشی وغیرہ ہو چکی "

"تاہم مَیں نے لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ ہر سارق کچھ نہ کچھ نشانات ضرور چھوڑ جاتا ہے"۔

"لیکن ایک ایسا بھی ہے۔ جو کبھی کسی قسم کا نشان نہیں چھوڑتا یعنے آرسین لوپن"

"یہ کیوں؟"

"کیوں؟ اس لئے کہ وہ صرف اس جرم ہی کے بارے میں جس کا وہ ارتکاب کرتا ہے۔ تجاویز اور تدابیر نہیں سوچتا بلکہ اُن تمام نکتوں پر غور کرتا ہے۔ جو اس کے خلاف عمل میں لائے جا سکتے ہیں"۔

"پہلے تو آپ نہایت رازداری سے کام لے رہے تھے"۔

"آہ اُس وقت تک مَیں نے اُسکو کام کرتے نہیں دیکھا تھا"۔

"اچھا تو اس لئے آپ خیال کرتے ہیں کہ . . "

"مَیں خیال کرتا ہوں کہ ہم لوگ بیکار اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں"

سچّی بات تو یہ ہے کہ اس تمام تحقیقات اور تفتیش سے کچھ بھی امید افزا نتیجہ برآمد نہیں ہُوا۔ یا اگر کچھ نکلا تو وہ اس قابل نہ تھا کہ اس سے کچھ کامیابی کی امید ہوتی۔ اسی اثناء میں کپتان کی گھڑی بھی چوری گئی۔

اس واقعہ نے اور بھی آگ لگا دی۔ اس کے جوش میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اُس نے روزاَن کی جس سے وہ کئی بار مل چکا تھا۔ اور زیادہ سختی اور ہوشیاری سے نگہداشت شروع کر دی۔ دوسرے دن گھڑی ایک دوسرے افسر کے کالر میں پائی گئی یہ سبب نہایت تعجب خیز تھا۔ مگر اس سے ایک چور کی دسترس اور مہارت تامہ کا ثبوت ملتا تھا۔ بلکہ اگر یہ کہنا مبالغہ نہ ہو تو یقیناً اُس سے انتہائے کمال مترشح تھا۔ وہ اپنے پیشہ کو نہ صرف ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لئے کرتا تھا بلکہ دلچسپی کے لئے بھی اُس نے ایک ایسے ایکٹر کی طرح جو مذاقیہ حرکات

کرتے وقت نہایت شادماں و فرحاں رہتا ہے اور مضحکہ خیز گفتگو کے دوران میں خود دل ہی دل میں مزے لیتا ہے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ہاں وہ اپنے طریقوں میں ایک مسلم الثبوت اُستاد تھا۔ اور جب میں نے روزاتن کو بہت زیادہ سرگرم اور مصروف دیکھا اور اسکی وہ زخنہ حکمت عملی پر نظر ڈالی جو عجیب الخلقت آرسین لوپن کی خاص صفت تھی۔ تو میں بھی بلا اظہار تعجب باز نہ رہ سکا۔

امریکہ پہنچنے سے ایک روز قبل شب کو ڈیک کے محافظ نے تاریک ترین حصہ میں کسی کے کراہنے کی آواز سُنی۔ وہ آگے بڑھا۔ اس جگہ پہنچکر کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص عرشہ جہاز پر لیٹا ہُوا ہے۔ اس کا سر ایک سبز مفلر میں لپٹا ہُوا ہے۔ اور دونوں ہاتھ رسی سے بندھے ہیں۔ اُس نے اس کو آزاد کیا۔ اُٹھایا اور نخلخہ سُنگھایا۔ یہ شخص روزاتن تھا!

ہاں یہ روزاتن ہی تھا جو اپنی تفتیش کے دوران میں پابہ جولاں کر کے لُوٹ لیا گیا تھا ایک ملاقاتی کارڈ اس کے لباس میں معمولی پن سے اٹکا ہوا تھا جس پر یہ عبارت لکھی تھی آرسین لوپن دلی شکریہ کے ساتھ مسٹر روزاتن کے دس ہزار فرانک قبول کرتا ہے"۔ فی الواقعہ مسروقہ پاکٹ بک میں بیس ہزار فرانک کے نوٹ تھے۔ اب مزہ دیکھئے۔ کہ اس بدنصیب شخص پر خود ہی اپنے کو اس مصنوعی صورت میں ظاہر کرنیکا الزام لگایا گیا لیکن اس واقعہ کے باوجود کہ اس طریقہ سے خود ہی ہاتھ پیر باندھ لینا غیر ممکن ہے۔ یہ صاف ثابت ہو گیا تھا۔ کہ کارڈ کی تحریر روزاتن کے خط نوشت سے بالکل مختلف تھی۔ برخلاف اس کے یہ تحریر آرسین لوپن کے طرز خط سے جو جہاز میں ایک پرانے اخبار میں لکھا پایا گیا تھا بالکل مشابہ تھی۔ پس اب یہ امر طے شدہ تھا کہ روزاتن آرسین لوپن نہیں بلکہ روزاتن روزاتن ہی تھا۔ شہر بورڈیو کے ایک تاجر کا سرپرست خاصکر اس سنسنی خیز واقعہ سے آرسین لوپن کی موجودگی کا اب اور زیادہ وثوق کے ساتھ یقین ہو گیا۔

سب لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری ہو گئی۔ اب کوئی مسافر بلکہ تنہا نہ اپنے کمرے میں رہنے اور نہ جہاز کے کسی دُور کے حصہ میں تفریحاً جانے کی جرأت کرتا تھا۔ جن کو باہم ایک دوسرے پر یقین تھا وہ چولی دامن کی طرح ہر وقت ساتھ رہتے۔ اور بایں ہمہ ایک قسم کی طبعی بدگمانی جتنے کہ اپنے بہترین شناساؤں کی طرف سے بھی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خطرہ کسی ایک شخص کی طرف سے نہیں تھا۔ بلکہ سب کی نظریں ہر ایک فرد پر لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے خطرہ نسبتاً زیادہ ہو گیا تھا۔ اب ہر شخص آرسین لوپن معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے غیر معمولی پریشان کن خیالات نے اس محیر العقول ہستی کو ہماری نظروں میں فوق الفطرت ہستی بنا دیا۔ ہم نے سمجھ لیا۔ کہ وہ ہر قسم کے بھروپ بدلنے پر قادر ہے۔ خواہ میجر راسن ہو یا مارکوئیس ڈی راور ڈان، یا اور کوئی شخص۔ بہرحال لاسلکی پیغام کے مطابق یہ ضروری نہیں رہا کہ اس کے نام کا پہلا حرف "ر" ہی ہو، اور وہ تنہا سفر کر رہا ہو۔ بلکہ اب ہمارا ہر شناسا آرسین لوپن تھا

یہانتک کہ وہ لوگ بھی جو مع اپنے اہل و عیال اور ملازمین کے سفر کر رہے تھے متفکر نظروں سے دیکھے جانے لگے۔

لاسلکی پیام نے ہم لوگوں کو کوئی مزید خبر نہیں دی۔ یا کم از کم کپتان نے اس کو ہم لوگوں تک نہیں پہنچایا یا اس خاموشی سے ہم لوگوں کی کچھ بھی تسکین نہیں ہوئی۔

بلحاظ واقعات یہ زیادہ تعجب خیز نہ تھا کہ گزشتہ دن سے لوگ نہایت درجہ پریشان اور خائف تھے۔ مسافروں کو ہر وقت کسی نئے ارتکاب جرم کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ اور اُن کا خیال تھا کہ اس مرتبہ صرف سرقہ کی واردات یا زدوکوب کا ارتکاب نہ ہوگا۔ بلکہ ایک سنگین جرم قتل وقوع میں آئے گا۔ کوئی بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ آرسین لوپن صرف ان دو معمولی واقعات پر قانع رہیگا۔ وہ جہاز کا مطلق العنان مالک تھا۔ اُسنے جہاز کے افسروں کو کٹھ پتلی بنا رکھا تھا۔ اس کو صرف اتنی ضرورت تھی۔ کہ وہ اپنی خواہش کا اظہار کرے بس جو کچھ وہ چاہتا تھا اپنی حسب خواہش کر سکتا تھا ہمارا جان و مال سب اسی کے قبضہ میں تھا۔

اس کا میں خود اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے لئے یہ گھڑیاں نہایت خوش کن اور فرحت بخش تھیں۔ کیونکہ خاتون نیلی انڈرڈاون کا مجھ پر اعتماد کرنا ہر شخص کے مرعوب کرنے کو کافی تھا۔ اوّل تو عورتوں کا فطرتاً بزدل ہونا۔ دوسرے ان واقعات کا اثر۔ وہ ڈر کر میرے پہلو میں پناہ لینے کے لئے آتی۔ اور میں اس کے لئے ہزار جان سے آمادہ و تیار تھا۔

میں دل و جان سے آرسین لوپن کو دعائیں دے رہا تھا۔ کیا اس کا موجب اس کی ذات نہ تھی۔ جس نے ہم کو یوں یکجا اور شیر و شکر کر دیا؟ کیا یہ اُس کی عنایات کا نتیجہ نہ تھا کہ میں نے اُن امید افزا خیالات کا مزہ حاصل کیا؟ کیسے خیالات محبت کے نغمہائے دلفریب اور اُن کا لطف بلکہ اس سے بھی زیادہ دلآویز میں معترف ہوں۔ خاندان ڈی اینڈریزیز شریف یو آون نسل سے ہے۔ لیکن اس کی شرافت حسبی و نسبی کے شہرے کم ہو چکے تھے۔ اور ایک معزز خاتون سے یہ بات چنداں بعید نہ تھی۔ کہ وہ ایک گمنام خاندان کے فرد سے رشتہ جوڑنا بے غیرتی سمجھے۔

نہ میں اس کا قائل تھا کہ یہ خیالات نیلی کو برافروختہ کرتے ہیں اس کی مخمور انکھڑیوں نے مجھے اجازت دے رکھی تھی۔ کہ میں اس کی پرستش کروں۔ اس کے نغمہائے شیریں میرے دل میں امید و بیم کے دریا موجزن کرتے تھے۔

ہم آخری لمحہ تک اپنی کہنیاں آہنی جنگلوں پر رکھے ہوئے پہلو بہ پہلو ایک ساتھ کھڑے رہے۔ یہانتک کہ امریکہ کا ساحل صاف نظر آنے لگا۔ تفتیش ختم ہو چکی تھی۔ ہر شخص محوِ انتظار نظر آرہا تھا۔ درجہ اوّل سے لیکر تیسرے درجہ تک کے مسافروں میں سے ہر شخص اس وقت کا نہایت بے چینی سے منتظر تھا۔ جبکہ جلد تر یہ عقدہ لاینحل کھلے۔

آرسین لوپن کون تھا، وہ کس نام سے ملقب اور کس قسم کی پوشاک میں ملبوس سفر کر رہا تھا؟

انکشاف کی گھڑی آن پہنچی۔ اگر میں سو سال بھی زندہ رہوں تب بھی اس واقعہ کی معمولی سی معمولی بات بھی لوحِ دل سے محو نہیں ہو سکتی۔

"نیلی تمہارا چہرہ کیسا زرد معلوم ہوتا ہے!" وہ نیم غشی کی حالت میں میرے بازو پر جھکی ہوئی تھی۔

"اور آپ بھی تو اوہو آپ کی بھی صورت کیسی تبدیل ہو گئی ہے؟" اس نے جواب دیا۔

"خیال کیجئے! یہ کیسا پرجوش اور نازک وقت ہے۔ مگر میں آپ کے پہلو بہ پہلو اس کے گزارنے میں بےحد خوش ہوں۔ نیلی مجھے تعجب ہے۔ کہ تمہارا دماغ کسی وقت بھی "

"بدحواسی و سراسیمگی کے زیر اثر وہ ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی۔ جہاز لنگر انداز ہو گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سے اترنے کی اجازت پاتیں بہت سے لوگ محکمہ چنگی کے حکام باوردی افسر چھٹی رساں وغیرہ جہاز پر آموجود ہوئے۔

نیلی نے کہا:۔

"اب اگر یہ سننے میں آتے۔ کہ آرسین لوپن اس عرصہ میں بچ نکلا۔ تو مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہو گی۔

"اس نے بےعزتی پر موت کو ترجیح دی ہو گی۔ اور گرفتاری سے یہ بہتر سمجھا ہو گا کہ بحر اوقیانوس میں کود کر جان دیدے!"

"دیکھئے مذاق نہ کیجئے" اس نے آزردہ ہو کر کہا۔

یکبارگی میں اچھل پڑا۔ اور اس کے جواب میں کہا۔

"کیا آپ اس چھوٹے قد والے ضعیف انسان کو تختۂ پل پر کھڑا دیکھ رہی ہیں؟"

"ہاں ہاں! اس سبز ڈراک کوٹ والے کو جو چھاتہ لگائے کھڑا ہے؟"

"ہاں وہی، یہی گینمارڈ ہے۔"

"گینمارڈ؟"

"ہاں وہ مشہور سراغرساں جس نے عہد کیا ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں آرسین لوپن کو گرفتار کریگا۔ اوہو اب میں سمجھا کہ ہم لوگوں کو سمندر کے اس ساحل سے کوئی خبر کیوں نہیں پہنچی۔ گینمارڈ یہاں موجود تھا۔ اور وہ اپنے معاملات میں کسی دوسرے شخص کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔"

"تو پھر آرسین لوپن کا گرفتار ہونا یقینی ہے؟"

"یہ کون کہہ سکتا ہے؟ میرا یقین ہے کہ گینمارڈ نے اس کو بجز مختلف صورتوں اور نقلی بھیسوں کے کبھی نہیں دیکھا۔ بغیر اس کے دریافت کئے ہوتے کہ وہ کس نام سے سفر کر رہا ہے یہ ...."

اس نے نسوانی شوق و استعجاب کے زیر اثر کہا۔ "اوہ"

"میں اس کی گرفتاری دیکھنے کی بیحد مشتاق ہوں!"

میں نے جواب دیا۔ "ملاحظہ کیجئے" اس میں کوئی کلام نہیں کہ آرسین لوپن اپنے دشمن کی موجودگی معلوم کرچکا تھا۔ وہ سب سے آخر میں تھا۔ جب اس بڈھے خرانٹ کی آنکھیں تھک چکی ہونگی یہاں سے کھسکیگا

مسافر تختوں پر سے گزرنے لگے گینمارڈ دوسری جانب رخ کئے اپنے چھاتے پر جھکا ہوا کچھ ایسے انداز سے کھڑا تھا گویا وہ ان گزرنے والے مسافروں کے دو طرفہ جھنڈ سے کچھ سروکار ہی نہیں رکھتا۔ میں نے دیکھا کہ جہاز کے افسروں میں سے ایک اس کے عقب میں کھڑا وقتاً فوقتاً اس سے سرگوشی کرتا جاتا تھا۔

جب مارکوئیس ڈی راور ڈان، میجر راسن، ریوالٹا، اطالوی اور بہت سے دیگر اشخاص گزر چکے، تو میں نے روزاتن کو آگے بڑھتے دیکھا۔

غریب روزاتن نے ابھی تک اس سفر کی آفات ناگہانی کو فراموش نہیں کیا تھا۔

"بہت ممکن ہے آرسین لوپن یہی ہو" نیلی نے کہا "آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں خیال کرتا ہوں کہ گینمارڈ اور روزاتن کی شکلیں ایک ہی تصویر میں موجود ہونا بہت ہی دلچسپی کا باعث ہونگی۔ کیا آپ کیمرہ لینے کی زحمت گوارا فرمائینگی؟

میں نے کیمرہ اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ لیکن اس کے استعمال کئے جانے کے وقت سے کہیں بعد روزاتن انکے پاس سے گزرا۔ افسر نے آہستہ سے کچھ گینمارڈ کے کان میں کہا۔ گینمارڈ نے شانوں کو حرکت دی اور روزاتن بھی آگے بڑھ گیا۔

اُف، خدایا! پھر آرسین لوپن کون تھا۔

"ہاں" نیلی نے باواز بلند کہا "آخر وہ کون ہے!"

اب کل بیس اشخاص رہ گئے تھے نیلی نے فرداً فرداً ہر شخص پر متجسسانہ اور پریشان کن نظر ڈالی۔ کیونکہ "وہ" ان بیس میں سے کوئی بھی نہ تھا۔

میں نے اس سے کہا

"ہم اور زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔"

وہ آگے بڑھی میں اس کے پیچھے ہولیا۔ لیکن ہم دس قدم بھی نہ چلے تھے کہ گینمارڈ ہمارے راستہ میں حائل ہوگیا۔

میں نے چلاّ کر کہا۔ "یہ کیا بات ہے؟"

"جناب ذرا ایک لمحہ ٹھہرئیے۔ آپ کو اسقدر عجلت ہی کیا ہے؟"

"میں اس دوشیزہ خاتون کا محافظ ہوں۔"

اس نے دوبارہ اور زیادہ تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ "بس ایک لمحہ"

اس نے انتہائی غور سے مجھے از سرتاپا دیکھا اور پھر

نگاہیں دوچار کرتے ہوئے کہا۔

"آرسین لوپن، میرا خیال ہے؟"

میں نے قہقہہ لگایا

"نہیں جناب، میں بیچارہ تو برنارڈ ڈی اینڈریزی ہوں"

"خوب، آج تین سال ہوتے ہیں کہ برنارڈ ڈی اینڈریزی مقدونیہ میں مرچکا۔"

"اگر برنارڈ ڈی اینڈریزی مرچکا ہوتا تو میں یہاں کیسے موجود ہوسکتا تھا۔ لہٰذا وہ مرا نہیں۔ یہ لیجئے میرے کاغذات موجود ہیں۔"

"یہ سب اسی کے کاغذات ہیں۔ اور میں نہایت خندہ پیشانی سے جناب کو بتاؤنگا کہ یہ کیسے آپ کے قبضہ میں آئے۔"

"لیکن آپ پاگل ہوگئے۔ آرسین لوپن تو اپنا سفر حرف ر سے شروع ہونے والے نام سے کر رہا ہے۔"

"جی ہاں! یہ بھی جناب ہی کی افترا پردازیوں کی ایک نئی جدت ہے۔ کہ غلط افواہ مشہور کرکے لوگوں کو مغالطہ میں ڈال دیا۔ تم میں جوہر قابل ہے، لیکن اس مرتبہ تمہاری قسمت کا پانسہ پلٹا ہے۔ آؤ۔ لوگ جان تو لیں کہ ایکی مرتبہ برے پھنسے"

میں نے ایک سکنڈ پس وپیش کیا ہی تھا کہ اس نے ایک خاص ضرب میرے داہنے بازو پر لگائی۔ میں درد سے چیخ اٹھا۔ اس نے اسی غیر مندمل زخم پر جس کا ذکر تار میں کیا گیا تھا۔ یہ ضرب لگائی تھی۔

اب بجز اس کے احکام کی پابندی کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں انڈر ڈاؤن کی طرف مخاطب ہوا۔ اس کا چہرہ سفید ہوگیا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔ ہماری نگاہیں دوچار ہوئیں اور پھر اس کی نظر اس کیمرہ پر جو میں نے اس کو دیا تھا پڑی۔ اس نے ایک فوری حرکت کی اور میں اس کا خیال، اور وہ یقین جو اس کے دل میں جاگزیں ہوچکا تھا سمجھ گیا۔ ہاں یہی مقام تھا۔۔۔ ان تنگ تختوں کے درمیان جو سیاہ قیمتی چمڑے سے ڈھکے ہوئے کیمرہ کے اندر منڈھے ہوئے تھے۔ جس کے لئے میں نے پہلے ہی سے یہ احتیاط برتی تھی۔ کہ قبل اس کے گینمارڈ مجھ کو گرفتار کرے کیمرہ نیلی کو سونپ دوں۔ یہی وہ جگہ تھی کہ جہاں مسٹر روزائن کے بیس ہزار فرانک اور خاتون گرلینڈ کے بیش بہا موتی، اور جواہرات پوشیدہ تھے۔

میں حلفیہ کہتا ہوں کہ اس نازک وقت میں کہ گینمارڈ اور اس کے دو ہمراہی میرے گرد موجود تھے۔ مجھے کسی بات کی پروا نہ تھی۔ اپنی گرفتاری، اپنے ساتھیوں کی مخالفت اور اسی قسم کی دیگر باتوں کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ میں صرف یہ دیکھ رہا تھا۔ کہ نیلی انڈر ڈاؤن اس شے کے بارے میں جو میں نے اس کو دی ہے۔ کیا طرز عمل اختیار کرتی ہے۔

یہی ایک شے تھی جو میرے خلاف مکمل شہادت

پیش کرسکتی تھی۔ اب آیا نیلی اُس کو پیش کریگی یا نہیں؟ یہی خیال مجھے ستا رہا تھا۔

"کیا وہ میرے ساتھ بیوفائی کریگی؟ کیا وہ مجھ کو برباد کریگی؟ کیا وہ دشمن جان کی طرح عمل کریگی یا ایک ایسی خاتون کی طرح جس کی حقارت، نسوانی جذبات اور ہمدردی سے نمایاں احساسات کے زیر اثر رحمدلی میں تبدیل ہوجایا کرتی ہے؟"

وہ میرے سامنے سے گزری، میں بلا کسی گفتگو کے بہت جُھک کر آداب بجالایا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میرا کیمرہ ہاتھ میں لئے وہ تختوں کی طرف بڑھی۔ میں نے اپنے جی میں خیال کیا۔" وہ عوام میں اس کو لیکر جانے کی جرأت نہ کرے گی وہ ابھی ایک گھنٹہ بعد مجھ کو دیدیگی:"

لیکن تختوں کے درمیانی حصہ پر پہنچکر اس نے بظاہر بے توجہانہ انداز سے کیمرہ کو جہاز اور خشکی کے درمیان پانی میں پھینک دیا۔ اس کے بعد میں اس کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا اس کی دلفریب صورت مجمع میں غائب ہوگئی۔ ایکبار پھر نظر پڑی اور دوبارہ چھپ گئی۔ یہ کل باتیں میرے لئے نہایت مفید تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے میں نہایت غمگین اور ملول بُت بنا تختہ جہاز پر کھڑا رہا۔ مگر اس وقت بھی دل میں طرح طرح کا جوش اور اضطراب پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے بعد گینمارڈ کو انتہائی حیرت میں مبتلا کرتے ہوئے میں نے ایک آہ سرد بھری اور کہا۔

"حضرت معاف کیجئے۔ اینجانب ہی شریف چور آرسین لوپن ہیں۔"

یہ الفاظ تھے جن میں آرسین لوپن نے اپنی داستان گرفتاری موسم سرما کی ایک رات کو میرے روبرو بیان کی۔ اتفاقات زمانہ اور پے در پے واقعات نے جنہیں میں اپنے افسانہ ابتدائی زندگی میں بیان کرچکا ہوں۔ ہمارے درمیان ایک رشتہ جسے میں دوستی کے نام سے یاد کرتا ہوں۔ قائم کر دیا ہے۔ ہاں! مجھے اس امر پر فخر ہے۔ کہ آرسین لوپن میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرکے میری عزت افزائی کرتا ہے۔ اور یہ صرف اسی دوستی کا نتیجہ ہے۔ کہ وہ اکثر اوقات بلا کسی اطلاع کے میرے پُرسکون خاموش مطالعہ میں اپنی نوجوانی کی اُمنگوں، اپنی پُرشوق زندگی کی تابناکی۔ اپنی عقل رسا کے کارناموں سے تنوع پیدا کردیتا ہے۔ کیونکہ اُسنے آجتک تقدیر کے ہاتھوں شکست پانے کی ذلت حاصل نہیں کی۔ ہمیشہ فتح و کامرانی اُسکے شامل حال رہی

اس کا حلیہ؟ بھلا میں کیسے اس کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں؟ میں نے آرسین لوپن کو بیسیوں بار دیکھا ہے۔ اور ہر بار ایک نئی انسانی شخصیت میرے روبرو موجود ہوتی۔ یا یوں کہئے کہ وہی ہستی مختلف شکلوں میں اور ہر بار نئی جدت کے ساتھ ہر بار چہرہ کی نرالی شکل، اپنے خاص انداز، اطوار اور اوصاف

کے ساتھ۔

اس نے ایک بار مجھ سے کہا۔ "خود مجھے یہ معلوم نہیں کہ میری اصلی شکل کیا ہے۔ میں آئینہ میں دیکھ کر خود اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا۔"

بس ایک خیالی نقشہ ہے۔ تاہم ان لوگوں کے لئے بجنسہ صحیح جو اُس سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اور ان کے لئے بھی جو اس کے غیر محدود ذرائع، اُس کے صبر آزما کارناموں اُس کی محیر العقول تبدیلیوں حتیٰ کہ چہرے کے عجیب رد و بدل اور اُس کی ظاہری صورت سے واقف ہیں۔

اس نے دریافت کیا۔ "کیا میں صرف ایک ہی طرح کی مقررہ صورت اختیار کر لوں؟ میں اُن خطرات کو جو ایک شخصیت پر ہمیشہ کے لئے وابستہ ہوتے ہیں نظر انداز کر دوں؟ یہ سمجھ لیجیے۔ کہ میرے افعال ہی میری شکل و صورت ہیں۔"

بعد ازاں اُس نے فخریہ طور پر ان الفاظ کا اضافہ کیا۔

"یہ بہت ہی بہتر ہے کہ لوگ کبھی یہ کہنے کے قابل نہ ہوں کہ" وہ آرسین لوپن جا رہا ہے" اس سے زیادہ دلچسپ یہ ہے کہ وہ بلا شک و شبہہ یہ چیخ اٹھیں کہ" یہ کام آرسین لوپن کے سوا کسی کا نہیں۔"

سلیم نیہدوردی

محسوساتِ جلیل

وہ فرطِ بیکسی ہے کہ اب کیا کہیں جسے
اتنا نہیں ہے کوئی کہ اپنا کہیں جسے

پانے لگا ہے لطفِ خلشہائے تیجی
وہ دل کہ حیات کی دنیا کہیں جسے

ہر پردہ حجاب میں اے حسن بے نقاب
دیکھا ہے یوں تجھے کہ نہ دیکھا کہیں جسے

پھر جوش پر ہے سینۂ محزوں میں آج کل
اک شوق موجِ لب دریا کہیں جسے

اب آرزو ہے دل کو کہ پھر وہ نگاہِ ناز
... دے کہ غم کا مداوا کہیں جسے

اکثر ہوا ہے رفعتِ پرواز میں جلیل
طے کر گیا ہوں اوجِ ثریا کہیں جسے

جلیل قدوائی

ایک تصویر کو دیکھ کر

ورق ہے یہ آئینہ دار لطافت غضب ہیں یہ نقش و نگار لطافت
کمال نزاکت ۔ بہار لطافت رواں ہے کوئی آبشار لطافت
فزوں جنون محبت سے رنگیں
مصور کے خون محبت سے رنگیں

وہ نقشہ کہ چشم تماشا پریشاں وہ صورت کہ سو تنگیٔ حسن حیراں
جمال پرستاں بہار گلستاں سراپا یہ تصویر ہے صبح خنداں
جوانی بھی ایسی کہ فانی نہیں ہے
قیامت ہے برپا جوانی نہیں ہے

ستارے ہیں افشاں کے لوح جبیں پر اُتر آئی رونق فلک کی زمیں پر
عیاں ہیں شکن گیسوئے عنبریں پر ہے کیا نظر اس رخ آتشیں پر
گلابی لبوں پر ضیائے تبسّم
جنوں خیز ہے یہ ادائے تبسّم

یہ کافر نگاہیں یہ بیہوش آنکھیں شراب تخیل سے مدہوش آنکھیں
غرور مسرت سے بیہوش آنکھیں ازل تک رہینگی وفا کوش آنکھیں
فنا کے تصور سے آزاد ہے تُو
محبّت کی بستی میں آباد ہے تُو

یہ ہنگامہ عاشقی کے زمانے اِدھر سے تقاضے اُدھر سے بہانے
وفا کے تماشے جنوں کے ترانے زبانوں پہ رہ جائینگے بس فسانے
مگر تیری آنکھوں کی مستی رہیگی
شراب محبّت برستی رہے گی

عابد

جانِ آرزو

پھر برقِ شعلہ ریز کو جنبش ہے چرخ پر — رقصاں ہے پھر یہ شعلۂ عریانِ آرزو
پھر ماہتاب بامِ فلک پر ہے جلوہ ریز — پھر ضوفشاں ہے شمعِ شبستانِ آرزو
پھر باصرہ نواز ستارے چمک اُٹھے — پھر شعلہ زا ہے سوزشِ پنہانِ آرزو
پھر یاد آگیا کوئی محفل فروزِ حسن — پھر بڑھ رہی ہے رونقِ ایوانِ آرزو
پھر بڑھ گئیں کسی کے تصور کی شوخیاں — پھر تازہ کشمکش میں پھنسی جانِ آرزو
رُخصت ہوئی مناظرِ لطف آفریں کی سیر — اب مَیں ہوں اور کاوشِ پنہانِ آرزو

جمعیتِ نشاط کا ساماں کہاں نصیب
اِک دِل ہے اب سو وہ بھی پریشانِ آرزو

فرحت

نوائے راز

گرمیِ چشمِ شوق سے آج کمال ہوگیا — رنگِ جمال بڑھ گیا، بڑھ کے جلال ہوگیا
دِل سے تھی ایک دل لگی عالمِ عقل و ہوش میں — آہ! جنونِ عشق میں وہ بھی وبال ہوگیا
حسن ہُوا ضیا فگن میرے دِل و دماغ پر — میرا ہر اک خیال خود اپنی مثال ہوگیا
چشمِ حقیقت آشنا کھُل گئی انفعال سے — آئینہ میرے قلب پر ماضی و حال ہوگیا

کرتے ہیں غیر ہمدمی دیکھ کے میری خستگی
آہ! فراقِ یار میں رازؔ یہ حال ہوگیا!!

رازؔ

روداد محبت

مصنفہ ٹالسٹائی — حصہ دوم — مترجمہ راز چاندپوری

تیسرا باب

اس وقت سے ہماری طرز زندگی اور ہمارے تعلقات بالکل بدل گئے۔ مثل سابق اب ہمارا آپس میں خلوت نشین ہونا خوشگوار نہ رہا۔ بدگمانیاں پیدا ہوتیں اور ہم ان کو نظرانداز کر دیتے۔ اب بہ نسبت اس کے کہ ہم دونوں تنہا بیٹھ کر گفتگو کریں یہ اچھا معلوم ہوتا تھا کہ کسی تیسرے شخص کی موجودگی میں ہم کلام ہوں

جب دیہاتی زندگی یا محفل رقص کا ذکر چھڑ جاتا تو ہم کو محسوس ہوتا کہ ہم خطرناک موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں اور ہم ایک دوسرے کی طرف نظر نہ کرتے۔

ہم دونوں کو معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اختلاف کی یہی وجہ ہے اور ہم اس سے بچنے کی کوشش کرتے

مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ مغرور اور مغلوب الغضب ہے اور میرے لئے لازمی ہے۔ کہ میں اس کو ناخوش ہونے کا موقع نہ دوں۔ اس کو سمجھایا گیا تھا کہ میں بغیر سوسائٹی کے نہیں رہ سکتی۔ اور دیہاتی زندگی میری حالت کے مناسب نہیں ہے۔ اور یہ لازمی تھا کہ اس ناگوار صحبت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ہم دونوں نے کبھی ان معاملات پر دو بدو گفتگوئیں کیں اور ایک دوسرے کے خیالات کا غلط اندازہ کیا۔

مدت سے ہم نے ایک دوسرے کو دنیا کی بہترین ہستی سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ ہم دوسروں سے اپنا مقابلہ کرتے اور ایک دوسرے کے متعلق جو کچھ رائے قائم کرتے اس کو پوشیدہ رکھتے۔

پیٹرسبرگ سے روانہ ہونے سے پہلے میری طبیعت خراب ہو گئی اور دیہات واپس جانے کے بجائے ہم نے شہر کے نزدیک موسم گرما میں رہنے کے قابل جگہ حاصل کر لی اور میرا شوہر اپنی والدہ سے ملنے کے لئے تنہا چلا گیا۔ جب وہ جانے والا تھا تو میں اس کے ساتھ جانے کیلئے کافی طور پر صحتیاب ہو چکی تھی لیکن اس نے اصرار کیا کہ تم کو یہیں پر قیام کرنا چاہئے۔ اور یہ عذر پیش کیا کہ اسکو میری تندرستی کی طرف سے خطرہ ہے۔ مجھ کو معلوم ہوا کہ دراصل اس کو میری صحت کی زیادہ پروا نہ تھی۔ بلکہ اس کو یہ خیال تھا کہ ہم دیہات میں جا کر خوش و خرم نہ رہ سکیں گے۔

میں نے اس کے ہمراہ جانے پر اصرار نہ کیا۔ اور وہیں ٹھہر گئی۔ اس کے بغیر ہر چیز بے لطف تھی۔ مگر جب وہ واپس آ گیا، تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کے آنے سے میری زندگی میں کوئی تغیّر پیدا نہ ہوا جیسا پہلے ہوتا تھا۔ ہمارے وہ اگلے تعلقات، جبکہ ہر خیال جس سے اس کا تعلق نہ ہوتا تھا ایک گناہ معلوم ہوتا تھا۔ اور جبکہ اس کے ہر کام اور ہر لفظ میں مجھے کمال معلوم ہوتا تھا۔ اور اس حالتِ مسرت میں ایک دوسرے سے نظر ملا کر ہم ذرا ذرا سی بات پر مسرور ہو جاتے تھے۔ اب غیر محسوس طریقہ پر تبدیل ہو گئے تھے اور ہم نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ زمانہ کہاں چلا گیا تھا۔

ہم دونوں میں سے ہر ایک کی دلچسپیاں اور مشاغل جداگانہ تھے جن میں ہم دونوں ایک دوسرے کے شریک نہ ہوتے تھے اور نیز اب یہ خیال بھی تکلیف دہ نہ رہا تھا کہ ہم دونوں اپنے اپنے جداگانہ عالم میں رہتے ہیں۔ جس سے دوسرے کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ خیال راسخ ہوتا گیا۔ اور ایک سال کے بعد جب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے تو ہماری آنکھوں میں مسرت کی جھلک نہ پیدا ہوتی تھی۔

اس کی وہ طفلانہ شوخیاں جن میں ہم دونوں شریک رہتے تھے۔ اب بالکل جاتی رہی تھیں۔ اس کی کمزوریاں جو میرے اندر حقارت آمیز جذبات پیدا کر دیا کرتی تھیں اور ہر چیز سے بے تعلقی اب مفقود ہو چکی تھی۔ اس کی وہ پُر معنی نظر جو پہلے مجھے پریشان کر کے مسرور بنا دیا کرتی تھی۔ اب باقی نہ رہی تھی۔ اب ہم نمازیں یا باہمی خوشی میں ایک دوسرے کے شریکِ حال نہ ہوتے تھے۔ اور دراصل اب ہم ایک دوسرے سے بہت کم ملتے تھے۔ وہ متواتر باہر سفر میں رہنے لگا۔ اور مجھے تنہا چھوڑ کر جانا اس کے لئے شاق نہ تھا۔ میں برابر سوسائٹی میں شریک ہوتی تھی۔ اور وہاں مجھے اس کی موجودگی کی ضرورت نہ تھی۔

اب ہم آپس میں مکالمہ و مباحثہ نہ کرتے تھے۔ میں اس کی ضرورت بہم پہنچانے کی کوشش کرتی تھی۔ اور وہ میری تمام ضروریات کو پورا کر دیتا تھا اور بظاہر ابھی تک ہم ایک دوسرے سے محبّت کا برتاؤ کرتے تھے۔

اگرچہ ہمیں ایک جگہ بیٹھنے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا لیکن جب کبھی ہم ایک جگہ بیٹھتے تھے تو مجھے اپنی تنہائی کے مقابلہ میں کسی قسم کی خاص مسرت یا جوش یا پریشانی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ میں اچھی طرح سمجھتی تھی کہ میرا شوہر کوئی اجنبی شخص نہیں ہے۔ بلکہ وہ میرا شوہر ہے۔ اور ایک لائق شخص ہے جس سے میں اس طرح واقف ہوں جس طرح خود اپنی ذات سے۔

مجھے اس سے بجز اس کے کہ وہ میرا شوہر ہے اور

سی قسم کی امید نہ تھی۔ مجھے معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرا یہ خیال بہت درست ہے۔ نیز یہ کہ ہمارے درمیان گویا کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا اور نہ آئندہ ہو سکتا تھا۔

جب وہ باہر جاتا تھا اور خصوصاً جب پہلی بار وہ مجھ سے جدا ہوا تو تنہائی کی وجہ سے مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ اور جب اس کا سہارا جاتا رہتا تو مجھے حقیقت حال معلوم ہوتی۔ حالانکہ میں ابھی تک اس کو نہ سمجھ سکی تھی۔ جب وہ واپس آتا تو میں ایک حالت مسرت میں اپنے آپ کو اس کی آغوش محبت کے سپرد کر دیتی۔ مگر دو گھنٹے کے اندر ہی یہ جوش مسرت سرد پڑ جاتا اور میرا دماغ سکون پذیر ہو جاتا۔ اور اس سے کہنے کے لئے میرے دل میں کوئی بات باقی نہ رہتی۔

محبت کے ان خاموش لمحوں میں جن سے ہم کبھی کبھی لطف اندوز ہوتے تھے مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ جس کی وجہ سے میرے دل میں ایک درد سا اٹھتا ہے۔ اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نگاہوں سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ محبت محدود ہے جس سے زیادہ وہ کچھ نہیں چاہتا اور جس کے لئے مجھ میں کافی قوت موجود ہے۔ بعض اوقات مجھے ایک قسم کا ملال ہوتا۔ مگر میں کبھی اس کے اسباب پر غور کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرتی۔ اور میں ان تمام دلچسپیوں میں جو میرے احاطۂ قدرت میں تھیں مصروف رہ کر اس مبہم افسردگی کو اپنے دل سے دور کرنے کی کوشش کرتی۔

سوسائٹی کی زندگی نے جس کی نمائش سے پہلے ہی دن میں مغلوب ہو گئی تھی۔ اور جس کی چاپلوسی کی طاقت نے میری خودداری کو شکست کر دیا تھا۔ بہت جلد میرے خیالات پر پورا قبضہ کر لیا تھا۔ وہ میری فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے دام میں گرفتار کر لیا تھا اور میرے تمام نیک خیالات پر غاصبانہ قبضہ جما لیا تھا۔

میں کبھی تنہا نہ رہتی تھی اور اپنی حالت کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ڈرتی تھی صبح سے شام اور رات گئے تک میں ادھر ادھر صحبتوں میں اپنا وقت گزارتی تھی۔ اور جب کبھی مجھے باہر جانے کا اتفاق نہ ہوتا تھا تو کسی نہ کسی شغل میں ضرور مصروف رہتی تھی۔ میں نہ تو خوش و خرم تھی نہ افسردہ و رنجیدہ بلکہ میں جانتی تھی کہ میری حالت ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہ ہو گی۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ اور ہمارے تعلقات بدستور قائم رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب چیزوں پر سکوت و جمود طاری ہے۔ اور ان میں کوئی تبدیلی قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ نہ وہ ترقی کر سکتی ہیں نہ تنزل پذیر ہو سکتی ہیں۔

ہماری اس سہ سالہ ازدواجی زندگی میں دو خاص واقعات پیش آئے لیکن ان میں سے کسی نے بھی میری حالت میں کوئی تغیر نہ پیدا کیا۔

پہلا واقعہ میرے پہلے بچّے کی پیدائش تھا اور دوسرا تاثیانہ کی موت۔ اوّل اوّل ماں ہونے کے احساس نے مجھ پر اسقدر غلبہ پایا اور میرا دل ایسی غیر معمولی لذّت سے لبریز ہو گیا۔ کہ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اب میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ مگر دو ماہ کے بعد جب میں پھر گھر سے باہر نکلنے کے قابل ہو گئی تو یہ جوش دان بدن سرد پڑتا گیا۔ اور عادت و فرائض کی بے کیف بجا آوری میں تبدیل ہو گیا اس کے برخلاف میرے پہلے لڑکے کی پیدائش کے وقت سے میرا شوہر پرانی طرز زندگی پر پھر کاربند ہو گیا اور اطمینان و سکون کے ساتھ گھر رہنے لگا اُس نے اپنی تمام محبت و مسرت اس بچّے کے لئے وقف کر دی۔

جب مَیں کسی محفل رقص میں شریک ہونے کی غرض سے نیا لباس پہنتی اور اپنے جگر پارے کے اوپر صلیب کا نشان بنانے کے لئے دایہ خانہ میں جاتی۔ تو اکثر اپنے شوہر کو وہاں موجود پاتی۔ وہ ملامت آمیز تیز نظر میرے چہرہ پر جما دیتا اور میرا ضمیر مجھ کو ملامت کرنے لگتا۔ مَیں اپنے نورِ نظر کے ساتھ اپنی بے اعتنائی پر افسوس کرتی اور اپنے دل میں کہتی "کیا یہ ممکن ہے کہ مَیں اور عورتوں سے زیادہ بُری ہوں؟" پھر مَیں اپنے دل سے پوچھتی "لیکن مَیں کیا کر سکتی ہوں؛ مجھے اپنے بچّے سے محبت ہے۔ مگر مَیں اپنا تمام وقت اس کے لئے صرف نہیں کر سکتی، اس طرح تو مَیں چند ہی روز میں اکتا جاؤں گی۔ اور کچھ بھی ہو میں تو تماشا کو پسند کرتی ہوں"

اس کی والدہ کی رحلت اس کے لئے ایک جانکاہ صدمہ تھی۔ اور جیسا کہ وہ کہا کرتا تھا بغیر اپنی ماں کے نکولسکوئی میں رہنا اس کے لئے بہت دشوار تھا۔ لیکن اگرچہ مَیں بھی اس کی مفارقت سے رنجیدہ تھی۔ اور اپنے شوہر سے ہمدردی رکھتی تھی۔ تاہم اب دیہات میں مجھے پہلے سے زیادہ مسرت اور راحت حاصل تھی۔

اس تین سال کے عرصہ میں ہم زیادہ تر شہر میں رہے اور ایک موسم گرما میں صرف دو ماہ دیہات میں بسر کئے اور تیسرے سال ہم باہر چلے گئے۔

ہم نے موسم گرما ساحلی مقامات میں گزارا۔

اس وقت میری عمر اکیس سال کی تھی۔ مَیں سمجھتی ہوں کہ اس وقت ہماری مالی حالت بہت اچھی تھی۔ مَیں خانگی زندگی میں اس چیز سے زیادہ جو مجھے پہلے حاصل ہو چکی تھی کسی اور شے کے حاصل کرنے کی آرزومند نہ تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ہر وہ شخص جس کو مَیں جانتی ہوں مجھ سے محبت رکھتا ہے۔ میری صحت بہت اچھی تھی۔ ساحلی مقامات میں میرا لباس سب سے بہتر ہوتا تھا اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ مَیں حسین ہوں موسم خوشگوار تھا' ایک عجیب دلکش و لطیف منظر میرے اردگرد تھا اور مَیں بہت ہی مسرور تھی۔

مَیں اسی طرح خوش و خرم تھی جیسی نکولسکوئی میں رہا کرتی

تھی۔ اور جب مجھے اس امر کا احساس ہوا کرتا تھا کہ میں مسرور ہوں اور اس لئے مسرور ہوں کہ اس کی مستحق بھی ہوں۔ اس وقت میری مسرت غیر محدود ہوتی اور اس میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی اور مجھے اور زیادہ خوشی حاصل کرنے کی خواہش رہتی تھی۔

اس کے بعد میری حالت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ مگر اس موسم گرما میں بھی ہر چیز خوشگوار تھی میرے دل میں کوئی آرزو اور تمنا نہ تھی۔ اور مجھے کسی بات کا خوف نہ تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میری زندگی مکمل اور میرا قلب پرسکون ہے۔

ان تمام نوعمر اشخاص میں جو اس موقع پر موجود تھے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کو میں کسی خاص قابلیت کے لحاظ سے منتخب کرتی یہاں تک کہ میں کسی کو اپنے "سفیر کرک" پر جو میری طرف خصوصیت سے مائل تھا۔ ترجیح نہ دے سکتی تھی۔

کوئی شخص بالکل نوعمر تھا اور کوئی بہت ضعیف۔ وہاں ایک خوبصورت بالوں والا انگریز اور ایک فرانسیسی بھی تھا۔ یہ لوگ شاہی عہدہ دار تھے۔ مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر تاہم ان سب کا ہونا میرے لئے ضروری تھا۔ ان سب کی حالت یکساں تھی۔ اور کوئی خاص بات قابلِ تعریف نہ تھی۔ پھر بھی یہ سب کے سب اس محفل عشرت کے رکن تھے۔ جو میری مسرت کی سرمایہ دار تھی۔

ان میں سے صرف ایک اطالوی نوجوان مارچیز ڈی نے بیہودہ طریقہ سے میری مدح سرائی کرکے دوسروں کے مقابلہ میں میرے دل میں زیادہ جگہ پیدا کر لی تھی۔ وہ میری تعریف کے کسی موقع کو بھی ضائع نہ کرتا تھا۔ محفل رقص میں وہ مجھے اپنا شریک بناتا، میرے ساتھ سیر کو جاتا باجہ بجاتا اور مجھ سے کہا کرتا تھا۔ کہ تم بہت خوبصورت ہو۔

بارہا میں نے اس کو اپنے مکان کے گرد گھومتے دیکھا اور اکثر اس کی تیز نگاہوں کی ناخوشگوار جسارت سے محجوب ہو کر میں اس کے سامنے سے ہٹ جانے پر مجبور ہوتی۔

وہ نوعمر حسین اور خوش وضع تھا۔ اس کا انداز تبسم اور اس کی جبین کے نقوش تعجب انگیز طریقہ پر میرے شوہر سے مشابہ تھے۔ مگر اس سے زیادہ جاذب توجہ۔ اگرچہ اس کے لبوں اس کی نظروں اور زنخدان میں میرے شوہر کے برخلاف بجائے نیکی، دلکشی اور حقیقی سکون کے ایک قسم کی درشتی اور وحشت پائی جاتی تھی۔ مگر مجھے اس منشا بہت پر تعجب تھا مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے بعض اوقات میں اس سے ہمدردی سے پیش آتی۔ اور اس کو تسلی دیتی، تاکہ وہ میرا ایک قابلِ اعتماد دوست بن جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ اس برتاؤ سے رنجیدہ اور افسردہ ہو جاتا اور اپنے پوشیدہ جذبات محبت سے مجھے پریشان کرتا اور ان کے اظہار کے لئے ہمیشہ تیار رہتا۔

میں نے اس کے جذبات کی پروا نہ کی مگر مجھے اس شخص

سے خوف معلوم ہونے لگا۔ اور اپنے ضمیر کے خلاف اکثر مجھے اس کا خیال رہنے لگا۔ میرا شوہر اس سے متعارف ہو چکا تھا اور اپنے دوسرے شناساؤں کے مقابلہ میں اس کے ساتھ بے پروائی اور مغرورانہ انداز سے پیش آتا تھا۔

اس موسم کے اختتام پر میں بیمار ہو گئی اور دو ہفتہ تک اپنے کمرہ سے باہر نہ نکل سکی۔ جب میں بیماری سے اٹھ کر پہلی بار ایک دن شام کے وقت گانا سننے کے لئے باہر نکلی تو مجھے معلوم ہوا کہ میری علالت کے زمانہ میں ایک مشہور مجسمۂ حسن لیڈی ایس، جس کی آمد کے لئے زمانہ چشم براہ تھا، آگئی ہے۔ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور گرمجوشی سے مجھے مبارکباد دی۔ مگر اس نووارد حسینہ کی جانب عوام کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ جہانتک میں نے اندازہ کیا لوگ صرف اس خاتون اور اس کے حسن ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے اس کو دیکھا۔ دراصل اس کے حسن میں دلکشی کی شان تھی۔ مگر میں نے اس کے چہرہ پر غرور کے نشانات پائے جس کا اثر میرے دل پر کچھ اچھا نہ ہوا۔ اور لوگوں سے میں نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا۔

پہلے جو چیزیں مجھے نظر فریب اور مسرور کن معلوم ہوتی تھیں آج ان پر افسردگی اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی دوسرے دن لیڈی ایس نے قلعہ کی سیر کا انتظام کیا۔ مگر میں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ قریب قریب صرف میں ہی ایک ایسی ہستی تھی جو وہاں نہ گئی۔ اور اب ہر چیز میری نظر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ہر شخص اور ہر شے مجھے لغو اور تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی۔ میں پریشان ہو گئی اور میری خواہش ہوئی کہ بقدر جلد ممکن ہو سکے مجھے روس واپس چلا جانا چاہئے۔

میرے دل میں ایک عجیب شرارت آمیز جذبہ تھا مگر ابھی تک مجھے اس کا یقین نہ تھا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میری طبیعت ناساز ہے اور میں نے بڑے بڑے مجمعوں میں جانا بند کر دیا۔ البتہ کبھی کبھی صبح کے وقت میں تفریح کے لئے باہر جاتی یا اپنی شناسا لیڈی ایل ایم کے ہمراہ سوار ہو کر نواح شہر میں گھومنے کے لئے چلی جاتی۔ اس زمانہ میں میرا شوہر وہاں موجود نہ تھا۔ وہ چند روز کے لئے ہیڈلبرگ چلا گیا تھا اور میرا علاج ختم ہونے پر مجھ کو اپنے ہمراہ لیکر روس کو واپس جانے والا تھا۔

ایک بار لیڈی ایس نے سب لوگوں کو ایک تفریح کی مہم پر چلنے کی ترغیب دی اور دوپہر کے کھانے کے بعد ایل ایم اور میں قلعہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ہم اپنی گاڑی میں آہستہ آہستہ چکردار بلند راستہ پر صدیوں کے پرانے شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے اور ان کے درمیان سے بیڈن کے گرد و نواح کا خوشنما منظر غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی شعاعوں سے چمکتا ہوا دور تک نظر آرہا تھا۔ تو ہم اپنی متانت کے ساتھ سرگرم کلام تھے

کہ آج سے پہلے کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ایل ایم کو اگرچہ میں پہلے سے جانتی تھی۔ مگر آج وہ پہلی بار ایک حسین اور ذہین عورت معلوم ہوتی جس کو ہر شخص اپنا ہمدرد بنا سکتا تھا۔ اور جسکے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے جا سکتے تھے۔

ہم نے اپنے خانگی معاملات اپنے بچوں اور بیڈن کی غیر دلچسپ صحبتوں کے متعلق گفتگو کی۔ ہم دونوں کی خواہش تھی کہ روس میں اپنے اپنے دیہاتی مکانوں کو واپس جائیں اور ہم پر ایک خاص قسم کا مسرت بخش و الم انگیز جذبہ طاری ہوگیا۔

ان سنجیدہ خیالات اور جذبات کی حالت میں ہم قلعہ میں پہنچ گئے۔ قلعہ کے اندر سایہ اور ٹھنڈک تھی۔ اور آفتاب کی شعاعیں کھنڈروں پر پھیلی ہوئی تھیں۔

ہم نے لوگوں کے قدموں کی آہٹ اور آوازیں سنیں۔ پھاٹک سے ہم بیڈن کا وہ دلفریب منظر دیکھ رہے تھے جو کم از کم ہم روسیوں کی نظر میں بہت فرحت بخش تھا ہم دم لینے کے لئے ٹھہر گئے اور خاموشی کے ساتھ غروب ہونے والے آفتاب کی طرف دیکھنے لگے۔

آوازیں زیادہ زور سے آنے لگیں۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ کوئی میرا نام لے رہا ہے۔ میری توجہ اس طرف مبذول ہوئی اور میں کان لگا کر ہر ایک بات سننے لگی۔ ان آوازوں سے میرے کان آشنا تھے۔ یہ آوازیں مارچیز ڈی اور اس کے فرانسیسی دوست کی تھیں۔ جن سے میں واقف تھی۔ وہ میرے اور لیڈی ایس کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔

فرانسیسی ہم دونوں کا تقابل کرکے ہماری نمایاں خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ اس نے کوئی بری بات نہ کہی مگر اسکی گفتگو سنکر میرا خون جوش مارنے لگا۔ اس نے میری اور لیڈی ایس کی دلکش اداؤں کی تعریف ان الفاظ میں کی۔ کہ میں ایک بچہ کی ماں بن چکی ہوں اور لیڈی ایس کی عمر ابھی انیس سال کی ہے۔ میرے بال بہت خوبصورت ہیں۔ مگر ان کے مقابلہ میں تمہاری دوست کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ روس کی معمولی بیگمات میں سے ہے۔ جو آجکل یہاں بڑی تعداد میں جمع ہو رہی ہیں۔

اس نے یہ کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کر دیا کہ میں نے یہ بہت اچھا کیا کہ لیڈی ایس کی حریف نہ بنی اور جہانتک بیڈن سے تعلق ہے۔ اب میرا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔

اس نے مکاری سے ہنستے ہوئے کہا "مجھے اس کی حالت پر افسوس ہے۔ اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ تمہارے اوپر قناعت کرلے۔"

اس نے اطالوی لہجہ میں وحشیانہ طور پر کہا "اگر وہ یہاں سے چلی جائیگی تو میں بھی اس کا تعاقب کرونگا۔"

فرانسیسی نے طنز یہ کہا "اللہ اللہ وہ کیسی خوش نصیب عورت ہے! تم کو ابھی تک اس سے محبت ہے۔"

اطالوی نے کہا۔ "محبت" اور وہ خاموش ہو گیا۔ "میں محبت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ بغیر محبت کے زندگی بے لطف ہے۔ زندگی کو دلچسپ بنانے کے لئے محبت ہی کارآمد چیز ہے۔ میری دلچسپیوں کا سلسلہ غیر منقطع رہا ہے۔ اور میں اس کو آخری دم تک نبھاؤنگا۔"

فرانسیسی نے کہا۔ "تم بڑے خوش نصیب ہو۔"

ہم کچھ اور نہ سن سکے۔ کیونکہ وہ اس گوشہ سے چلے گئے تھے۔ اور جلد ہی ان کے قدموں کی آواز دوسری طرف سنائی دینے لگی۔ وہ زینہ سے نیچے اُترے۔ اور چند لمحوں میں ایک طرف کے دروازہ سے اندر داخل ہوئے۔ اور ہم کو دیکھ کر حیرت و استعجاب میں ششدر کھڑے رہ گئے۔ جب مارچیز میرے پاس آیا تو مجھے شرم معلوم ہوئی۔ اور قلعہ سے باہر نکلتے وقت جب اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈال لیا تو مجھے خوف معلوم ہونے لگا۔ میں اس کی امداد سے انکار نہ کر سکی۔ اور ہم دونوں ایل ایم کے پیچھے روانہ ہوئے۔ جو اپنے دوست کے ساتھ آگے آگے گاڑی کی طرف جا رہی تھی۔

فرانسیسی نے میرے متعلق جو کچھ کہا تھا۔ اس سے مجھے بے حد صدمہ تھا۔ اگرچہ میں جانتی تھی کہ میرے خیالات بھی اپنے متعلق یہی ہیں۔ لیکن پھر بھی مارچیز کے گستاخانہ الفاظ نے مجھے حیرت زدہ اور پریشان کر دیا تھا۔ مجھے اس خیال سے کہ میں نے اس کی گفتگو سن لی تھی افسوس ہوا۔ مگر پھر بھی اس کو میرے سامنے آتے ہوئے ذرا بھی شرم نہ معلوم ہوئی۔ میں اس کو اپنے اسقدر نزدیک دیکھکر برافروختہ ہو گئی۔ اور بغیر اس کی طرف دیکھے یا اس کی بات کا جواب دئے اس طرح اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے کہ اس کی بات نہ سن سکوں ایل ایم اور فرانسیسی کے پیچھے جلد جلد قدم بڑھانے لگی۔ گویا میں اس کی کوئی بات سننا نہیں چاہتی ہوں۔

مارچیز نے منظر کی دلفریبی۔ اتفاقیہ مجھ سے ملنے کی خوشی اور نیز بہت سی دوسری باتوں کا ذکر کیا مگر میں نے مطلق توجہ نہیں کی۔ کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں اس وقت اپنے شوہر اپنے لخت جگر اور روس کے خیالات میں محو تھی۔ اور حجاب، ہمدردی اور خواہشات کے عجیب تاثرات سے متاثر ہو رہی تھی۔ میں حتی الامکان جلد سے جلد گھر پہنچنے کے لئے بیتاب تھی۔ تاکہ ہوٹل کی خلوت میں بیٹھ کر ان خیالات پر غور کر سکوں۔ جو یکایک میرے دماغ میں پیدا ہو گئے تھے۔ مگر ایل ایم آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور گاڑی ہنوز فاصلہ پر تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا ساتھی بے دلی کیساتھ آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا ہے۔ گویا وہ مجھے قصداً پیچھے رکھنا چاہتا ہے

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "ایسا نہیں ہونا چاہئے" اور زیادہ تیزی سے چلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اس نے

مجھے تیز چلنے سے روکا۔ اور میرا ہاتھ دبایا۔ ایل ایم موڑ پر پہنچ کر نظر سے غائب ہوگئی، ہم بالکل تنہا رہ گئے اور میں خوف کے مارے کانپنے لگی۔ میں نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "مجھے معاف کرو" اور اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر میری آستین کی جھالر اس کے بٹن میں الجھ گئی۔ وہ اپنا سر جھکا کر جھالر علیحدہ کرنے لگا۔ اور اس کی بغیر دستانوں کی انگلیاں میرے ہاتھوں سے مس ہوگئیں۔ اور ایک عجیب نئے جذبہ سے جس میں نہ خوف تھا نہ مسرت، میں کانپنے لگی میں نے اس کی طرف دیکھا تاکہ اس حقارت کو جو اسکی طرف سے میرے دل میں پیدا ہوگئی ہے۔ ظاہر کر دوں لیکن میری نگاہیں اس کو ظاہر نہ کرسکیں بلکہ اس سے صرف خوف اور پریشانی کا اظہار ہوسکا۔

اس کی اشک آلود للچائی ہوئی نظریں میرے چہرہ، گردن اور سینہ پر پڑیں۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری کلائی تھام لی۔ اُس کے لب وا ہوئے۔ اور اُس نے محبت کا اظہار کیا۔ اُس نے کہا۔ "دُنیا میں میرے لئے تم سب کچھ ہو۔" اور اُس کے لب میرے لبوں سے مل گئے اُس نے زور سے میرے ہاتھوں کو دبایا۔ اور میرے بدن میں ایک آگ سی لگ گئی۔

ایک آتش سوزاں میری رگ رگ میں سرایت کر گئی میری آنکھوں کے تلے اندھیرا آگیا۔ میں کانپنے لگی اور وہ الفاظ جن سے میں اس کو اس حرکت سے باز رکھنا چاہتی تھی حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ یک بیک مجھے اپنے رخسار پر بوسہ کی گرمی محسوس ہوئی۔ میں ٹھہر گئی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ میری زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ میں نے کوئی حرکت نہ کی۔ اور پریشانی کے عالم میں انتظار کرنے لگی۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی —— لیکن کس بات کی؟

یہ سب کچھ صرف ایک لمحہ میں ختم ہوگیا مگر یہ لمحہ بہت ہی خطرناک تھا۔ اس وقت مجھے اس شخص کی حالت پر غور کرنے کا موقع ملا۔ اُس کے چہرہ سے اسکے دلی جذبات ظاہر تھے۔ اس کے کشیدہ ابرو اس کی ٹوپی کے نیچے چمک رہے تھے۔ اور مثل میرے شوہر کے معلوم ہوتے تھے۔ اسکی خوبصورت ستواں ناک اور کشادہ نتھنے، اس کی لمبی مونچھیں جو دونوں طرف بل کھائی ہوئی تھیں۔ اس کی شاہانہ شان، اس کی صاف زنخداں اور اس کی سُرخ گردن الغرض اس کے سب اعضاء پر میں نے نگاہ ڈالی۔ اور وہ مجھے اسقدر اجنبی معلوم ہوا۔ کہ مجھے اس سے نفرت ہوگئی۔ اور اس سے خوف معلوم ہونے لگا۔ مگر اس وقت میں اس اجنبی کے جوش و سرگرمی سے مغلوب ہوگئی تھی۔

مجھے اس کے بوسہ کا جواب بوسہ سے اور اُس کے گورے گورے ہاتھوں کی گرفت کا بدلہ اپنے ہاتھوں کی گرفت سے لینے کی آرزو ہوئی۔ اور جب اُس نے ایک

خاص انداز سے انگڑائی لی۔ تو مجھے اپنے آپ کو اس ممنوع غار مسرت میں دھکیل دینے کی زبردست خواہش ہوئی۔

میں نے اپنے دل میں کہا " میں بڑی بدنصیب ہوں تو پھر اس بدنصیبی اور مایوسی کے بار کو جو میرے شانوں پر ہے۔ اور زیادہ کیوں نہ بڑھ جانے دوں "

اُس نے اپنا ایک ہاتھ میری کمر میں ڈال دیا۔ اور اپنے چہرہ کو میرے چہرہ پر جھکا دیا۔

میں نے اپنے دل میں کہا " اور بھی زیادہ شرم اور گناہ کا بار میرے سر پر کیوں نہ رکھ دیا جائے ؟ "

اُس نے ایسے لہجہ میں جو میرے شوہر سے مشابہ تھا میرے کان میں کہا۔ " میری پیاری " اور مجھے اپنے شوہر اور بچّہ کی وہ محبّت یاد آئی۔ جو کچھ دنوں پہلے میرے دل میں تھی۔ اور اب ہمیشہ کے لئے میں اس سے محروم ہو چکی تھی۔

لیکن اس وقت یکایک ہم نے ایل ایم کی آواز سنی۔ جو راستہ کے گھماؤ پر کھڑی ہوئی مجھے بلا رہی تھی۔ اس کی آواز سُن کر میرے ہوش و حواس درست ہوئے۔ میں نے اس کی گرفت سے رہائی حاصل کی اور بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے ایل ایم کی طرف دوڑی۔ اُس نے اپنی ٹوپی اُتاری۔ اور مسکرا کر کچھ کہا۔ وہ اس ناقابلِ بیان نفرت کو جو اس وقت اس کی طرف سے میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ بالکل نہ سمجھ سکا۔

مجھے اپنی موجودہ زندگی ناخوشگوار، اپنا مستقبل یاس انگیز اور ماضی تاریک معلوم ہونے لگا۔ ایل ایم نے سلسلۂ کلام شروع کیا۔ مگر میں نے اس کا ایک لفظ بھی نہ سُنا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس حقارت کو جو میری طرف سے اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ چھپانے کے لئے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کے ہر لفظ اور اس کی ہر نظر سے مجھے ملامت اور اہانت آمیز ہمدردی کا احساس ہوا۔ اس قابلِ نفرت بوسہ نے میرے رُخسار میں سوزش پیدا کر دی تھی۔ اور اپنے شوہر اور بچّہ کا خیال میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

مجھے امید تھی کہ میں اپنے کمرہ کی تنہائی میں بیٹھ کر اپنی موجودہ حالت پر غور کر سکوں گی۔ مگر تنہا رہنا بھی میرے لئے خطرناک تھا۔ میں نے چائے بھی نہ پی اور بغیر کسی وجہ کے میں نے ایک حالتِ اضطراب میں جلد جلد اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ تاکہ میں شام کی گاڑی سے ہیڈلبرگ جا سکوں جہاں میرا شوہر تھا۔

جب میں ایک خالی درجہ میں اپنی خادمہ کے ساتھ باطمینان بیٹھ گئی۔ ٹرین روانہ ہو گئی۔ اور کھڑکی سے ہوا کے سرد جھونکے اندر آ کر میرے جسم سے مس ہونے لگے، تو میرے ہوش و حواس درست ہوئے۔ اور مجھے اپنے ماضی و مستقبل پر غور کرنے کا موقع ملا۔

میری تمام ازدواجی زندگی ہیڈبرگ میں آنے کے وقت سے اس وقت تک ایک ایک نئی شان سے میرے پیش نظر ہوتی۔ اور میرے قلب پر ایک بار سا محسوس ہونے لگا۔ مجھے پہلی بار اپنی ابتدائی ازدواجی زندگی جو ہم نے دیہات میں بسر کی تھی۔ اور اپنے منصوبے یاد آئے۔ اور پہلی بار میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ وہ ان ایام میں کس طرح خوش وخرم زندگی بسر کر چکا ہے۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اسکی خطاوار ہوں۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "لیکن اُس نے مجھے سوسائٹی میں شریک ہونے سے کیوں نہ باز رکھا۔ اور اُس نے مجھے کیوں فریب دیا؟ اس نے کیوں مجھ سے صلح نہیں کی؟ اس نے کیوں مجھ کو ذلیل کیا؟ اور اس نے کیوں اپنی محبت کی قوت کو مجھ پر استعمال نہیں کیا؟ یا کیا حقیقت میں اس کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟" لیکن خواہ وہ کتنا ہی قصوروار کیوں نہ ہو، پھر بھی مجھے اس خیال نے پریشان بنا رکھا تھا کہ ایک غیر آدمی نے میرے رخسار کا بوسہ لیا تھا۔ اور ابھی تک مجھے اس کی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

جسقدر ہیڈبرگ نزدیک ہوتا گیا اُسیقدر صاف طور پر مجھے اپنے شوہر کا تصور بندھا۔ اور اسی قدر آنے والی ملاقات سے مجھے خوف معلوم ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ میں اس سے سب کچھ کہہ دونگی۔ ندامت کے آنسو برساؤنگی۔ اور وہ مجھے معاف کر دیگا۔

جیسے ہی میں اپنے شوہر کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور اس کے متین مگر متعجب چہرہ پر میری نظر پڑی تو مجھے معلوم ہوا کہ نہ مجھے اُس سے کچھ کہنا ہے نہ اپنے قصور کا اعتراف کرنا ہے۔ اور نہ اس سے معافی مانگنی ہے اور میرا غم پنہاں بدستور میرے دل ہی میں رہیگا۔

اُس نے پُوچھا۔ "تم یہاں کیوں آگئیں؟ میں تو خود کل تمہارے پاس جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔" مگر میرے چہرہ کو غور سے دیکھ کر وہ خوفزدہ ہوگیا۔

اس نے کہا۔ "کیا معاملہ ہے؟ کیا قصّہ ہے؟"

میں نے اپنے آنسوؤں کو بمشکل روکتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں، میں ہمیشہ کے لئے چلی آئی ہوں۔ کل ہی وطن واپس چلو۔"

وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا ہوا مجھے غور سے دیکھتا رہا اور پھر مجھ سے پُوچھنے لگا۔ "اچھا اب بتاؤ کہ کیا بات ہے؟"

میں محجوب ہوگئی اور اپنی نگاہ نیچی کرلی۔ غصّہ کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

مجھے اس کے شکوک کا اندازہ کر کے خوف معلوم ہونے لگا۔ اور میں نے مکّاری سے کہا۔ "کوئی بات نہیں ہے، مجھے تنہائی کی وجہ سے تکلیف تھی۔ اور مجھے اپنی طرز زندگی اور تمہارا خیال پریشان کرنے لگا تھا۔ آخر میں کبتک تمہاری گنہگار بنی رہونگی؟ تم اس جگہ میرے ساتھ کیوں آئے جہاں